کشیر

تاریخِ کشمیر — جلد اول

جی۔ ایم۔ ڈی۔ صوفی

پنجاب یونیورسٹی، لاہور — ۱۹۴۸ء

اردو ترجمہ: مترجمہ بذریعہ کلاؤڈ (Claude)، ۲۰۲۶ء

کشیر—تاریخِ کشمیر، جلد اول

جی۔ ایم۔ ڈی۔ صوفی (G. M. D. Sufi)

پنجاب یونیورسٹی، لاہور— اردو ترجمہ ۲۰۲۶ء

1948

کشیر—تاریخِ کشمیر، جلد اول

1. دیباچہ
2. زمانی جدول
3. باب اول — کشیر اور کوشُر، یعنی کشمیر اور کشمیری
4. باب دوم — قبل از اسلام کا دور
5. باب سوم — کشمیر میں اشاعتِ اسلام
6. باب چہارم — سلاطینِ کشمیر
7. باب پنجم — چکوں کے عہد میں کشمیر
8. باب ششم — مغلوں کے عہد میں کشمیر
9. باب ہفتم — افغانوں کے عہد میں کشمیر

دیباچہ

یہ امر عجیب ہے کہ وادیِ کشمیر کے پہاڑوں، وادیوں اور جھیلوں، اس کی برفوں، ندیوں اور سایہ دار گوشوں کا بیان کرنے والے تو بے شمار ملے، مگر اس کی تاریخ بیان کرنے والا، یا یہ بتانے والا کہ اس وادی نے دنیا کو کیا کچھ دیا ہے، شاید ہی کوئی ہوا۔ بلاشبہ کلہن کی راج ترنگنی، جس کے لفظی معنی "بادشاہوں کا دریا" ہیں، قدیم ترین زمانے سے ۱۱۴۹ء تک کشمیر کی تاریخ کا سنسکرت اشعار میں جائزہ لیتی ہے، لیکن یہ "بادشاہوں کا دریا" زیادہ سے زیادہ گویا کشمیر کا شاہنامہ ہی رہا، بایں معنی کہ یہ ایک ڈھیلی ڈھالی منظوم روایت ہے۔ یہ آنجہانی سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein) کی محنت اور عرق ریزی ہی کا احسان ہے کہ ہمیں وہ عظیم الشان محشّیٰ انگریزی ترجمہ میسر آیا جس نے کشمیر کی قدیم تاریخ کے سنجیدہ طالب علم کے لیے کلہن کی "تواریخِ سلاطینِ کشمیر" کے مندرجات کو واضح کر دیا ہے۔

کلہن کی تاریخ کا یہ سلسلہ سنسکرت اشعار ہی میں پنڈت جون راج نے اپنی راج آولی میں جاری رکھا؛ اس کے شاگرد پنڈت سری ور نے اپنی جین راج ترنگنی میں اسے ۱۴۸۶ء تک پہنچایا؛ پراجیہ بھٹ نے اپنی راج آولی پتاکا میں ۱۵۱۲ء تک؛ اور شُک نے اپنی راج ترنگنی میں ۱۵۸۶ء میں اکبر کی فتحِ کشمیر تک، بلکہ اس سے بھی کچھ آگے ۱۵۹۶ء تک۔ یہ منظوم سنسکرت تواریخ انگریزی خواں قاری کو آنجہانی مسٹر جوگیش چندر دت (Jogesh Chunder Dutt) کی "کنگز آف کشمیرا" میں دستیاب ہیں، مگر یہ سلسلہ بھی تشفی بخش ہونے سے بہت دور ہے۔

میری اس رائے کی تائید سر اورل سٹائن کے ان ریمارکس سے ہوتی ہے، جب وہ کہتے ہیں: ”جون راج خاصی استعداد کا حامل عالم تھا، مگر بظاہر ہر قسم کی جدت سے عاری۔ سری ور کلہن کا کورانہ مقلد تھا۔ پراجیہ بھٹ اور شُک کی تصنیف تو انشا پردازی میں سری ور کی تاریخ سے بھی فروتر ہے“ (دی اینشنٹ جیوگرافی آف کشمیر، صفحہ 42)۔

علاوہ ازیں، جون راج کا وہ سنسکرت متن جو مسٹر دت کے پیشِ نظر رہا، یعنی کلکتہ ایڈیشن، ۹۸۰ شلوکوں پر مشتمل تھا، جب کہ ڈاکٹر پیٹرسن (Dr. Peterson) کے مرتبہ سنسکرت متن، یعنی ۱۸۹۶ء کے بمبئی ایڈیشن، میں ۱۳۳۴ شلوک ہیں۔ مزید برآں، پراجیہ بھٹ کی اصل تصنیف، موسوم بہ راج آولی پتاکا، اب تک التفات سے محروم چلی آئی ہے، اور شُک کی راج ترنگنی کو مسٹر دت، ڈاکٹر پیٹرسن اور سر اورل سٹائن نے پراجیہ بھٹ اور شُک کی مشترکہ تصنیف سمجھ لیا ہے، جس کی ظاہری وجہ وہ التباس ہے جو سلطان فتح شاہ کے تین بار تختِ کشمیر پر متمکن ہونے سے پیدا ہوا۔ جب سری ور نے اپنی تاریخ ختم کی تو فتح شاہ پہلی بار حکمرانی کر رہا تھا؛ اور جب شُک نے اپنی تاریخ کا آغاز کیا تو فتح شاہ پھر سلطان تھا۔ چونکہ وہی حکمران دوسری بار تخت نشین تھا، اس لیے ان تینوں اہلِ قلم کا سلسلہ متصل دکھائی دیا؛ مگر حقیقت یہ ہے کہ پنڈت پراجیہ بھٹ کی راج آولی پتاکا ان درمیانی پچیس برسوں، یعنی ۱۴۸۷ء تا ۱۵۱۲ء، سے بحث کرتی ہے جن میں سلطان فتح شاہ اور سلطان محمد شاہ دو دو بار ایک دوسرے کو معزول کر کے یکے بعد دیگرے تخت نشین ہوتے رہے۔

فارسی میں قبلِ مغلیہ، مغلیہ اور مابعدِ مغلیہ ادوار سے متعلق متعدد تواریخ موجود ہیں، اور چند ایک اردو میں بھی، مگر تاریخِ کشمیر کا کوئی ایسا معتبر اور تازہ ترین مرقع دستیاب نہیں جو اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ کے لیے قابلِ اعتماد رہنما کا کام دے سکے۔ چنانچہ میں

نے اس سمت میں ایک کوشش کی ہے۔ تاہم، چونکہ کلہن کی تاریخ کا سر اورل سٹائن کا انگریزی ترجمہ کشمیر کی قدیم تاریخ پر ایک مستند تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے، اور آنجہانی رنجیت سیتارام پنڈت کی "رِور آف کنگز" میں وہ گہرا تبحر موجود ہے جس کے ذریعے انہوں نے کشمیر کی تاریخ کے ویدک، بدھ اور برہمنی ادوار کے قابلِ ذکر کارناموں کو اجاگر کیا ہے، اس لیے میں نے اپنا کام عہدِ وسطیٰ کے قدرے مفصل بیان تک محدود رکھا ہے، البتہ واقعات کا سلسلہ اپنے زمانے تک پہنچا دیا ہے۔

زیرِ نظر عہد میں سلاطینِ کشمیر کے کارناموں کا محض خشک خاکہ پیش کرنے کے بجائے مجھے یہ امر زیادہ اہم معلوم ہوا کہ موضوع کو تہذیبی و ثقافتی نقطۂ نظر سے برتا جائے۔ چنانچہ اگرچہ میں قدیم ترین زمانے سے اپنے عہد تک کشمیر کی سیاسی تاریخ کا کم و بیش مسلسل مرقع پیش کر رہا ہوں، تاہم وادیِ کشمیر میں مسلم نظامِ حکومت و معاشرت کی تشریح کو خاص نمایاں مقام دیا گیا ہے، کیونکہ تاریخِ کشمیر کے اس دلچسپ اور اہم پہلو کی جانب شاذ ہی کبھی کوئی خصوصی توجہ دی گئی ہے۔

کاشر — اس کتاب کا نام

"کاش" دراصل وہ نام ہے جو خود کشمیری وادیِ کشمیر کو دیتا ہے؛ وہ اپنے آپ کو اور اپنی زبان کو "کوشر" یا "کاشر" کہتا ہے۔ جیسا کہ سر جارج گریئرسن (Sir George Grierson) نے اپنی "ڈکشنری آف دی کشمیری لینگویج"، صفحہ 481، میں نشان دہی کی ہے، لفظ "کشمیر" کا استعمال خالص کشمیری ہونے کے بجائے زیادہ تر ہندوستانی اور ایرانی ہے۔

آنجہانی سر اورل سٹائن نے راج ترنگنی پر کام اس زمانے میں کیا جب وہ پنجاب یونیورسٹی کے رجسٹرار تھے۔ یہ ایک اتفاق ہے کہ کاشر کی تصنیف، جسے میں نے "اسلامک کلچر اِن کشمیر" کا عنوان دیا تھا، میرے حصے میں اس وقت آئی جب میں دہلی یونیورسٹی کا رجسٹرار تھا۔ اور اب یہ کتاب پہلی بار، اپنی موجودہ صورت اور نظرثانی شدہ نام کے ساتھ، پنجاب یونیورسٹی — سر اورل سٹائن کی پرانی یونیورسٹی — کی جانب سے، سر اورل ہی کی کتاب کی طرح دو جلدوں میں، شائع ہو رہی ہے۔ انہی دنوں یہ اطلاع بھی ہے کہ کلہن کی "تواریخِ سلاطینِ کشمیر" کے سر اورل کے انگریزی ترجمے کا ان کا نظرثانی شدہ ایڈیشن ریاست جموں و کشمیر کے زیرِ اہتمام زیرِ طبع ہے۔ مگر افسوس کہ سر اورل ۱۹۴۳ء میں کابل (افغانستان) میں وفات پا گئے۔

کاشر کے باب اول میں قاری کو کشمیر کا عمومی بیان اور کشمیریوں کے کردار و احوال پر ملاحظات ملیں گے۔ باب دوم میں قدیم ترین زمانے سے اس سرزمین میں اسلام کی آمد تک کشمیر کی تاریخ کی تلخیص کی کوشش کی گئی ہے۔ اشاعتِ اسلام کا ذکر، وادی پر اس کے نمایاں نقش کے پیشِ نظر، باب سوم میں کیا گیا ہے۔ باب چہارم اور باب پنجم اس سرزمین کے ابتدائی مسلمان حکمرانوں سے متعلق ہیں۔ یہ دونوں باب ۱۳۲۰ء سے ۱۵۸۶ء تک دو سو ساٹھ برس سے زائد کے عرصے پر محیط ہیں — ایک ایسا زمانہ جو تاریخِ ہند میں محمد تغلق کی تخت نشینی سے عہدِ اکبری کے تقریباً وسط تک، اور تاریخِ انگلستان میں ایڈورڈ سوم کے عہد سے ملکہ الزبتھ کے عہد کے تقریباً وسط تک کے زمانے کے کم و بیش متوازی ہے۔

سلطان شہاب الدین، جس کا عہدِ حکومت ۱۳۵۴ء تا ۱۳۷۳ء ہے، کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران تھا جس نے اپنی فتوحات کو کابل اور کاشغر تک وسعت دی اور جامِ سندھ کو شکست

دی۔ کشمیر کی عظمت زین العابدین کے عہد میں نقطۂ عروج کو پہنچی، جو بڈشاہ یعنی "شہنشاہِ اعظم" کے لقب سے مشہور ہے؛ اس نے تبت اور پنجاب فتح کیے اور اپنی سلطنت پرش آور — موجودہ پشاور — سے سندھ اور سرہند تک قائم کی۔ اس کا پچاس برس پر پھیلا ہوا دورِ حکومت، ۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء، عہدِ وسطیٰ کے کشمیر کا زریں دور تھا۔

زین العابدین کا عہد تقریباً سادات حکمرانوں — خضر خان کے بیٹے معز الدین مبارک اور اس کے دو جانشینوں محمد اور علاء الدین عالم شاہ — نیز بہلول لودھی کے زمانے کا ہم عصر تھا۔ سلطانِ کشمیر کی روشن خیال حکومت اس افراتفری اور انتشار سے نمایاں تضاد پیش کرتی تھی جو اس وقت ہندوستان کی شان و شوکت کے مرکز اور علامت، دہلی، اور اس کے گرد و نواح میں برپا تھا۔ سلاطینِ کشمیر کے متاخر عہد کی کشمیری تقویم جو معما پیش کرتی رہی ہے، اسے سکوں، کتبوں، مادہ ہائے تاریخ اور ہم عصر ہندو اور مسلمان مؤرخین کی چھوڑی ہوئی روایات کے بغور تقابل کے ذریعے سلجھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

مغلوں کی فتحِ کشمیر اور ان کی ۱۶۴ برس پر محیط حکومت باب ششم کا موضوع ہے۔ باب ہفتم افغانوں کے زیرِ نگیں کشمیر سے بحث کرتا ہے، جو ۶۷ برس تک، یعنی ۱۸۱۹ء تک، اس پر قابض رہے، جب کشمیر میں مسلم اقتدار تقریباً پانچ سو برس قائم رہنے کے بعد اختتام کو پہنچا۔

کشمیر میں مسلم حکومت کے عہد، یعنی ۱۳۲۰ء تا ۱۸۱۹ء، کے دوران دنیا کے اہم ہم عصر سیاسی اور تہذیبی واقعات کا ایک نقشہ بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ اس نقشے پر ایک نظر ہی اس نقطۂ نظر کی اہمیت کو اجاگر کر دے گی جو، امید ہے، بیک وقت دلچسپ بھی ہوگا اور سبق آموز بھی۔ یہاں کاشر کی جلد اول ختم ہوتی ہے۔

کشمیر میں اسلامی تہذیب و ثقافت کا ایک وسیع عمومی جائزہ ابواب ہشتم، نہم اور دہم میں ان عنوانات کے تحت دیا گیا ہے: (۱) مسلم عہدِ حکومت کے کشمیر میں علوم و ادبیات اور اہلِ قلم؛ (۲) مسلم عہدِ حکومت کے کشمیر میں فنون و دستکاری؛ اور (۳) کشمیر میں مسلم عہدِ حکومت کا ملکی و عسکری نظم و نسق۔ ان ابواب میں، جن سے کاشر کی جلد دوم کا آغاز ہوتا ہے، قاری کو ان اہم اثرات کا خلاصہ ملے گا جو مسلم ریاست اور معاشرت کے اثر و نفوذ سے اہلِ کشمیر پر مرتب ہوئے۔

باب یازدہم — سکھوں کے عہد کا کشمیر، ۱۸۱۹ء سے ۱۸۴۶ء تک ستائیس برس — کے بعد باب دوازدہم آتا ہے، جو آخری باب ہے: ڈوگرہ عہدِ حکومت کا کشمیر، جو اس روداد کو مہاراجہ پرتاپ سنگھ کی وفات، ستمبر ۱۹۲۵ء، تک لے آتا ہے۔

نقلِ حروف کا جو نظام اختیار کیا گیا ہے وہ، جہاں تک پریس کے وسائل نے اجازت دی، بیشتر وہی ہے جو کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں مستعمل ہے، جب کہ انگریزی املا کی مختلف صورتوں میں سے وہی اختیار کی گئی ہیں جنہیں کنسائز آکسفرڈ ڈکشنری نے ترجیح دی ہے۔

مجھے قاری کو پیشگی بتا دینا چاہیے کہ کاشر اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے ایک ماخذ کتاب کے طور پر مرتب کی گئی ہے، اس لیے میں نے ان ماہرین اور عینی شاہدین کے اقتباسات کثرت سے نقل کرنے میں کوئی تامل نہیں کیا جن کی بات متعلقہ نکتے پر وقعت رکھتی تھی، اور ان کے مشاہدات کو نئے سرے سے اپنے الفاظ میں ڈھال کر پیش کرنے سے احتراز کیا ہے۔ بعض مقامات پر فارسی یا اردو کے اشعار، ابیات اور مختصر اقتباسات کا انگریزی ترجمہ نہیں کیا گیا؛ وہ اپنی فارسی یا اردو کی نفاستِ بیان کی بنا پر کاشر میں اصل صورت میں درج ہیں۔ ترجمے میں ”ذاتی اسلوب، شعر کی موسیقیت اور پیکر تراشی کی

جزئیات" لازماً دھندلا جاتی ہیں۔ بے کیف اور سپاٹ ترجمہ تو محض "ایک غیر شفاف پردہ" ہوتا ہے، چنانچہ اس کی کوشش ہی نہیں کی گئی، جس کے لیے صرف انگریزی جاننے والے قاری سے درگزر کی درخواست ہے۔

متعدد اہلِ علم، احباب، شناساؤں اور دیگر حضرات نے کاشر کو جا بجا پڑھا — بعض نے مکمل، بعض نے ان حصوں کو جن سے انہیں دلچسپی تھی یا جن میں وہ ماہر تھے۔ بعض نے کتاب کو عبارت اور رموزِ اوقاف کی اغلاط دور کرنے کی غرض سے پڑھا۔ یہ سب حضرات اتنے ہیں کہ ایک ایک کا نام لینا ممکن نہیں؛ میں ان سب کا نہایت شکر گزار ہوں۔

اگر میں نے اپنی یہ محبت بھری محنت پنجاب یونیورسٹی کی نذر کی ہے اور یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ نے اسے قبول فرمایا ہے تو اس کا محرک بنیادی طور پر معزز جسٹس ڈاکٹر دین محمد، ایم اے، ایل ایل ڈی، جج ہائی کورٹ پنجاب، کی ذات رہی ہے۔

غلام محی الدین صوفی چنار باغ، سری نگر، کشمیر۔ ۲۶ مگھر ۲۰۰۷ بکرمی بروز اتوار، ۱۰ دسمبر ۱۹۴۴ء ۲۳ ذوالحجہ ۱۳۶۳ھ

اب (۱۹۴۸ء میں) عزت مآب ڈاکٹر دین محمد، ایم اے، ایل ایل ڈی، گورنر سندھ (پاکستان) ہیں۔

اظہارِ تشکر برائے گوناگوں تعاون

ان حضرات کے نام جنہوں نے مسودے کے حصے یا صفحات پریس کے لیے ٹائپ کر کے میری معاونت کی: لیفٹیننٹ احمد محی الدین صوفی، بی اے، سابق آر آئی این وی آر، اربن

ری ہیبی لی ٹیشن آفیسر برائے سندھ، اور اس سے قبل ری سیٹلمنٹ ایڈوائس آفیسر، بمبئی۔ مسٹر محمود محی الدین صوفی، ایم اے (بمبئی)، ایکسچینج بینک آف انڈیا اینڈ افریقہ لمیٹڈ، کراچی۔ مس میمونہ صوفی، بی اے، بی ٹی (پنجاب)، 81 نریمان روڈ، کراچی۔ مسٹر عبداللہ حسن خان، بی اے، ایل ایل بی (بمبئی)، بمبئی۔ مسٹر محمد شفیع قریشی، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور۔ مسٹر جی کے ریڈی، سابق ایڈیٹر "دی کشمیر ٹائمز"، امیرا کدل، سری نگر۔ پنڈت پرتھوی ناتھ کول بامزئی، بی اے (پنجاب)، رئیس، کول منزل، زینہ کدل، سری نگر۔ خواجہ غلام احمد، بی اے (علی گڑھ)، ایل ایل بی (پنجاب)، ریزیڈنسی روڈ، سری نگر۔ مسٹر یعقوب سنت رام، سٹینوگرافر، دفترِ دہلی یونیورسٹی۔ مسٹر بھگت رام، سابق کارکنِ دفترِ دہلی یونیورسٹی۔ مولوی محمد حامد الدین، اسی دفتر کے سابق اکاؤنٹنٹ۔ مسٹر محمد شفیع، ٹائپسٹ، دفتر ڈائریکٹر تعلیمات، ریاست جموں و کشمیر۔ پنڈت جانکی ناتھ، ٹائپسٹ، دفتر میونسپلٹی، سری نگر۔ آنجہانی مسٹر ویدیا اور مسٹر باپٹ، ٹائپسٹ، دفتر بمبئی یونیورسٹی لائبریری، بمبئی۔ مسٹر بہمن جی دوباش، کولابا، بمبئی، کے ٹائپسٹ۔ مسٹر ہاتم، سٹینوگرافر، ایکسچینج بینک آف انڈیا اینڈ افریقہ لمیٹڈ، کراچی۔ مسٹر غوث محمد خان لودھی، ٹائپسٹ، سی اینڈ ایم جی پریس، لاہور۔ مسٹر جی معین الدین، پی اے ایس، مسٹر عنایت اللہ خان، پی اے ایس، اور خواجہ غلام محمد (ریٹائرڈ) نے کاشر کے حصوں کی ٹائپنگ کے لیے اپنے سٹینوگرافر مامور فرمائے۔

حسبِ ذیل کتب خانوں کے عملے کا بھی شکریہ واجب ہے: (۱) پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور — خصوصاً مسٹر محمد شفیع قریشی، قاری محمد ظریف، مولوی عبد السبوح، خلیفہ عبد الرحمٰن اور ایم غلام محمد؛ (۲) بمبئی یونیورسٹی — اس کے پرجوش لائبریرین ڈاکٹر پی ایم جوشی، ایم اے، پی ایچ ڈی (لندن)، ان کے سابق اسسٹنٹ مسٹر بھوسلے، اور بالخصوص

مسٹر سوداگر، مسٹر نارویکر، مسٹر ریگے، مسٹر نائک، مسٹر جوشی اور مسٹر ولی احمد کاملی؛ (۳) سری پرتاپ سنگھ لائبریری، سری نگر، اور اس کے لائبریرین مسٹر جے سپرو، بی اے؛ (۴) آرکیالوجی اینڈ ریسرچ لائبریری، سری نگر، اور خصوصاً اس کے اسسٹنٹ خواجہ غلام احمد مشتاق؛ (۵) خان بہادر خلیفہ محمد اسد اللہ، بی اے، نے، جب وہ امپیریل لائبریری، کلکتہ کے لائبریرین تھے، اپنے کتب خانے کی کتابوں، نقشوں وغیرہ سے متعلق تمام استفسارات کا فوری جواب دیا اور جب بھی ان سے رجوع کیا گیا، کتابوں کی ترسیل کا اہتمام فرمایا۔

زمانی جدول

کشِیر — زمانی جدول

قبل از اسلام عہد: قدیم ترین زمانوں سے لے کر تاریخِ کشمیر کا وہ حصہ جو ویدک، بدھ اور برہمنی ادوار پر محیط ہے۔

سلاطینِ کشمیر: اس سلسلے کا آغاز ۱۳۲۰ء میں سلطان صدر الدین (رنچن) سے ہوتا ہے اور اختتام سلطان حبیب شاہ پر؛ یعنی ۱۳۲۰ء تا ۱۵۶۰ء، کل ۲۴۰ برس۔ اس عرصے میں ۱۳۲۳ء تا ۱۳۳۸ء کا پندرہ سالہ وقفہ اُدیانا دیو اور کوٹا رانی کی حکمرانی پر مشتمل ہے۔

چک: ۱۵۶۰ء تا ۱۵۸۶ء، یعنی ۲۶ برس۔

مغل: ۱۵۸۶ء تا ۱۷۵۲ء، یعنی ۱۶۶ برس۔

افغان: ۱۷۵۲ء تا ۱۸۱۹ء، یعنی ۶۷ برس۔

کشمیر میں مسلم اقتدار کی مجموعی مدت: ۲۴۰ + ۲۶ + ۱۶۶ + ۶۷ = ۴۹۹ برس۔

سکھ: ۱۸۱۹ء تا ۱۸۴۶ء، یعنی ۲۷ برس۔

ڈوگرے: مہاراجا گلاب سنگھ سے مہاراجا پرتاپ سنگھ تک، موجودہ فرماں روا کو شامل کیے بغیر، ۱۸۴۶ء تا ۱۹۲۵ء، یعنی ۷۹ برس۔ ۱۹۴۶ء میں کشمیر میں ڈوگرہ راج نے اپنی ایک صدی مکمل کر لی۔

تصحیح نامہ — جلد اول

عکسِ تحریر (فیکسیملی)، سطر 3: Nishat کے بجائے Nashāt پڑھیے۔

صفحہ 15، سطر 2: Honigberger کا املا درست صورت میں پڑھیے۔

صفحہ 26، اشعار کے نیچے: غلط چھپے ہوئے لفظ کے بجائے خشاط پڑھیے۔

صفحہ 35: باب کا عنوان Pre-Islamic کے بجائے Early History, Buddhist and Brāhmanical پڑھیے۔ صفحہ 37، سطر 3، پیراگراف 3: Samdhimatnnagar کے بجائے Samdhimatnagar پڑھیے۔ صفحہ 44، اوپر سے سطر 5: Sheikhupura کے بجائے Shaikhupura پڑھیے۔ صفحہ 53، آخری پیراگراف میں دو مقامات پر 751 کے بجائے 753 پڑھیے۔ صفحہ 65، نیچے سے سطر 8: ناقص چھپے ہوئے لفظ کے بجائے shall پڑھیے۔ صفحہ 69: دوسرے پیراگراف میں تین مقامات پر Udyanadeva کے بجائے Udayanadeva پڑھیے؛ یہی تصحیح صفحہ 123 کے پہلے اور دوسرے پیراگراف میں، اور صفحہ 129 کے پہلے، دوسرے اور تیسرے پیراگراف میں بھی ملحوظ رکھیے۔ صفحہ 92: ریو (Rieu) اور بلوشے (Blochet) کے ناموں میں é نہیں بلکہ e درست ہے؛ یہی تصحیح Rieu کے سلسلے میں صفحات 164، 242 اور 250 پر بھی کیجیے۔ صفحہ 112، نیچے سے سطر 14: 1394 کے بجائے 1494 پڑھیے۔

صفحہ 124: جو میں پیش اگلے مصرعے میں جا پڑی ہے، جہاں اس کی سرے سے ضرورت ہی نہیں۔

صفحہ 135: حاشیہ نمبر 2 میں by اور Sir کے درمیان فاصلہ درکار ہے۔

صفحہ 141، نیچے سے سطر 3: Ghazni میں حرفِ I پر علامتِ مد ہونی چاہیے۔ صفحہ 147: appraised کے بعد کا سکتہ اپنی اصل جگہ سے آگے جا پڑا ہے۔ صفحہ 171، سطور 4 اور 21: Gujrat کے بجائے Gujarat پڑھیے۔ صفحہ 173، حاشیہ نمبر 4: حرف f ٹوٹا ہوا چھپا ہے، اور کتاب کے نام میں علامتِ مد i پر نہیں بلکہ a پر ہونی چاہیے۔

صفحہ 178، ضمنی عبارت کے نیچے سطر 2: Bad کے بجائے Bād پڑھیے۔

صفحہ 205: نیچے سے سطر 8 میں first کے بعد کا سکتہ حذف کر دیجیے۔

صفحہ 207، اوپر سے سطر 11: Nazar کے بجائے Nazr پڑھیے۔

صفحہ 222: Qazi-ul-Quzzat کے بجائے Qazi'l-quzat پڑھیے۔ صفحہ 224: Akbari میں a پر علامتِ مد ہونی چاہیے، اور یہی صورت jagir میں بھی ہے۔

صفحہ 225، نیچے سے سطر 7: Iran کا حرف I غلط فونٹ میں چھپا ہے۔

صفحہ 236، متن کے نیچے سے سطر 2: 1887 کے بجائے 1387 پڑھیے۔ صفحہ 237: آخری مصرعے میں غلط چھپے ہوئے لفظ کے بجائے صدائے پڑھیے۔ صفحہ 250، اوپر سے سطر 18: نظام الدین کی تاریخِ وفات میں 1694 کے بجائے 1094 پڑھیے۔ صفحہ 251، اوپر سے سطور 6، 7 اور 8: کشمیر صوبۂ کابل میں شامل تھا، نہ کہ کابل کشمیر میں۔ صفحہ 257، اوپر سے سطر 19: B.A. اور P.B. کے درمیان کا نشانِ ربط (ہائفن) زائد ہے۔ صفحہ 263، اوپر سے سطر 8: Gujrati کے بجائے Gujarati پڑھیے۔ صفحہ 298: Zulfiqar اور Zulfaqar دونوں املا روا ہیں، اگرچہ بعض حضرات Zulfaqar ہی پر شدت سے اصرار کرتے ہیں۔ صفحہ 300: پیراگراف کی آخری سطر میں emper کے بجائے temper پڑھیے۔

صفحہ 312: فارسی شعر کی پہلی سطر میں غلط چھپے ہوئے لفظ کے بجائے مان پڑھیے۔

باب اول — کشیر اور کوشُر، یعنی کشمیر اور کشمیری

کشمیر اور کشمیری

بہت سے اہلِ قلم نے کشمیر کی منظر کشی کی کوشش کی ہے، بعض نے تو خاصی تفصیل سے، مگر کشمیر آج بھی بیان کی گرفت میں نہیں آتا۔

ابوالفضل کا قول ہے: "کشمیر کی تعریفیں زبان کی تنگنائیوں میں سما نہیں سکتیں۔" اور حافظؔ بھی یہی کہتے ہیں کہ کشمیر کی تصویر کھینچنا ایسا ہی ہے جیسے فرہاد کا اپنی محبوبہ شیریں کی خاطر کوہِ بیستون سے جوئے شیر جاری کرنا۔

کشمیر، جو فی الحقیقت کنواری برف کے ایک تاباں حلقے میں جڑا ہوا سبزے کا زمرد ہے، ایسا خوب صورت ملک ہے — زرخیز زمین، شان دار آب و ہوا، عظیم پہاڑوں، عمدہ دریاؤں اور دل کش جھیلوں سے مالا مال، اور ایسے دل فریب پھولوں، لذیذ پھلوں، نغمہ سرا پرندوں اور بھینی بھینی خوشبوؤں سے آراستہ — کہ کبھی اسے "نوعِ انسانی کی اصل جنت کا مقام" ہونے کی بڑی شہرت حاصل رہی۔ چنانچہ یہ امر معنی خیز ہے کہ ڈاکٹر ٹیرا (Dr. De Terra) کے بہ قول کشمیر اور اس سے ملحق میدانوں میں جنوبی ایشیا کے قدیم انسان کے مطالعے کے لیے تمام تر ضروری مواد موجود ہے، اور ہمالیائی عہدِ یخ بندان کی اولین شہادت بھی کشمیر ہی سے ملی ہے۔ اگرچہ ممکن ہے کشمیر اصل جنت نہ ہو، تاہم وہ یقیناً روئے زمین کے مبارک ترین خطوں میں شمار ہوتا ہے۔ فی الواقع یہ بجائے خود ایک الگ تھلگ عالم ہے، جس میں ہر مقام سب سے حسین معلوم ہونے لگتا ہے، شاید اس لیے کہ ہر مقام کسی نہ کسی خصوصیت میں

باقی سب سے بڑھا ہوا ہے۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ (Sir Francis Younghusband) کہتے ہیں کہ جس ملک سے کشمیر کا موازنہ کیا جانا مناسب ہے وہ سوئٹزرلینڈ ہے۔

کشمیری زبان میں کشمیر کے باشندے کو "کوشُر" کہتے ہیں اور یہی نام اس کی زبان کا بھی ہے۔

(حواشی: اکبرنامہ، انگریزی ترجمہ از ایچ.بیورج (H. Beveridge)، صفحہ 828۔ لفظ "ڈرائنگ" یہاں اپنے قدیم مفہوم میں ہے، یعنی "ایک مقام سے دوسرے مقام تک نہر یا کھال کھودنا اور لے جانا" — مرے کی انگریزی لغت (Murray's English Dictionary)۔ دی ہسٹوریز ہسٹری آف دی ورلڈ (The Historians' History of the World) — دی ٹائمز، لندن، ۱۹۰۷ء، جلد دوم، صفحہ 485۔ 5-6۔ "سٹڈیز آن دی آئس ایج اِن انڈیا اینڈ ایسوسی ایٹڈ ہیومن کلچرز" از ڈاکٹر ایچ ڈی ٹیرا اور ٹی ٹی پیٹرسن (T. T. Paterson)، واشنگٹن ڈی سی، ۱۹۳۹ء، صفحہ 1؛ ایضاً، صفحہ 1۔ "کشمیر" از سر فرانسس ینگ ہسبنڈ، ۱۹۱۷ء، صفحہ 2۔)

کشمیر اور سوئٹزرلینڈ

سوئٹزرلینڈ میں بلاشبہ بہت سی رعنائیاں ہیں اور جھیل اور کوہستانی مناظر کا ایسا امتزاج ہے جس میں وہ کشمیر پر فوقیت رکھتا ہے، لیکن اس کی ساخت چھوٹے پیمانے پر ہے اور وہاں برف پوش پہاڑوں کا ویسا وسیع پھیلاؤ نہیں۔ تاہم وین (G. T. Vigne) کی نظر میں کشمیر کی گھاٹیاں، مرغزار، جنگل اور ندیاں سراسر الپائی ہیں۔ علاوہ ازیں دنیا میں کوئی ایسا مقام نہیں جہاں برفانی پہاڑوں کا مکمل دائرہ تقریباً ۱۹۰۰ مربع میل کے ایسے میدان کو گھیرے دیکھا جا

سکے جو ہر جگہ سطحِ سمندر سے ۵۰۰۰ فٹ سے زیادہ بلند ہو اور جس کا طول — تقریباً ۸۴ میل — اور عرض — تقریباً ۲۰ تا ۲۵ میل — وادیٔ کشمیر کے برابر ہو۔ ایک برف زار سے دوسرے برف زار تک وادی کی چوڑائی ۲۵ تا ۳۰ میل ہے۔ سوئٹزرلینڈ کی مرکزی وادیاں کشمیر کی ضمنی وادیوں جیسی ہیں۔ کشمیر کے پہاڑوں کی مسلسل دیوار کی بہت سی چوٹیاں مون بلاں (Mont Blanc) سے ہزاروں فٹ اونچی ہیں اور کوہِ قفقاز کی رفیع ترین چوٹیوں سے کہیں تجاوز کر جاتی ہیں۔ سوئٹزرلینڈ کے عقب میں وہ کچھ نہیں جو کشمیر کی پشت پر موجود ہے اور جنوبی جانب سے جھلکیوں میں دکھائی دیتا ہے — یعنی شان دار پہاڑوں کا وہ خطہ جو دنیا کے ہر دوسرے خطے پر فائق ہے۔ بالائی ہمالیہ میں اپنے محلِ وقوع کے باعث کشمیر ہندوستان کا پیڈمانٹ (Piedmont) ہے۔

کشمیر اور یونان

شعرا نے ارغوانی پہاڑیوں اور گوناگوں خط و خال، رقصاں سمندروں اور شفاف نیلگوں آسمان والے حسین یونان کے نغمے گائے ہیں، لیکن کشمیر یونان سے بھی زیادہ خوب صورت ہے۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ لکھتے ہیں: ”اسے وہی نیلا آسمان اور وہی درخشندہ دھوپ میسر ہے، مگر اس کی ارغوانی پہاڑیاں کہیں زیادہ عظیم پیمانے پر ہیں، اور اگر اس کے پاس سمندر نہیں تو جھیل اور دریا ہیں، اور ان سے بھی زیادہ پُرشکوہ برفانی پہاڑ ہیں۔ اس کے قدرتی مناظر میں بھی زیادہ تنوع ہے — کھیت اور جنگل کا، ناہموار پہاڑوں اور کھلی وادی کا۔“ اور ینگ ہسبنڈ، جنھوں نے دونوں ملک دیکھے ہیں، مزید لکھتے ہیں: ”اور مجھے کشمیر ہی اپنے قدرتی حسن سے دل پر نقش چھوڑنے کا کہیں زیادہ اہل معلوم ہوتا ہے۔“ سوئٹزرلینڈ اور یونان کی

میری اپنی سیاحتیں ینگ ہسبنڈ کے ان مشاہدات کی تصدیق کرتی ہیں۔ سر محمد اقبال کا یہ کہنا مبالغہ نہیں:

من خدا را دیدم نجاے حجاب گرہ و درا و غروب آفتاب

(حواشی: "ٹریولز" (Travels) از جی ٹی وین، لندن، ۱۸۴۲ء، جلد اول، صفحہ 289۔ "کشمیر"، صفحہ 133۔)

ڈل کا حسن

اکثر ایسا ہوا ہے کہ لوگ پہلی نظر میں تاج محل سے متاثر نہیں ہوئے، مگر جب انھوں نے اسے قریب سے دیکھا تو شاہ جہاں کے اس "سنگِ مرمر میں ڈھلے خواب" کی دل کشی ان پر آشکار ہو گئی۔ کبھی کبھی ایسا ہی اُس شکی سیاح کے ساتھ ہوتا ہے جو کشمیر کا رخ کرتا ہے۔ ایسا شخص سب سے پہلے صبح سویرے تختِ سلیمان پر چڑھ جائے۔

وہ خود محسوس کرلے گا کہ ڈل کی ایک جھلک کیسی فوری قلبِ ماہیت کر دیتی ہے—یہ منظر عظیم ہے، اتنا عظیم کہ الفاظ اس کے بیان سے قاصر ہیں۔ پانی اس قدر شفاف ہے کہ گرد و پیش کے پہاڑوں کے عکس اس میں مکمل اترتے ہیں۔ "چنار اور بید، خوش منظر کٹیاں، سیاہ سرو، نیلگوں بُعد اور برف پوش پہاڑ مل کر ایسی تصویر بناتے ہیں جس کی نظیر کہیں اور مشکل ہی سے ملے گی۔"

مرحوم جسٹس میاں محمد شاہ دین نے پھر کیا خوب تمنا کی تھی: "اور مروں تو میری قبر ڈل کے کنارے ہو!"

اب شکی شخص شکی نہیں رہ سکتا: اس حسین جھیل کی دل آویز رعنائیاں جلد ہی اسے مغلوب کر لیتی ہیں۔ یہ پانی کی کوئی ایک بڑی چادر نہیں، اور اسی وجہ سے اور بھی زیادہ دل کش ہے۔ چھوٹی چھوٹی نہریں تیرتے باغوں اور ننھے جزیروں کو قطع کرتی ہیں، جب کہ اس کے کناروں پر — جو تقریباً پانچ میل طول اور دو میل عرض کا رقبہ گھیرے ہوئے ہیں — جا بجا گاؤں اور باغات بکھرے ہوئے ہیں۔

گاندربل کے حسین دودھیا پانیوں، اچھ بل، کوکرناگ اور ویری ناگ کے ابلتے چشموں، وادیٔ لدر میں ۱۲۰۰۰ فٹ کی بلندی پر واقع شیش ناگ کی "عجب بے نام رنگت والی" کوہی جھیل — جس دل کش وادیٔ لدر میں چرواہوں کی بستی پہلگام یعنی "گڈریوں کا گاؤں" (سری نگر سے تقریباً ۶۰ میل، سطحِ سمندر سے تقریباً ۷۰۰۰ فٹ بلند) ایک خوش گوار تفریح گاہ ہے — نیز "گوشہ نشیں، گہری اور خاموش" مانسبل اور کنولوں سے کڑھی ہوئی وولر کی میٹھے پانی کی جھیلوں، تراگبل کی بلندیوں، سونامرگ کی برفانی وادی، گنگا بل کی گھاٹی، گلمرگ یعنی "پھولوں کے مرغزار" کی دل کشی، اور جنگل کے کنارے اَپھروٹ کے دامن میں واقع گہرے یشب رنگ چشمے کی ماورائی مسرتوں کی مدح میں صفحوں کے صفحے لکھے جا چکے ہیں، مگر الفاظ ہمیشہ اُن حسنوں کے بیان سے یکسر عاجز ثابت ہوئے ہیں جو سرے سے بیان کی گرفت میں آتے ہی نہیں۔ "پہاڑ اور وادی، دریاؤں، جنگلوں اور میدانوں کا شیریں تبادلہ؛ کہیں خشکی، کہیں جھیل، اور جنگلوں سے تاج پوش کنارے، چٹانیں، کھوہیں اور غار!" — فردوسِ گم گشتہ (Paradise Lost)، دفتر نہم، ۱۱۵–۱۱۸۔

(حواشی: 1۔ گاندربل گاؤں، سری نگر سے ۱۳ میل، دریائے سندھ کے — جو جہلم کا معاون دریا ہے — بائیں کنارے پر واقع ہے۔ 2۔ اچھ بل گاؤں اسلام آباد سے تقریباً ۶ میل

جنوب مشرق میں ہے اور اس میں سید شہاب الدین بغدادی کا مزار ہے۔ جہاں آرا بیگم، معروف بہ بیگم صاحبہ، کی نسبت سے اچھ بل صاحب آباد کہلاتا ہے۔ 3-4۔ کوکرناگ کا چشمہ ویری ناگ سے چند میل کے فاصلے پر ہے، جو دریائے جہلم کا مانا ہوا منبع ہے۔ ویری ناگ، یعنی "ویر" کا ناگ یا چشمہ، جو نیلا ناگ بھی کہلاتا ہے، اپنا نام ویر کے پرگنے سے لیتا ہے جو اب شاہ آباد کہلاتا ہے۔ 5۔ شیش ناگ اُس ناگ کا نام ہے جس پر اعتقاد کے مطابق زمین قائم ہے۔ 6۔ مانسبل جھیل، جس کا قطر تقریباً دو میل ہے اور جو کشمیر کی تمام جھیلوں میں حسین ترین سمجھی جاتی ہے، سری نگر سے تقریباً ۱۶ میل شمال مغرب میں واقع ہے۔ اس کے گرد پُرشکوہ پہاڑیاں ہیں۔ "مانس" سے مراد پہاڑ اور "بل" سے جھیل ہے؛ گویا پہاڑی جھیل۔ یہ وادی کی گہری ترین جھیل ہے جس کی زیادہ سے زیادہ گہرائی 12.8 میٹر ہے۔ اینڈریو ولسن (Andrew Wilson) نے ۱۸۷۵ء میں لکھا: "یہ ننھی جھیل گراسمیئر سے کچھ زیادہ بڑی نہیں، مگر اس کے کنارے عجب طور پر سکون اور تنہائی کا تاثر دیتے ہیں۔" (دی اباڈ آف سنو، صفحہ 424)۔ اس کے ایک کنارے پر ایک عمدہ مغل باغ کے کھنڈر واقع ہیں۔ 7۔ تراگبل (مع چوکی اور ریسٹ ہاؤس)، ۹۱۶۰ فٹ بلند، بانڈی پورہ سے دس میل سے زائد شمال میں ہے، اور بانڈی پورہ وولر کے کنارے پر واقع ہے۔ 8۔ اَپھروٹ گلمرگ کے اوپر ایک پہاڑی ہے۔)

ابوالفضل کی نظر میں کشمیر ایسا سحر انگیز ہے کہ اسے بجا طور پر دائمی بہار کا ایسا باغ کہا جا سکتا ہے جو آسمان تک سلسلہ در سلسلہ بلند ہوتے ایک قلعے کے گرد پھیلا ہوا ہے، اور جو بجا طور پر اہلِ دنیا کی تفریح گاہ بھی بن سکتا ہے اور تارک الدنیا گوشہ نشیں کی خلوت گاہ بھی۔ ان کے برادر فیضی کہتے ہیں:

آثار قدرت ازلی حرم کہ چہ ست ہر نظارہ بتازد نظر

دیگر دلکشیاں

بہ الفاظِ دیگر، تفریح کے متلاشی کے لیے کشمیر ایشیا کا سب سے بڑا باغ ہے۔ ”شکار کے شائق کے لیے یہاں طرح طرح کا شکار میسر ہے۔ ماہرِ نباتات اور ماہرِ حیوانات کے لیے یہاں نباتات و حیوانات کی بڑی دولت ہے۔ دل کش گھاٹیاں اور سایہ دار کوہی شاخیں اپنے خوش منظر ماحول میں شاعر کی طبعِ رسا کے لیے ایک ناتمام موضوع اور فلسفی کے تفکر کے لیے پس منظر مہیا کرتی ہیں۔ ماہرِ لسانیات کے لیے کشمیر اور اس کے گرد و نواح میں نسلِ انسانی کی مختلف شاخوں سے تعلق رکھنے والی بولیوں کا تنوع موجود ہے۔ ماہرِ ارضیات کے لیے یہ ٹیوں اور چٹانوں کا ایسا دل چسپ مطالعہ پیش کرتا ہے جس کے زمانی شواہد ہندوستان میں اور کہیں میسر نہیں۔ ماہرِ آثارِ قدیمہ کے لیے یہاں مختلف ادوار کی بے شمار یادگاریں اور تہذیبوں کے باہمی عمل کو ظاہر کرنے والے ثقافتی اثرات کے نقوش ہیں۔ محقق کے لیے کشمیر کے مخصوص (ہندو) فلسفیانہ نظاموں میں تحقیق کا وسیع میدان ہے“ — اور مسلم تاریخ، ثقافت، شاعری اور عمرانیات کی تحقیق کا بھی۔ ”مہم جو کے لیے سرحدوں کی پُراسرار سرزمینیں اور فلک بوس پہاڑ توجہ کے مستحق ہیں۔“

(حواشی: متن میں ”سمندر اور ساحل“ کے الفاظ ہیں۔ 2۔ آئینِ اکبری، انگریزی ترجمہ از کرنل ایچ ایس جیریٹ (Colonel H. S. Jarrett)، کلکتہ، ۱۸۹۱ء، جلد دوم، صفحہ 348۔ 3۔ ریاست جموں و کشمیر کی سالانہ انتظامی رپورٹ برائے ۱۹۴۰-۴۱ء، جس میں وین،

مورکرافٹ (Moorcroft)، ایلفنسٹن (Elphinstone) اور سر والٹر لارنس (Sir Walter Lawrence) کی آرا یکجا کی گئی ہیں — صفحہ 11۔)

اور پھر — کشمیر میں رہنا دنیا کے بیشتر ملکوں کی نسبت سستا ہے۔ سری نگر، جو گویا سوئٹزرلینڈ کے قلب میں بسا ہوا وینس ہے، شان دار ہاؤس بوٹوں اور رنگ رنگیلے ڈونگوں میں دل فریب قیام کی سہولت پیش کرتا ہے۔ اور دیہات اور پہاڑوں میں خیموں تلے آزاد اور صحت بخش زندگی کے لیے خیمہ گاہیں موجود ہیں۔ کولاہوئی کشمیر کا میٹرہارن (Matterhorn) ہے، جو پہاڑوں اور برفانی تودوں کے حسین ماحول میں ۱۷۸۰۰ فٹ بلند ایستادہ ہے۔ لولاب اسکاٹ لینڈ اور ویلز کی یاد دلاتا ہے۔ کشمیر کے مخروطی جنگلات شمالی ہندوستان کے بہترین جنگلات ہیں۔

آب و ہوا

اگرچہ وادی سطحِ سمندر سے تقریباً ۵۰۰۰ فٹ بلند ہے، مگر یہاں اتنی سردی نہیں پڑتی جتنی اِس بلندی پر متوقع ہو سکتی ہے: گرمش نہ گرم است و سردش نہ سرد است "گرمی ہے مگر گرم نہیں؛ سردی ہے مگر سرد نہیں۔"

اس کی وجہ گرد و پیش کی بلند پہاڑیاں ہیں جو وادی کو شمال کی سرد ہواؤں اور جنوب کی جھلسا دینے والی لوؤں سے بچاتی ہیں۔ اس کے باوجود، ڈاکٹر آرتھر نیو (Dr. Arthur Neve) نشان دہی کرتے ہیں کہ کشمیر کے مختلف حصوں میں درجۂ حرارت یا رطوبت کا اتنا ہی تنوع مل سکتا ہے جتنا بحیرۂ روم کے سواحل سے نارتھ کیپ تک پورے یورپ میں۔ جنوری سے وسط فروری تک سری نگر کا اوسط درجۂ حرارت ۳۵ درجے فارن ہائیٹ اور جولائی سے وسط

اگست تک ۸۰ درجے رہتا ہے؛ سائے میں انتہائیں پہلی صورت میں ۱۵ تا ۴۵ درجے اور دوسری صورت میں ۵۵ تا ۹۶ درجے، اور بعض برسوں میں ۹۸ یا ۹۹ درجے تک جا پہنچتی ہیں۔ مئی کے بالکل آخر تک خود وادی کی آب و ہوا سوئٹزرلینڈ سے بہت ملتی جلتی رہتی ہے۔ جوں جوں گرمی کا موسم بڑھتا ہے، وہ قدرے ماند کر دینے والی ہو جاتی ہے، مگر حرارت شاذ ہی، بلکہ شاید کبھی نہیں، جنوبی اٹلی کی حرارت سے بڑھتی ہے۔ خزاں کے مہینے سارے سال میں سب سے خوش گوار ہوتے ہیں، جن کے دن صاف اور روشن مگر خاصے خنک ہوتے ہیں۔ بارش دیگر تمام ہمالیائی پہاڑی مقامات سے کہیں کم ہوتی ہے؛ سری نگر میں سالانہ مقدار شاذ ہی ۲۷ انچ سے بڑھتی ہے۔ گلمرگ میں یہ بہت زیادہ ہے، مگر پھر بھی مری کی بارش کے دو تہائی سے زیادہ نہیں۔ تاہم دو مہینے وادی کے نشیبی حصے بھی شاذ ہی برف سے خالی رہتے ہیں، جو پہلے آٹھ انچ یا فٹ بھر گہری جمی رہتی تھی، اگرچہ اب اتنی نہیں جمتی۔ کشمیر فی الواقع سرمائی کھیلوں کا ایک مرکز ہے۔ ڈاکٹر آرتھر نیو کے مطابق سینے کے امراض کے لیے کشمیر کی آب و ہوا انگلستان کی آب و ہوا سے زیادہ موزوں ہے۔

(حاشیہ: ”دی ٹورسٹس گائیڈ ٹو کشمیر، لداخ، سکردو وغیرہ“ از میجر آرتھر نیو، پندرھواں ایڈیشن، نظرِ ثانی ڈاکٹر ای ایف نیو (Dr. E. F. Neve)، صفحہ 4۔)

امریکی سیاح کو کشمیر کی آب و ہوا میں کینیڈا کی سردی اور شمالی میکسیکو کی گرمی، یا سان فرانسسکو کی تازگی اور لاس اینجلس کی اعتدال پسندی ملے گی۔

”کشمیر کی سرزمین کیسی بے پناہ مہمان نواز ہے کہ راہ کے پتھروں نے بھی مجھے پانی پلا دیا!“

وادیٔ کشمیر

وادیٔ کشمیر، جو اس کتاب کا موضوع ہے، موجودہ ریاست جموں و کشمیر کے دو اضلاع پر مشتمل ہے، یعنی ضلع اننت ناگ اور ضلع بارہ مولہ۔ ضلع اننت ناگ کی چار تحصیلیں ہیں: (۱) سری نگر، (۲) اسلام آباد یا اننت ناگ، (۳) کول گام، (۴) پلوامہ، جو پہلے اونتی پور کہلاتا تھا۔ ضلع بارہ مولہ کی تحصیلیں یہ ہیں: (۱) بارہ مولہ، (۲) بڈگام یا سری پرتاپ سنگھ پورہ اور (۳) ہندواڑہ یا اتر مچھی پورہ۔ یہی سات تحصیلیں اصل وادیٔ کشمیر کی تشکیل کرتی ہیں۔ ایک قدیم روایت کشمیر کے دیہات کی تعداد ۶۶۰۶۳ بتاتی ہے، لیکن ۱۴۰۰ء میں جمع کی گئی وہ معلومات، جنھیں سٹائن (Stein) درست مانتے ہیں، میدانوں اور پہاڑوں کو ملا کر دیہات کی تعداد ایک لاکھ بتاتی ہیں۔ ۱۸۹۱ء کی مردم شماری کشمیر کے دیہات کی تعداد ۲۸۷۰ بتاتی ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری صوبۂ کشمیر کے آباد قصبوں اور دیہات کی تعداد ۳۵۵۷ اور ۱۹۴۱ء کی مردم شماری ۳۷۳۸ بتاتی ہے، یعنی پچاس برس میں ۸۶۳ دیہات کا اضافہ۔ بہ ظاہر ۱۴۰۰ء کی وہ معلومات جن میں دیہات کی تعداد ایک لاکھ بتائی گئی، یا تو اُس پورے علاقے پر محیط ہوں گی جو اُس وقت سلطانِ کشمیر کے زیرِ نگیں تھا، یا وادی اور اس کے گرد و نواح کے پورے کشمیری بولنے والے علاقے پر، یعنی وادیٔ وتستا، وادیٔ سندھ، کشتواڑ، پادر، ریاسی، راجوری، اڑی، پونچھ، کرناہ، دریائے چناب کے شمالی اور مغربی کنارے، رام بن، بٹوت اور دردستان کا ایک حصہ۔

قدیم زمانے سے وادیٔ کشمیر دو بڑے حصوں میں منقسم چلی آ رہی ہے جو اپنے جدید ناموں کمراج اور مراج سے معروف ہیں۔ سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein) کے بقول یہ دونوں اصطلاحات سنسکرت کے الفاظ "کرم راجیہ" اور "مڈو راجیہ" سے مشتق ہیں۔ مراج یا مراز میں سری نگر سے اوپر دریائے جہلم کے دونوں کناروں کے اضلاع شامل ہیں، اور

کمراج یا کمراز میں اس سے نیچے کے علاقے۔ ابوالفضل نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔ مسلم عہدِ حکومت میں بظاہر سری نگر مراج کا صدر مقام تھا اور سوپور کمراج کا صدر مقام۔

کلہن کی راج ترنگنی کا سٹائن کا انگریزی ترجمہ، جلد اول، صفحات 438-439۔

رقبہ

وادیٔ کشمیر کا رقبہ ۶,۱۳۱ مربع میل ہے، جو ریاست کوچین (۱,۴۱۸ مربع میل) سے چار گنا زیادہ، ریاست الور (۳,۱۵۸) سے تقریباً دوگنا، پٹیالہ (۵,۹۳۲) سے بڑا، بھوپال (۶,۹۰۲) سے قدرے چھوٹا، ہالینڈ (۱۲,۵۸۲) کے نصف کے لگ بھگ، یورپی ترکی (۱۰,۸۸۲) کے نصف سے زیادہ اور سوئٹزرلینڈ (۱۵,۹۷۵) کے ایک تہائی سے زائد ہے۔ عرض بلد کے لحاظ سے کشمیر شام کے شہر دمشق، مراکش کے شہر فاس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ریاست جنوبی کیرولائنا کے مقابل واقع ہے۔ اگرچہ رقبے کے اعتبار سے وادی کوئی غیر معمولی اہمیت نہیں رکھتی، تاہم آب و ہوا، زمین اور دل کش مناظر کے حسن اور تنوع میں یہ اپنی مثال آپ ہے۔ وادی کے بارے میں کہا گیا ہے کہ "اس کی بلندی کا ہر سو فٹ آب و ہوا اور نباتات کا کوئی نیا رنگ سامنے لاتا ہے، اور تیس میل کی مختصر سواری میں انسان جھلسا دینے والی گرمی سے نکل کر نہایت خوش گوار ٹھنڈی فضا میں پہنچ سکتا ہے، یا اکتا دینے والے مرطوب موسم سے بچ کر خشک اور روشن دھوپ والی فضا میں پناہ لے سکتا ہے۔" مغلوں کے نزدیک یہ "ہندوستان کی ارضی جنت" کے نام سے معروف تھی، اور جہانگیر نے، جس نے سب سے پہلے اسے شہرتِ عام بخشی، برنیر (Bernier) کے بیان کے مطابق

یہ اعلان کیا تھا کہ وہ اپنی عظیم سلطنت کے ہر دوسرے صوبے سے محروم ہو جانا گوارا کر لے گا، مگر کشمیر کا کھونا اسے گوارا نہیں۔

بدایونی کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اکبر کشمیر کو اپنا "باغِ خاص" کہا کرتا تھا۔

آبادی

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق وادیٔ کشمیر کی آبادی ۱۳,۳۱,۷۷۱ تھی، جس میں ۱۲,۵۶,۲۷۴ مسلمان، ۶۴,۸۰۶ ہندو اور ۱۰,۲۵۷ سکھ تھے، جب کہ باقی عیسائی، بدھ، پارسی اور دیگر اقوام سے تعلق رکھتے تھے۔ یکم مارچ ۱۹۴۱ء کو وادی کی کل آبادی ۱۴,۶۴,۰۳۴ تھی۔

1۔ "دی ویلی آف کشمیر" از والٹر آر لارنس (Walter R. Lawrence)، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۸۹۵ء، صفحات 13-14۔ 2۔ برنیر کا سفرنامہ، دوسرا ایڈیشن، نظرثانی از وی اے سمتھ (V. A. Smith)، ۱۹۱۴ء، صفحہ 401۔ 3۔ منتخب التواریخ، فارسی متن، کلکتہ، ۱۸۶۵ء، جلد دوم، صفحہ 369۔

وادی کی شکل ایک بیضوی طشتری، یا زیادہ صحیح الفاظ میں جوتے کی وضع کے پیالے جیسی ہے۔ کشن گنگا کے آبی تقسیمِ کوہ کے دامن سے لے کر اسلام آباد سے آگے جنوب مشرقی گوشے تک وادی کا فرش کم پختہ جھیلی تہوں اور دریا آوردہ مٹی سے بنا ہے۔ اس رقبے کا بیشتر حصہ، جو دو ہزار مربع میل سے متجاوز ہے، ایسی ریت اور باریک مٹی پر مشتمل ہے جس میں جہلم اور اس کے معاون دریاؤں نے گوناگوں نشیب و فراز تراش دیے ہیں۔ سیاحوں نے ان بلند چبوتروں (کریووں) کا ذکر کیا ہے جو وادی کے نمایاں خد و خال میں شمار ہوتے ہیں۔

درحقیقت ان چبوتروں کے بغیر وادی "ایک ویران منظر" پیش کرتی۔ "ان کے سرسبز کاشت شدہ کھیت بے آب و گیاہ پتھریلی ڈھلوانوں سے نمایاں تضاد رکھتے ہیں اور منظرنامے کو انسانی منصوبہ بندی کی ایک واضح فضا عطا کرتے ہیں۔ انہی پر گاؤں اور چھوٹے قصبے وادی کے سنگ ریزوں سے اٹے کناروں کے دامن میں یوں بسے ہوئے ہیں گویا بہار اور گرما کے تباہ کن سیلابوں سے محفوظ کر دیے گئے ہوں۔ مندروں کے کھنڈر ان میں سے بعض بستیوں کی عظیم قدامت پر گواہ ہیں، جن کا سلسلہ عیسوی عہد کے پہلے ہزاریے تک جا پہنچتا ہے۔"

کشمیر قبل از تاریخ زمانے میں ایک وسیع جھیل

ارضیاتی شواہد اور دیومالائی روایت دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ وادیٔ کشمیر کبھی، غالباً دس کروڑ برس پہلے، سیکڑوں فٹ گہری ایک وسیع و عریض جھیل تھی۔ کشمیری روایات کے مطابق شیو (ہندو تثلیث کے دیوتاؤں میں سے ایک) کی ایک شکتی، جس کا نام ستی تھا، پانی کی صورت میں ظاہر ہوئی؛ یہی شکتی پاروتی بھی کہلاتی ہے، اور جس مقام پر وہ ظاہر ہوئی وہ "ستی سرس" کے نام سے مشہور ہوا، یعنی وہ جگہ جہاں شکتی ستی نے جھیل کی شکل اختیار کی۔

جھیل کی داستان

روایت یوں چلی آتی ہے کہ برہما کے پوتے کشیپ کو، جب وہ جنوب سے زیارت کے سفر پر پنجاب میں جالندھر پہنچا، معلوم ہوا کہ شمال مغرب کا سارا ملک ایک راکشس (دیو) جل اودبھو (آب زاد) کے ہاتھوں اجاڑ دیا گیا ہے، جو عظیم ستی سرس میں رہتا تھا۔ جل اودبھو

اور اس کے چیلوں کی تباہ کاریوں پر رنجیدہ ہو کر کشیپ عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گیا، جس کے نتیجے میں ہندو تثلیث یعنی برہما، وشنو اور شیو اس کی مدد کے لیے ظاہر ہوئے۔ انہوں نے دیکھا کہ اندر (گرج کے دیوتا) اور دوسرے دیوتا اس سے پہلے بھی کئی مواقع پر دیووں کے استیصال کی کوشش کر چکے تھے اور خاصی تعداد کو نیست و نابود کرنے میں کامیاب بھی ہوئے تھے، لیکن دیووں کی اکثریت پانی کے نیچے چھپ کر بچ نکلی تھی۔ وشنو نے وراہ (سؤر) کی شکل اختیار کر کے وراہ مول (موجودہ بارہ مولہ) کے پہاڑوں پر اپنی دم سے ضرب لگائی اور باقی ماندہ رکاوٹوں کو اپنے دانتوں سے کاٹ ڈالا۔ جھیل کا پانی بہہ نکلا، مگر دیو نے اس نشیبی زمین میں پناہ لے لی جہاں اب سری نگر آباد ہے۔ کچھ عرصے تک وہ تعاقب کرنے والوں کو چکمہ دیتا رہا، لیکن آخر کار پکڑا گیا اور دیوتاؤں کے ہاتھوں کچل کر مارا گیا۔ جل اودبھو کے مارے جانے پر چھوٹے دیووں کی ہمت ٹوٹ گئی اور خشک ہو جانے والا طاس رفتہ رفتہ گرمیوں میں آباد ہونے لگا۔ البتہ سردیوں میں لوگ جنوب کے نسبتاً خشک اور گرم علاقوں کو لوٹ جاتے اور کشمیر دیووں کے حوالے چھوڑ جاتے۔ ایک موسمِ سرما میں ایک بوڑھا برہمن ایک غار میں ڈیرہ ڈال کر پیچھے رہ گیا۔ دیووں نے اسے پکڑ لیا اور اس مقام پر اٹھا لے گئے جو اب نیل ناگ (سانپوں کا سردار) کہلاتا ہے، جہاں اسے جھیل میں پھینک دیا گیا۔ وہ تہہ تک جا پہنچا، مگر اسے یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ وہ درحقیقت ایک محل ہے جس میں بادشاہ نیل ناگ (کشیپ کا بیٹا) اپنے تخت پر جلوہ افروز تھا۔

1۔ ”ہندوستان میں برفانی عہد اور اس سے وابستہ انسانی تہذیبوں پر مطالعات“ از ڈاکٹر ایچ ڈی ٹیرا (H. De Terra) اور ٹی پیٹرسن (T. Paterson)، واشنگٹن ڈی سی، ۱۹۳۹ء۔

2۔ ستی دکش کی بیٹی اور شیو کی بیوی تھی۔ اس نے دکش کے یگیہ کی قربانی کی آگ میں خود کو بھسم کر ڈالا، کیونکہ دکش نے شیو کو قربانی کے نذرانوں میں اپنا حصہ لینے کی دعوت دینے سے انکار کر دیا تھا۔

بارہ مولہ کا قصبہ دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر واقع ہے، جنہیں ایک پل آپس میں ملاتا ہے۔ بارہ مولہ اور سری نگر کے درمیان فاصلہ ۳۴ میل ہے۔ سطح سمندر سے قصبے کی بلندی ۵,۱۰۰ فٹ ہے۔ ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق بارہ مولہ کی آبادی ۶,۸۸۶ تھی، جن میں ۵,۸۳۹ مسلمان تھے۔ ۱۹۴۱ء میں یہ آبادی تقریباً دگنی ہو کر ۱۲,۷۲۲ ہو گئی۔ قصبے سے آگے سری نگر کی سڑک شروع ہوتی ہے۔ اس عمدہ سڑک کے دونوں جانب بلند و بالا، سیدھے، سفید سفیدے کے درخت ایستادہ ہیں۔ ہشک پورہ، جسے کشان بادشاہ ہشک نے دوسری صدی عیسوی میں بسایا تھا اور جو اب گھٹ کر اور بگڑ کر جدید گاؤں اُسکر (وُشکر) کی شکل اختیار کر گیا ہے، جدید قصبے کے جنوب مشرق میں تقریباً دو میل کے فاصلے پر واقع ہے۔

2۔ نیل ناگ (نیلا چشمہ) پانی کی ایک بیضوی سطح ہے، جو تقریباً ۱۰۰ گز طویل، ۲۰ گز عریض اور قریباً ۴۰ فٹ گہری ہے، اور وادیٔ کشمیر کے جنوبی جانب پہاڑیوں کی ڈھلوانوں پر ایک نشیب میں، گوگجی پٹھر گاؤں میں واقع ہے، جو چرار شریف سے تقریباً ۴ میل مغرب میں ہے، اور چرار شریف سری نگر سے ۲۰ میل کے فاصلے پر ہے۔ نیل ناگ ہندوؤں کے نزدیک متبرک ہے۔ نیل ناگ کے شمال مغرب میں ۳ میل سے کم فاصلے پر دودھ گنگا پہاڑوں سے نکل کر کریوہ کی پہاڑیوں میں داخل ہوتی ہے۔

اس نے اس بادشاہ کے حضور شرفِ باریابی حاصل کیا اور اپنے ساتھ روا رکھے گئے ناروا سلوک کی شکایت اس کے سامنے پیش کی۔ بادشاہ نے نہایت مہربانی کا برتاؤ کیا اور اس کی رہنمائی کے لیے اسے "نیلمت پران" عطا کیا، اور یقین دلایا کہ اگر وہ اس کتاب کے احکام کی پابندی کرے اور اس میں مقرر کردہ نذرانے پیش کرے تو دیو اسے ستانا چھوڑ دیں گے۔ بہار کے موسم میں وہ خشکی پر واپس پہنچا دیا گیا۔ اس نے ان ہدایات پر عمل کیا اور دوسروں کو بھی ان کی تعلیم دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ اس وقت سے لوگ موسمِ سرما میں بھی کشمیر میں مقیم رہنے کے قابل ہو گئے اور دیووں نے انہیں تنگ کرنا چھوڑ دیا۔

ارضیاتی شہادت

مذکورہ بالا کہانی، داستان ہونے کے باوجود، ابتدائی ارضیاتی مشاہدات کے نتائج سے مطابقت رکھتی ہے۔ قبل از تاریخ زمانے میں کشمیر کے طاس میں آج کی نسبت کہیں بڑی جھیل موجود تھی۔ ان ابتدائی مشاہدات کے مطابق طاس کے مغربی گوشے کی ریتلی چٹان بظاہر کسی عظیم قدرتی حادثے سے پھٹ گئی، جس کے بعد رگڑ اور گھساؤ کا عمل جاری رہا؛ اور جھیل کا پانی بارہ مولہ کے درے کے گہرے ہوتے چلے جانے سے خارج ہوا، جو پانی کے بتدریج کٹاؤ کے سست عمل کا نتیجہ تھا اور جس کی تکمیل میں یقیناً سیکڑوں برس صرف ہوئے ہوں گے۔ اس عہد میں آب و ہوا اس قدر سرد تھی اور جاڑوں کی برف باری اتنی شدید اور طویل ہوتی تھی کہ ملک صرف گرمیوں میں ان خانہ بدوشوں کے رہنے کے قابل تھا جو سردیوں میں جنوب کی طرف ہجرت کر جاتے تھے۔ تاہم وقت گزرنے کے ساتھ آب و ہوا معتدل ہو گئی اور کشمیر ایک مستقل اور خوش حال زرعی آبادی کا مسکن بن گیا۔

تاہم اب ان ابتدائی مشاہدات سے اختلاف کیا جانے لگا ہے۔ [ابتدائی ماہرینِ ارضیات کا خیال تھا کہ کشمیر کے طاس کو بھرنے والے دریا آوردہ ذخائر گرد و پیش کے پہاڑوں کے ریزوں سے وجود میں آئے اور ایک عظیم جھیل کی تہہ میں جمع ہوئے۔ کہا گیا ہے کہ یہ ذخائر کبھی پوری وادی کو اس کی موجودہ سطح سے ایک ہزار فٹ کی بلندی تک ڈھانپے ہوئے تھے اور ان کا بڑا حصہ دریائے جہلم بہا کر پنجاب کے میدانوں میں لے گیا۔ ولر جھیل، جس کا طول اب ۱۰ میل اور عرض ۵ میل ہے، کو مونٹگومری (Montgomerie) نے اس عظیم آبی وسعت کی آخری یادگار قرار دیا تھا جو کبھی پورے کشمیر پر محیط تھی۔ لیکن ایک عظیم قبل از تاریخی جھیل کا یہ تصور مسٹر آر ڈی اولڈھم (R. D. Oldham) نے ترک کر دیا ہے۔ مسٹر اولڈھم نے ۱۹۰۳ء میں وادیٔ کشمیر کے کریووں یعنی بلند سطحِ مرتفع اور موجودہ جھیلوں کا مطالعہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ کریوے دریائی اصل کے ہیں، جھیلی اصل کے نہیں، اور یہ کہ کسی زمانے میں بھی یہاں آج سے نمایاں طور پر بڑی جھیل موجود نہیں رہی۔ — ''اے سکیچ آف دی جیوگرافی اینڈ جیالوجی آف دی ہمالیہ ماؤنٹینز اینڈ ٹبٹ'' از کرنل ایس جی برارڈ (S. G. Burrard) اور ایچ ایچ ہیڈن (H. H. Hayden)، کلکتہ، ۱۹۰۷-۰۸ء، حصہ سوم، صفحہ 169۔]

نیلمت، یعنی ناگوں کے سردار رشی نیل کی تعلیمات، وہ قدیم ترین موجود تحریری دستاویز ہے جو کشمیر کی پیدائش اور اس کے متبرک مقامات سے متعلق مقدس روایات سے بحث کرتی ہے۔ مزید برآں، یہ ان بنیادی ماخذ میں سے ایک ہے جن سے کلہن نے اپنی راج ترنگنی کی تصنیف کے وقت استفادہ کیا۔ کلہن اس کا ذکر اس کتاب کی حیثیت سے بھی کرتا ہے جس میں نیل نے اہلِ کشمیر کے لیے رسوم اور تہوار مقرر کیے تھے۔ نیلمت یعنی تعلیماتِ نیل کا سنسکرت متن، تنقیدی حواشی کے ساتھ، ڈاکٹر کے ڈی وریس (K. De Vrees) کی ترتیب

سے (صفحات xxi تا 151)، ۱۹۳۶ء میں لائیڈن (ہالینڈ) میں ای جے برل (E. J. Brill) کے اہتمام سے شائع ہوا۔

کشمیر کا نام

قدیم نام ستی سرس کی جگہ "کا سمیرا" نے لے لی، جس کا مفہوم یہ لیا جا سکتا ہے: وہ (سرزمین) جس سے پانی (کا) ہوا (سمیرا) کے ذریعے خشک کر دیا گیا ہو۔ ایک اور تعبیر کے مطابق کشمیر ایک پراکرت مرکب ہے، جس کے اجزا یہ ہیں: "کس" بمعنی نالہ یا آبی گزرگاہ، اور "میر" بمعنی پہاڑ۔ اس طرح "کس میر" کے معنی چٹانی لگن یا کھد کے ہو سکتے ہیں۔ اپنی ہیئت کے اعتبار سے کشمیر واقعی ایک گہرا طاس ہے (۸۴ ضرب ۲۰ تا ۲۵ میل) جس کی دیواریں چٹانی ہیں۔ یہ ایک نظریہ ہے۔ دوسرا نظریہ — کہ کشمیر، یا باشندوں کی زبان میں "کشیر"، کا یہ نام "کش" نامی نسل کے لوگوں کی آبادکاری کے باعث پڑا، جو ایک سامی قبیلہ تھے اور جنہوں نے وہ شہر بسائے جو اب کش، کاشان اور کاشغر کہلاتے ہیں — ابھی مناسب تحقیق کا محتاج ہے۔

1۔ دیکھیے بابر کی یادداشتوں کے انگریزی ترجمے کا سر لوکس کنگ (Sir Lucas King) کا نظرثانی شدہ ایڈیشن، جلد اول۔ اس نظریے کو قبول کرنے سے ہمیں وہ نظریہ ترک کرنا پڑے گا جو کش کو ہمالیائی پہاڑوں کے کھش قبائل سے جوڑتا ہے، اور تحقیق کا ایک بالکل نیا میدان کھل جائے گا۔ سر جارج گریئرسن (Sir George Grierson) نے اپنی "لنگوئسٹک سروے آف انڈیا"، جلد نہم، حصہ چہارم، صفحات 2-8 میں کھشوں کی اصل پر

بحث کی ہے۔ ایک قیاس یہ ہے کہ کش وہی سامی کوش یا کاش ہے، نہ کہ آریائی زبان بولنے والے کھش۔

کش بخارا کے علاقے میں سمرقند اور بلخ کے درمیان تجارتی شاہراہ پر واقع ایک قصبہ ہے۔ کش اب اپنے گرد و نواح کی زرخیزی کے باعث "شہرِ سبز" کہلاتا ہے۔ شہرِ سبز شمال، مشرق اور جنوب کی جانب پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ موجودہ قصبہ ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں تعمیر ہوا۔

کاشان ایران کے عراقِ عجم کے چھوٹے صوبے کاشان کا ایک قصبہ ہے۔ اس کی آبادی ۳۰,۰۰۰ ہے اور یہ ایران کے گرم ترین قصبوں میں شمار ہوتا ہے، جو اصفہان کے شمال مشرق میں ۹۰ میل اور تہران سے ۱۵۰ میل کے فاصلے پر ایک زرخیز میدان میں واقع ہے۔ یہ صوبہ دو اضلاع میں منقسم ہے: "گرم سیر" یعنی گرم علاقہ اور "سرد سیر" یعنی سرد علاقہ۔ گیلان سے درآمد شدہ خام مال سے ریشمی کپڑوں کی بڑی مقدار اور تانبے کے برتن کاشان میں تیار ہو کر ایران کے تمام حصوں کو بھیجے جاتے ہیں۔ کاشان عرقِ گلاب بھی برآمد کرتا ہے اور ایران کا واحد مقام ہے جہاں کوبالٹ دستیاب ہوتا ہے۔ زیورات اور قالین بھی یہاں تیار ہوتے ہیں۔ شہر سے چار میل مغرب میں پہاڑیوں کے دامن میں فین کے خوب صورت باغات واقع ہیں۔ 4۔ کاشغر چین کے انتہائی مغرب میں چینی ترکستان کے صوبے کے علاقے کاشغریہ کا ایک اہم شہر ہے۔ اس وقت کاشغر دو شہروں پر مشتمل ہے، جن میں ایک کہنہ شہر یعنی "پرانا شہر" ہے۔

اگر یہ نظریہ درست ثابت ہو تو لفظِ کشمیر کی اصل—یعنی کش نسل کا نام اور "یر" ایسا لاحقہ جو "ان" اور "غر" کی مانند ہے—اس یقین کی گنجائش پیدا کر دے گی کہ بطلیموس

(Ptolemy) کے بیان کردہ کوہِ ایماؤس سے پرے واقع "کاسیا ریجیو" اور "کاسی مونٹیس" اسی کش نسل کے مسکن تھے، جس کا غلبہ کسی زمانے میں غالباً کاشغر سے کشمیر تک پھیلا ہوا تھا اور ان دونوں خطوں میں اس نے اپنا نام چھوڑا ہے۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ کشمیر کا نام نہایت قدیم ہے اور بقول سٹائن، علمِ لسان نہ اس کی اصل کا کوئی سراغ فراہم کر سکتا ہے اور نہ اس کی ساخت ہی کا تجزیہ کر سکتا ہے۔ کشمیر کا قدیم ترین چینی حوالہ ۵۴۱ء کا ہے، جس میں وادی کو "کو شی می" کہا گیا ہے۔ کشمیر کا نام اس ملک کی معلوم تاریخ میں ہمیشہ اس کے واحد نام کے طور پر مستعمل رہا ہے، اور اسے باشندوں اور بیرونی لوگوں دونوں نے یکساں طور پر استعمال کیا ہے۔ "ہم اس کے مسلسل استعمال کا سراغ دستاویزوں کے ایک غیر منقطع سلسلے کے ذریعے تیئیس صدیوں سے زیادہ عرصے تک پیچھے لے جا سکتے ہیں، جب کہ خود یہ نام بلاشبہ اس سے کہیں زیادہ قدیم ہے۔" باشندے اسے "کشیر" تلفظ کرتے ہیں، جو سٹائن کے نزدیک میم کے حذف کے ساتھ کشمیر ہی کا براہِ راست صوتی مشتق ہے۔ کشیر کے باشندے اور کشیر کی زبان کے لیے "کشُر" یا "کوشُر" مستعمل ہے۔

کشمیر کا بیرونی دنیا میں تعارف

سٹائن کا کہنا ہے کہ سکندر کی مہم کے احوال میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا جس سے وادیٔ کشمیر کے بارے میں سنی سنائی واقفیت تک کا ثبوت فراہم ہوتا ہو۔ بیرن ہیوگل (Baron Hügel) لکھتے ہیں: "کشمیر کے متعلق پہلی مستند اطلاع جو یورپ تک پہنچی، بظاہر پرتگیزیوں کے توسط سے پہنچی، جن کے مذہبی جوش نے انہیں مقامی باشندوں میں عیسائیت کی

اشاعت پر آمادہ کیا؛ کیونکہ ہم ان روایات کو کم ہی معتبر گردانتے ہیں جن میں بیان کیا جاتا ہے کہ جب سکندرِ اعظم نے پورس پر حملہ کیا تو کشمیر کا راجا اس کی مدد کے لیے نکلا تھا۔" پرانا شہر ۱۵۱۳ء میں تعمیر ہوا، اورینگی شہر یعنی "نیا شہر" ۱۸۳۸ء میں بسایا گیا؛ یہ دونوں تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر واقع ہیں اور دریائے قزل سو انہیں ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔ کاشغر متعدد اہم اور قدیم شاہراہوں کے سنگم پر واقع ہے، اور اسی بنا پر اسے خاصی عسکری، تجارتی اور معاشرتی اہمیت حاصل ہے۔ تہذیبی اعتبار سے یہ یارقند سے برتر ہے۔ کاشغر میں ریشم، قالین اور زیورات تیار ہوتے ہیں اور اس کی آبادی کا تخمینہ باسٹھ ہزار نفوس لگایا گیا ہے۔

۱۔ کلہن کی راج ترنگنی کا انگریزی ترجمہ از سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein)، جلد دوم، صفحہ 386۔ ۲۔ دی اینشنٹ جیوگرافی آف کشمیر (The Ancient Geography of Kashmir)، صفحات 61-62۔ ۳۔ ایضاً، صفحہ 8۔

۴۔ سفرنامہ (Travels) از بیرن چارلس ہیوگل (Baron Charles Hügel)، لندن، ۱۸۴۵ء، صفحہ 4۔

"اگرچہ بعد کے یونانی مصنفین ایک ایسے ملک کا ذکر کرتے ہیں جسے وہ کاسپاتیرس کہتے ہیں اور جو بظاہر کشمیر ہی معلوم ہوتا ہے۔ ایسے غیر تسلی بخش بیانات کو نظرانداز کرتے ہوئے ہم پھر یہی کہیں گے کہ یورپ کے لیے کشمیر ایک حد تک اُس وقت تک نامعلوم رہا جب تک پرتگال کی رعایا نے پہلی بار اس کی وادیوں میں قدم نہ رکھا۔" جیروم زیویئر (Jerome Xavier)، جو ناوار کے ایک اعلیٰ نسب خاندان کا فرد تھا، غالباً پہلا یورپی خیال کیا جاتا ہے جسے اس دور افتادہ خطے تک رسائی کا شرف یا حوصلہ نصیب ہوا۔ اسی خاندان کا ایک اور فرد، فرانسس

زیویئر (Francis Xavier)، "مشرق میں عیسائی صداقت کی روشنی پھیلانے کے ایسے ہی پرجوش جذبے سے سرشار ہو کر، رسولِ ہند (Apostle of the Indies) کا شاندار لقب پہلے ہی حاصل کر چکا تھا، اور یہ لقب اسے کچھ بے جا نہیں ملا تھا۔" جیروم زیویئر آگرہ میں اکبرِ اعظم کے دربار میں حاضر ہوا اور شہنشاہ کے ہمراہ کشمیر گیا۔ کشمیر کے بارے میں زیویئر کے تاثرات اس کی تصنیف "دے ریبس جاپونی کیس، اِنڈی کیس" (De Rebus Japonicis, Indicis) وغیرہ (اینٹورپ، ۱۶۰۵ء) میں شائع ہوئے۔

اگلا نامور سیاح جس نے مغرب کو کشمیر سے روشناس کرایا، فرانسس برنیئر (Francis Bernier) تھا، جو جنوبی فرانس کی مونپیلیے فیکلٹی کا ڈاکٹرِ طب تھا۔ برنیئر ۱۶۵۴ء میں، انتیس برس کی عمر میں، دنیا دیکھنے کے شوق میں فرانس سے روانہ ہوا۔ ۱۶۵۷ء میں، شاہ جہاں کے عہدِ حکومت میں، شام اور مصر کی سیاحت کے بعد وہ سورت پہنچا؛ یہ عین وہ زمانہ تھا جب شاہ جہاں کے بیٹے تختِ مغلیہ کے لیے باہم برسرِپیکار تھے اور بالآخر اورنگ زیب دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔ برنیئر ۱۶۵۹ء کے اواخر میں دہلی پہنچا۔ دہلی میں قیام کے دوران، چونکہ اتفاقاً اس کا مال و اسباب ضائع ہو چکا تھا اور وہ بے بسی کے عالم میں تھا، اس نے کوئی ملازمت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کوشش میں ناکامی کے بعد اسے اورنگ زیب کے دربار کے ایک امیر دانشمند خان کی سفارش سے سرکاری خیراتی فنڈ سے ماہانہ وظیفہ مل گیا۔ ہندوستان میں بارہ برس قیام کے بعد برنیئر فرانس واپس چلا گیا۔ اس نے پیرس میں سکونت اختیار کی جہاں اس کا سفرنامہ ۱۶۷۰ء میں شائع ہوا۔ کشمیر آنے والا دوسرا اہم سیاح ایک جیسوئٹ پادری ڈیسیڈری (Father Desideri) تھا۔ کشمیر کے بارے میں اس کے مشاہدات اس کے ایک مکتوب میں محفوظ ہیں جو ۱۷۱۶ء میں لہاسہ سے "لے لیتر ایدیفیانت" (Les Lettres Édifiantes) کے عنوان سے لکھا گیا۔ پھر ۱۷۸۳ء میں

جارج فورسٹر (George Forster) آیا، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کی پریذیڈنسی مدراس کا ایک سرکاری ملازم تھا۔ اس وقت تک احمد شاہ درانی کشمیر کو افغانستان سے ملحق کر چکا تھا۔ درحقیقت احمد شاہ کے بیٹے اور جانشین تیمور شاہ کو اپنے باپ کی فتوحات کے ثمرات سے بہرہ ور ہوتے ہوئے تخت نشینی پر دس برس گزر چکے تھے۔ کشمیر کا انتظام آزاد خان کے ہاتھ میں تھا۔

دیگر نامور سیاحوں میں ولیم مورکرافٹ (William Moorcroft)، جی ٹی وین (G. T. Vigne)، بیرن ہیوگل، ڈاکٹر ہونگ برگر (Dr. Honigberger)، وکٹر ژاکمون (Victor Jacquemont) اور بیرن ایرک فون شونبرگ (Baron Eric von Schönberg) شامل ہیں۔ یہ سب سکھ عہدِ حکومت میں کشمیر آئے۔ قاری کو "کشیر" میں بروقت ان سیاحوں کے مختصر حوالے نیز ان کے سفرناموں سے متعلقہ اقتباسات ملیں گے۔

کشمیر میں سنگی عہد

اب تک یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ کشمیر میں کوئی سنگی عہد نہیں گزرا۔ تاہم حالیہ دریافتیں — زرعی آلات، ایک جنگی کلہاڑی، قدیم قبروں کے ٹیلے، ایستادہ عظیم سنگی ستون اور زمین پر پڑے یک سنگی ستون — جو کشمیر میں پاندریتھن، تختِ سلیمان، وندراہوم، رنگیل، نارن ناگ اور آرہوم کے مقامات پر محتاط تلاش کے بعد برآمد ہوئی ہیں، ایسے عہد کے وجود کو ثابت کرتی معلوم ہوتی ہیں۔

قدیم باشندے: اولین آبادکار

بدھ عہد سے قبل، بلکہ اس کے بعد بھی، ناگ پرستی کا وسیع رواج اس امر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وادیٔ کشمیر کے اولین آبادکار لازماً وہی لوگ رہے ہوں گے جو قدیم باشندوں (اصلی النسل اقوام) کے نام سے معروف ہیں اور جو آریاؤں کی آمد سے پہلے پورے ہندوستان میں پھیل چکے تھے۔ اس بارے میں کچھ معلوم نہیں کہ یہ ابتدائی باشندے کشمیر میں داخل ہوتے وقت تہذیب کے کس درجے پر فائز تھے۔

آریا

پھر ہندوستان کے شمال مغرب سے آریائی یلغار کی لہر آئی، اگرچہ کیتھ (Keith) جیسے اہلِ علم اس نظریے کو تسلیم نہیں کرتے۔ پنجاب اور شمالی ہندوستان کی طرح یہاں بھی وہ قدیم باشندوں میں گھل مل کر ایک قوم بن گئے۔ وہ لازماً اتنی بڑی تعداد میں آئے ہوں گے کہ یہاں کے لوگوں پر اپنی نسلی چھاپ ثبت کر سکیں۔ یہ ثابت کرنے کی کوشش بھی کی گئی ہے کہ کشمیر کبھی ایک زرتشتی ملک تھا، مگر اس رائے کی تائید میں جو حوالے پیش کیے جاتے ہیں وہ کم و بیش افسانوی نوعیت کے ہیں۔

یہود

وہ جسمانی اور نسلی خصوصیات جو کشمیری کو گرد و پیش کی تمام اقوام سے نمایاں طور پر ممتاز کرتی ہیں، وادی میں آنے والے باریک بین سیاحوں کو ہمیشہ متوجہ کرتی رہی ہیں، اور ان کی اصل کے بارے میں کئی قیاس آرائیوں کا باعث بنی ہیں۔ ایسا ہی ایک قوی قیاس کشمیریوں کا رشتہ یہودیوں سے، یا بالفاظِ دیگر عبرانی اقوام میں سے کسی ایک سے، جوڑتا ہے۔ کشمیر کے بہت سے باشندوں کے خد و خال کی ''یہودی'' وضع کو بیسیوں جدید سیاحوں نے

محسوس کیا ہے۔ حالیہ زمانے میں کشمیر کے دو صفِ اول کے ماہرین، جن کی اس سرزمین اور اس کے باشندوں کے بارے میں گہری واقفیت شاید ہی محلِ نظر ہو، یعنی سر والٹر لارنس (Sir Walter Lawrence) اور سر فرانسس ینگ ہسبنڈ (Sir Francis Younghusband) نے مردوں، عورتوں اور بچوں کے چہروں میں نمایاں "یہودی" وضع کا اعتراف کیا ہے۔

۱۔ "کشمیر میں سنگی عہد" از مسٹر جی ای ایل کارٹر (G. E. L. Carter)۔ سنگی آلات کا وہ ذخیرہ جس پر مسٹر کارٹر نے اپنا مقالہ استوار کیا ہے، پرنس آف ویلز میوزیم، بمبئی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ نیز دیکھیے ڈاکٹر ٹیرا (Dr. de Terra) کی تصنیف "ہندوستان میں برفانی عہد پر مطالعات"، صفحہ 2۔ ڈاکٹر ٹیرا نے ۱۹۳۲ء میں وادیٔ کشمیر کا ارضیاتی جائزہ شروع کیا۔ ۲۔ سر جے جے مودی (Sir J. J. Modi)، جرنل آف دی بمبئی برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، جلد ۱۹، دسمبر ۱۸۹۵ء، صفحات 237-248، زیرِ عنوان "کشمیر اور قدیم ایرانی"۔

آنجہانی سر والٹر لارنس کا بیان ہے کہ خمیدہ ناک یہاں کے خد و خال کی ایک نمایاں خصوصیت ہے اور غالب وضع قطعی طور پر عبرانی ہے۔ سر فرانسس کہتے ہیں کہ "یہاں قدیم مشائخانہ وضع کے عمدہ نمونے دیکھے جا سکتے ہیں، بالکل ویسے ہی جیسے ہم قدیم بنی اسرائیل کے سورماؤں کا تصور کرتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں — اگرچہ مجھے اعتراف ہے کہ اس کے حق میں کوئی خاص سند نہیں — کہ یہ کشمیری بنی اسرائیل کے گم شدہ قبائل میں سے ہیں..... اور یقیناً، جیسا کہ میں کہہ چکا ہوں، کشمیر میں ہر جگہ، اور خاص طور پر بالائی دیہات میں، حقیقی بائبلی وضع کے چہرے نظر آتے ہیں۔ یہاں کسی بھی دن اسرائیلی گڈریے کو

اپنے ریوڑ اور مویشی چراتے دیکھا جا سکتا ہے۔" برنیئر بھی اس سے کم قطعی نہ تھا۔ اس نے لکھا:

"پیر پنجال کے پہاڑ عبور کر کے جب میں اس سلطنت میں داخل ہوا تو سرحدی دیہات کے باشندے مجھے یہودیوں سے مشابہ محسوس ہوئے۔ ان کے چہرے مہرے، ان کے طور طریقے، اور وہ ناقابلِ بیان امتیازی خصوصیت جس کی بدولت ایک سیاح مختلف قوموں کے باشندوں میں تمیز کر لیتا ہے—یہ سب کچھ اسی قدیم قوم سے تعلق رکھتا معلوم ہوتا تھا۔ میری اس بات کو محض وہم پر محمول نہ کیجیے، کیونکہ ان دیہاتیوں کی یہودی شباہت کو ہمارے جیسوئٹ پادریوں اور کئی دوسرے یورپی باشندوں نے میرے کشمیر آنے سے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا۔"

عظیم بزرگ شاہ ہمدان چودھویں صدی عیسوی میں کشمیر تشریف لائے۔ انہوں نے بھی وادی کا نام باغِ سلیمان رکھا، جو بظاہر کشمیر میں بنی اسرائیل کی آبادکاری کی تائید کرتا ہے۔ ابو ریحان البیرونی (۹۷۳ء–۱۰۴۸ء) کشمیر کے خلاف محمود کی مہم میں شریک ہوا، غالباً ۱۰۲۱ء میں؛ یہ مہم کشمیریوں کے جواں مردانہ دفاع اور شدید برف باری کے باعث ناکام رہی۔ تاہم البیرونی نے غزنہ اور پنجاب میں اپنے طویل قیام (۱۰۱۷ء–۱۰۳۰ء) کے دوران کشمیر کے بارے میں معلومات جمع کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہ دیا۔ کلہن سے ایک صدی سے بھی زائد عرصہ قبل کشمیر کے باشندوں کے بارے میں البیرونی لکھتا ہے:

۱۔ دی ویلی آف کشمیر (The Valley of Kashmir)، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۱۸۹۵ء، صفحہ 318۔

۲۔ کشمیر، اشاعت ۱۹۱۷ء، صفحات 129-130۔ ۳۔ سفرنامہ (سمتھ کا ایڈیشن)، صفحہ 430۔ ۴۔بیل کی اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری، صفحہ 238۔

۵۔ راج ترنگنی، انگریزی ترجمہ از سٹائن، جلد 2، صفحہ 360۔

"انہیں اپنے ملک کی قدرتی مضبوطی کا خاص خیال رہتا ہے، اسی لیے وہ اس میں داخل ہونے والے راستوں اور درّوں پر سخت گرفت رکھنے کا ہمیشہ خوب اہتمام کرتے ہیں۔ نتیجتاً ان کے ساتھ کسی قسم کا لین دین رکھنا نہایت دشوار ہے۔ اگلے زمانوں میں وہ ایک آدھ غیر ملکی کو، خصوصاً یہودیوں کو، اپنے ملک میں داخل ہونے کی اجازت دے دیا کرتے تھے، مگر آج کل وہ کسی ایسے ہندو کو بھی داخل نہیں ہونے دیتے جسے وہ ذاتی طور پر نہ جانتے ہوں، چہ جائیکہ کسی اور کو۔"

افغانوں کے خون میں "یہودی" آمیزش کا امکان بھی ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ سر جارج گریئرسن (Sir George Grierson) کی تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ کشمیری زبان کا تعلق دردی گروہ سے ہے نہ کہ سنسکرت گروہ سے، اگرچہ یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ سنسکرت نے موجودہ کشمیری زبان پر خاصا اثر ڈالا ہے۔

اب یہ بات قطعی طور پر معلوم ہو چکی ہے کہ پشتو ایرانی خاندانِ السنہ کی مشرقی شاخ کی ایک زبان ہے، اور کشمیری بھی ایرانی گروہ سے، یا زیادہ صحت کے ساتھ کہیے تو ہند ایرانی گروہ سے، تعلق رکھتی ہے۔ لہٰذا پشتو اور کشمیری کے درمیان کچھ نہ کچھ قرابت ضرور ہونی چاہیے۔

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، کشمیر میں بولی جانے والی زبان کو اس کے باشندے کشمیری نہیں بلکہ "کوشُر" کہتے ہیں اور سرزمین کو "کشیر"۔

تاہم یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ البیرونی کے بیان کے سوا کوئی مستند تحریری شہادت دستیاب نہیں جس سے کشمیر میں کسی بڑے یہودی، یا بالفاظِ دیگر عبرانی، عنصر کا وجود ثابت ہو سکے۔

[شاید اس ضمن میں حسبِ ذیل اقتباس دلچسپی سے پڑھا جائے گا:

مونٹریال گزٹ کے مطابق ڈاکٹر جل کوسلے بیٹ (Dr. Jill Cossley Batt)، بی اے، ڈی ایس سی، مصنفہ و سیاح، نے ڈاکٹر ارون بیئرڈ (Dr. Irvine Baird) کے اشتراک سے ہمالیہ کی بلندیوں پر، تبت کی حدود کے اندر، ایسے پُراسرار لوگوں سے ملاقات کی جو غاروں میں رہتے ہیں، ایک قدیم تہذیب کی خصوصیات کو برقرار رکھے ہوئے ہیں، اور جنہیں "گم شدہ قبیلہ" کا نام دیا گیا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ گم شدہ قبیلہ کلدانی نژاد ہے۔ توقع ہے کہ بیٹ اور بیئرڈ کے نظریات "دی لاسٹ ٹرائب" (The Lost Tribe) نامی کتاب میں پیش کیے جائیں گے۔ ۱۹۳۰ء–۱۹۳۱ء میں ڈاکٹر بیٹ اور ڈاکٹر بیئرڈ کی اس مہم کی سرپرستی کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوفاؤنڈلینڈ کے وزرائے اعظم اور بیالیس ممتاز برطانوی اور امریکی اداروں نے کی۔ — مونٹریال گزٹ کے اس موضوع پر مضمون سے ماخوذ، جو بمبئی کرانیکل، بمبئی، مؤرخہ ۱۷ دسمبر ۱۹۳۳ء، صفحہ 13 میں دوبارہ شائع ہوا۔]

۱۔ البیرونی کی کتاب الہند — انگریزی ایڈیشن از ڈاکٹر ایڈورڈ سخاؤ (Dr. Edward Sachau)، جلد اول، صفحہ 206۔ ۲۔ ابوالفضل لکھتا ہے: "اس ملک کے راستے ایسی نوعیت کے ہیں کہ اگر حکمران کو اجنبیوں کی آمد کی خبر چند روز پہلے مل جائے اور وہ درّوں پر قبضہ کر لے تو ہزاروں رستموں سے آراستہ لشکر کے لیے بھی اس ملک پر قابض ہونا دشوار

بلکہ ناممکن ہو گا۔" – اکبر نامہ (انگریزی ترجمہ از بیوریج (Beveridge)، ۱۹۰۶ء، جلد دوم، صفحہ 198)۔ تاہم ابوالفضل سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ ہمارے زمانے میں ہوائی جہاز کی ایجاد کی پیش بینی کر لیتا!

عرب

"آٹھویں صدی میں وادیٔ سندھ پر عربوں کی یلغار کا پہلا ریلا مسلم افواج کو بعض اوقات کشمیر کی حدود کے خاصا قریب لے آیا تھا۔" مگر پنجاب میں بھی کوئی مستقل فتح حاصل نہ ہو سکی۔ المسعودی، قزوینی اور الادریسی جیسے مسلمان جغرافیہ نگاروں کے بیانات محض ایک مختصر ذکر تک محدود ہیں۔ تاہم کشمیر میں دریائے جہلم کے دائیں کنارے آباد بمبا قبیلہ بنو امیہ کی اولاد ہونے کا دعویدار ہے؛ کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کی ایک شاخ بدخشاں ہجرت کر گئی تھی، کئی پشتوں تک وہاں مقیم رہی، اور ۱۳۲۲ء میں دلچہ کے ساتھ کشمیر آئی۔

یہاں ایک ملتی جلتی قوم کا حوالہ شاید بمبا قبیلے کے دعوے کو سمجھنے میں ہماری مدد کر سکے۔ بمبئی میں مقیم روسی مستشرق مسٹر ڈبلیو ایوانوف (W. Ivanow) نے مجھے ایک روسی تصنیف کے ایک پیراگراف کا ترجمہ فراہم کیا ہے جسے میں یہاں نقل کرنا چاہوں گا: "عرب: (مردم شماری ۱۹۲۴ء – ۳۱۸، ۵۴ افراد)۔ بخارا کے ضلع میں اور صوبہ سمرقند کے اضلاع قتاقرغان اور سمرقند میں مسلسل آبادی کی صورت میں رہتے ہیں۔ متفرق گروہوں کی شکل میں ازبک اور ترکمان جمہوریاؤں کے بہت سے دوسرے مقامات پر ازبک یا تاجک آبادی کے درمیان آباد ہیں اور بنیادی طور پر زراعت پیشہ ہیں۔ زبان: اکثریت اپنی اصل زبان کھو چکی ہے اور ازبک، ترکی یا تاجیکی بولتی ہے، یعنی وہی زبان جو ان کے گرد و پیش کی آبادی کی

ہے۔ بخارا کے ضلع کے تعلقہ قراقول کے چند دیہات میں آباد عربوں نے اپنی اصل عربی محفوظ رکھی ہے۔ بعض مقامات پر وہ اب بھی اپنی قبائلی تقسیمیں برقرار رکھے ہوئے ہیں، اگرچہ اکثریت پہلے ہی اپنے گرد وپیش کی آبادی میں مکمل طور پر جذب ہو چکی ہے۔ مذہب — سنی۔"

۱۔ دی اینشنٹ جیوگرافی آف کشمیر از ڈاکٹر سٹائن، صفحہ 20۔

۲۔ امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا (جلد ۱۵، اشاعت ۱۹۰۸ء، صفحہ 101) میں بنو ہاشم لکھا ہے، مگر بنو امیہ زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے۔ تاہم بمبا اب راجپوتوں میں شمار ہوتے ہیں۔
۳۔ "سوویت یونین میں آباد قومیتوں کی فہرست" از زاروبن (Zarubin)، لینن گراڈ، ۱۹۲۷ء، صفحہ 21، پیرا 81۔

تاہم اس میں ہند آریائی نسل کی قوی آمیزش موجود ہے، اور اس اثر کی وسعت کا اندازہ اس عظیم تغیر سے لگایا جا سکتا ہے جو سنسکرت نے کشمیری زبان میں پیدا کیا۔ ہمارے پاس یہ قیاس کرنے کی معقول بنیاد موجود ہے کہ ہندو عہد میں بھی کشمیر غیر ملکی اقتدار کے تحت رہا اور ان بیرونی خاندانوں کی حکومت کے ساتھ ساتھ انہی قومیتوں کے تارکینِ وطن کی آبادکاری بھی ہوتی رہی، اگرچہ اس کا امکان کم ہے کہ یہ نوآبادیاں وسیع پیمانے پر رہی ہوں۔

لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ کشمیر کی موجودہ آبادی قدیم باشندوں کے ساتھ خفیف "یہودی"، کثیر آریائی اور بعض دیگر غیر ملکی عناصر کی آمیزش سے عبارت ہے۔ کشمیری کی اصل و نسل کے بارے میں اتنا ہی کافی ہے۔ اب اس کے کردار کی طرف آتے ہیں۔

کشمیری کا کردار

یہ بات کہ کشمیری بنیادی طور پر صوفی منش اور خیال پرور واقع ہوا ہے، وہ لوگ بہ آسانی تسلیم کر لیں گے جنھوں نے اسے قریب سے جانا اور گہری نظر سے پرکھا ہے۔ اس کے ماحول نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔ برف پوش فلک بوس چوٹیوں، بہتے ہوئے سیمیں چشموں اور پرشکوہ گوشہ ہائے تنہائی نے یہ ذہنی کیفیت پیدا کی ہے۔ تیسری صدی قبل مسیح سے چوتھی صدی عیسوی تک، یعنی سات سو برس تک، بدھ مت کا رواج، ویدانت کی تعلیم، اور فارسی ذرائع سے رستا ہوا اسلامی تصوف — یہ سب یکے بعد دیگرے کشمیر میں اپنے لیے سازگار ٹھکانا پاتے رہے۔ پنڈت اور پیر نے اسے توہم پرست بنانے میں بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ نتیجہ یہ ہے کہ تصوف اور توہم پرستی اب کشمیری کی سرشت میں رچ بس گئے ہیں۔ درحقیقت وہ اسی فضا میں سانس لیتا ہے۔ وہ آج تک ان مشاہدات کی تقریباً پوری تصدیق کرتا ہے جو مرزا حیدر دوغلت نے ۱۵۵۰ء کے لگ بھگ قلم بند کیے تھے۔ مرزا نے لکھا کہ کشمیر میں اس قدر بدعتوں کو جواز بخش دیا گیا ہے کہ لوگوں کو حلال و حرام کی کچھ خبر نہیں۔ نام نہاد "پیر" (روحانی رہنما) اور "صوفی" (اہلِ تصوف) "ہر وقت خوابوں کی تعبیریں بتانے، کرامات دکھانے اور عالمِ غیب سے ماضی یا مستقبل کے بارے میں اطلاعات حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں.... شریعتِ مطہرہ کو طریقت سے کم تر درجہ دیتے ہیں، اور نتیجتاً اہلِ طریقت کا شریعت سے کوئی سروکار نہیں رہتا۔"

مرزا حیدر کی تاریخِ رشیدی کا انگریزی ترجمہ، جو الیاس اور راس (Elias and Ross) نے کیا ہے، صفحہ 436 پر اس دعا پر ختم ہوتا ہے: "خدائے بزرگ و برتر تمام اہلِ اسلام کو ایسی مصیبتوں اور آفتوں سے محفوظ رکھے اور سب کو راہِ راست کی ہدایت عطا فرمائے۔" ایسی دعا کی ضرورت آج بھی اسی شدت سے محسوس ہوتی ہے، اور اگر کشمیر کے مسلمانوں کو دنیا میں کوئی حقیقی ترقی کرنی ہے تو ہر وہ چیز جو "پیر پرستی" یعنی اولیا پرستی کی طرف مائل کرتی

ہے، جس قدر جلد اور جس قدر مکمل طور پر ممکن ہو، جڑ سے اکھاڑ دی جانی چاہیے۔ یہ صورتِ حال اسلام کی حقیقی تعلیمات سے کیسا عجیب تضاد رکھتی ہے، جس کے پیغمبر ہر قسم کی کرامت نمائی سے انکار فرماتے ہیں اور — بقول امیر علی، مصنفِ "اسپرٹ آف اسلام" — "اپنی رسالت کی صداقت کا مدار ہمیشہ اور کلیتاً اپنی تعلیمات پر رکھتے ہیں۔ وہ اپنا اثر قائم کرنے یا اپنی تنبیہات منوانے کے لیے کبھی خرقِ عادت کا سہارا نہیں لیتے۔ وہ ہمیشہ مظاہرِ فطرت ہی کو حضورِ الٰہی کی نشانیوں کے طور پر پیش کرتے ہیں، اور بلا تذبذب انسان کے باطنی شعور اور اس کی عقل کو مخاطب کرتے ہیں، نہ کہ اس کی کمزوری یا زود باوری کو۔"

کشمیری کے تخیل نے دنیا کو نہایت عمدہ شاعری عطا کی ہے، جس کی مگر کبھی پوری قدر نہیں ہو سکی، کیونکہ اسے مناسب قالب میں پیش نہیں کیا گیا۔ ذہانت میں وہ شاید ہر دوسرے ہندوستانی سے بڑھ کر ہے اور بحث و استدلال میں بہت تیز ہے۔ معمولی سے معمولی کشمیری بھی اکثر موضوعات پر سمجھ داری سے گفتگو کر سکتا ہے اور طنز کا خاص ملکہ رکھتا ہے، لیکن دوسری فن کار قوموں کی طرح وہ جذباتی اور مبالغہ پسند ہے۔ اسے گانے اور نغمہ سرا پرندوں کا بھی شوق ہے۔ دھان کے کھیتوں میں گائے جانے والے بعض گیت شاعرانہ خیال سے معمور ہیں اور ان کی لَے شیریں اور درد انگیز ہے۔ کشمیری اگرچہ بہت بلند آواز، باتونی اور ضدی واقع ہوا ہے، مگر زلزلے اور ہیضے جیسی آفتوں میں غیر معمولی طور پر پرسکون رہتا ہے۔ کشمیری ہر کام میں ہاتھ ڈال سکتا ہے۔

وہ بہترین کاشت کار اور عمدہ باغبان ہے اور فنِ باغبانی سے خاصی واقفیت رکھتا ہے۔ وہ نہایت عمدہ اونی کپڑا بُن سکتا ہے اور اعلیٰ درجے کی ٹوکریاں بنا سکتا ہے۔ وہ لکڑی پر نقاشی کا ماہر اور عمدہ سنار و نقرہ ساز ہے۔ روغن کاری کے فن کو خوب سمجھتا ہے اور سونے کا تار

جَڑ کر ایک خاص لکڑی کی خوب صورت رگوں کی ہو بہو نقل اتارنے میں غیر معمولی مہارت رکھتا ہے۔ وہ اپنا مکان خود تعمیر کر سکتا ہے اور اپنی رسیاں خود بٹ سکتا ہے۔ لارنس (Lawrence) کا کہنا ہے کہ درحقیقت شاید ہی کوئی کام ایسا ہو جو وہ نہ کر سکے۔ بحیثیت ایک باکمال دست کار، دنیا میں اس کے ہم پلہ چند ہی ہوں گے، مگر غالباً کوئی اس سے بڑھ کر نہیں۔

پیری (Pirie) کا بیان ہے کہ کشمیر کا ملاح وینس کے گنڈولا بان جیسا ہی مشاق ہے اور خطرناک سے خطرناک صورتِ حال سے بخیریت نکل آتا ہے۔ وازہ نہایت عمدہ باورچی ہے اور غالباً صرف گوشت ہی کے پچاس لذیذ کھانے تیار کر سکتا ہے؛ البتہ اس کا اندازِ ضیافت اب بھی اصلاح طلب ہے، اگرچہ وہ اپنے طریقِ خدمت میں تبدیلی لا رہا ہے۔ اس امر میں کوئی کلام نہیں کہ پنجابی دسترخوان پر وازہ کے اثرات نمایاں طور پر مرتب ہوئے ہیں۔ ”واین“ یا ”ووِن“ — جو کوئی الگ تھلگ طبقہ نہیں — دراصل بنیا یا چھوٹا دکان دار ہے اور کبھی کبھار سود پر روپیہ چلانے والا مہاجن بھی۔ کشمیری اپنے کاروبار کو خوب سمجھتا ہے اور شاذ ہی گھاٹے کا سودا کرتا ہے، اگرچہ کبھی کبھی دیہاتی کشمیری اتنی نادانی ضرور کر بیٹھتا ہے کہ باہر سے آنے والے سے اپنا مال یا میوہ چھپا لے۔ عام طور پر امیرا کدل اور اس کے گرد و نواح میں شہری دکان دار کے تین نرخ ہوتے ہیں: سب سے سستا اپنے لوگوں کے لیے، اس سے مہنگا وادی میں آنے والے ہندوستانی سیاحوں کے لیے، اور سب سے مہنگا یورپی یا امریکی کے لیے۔ کشمیری دکان دار کی حد تک ان نرخوں میں شاید کوئی منطق ہو، لیکن خریدار کے ساتھ یہ صریح ناانصافی ہے کہ اسے ایک ہی جنس کے لیے کبھی سستا، کبھی مہنگا اور کبھی مہنگے سے مہنگا دام دینا پڑے۔

کشمیری قدامت پسند ضرور ہے، مگر نئے خیالات کے لیے اس کے دروازے بالکل بند بھی نہیں۔ وہ اپنی بیوی اور بچوں سے شفقت سے پیش آتا ہے، اورینگ ہزبنڈ (Younghusband) کے بقول دیہاتیوں میں طلاق کے قصے یا بدکاری کے واقعات شاذ و نادر ہی سننے میں آتے ہیں۔ وہ مہمان نواز ہے اور اپنے مہمانوں کی نہایت خندہ‌پیشانی سے تواضع کرتا ہے۔ کشمیری نہ قاتل ہے نہ رہزن، اور جان و مال کے خلاف جرائم یہاں کم ہی رونما ہوتے ہیں۔ کشمیری کا کتا بھونکے گا تو سہی مگر کاٹے گا نہیں۔ حتیٰ کہ اس کے سانپ بھی زہر سے خالی ہیں، سوائے داچھی گام رکھ وغیرہ کے افعی کے۔ اس کے دریا اور جھیلیں خطرناک جانوروں سے پاک ہیں۔ ہاپت یعنی ریچھ، آوارہ بھیڑیا، چیتا، تیندوا اور لگڑبگا ہی اس کے جنگلوں کی واحد، اور وہ بھی خال خال، دہشت ہیں۔ کشمیری نہ شرابی ہے نہ افیونی؛ سوائے اس کے کہ وہ نسوار کا پکا عادی ہے، اسے غیر معمولی طور پر پرہیزگار کہا جا سکتا ہے۔ برنیئر (Bernier) نے لکھا ہے: "کشمیری اپنی ذہانت کے لیے مشہور ہیں اور ہندوستانیوں سے کہیں زیادہ ہوشیار اور طباع سمجھے جاتے ہیں۔ شاعری اور علوم میں وہ اہلِ فارس سے کم نہیں۔ وہ نہایت چست اور محنتی بھی ہیں۔" سیاح وین (Vigne) کشمیری کو "مشرق کا نیپولیٹن" کہتا ہے۔

جارج فورسٹر (George Forster) نے ۱۷۸۳ء میں لکھا: "کشمیری زندہ دل اور شگفتہ مزاج لوگ ہیں جن میں لذت پسندی کا رجحان بہت قوی ہے۔ دولت کے حصول میں ان سے بڑھ کر کوئی سرگرم نہیں، نہ اس کے کمانے میں کسی کے پاس ان سے زیادہ اختراعی صلاحیتیں ہیں، اور نہ کوئی عیش و تعیش کے اخراجات کے اتنے ڈھنگ نکالتا ہے۔ ادنیٰ سے ادنیٰ درجے کا کشمیری بھی جب اپنے پاس دس شلنگ پاتا ہے تو بلا توقف اپنے یار دوست جمع

کرتا ہے اور جھیل میں کشتی ڈال کر اس وقت تک جی بہلاتا رہتا ہے جب تک آخری دمڑی خرچ نہیں ہو جاتی۔"

سر والٹر لارنس (Sir Walter Lawrence) کہتے ہیں کہ بہت سے پہلوؤں سے کشمیری کاشت کار آئرش باشندے سے مشابہ ہے؛ اس میں یقیناً وہی حاضر جوابی ہے جو آئرش قوم کا خاصہ ہے، اور لگان ادا کرنے سے وہی گہری جڑیں رکھنے والا گریز بھی۔ آئرلینڈ اور کشمیر میں مماثلت کے بہت سے پہلو ہیں۔ دونوں چھوٹے ملک ہیں جو اپنے سے زیادہ طاقتور قوموں کے اقتدار اور حمایت کے تابع رہے ہیں، اور اس کے باوجود دونوں نے کسی تبدیلی یا اصلاح کا کبھی خیر مقدم نہیں کیا۔

کشمیری اور آئرش دونوں مذاق پسند ہیں، بے ضرر چالوں کے شوقین اور خوش مزاج چرب زبانی کے استاد۔ دونوں اپنے بچوں اور بوڑھوں سے مہربانی کا سلوک کرتے ہیں، اور سر والٹر مزید کہتے ہیں کہ دونوں حفظانِ صحت کے ابتدائی اصولوں سے یکساں بے پروا ہیں، اگرچہ کشمیری جھونپڑے کا اندرون غالباً اسی درجے کے آئرش مسکن کے اندرون سے زیادہ صاف ہوتا ہے۔

کشمیر کی عورتیں

کشمیر کی عورتوں کے بارے میں بہت سے بیرونی مبصرین نے اپنے تاثرات قلم بند کیے ہیں۔ دو بالکل متضاد آرا — ایک انگریز کی اور دوسری ایک فرانسیسی کی — واقعی چونکا دینے والی ہیں۔ کرنل الیگزینڈر ڈاؤ (Colonel Alexander Dow) اپنی کتاب "تاریخ ہندوستان"،

مطبوعہ ۱۷۷۲ء (جلد اول، صفحہ 41) میں لکھتا ہے: ”یہاں کے باشندے حیرت انگیز حد تک خوب صورت ہیں اور عورتیں تو خاص طور پر سحر انگیز حسن رکھتی ہیں۔“

اور اینڈریو ولسن (Andrew Wilson) اس روایت کا حوالہ دیتا ہے کہ ہاروت و ماروت نامی دو فرشتے کشمیری عورتوں کے حسن کے دام میں گرفتار ہو گئے تھے (دی ابوڈ آف سنو، صفحہ 420)۔ فرانسیسی ماہرِ فطرت وکٹر ژاکموں (Victor Jacquemont) اپنے ”خطوط از ہند“ (جلد دوم، صفحہ 65) میں لکھتا ہے: ”جان لو کہ میں نے کشمیر جیسی بدصورت چڑیلیں کہیں نہیں دیکھیں۔ یہاں کی صنفِ نازک غیر معمولی طور پر بدشکل ہے۔“ دوسری طرف مشرقی شعرا کشمیری عورتوں کے حسن کی ستائش میں یک زبان ہیں، اور اس کی نمائندہ مثال شاعر ظہوری کی ہے، جو کہتا ہے:

ترکان غارت گرِ صبر و ہوش بہ کشمیریان ملاحت فروش

بیرونی سیاح اکثر اس سے پہلے ہی عمومی حکم لگانے کی غلطی کر بیٹھتے ہیں کہ حقیقی صورتِ حال کا صحیح اندازہ قائم کرنے کے لیے کافی مشاہدہ کر چکے ہوں۔ عہدِ وسطیٰ کے مشرقی مؤرخین، اور ان میں بھی خاص کر وہ طبقہ جسے فنِ سخن ودیعت ہوا تھا، اپنے مبالغہ آمیز رجحان کے لیے بدنام ہیں۔ جس فرانسیسی مصنف کا حوالہ اوپر دیا گیا ہے، وہ یقیناً اس غلاظت سے متنفر ہوا ہو گا جو کشمیر کی عورتوں کے بعض طبقوں کا مقدر ہے۔ مرحوم خان بہادر پیرزادہ محمد حسین ایم اے، سابق چیف جسٹس کشمیر، کی ”آئینۂ کشمیر“ میں یہی حقیقت ان سطور میں نمایاں کی گئی ہے، جن میں کہا گیا ہے کہ حسن و رنگ میں مشہور ان عورتوں کے پاس نہ صاف کپڑے ہیں نہ بننے سنورنے کا سامان، مگر:

حیا و عصمت و عفت تو اب تک ان میں ہے باقی

ایک بار جب ایک زنانہ مشن کی مبلغہ بے اختیار کہہ اٹھی: "پیاری کشمیری عورتو، تم دھوتی نہاتی کیوں نہیں؟" تو انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور جواب دیا: "ہم پر اتنے ظلم ہوئے ہیں کہ ہمیں صفائی کی پروا ہی نہیں رہی۔" شاید یہی جواب اس حقیقت کی توضیح کرتا ہے کہ افغانوں اور سکھوں کے جابرانہ دورِ حکومت میں صفائی ستھرائی تاوان یا اغوا کو دعوت دیتی تھی، اور یوں گندگی کی عادت عورتوں پر جبراً مسلط ہو گئی۔ جارج فورسٹر، جو ۱۷۸۳ء میں کشمیر آیا، وادی کی عورتوں کو جنوبی فرانس کی ان عورتوں سے تشبیہ دیتا ہے جو اپنے حسن کے لیے مشہور ہیں، اور مزید کہتا ہے کہ کشمیر کی عورتیں "جنوبی فرانس یا اسپین میں گندمی رنگت والی حسینائیں کہلائیں گی۔" ہندوستانی نگاہ میں کشمیر کی عورتیں ساخت کے اعتبار سے ان کی اپنی عورتوں سے مختلف ہیں۔ پنجاب کی گندم گوں، سخت ہڈیوں والی کسان عورتوں یا ہندوستان کے دوسرے حصوں کی سانولی عورتوں کے مقابلے میں کشمیری عورتیں رنگت میں زیادہ گوری، اکثر نیلی آنکھوں والی، نرم اندام اور دلکش وضع قطع کی ہیں۔ پنڈتانی اکثر زیادہ نازک خد و خال کی نظر آتی ہے، مگر مسلمان عورت زیادہ توانا ہے اور زیادہ مضبوط جسمانی سکت رکھتی معلوم ہوتی ہے۔ بظاہر اس کا سبب ایک طرف ذات پات کی پابندیاں اور دوسری طرف وسیع تر میدان قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن یکساں حالاتِ زندگی میں شاید ایسا کوئی فرق سرے سے موجود ہی نہ ہو، اگرچہ پچیس برس قبل ایک سرکاری جائزے میں پنڈتانیوں میں تپِ دق کی بڑی کثرت سامنے آئی تھی۔ کشمیری عورت کی بڑی بڑی روشن سیاہ آنکھیں کسی ترک، ایرانی یا افغان حسینہ کی آنکھوں کے ہم پلہ ہیں، اگرچہ خواجہ حافظ شیرازی اپنے دیوان میں صرف کشمیریوں اور ترکوں ہی کو منتخب کرتے ہیں، جب کہتے ہیں:

بہ شعر حافظ شیرازی می رقصند و می نازند سیہ چشمان کشمیری و ترکان سمرقندی

یہ فی الواقع عظیم حافظ اور بیجاپور کے مشہور درباری شاعر ظہوری کی طرف سے ایک خراجِ تحسین ہے کہ جمالِ صورت میں کشمیری کو ترک کے ساتھ رکھا جائے، کیونکہ ترک بالاتفاق مشرق کی تمام اقوام میں سب سے خوب رو ہے۔ شیخ سعدی نے بھی ترک کے حسن کے اسی عالمگیر اعتراف کو زبان دی ہے، جب وہ کہتے ہیں کہ:

حسن بہ ترکان دادند

تاہم اس میں کوئی شک نہیں کہ غربت اور جہالت اور اس بدنصیب وادی کے سیاسی نشیب و فراز نے یہاں کی عورتوں کے نسائی حسن کو خاصا گہنا دیا ہے اور وادی میں آنے والے ایک سیاح سے یہ کہلوایا ہے:

حسن کو چاہیئے انداز و ادا، ناز و نمک کیا ہوا گر ہو گلوں کی طرح گال سفید

لیکن اگر انہیں بھی آزادی اور شائستہ معیارِ زندگی کے وہی مواقع میسر آئیں جو مغرب کی عورتوں کو حاصل ہیں تو منظر بالکل مختلف ہو گا، اور کشمیر کی عورتیں دنیا کی بہترین عورتوں میں شمار ہوں گی، جیسا کہ پنجاب اور متحدہ صوبہ جات وغیرہ میں جا بسنے والی بعض کشمیری عورتوں کے احوال سے ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ سماجی اصلاح و ترقی کے پروگرام میں کشمیر کی عورتوں کی صحت اور تعلیم و شعور کو اولین اہمیت حاصل ہونی چاہیے۔ مسز ایشلی کیرس ولسن (Mrs. Ashley Carus-Wilson) نے لکھا ہے کہ کشمیری بچے نہایت پیارے ہوتے ہیں۔ فی الواقع اپنے دل آویز حسن کی نمایاں معصومیت میں وہ مغرب کے بچوں سے بخوبی مقابلہ کر سکتے ہیں، لیکن ماں کی ہولناک ناخواندگی اور گرد و پیش کی غلاظت اور غربت انہیں بڑے ہو کر ویسا دل آویز نہیں رہنے دیتی۔

کشمیری پر تنقید

اس کہاوت میں، جو تفریحاً بھی اور طنزاً بھی بہت کثرت سے دہرائی جاتی ہے، کشمیری کو کمبوہ اور افغان کے ساتھ بدذات قرار دیا گیا ہے:

اگر قحط الرجال افتد از ایشاں انس کم گیری یک افغان، دوم کمبوہ، سوم بدذات کشمیری

کرنل ٹورنس (Colonel Torrens) کے سفرنامے (صفحہ 299) میں اس کا ترجمہ یوں کیا گیا ہے: ”اگر تقدیر مردوں کا قحط بھی نازل کر دے تو اے میرے دوست، خبردار رہنا افغان سے، اور کمبوہ سے بھی، جو خود بدمعاش ہے، لیکن سب سے بڑھ کر اس بدنسل و کمینے کشمیری سے دامن بچانا۔“

یہاں بھی شمالی ہند کے تین بدنام عیاروں میں کشمیری ہی کو بدترین ٹھہرایا گیا ہے! تاہم ایک زیرک کشمیری نے ایک بار اپنے ہجو گو ہی پر پانسہ الٹ دیا اور کہا کہ اس کہاوت کا اصل مطلب یہ ہے کہ افغان سب کے سب برے ہیں، کمبوہ بھی سارے کے سارے برے ہیں، مگر کشمیریوں میں صرف بدذات کشمیری ہی سے پرہیز لازم ہے، ہر کشمیری سے نہیں۔

عام کشمیری، یا بہرحال ہانجی یعنی ملاح، خاصا کثیر الاولاد سمجھا جاتا ہے۔ اس کی وجہ شاید وہی عام سبب یعنی کشمیری کی مجموعی غربت ہو۔ بعض کا البتہ خیال ہے کہ اس کا سبب دریاؤں اور دوسرے پانیوں میں مچھلی کی کثرت ہے، لیکن اس بارے میں کوئی قطعی حکم لگانا دانش مندی نہ ہوگی۔ یہ فی الواقع ایک دلچسپ تحقیق طلب موضوع ہے۔

یہ دعویٰ بھی کیا گیا ہے کہ کشمیری ”بزدل، جھوٹا اور گندا آدمی ہے۔“

وہ بزدل ہے تو اس لیے کہ طویل جبر و استبداد نے اسے ایسا بنا دیا ہے۔

اس کی بزدلی غیر معمولی ہے۔

خطرے کے ادنیٰ سے اشارے پر گھر بیٹھا رہنے والا غریب کشمیری کانپنے لرزنے اور رونے چلانے لگتا تھا۔ کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا کہ پنجاب میں عام طور پر کہا جاتا تھا کہ کشمیری بندوق چلانے کی جرأت نہیں کرے گا بلکہ ڈر کے مارے اسے پھینک کر کہے گا کہ "یہ خود بخود چل جائے گی۔"

شمالی ہند کے بعض پہاڑی علاقوں کے باشندے بھی کسی قدر بزدل پائے گئے ہیں، لیکن جن لوگوں نے شملہ یا ڈلہوزی میں کشمیری قلیوں اور دوسرے پہاڑی اضلاع کے قلیوں کو ایک ساتھ کام کرتے دیکھا ہے، انہوں نے ضرور محسوس کیا ہو گا کہ کشمیری قلی یقیناً زیادہ بزدل مگر بلاشبہ زیادہ شائستہ ہے، اور آلڈس ہکسلے (Aldous Huxley) کے بقول "حیرت انگیز حد تک خوش مزاج" بھی۔ درحقیقت وہ اکثر دوسرے پر رعب جما لیتا ہے اور کام کا گندا یا زیادہ کٹھن حصہ اسی کے سپرد کر دیتا ہے۔

تلاشِ رزق میں دربدر ہر وقت پھرتا ہے تری تحقیر سب اغیار سرِ بازار کرتے ہیں

"غربت چونکہ ہمیشہ دردناک حد تک شدید رہی ہے، اس لیے غریبوں کو شاید ہی موردِ الزام ٹھہرایا جا سکے کہ وہ خطرے کی پہلی ہلکی سی جھلک کے بعد ہی ایسے گھروں کو چھوڑ جاتے ہیں جہاں معاشرتی حالات انہیں بہت ہی کم کچھ مہیا کرتے ہیں۔ فی الحقیقت مال و متاع کی کمی ایک گونہ آزادی بھی عطا کرتی ہے۔ مگر یہاں یہ آزادی گھر بار چھوڑ جانے کی آزادی ہے! — نامعلوم"

اگرچہ صورتِ حال یہی ہے، تاہم یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے کہ کشمیری پہلوان ہندوستان کے اکھاڑوں میں اپنے حریفوں کے لیے دہشت کی علامت رہا ہے۔ چنانچہ کوئی تعجب نہیں کہ ولیم مورکرافٹ (William Moorcroft) نے ۱۸۲۰ء کے لگ بھگ لکھا کہ کشمیری کسانوں میں ایسے مضبوط اور عضلاتی جسم پائے جاتے ہیں جو فارنیز ہرکولیس کے مجسمے کے لیے نمونے کا کام دے سکتے تھے۔ فی الواقع کشمیری تضادات کا مجموعہ ہے۔

پھر یہ کہ "وہ جھوٹا ہے، کیونکہ حکومت کے اُس مخصوص نظام نے، جس نے جاسوسی کے نہایت منظم جال کو پروان چڑھایا، اسے جھوٹ پر مائل کیا۔" اور سر ڈبلیو ایچ بیوریج (Sir W. H. Beveridge) کے الفاظ میں "جس سرزمین پر دہشت ایک بار زہریلی دھند کی طرح چھا چکی ہو، وہاں سچائی آسانی سے نہیں پنپتی۔" بزدلی اور دروغ گوئی نے بہ تدریج اس میں حسد اور کینہ، خود ستائی ("تھیکن") اور دوسروں کی مذمت کے اوصاف پیدا کر دیے ہیں۔ اس میں ہمدردی کا بظاہر فقدان ہے، اگرچہ زبانی جمع خرچ بہت ہے۔ جس طرح ادنیٰ درجے کا اینگلو انڈین اکثر "بلڈی" کی گالی استعمال کرتا ہے، یا انگریز "ڈیم اٹ" کی رٹ لگاتا ہے، اسی طرح کشمیری "تپت" اور "تاوان" پکار کر کوسنے دیتا ہے۔ "ترٹھ" اور "زہرباد" عورتوں کی زبان پر اسی طرح جاری رہتے ہیں جس طرح پنجابی عورتیں "سدھ" اور "سیاپا" کہتی ہیں۔ پھر کشمیری اپنی قسموں سے بھی خوب کھلواڑ کرتا ہے: "بیادِ قرآن" وہ دن میں پچاس مرتبہ دہراتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے نچلے طبقے کا لاہوری یا کوئی بھی ایسا پنجابی جس کی زبان کی نوک پر ہر وقت گالی رہتی ہے۔

قنوطیت، تعلیم سے محرومی اور غربت نے کشمیری کو گندا بنا دیا ہے۔

میرے نزدیک اس کی گندگی ہی اجنبی کی نظر میں اس کی ذلت کا سبب ہے۔ آلڈس ہکسلے (Aldous Huxley) تو یہاں تک کہہ گیا ہے کہ کشمیری کو گندگی میں گویا کمال حاصل ہے۔ اس کی گندی عادات کے خلاف ایک باقاعدہ جہاد ہی وقت کی واحد ناگزیر ضرورت ہے؛ تاہم ضمناً یہ کہنا ضروری ہے کہ گندگی کی یہ عادت بعض صورتوں میں یورپی باشندے میں بھی، خود اس کے اپنے وطن میں، پائی جاتی ہے، جہاں وہ صاف کپڑے تو پہن لیتا ہے مگر بدن کو ویسا ہی صاف نہیں رکھتا، اور غسل سے یا تو اس کے اخراجات کے باعث گھبراتا ہے یا اُس سخت آب و ہوا کے سبب جس سے وہ، کشمیری ہی کی طرح، دوچار رہتا ہے۔ ایسا یورپی اس پر بھی کشمیری کو "نوعِ انسانی کے لیے باعثِ ننگ وہ ورزشی بدن والا داڑھی دار" کہنے سے شرم محسوس نہیں کرتا۔

۱۔ ٹریولز (Travels)، جلد اول، ص 128۔ ۲۔ فارنیز ہرکولیس پہلی صدی قبل مسیح کا سنگِ مرمر کا ایک مجسمہ ہے جس میں ہرکولیس کو مبالغہ آمیز عضلات کے ساتھ دکھایا گیا ہے۔ یہ مجسمہ فارنیز محل میں رکھا تھا۔ فارنیز اٹلی کے ایک ڈیوک خاندان کا نام ہے جو پندرہویں سے سترہویں صدی عیسوی تک اٹلی کی ریاست پارما کا حکمران خاندان رہا۔

"اور صفائی ستھرائی کے فقدان پر ناک بھوں نہ چڑھاؤ۔ یاد رکھو کہ چینی انتہائی غریب ہیں اور اس جنگ میں پہلے ہی ہولناک مصائب جھیل چکے ہیں۔" یہ وہ نصیحت ہے جو فروری ۱۹۴۳ء میں چین میں متعین امریکی فوجیوں کے کتابچے میں درج تھی۔ تو کیا مغرور و متکبر غیر ملکی کو انتہائی غریب کشمیری سے ملتے وقت یہ نصیحت فراموش کر دینی چاہیے؟ کشمیری کو حقیر جاننے والے اس قسم کے اہلِ مغرب کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک زمانے میں وہ خود بھی اہلِ مشرق کی جانب سے ایسے ہی فقروں اور ایسے ہی تمسخر کا نشانہ بنتے رہے ہیں۔ "ہم اپنی

بہت سی آسائشوں کے لیے انہی سراسینوں (اہلِ عرب) کے مرہونِ منت ہیں۔ چونکہ وہ مذہباً پاکیزگی پسند تھے، اس لیے ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ اہلِ یورپ کے دستور کے مطابق ایسا لباس پہنتے جو اُس وقت تک بدلا نہ جاتا جب تک وہ خود بخود گل سڑ کر جوؤں، تعفن اور چیتھڑوں کا ایک گھناؤنا ڈھیر بن کر جھڑ نہ جاتا [شاید غریب کشمیری کے سر ڈھانپنے کے کپڑے کی مانند؟]۔ انہوں نے ہمیں کتان اور سوت کا وہ بار بار بدلا اور بار بار دھویا جانے والا زیرِ جامہ استعمال کرنا سکھایا جو آج بھی خواتین میں اپنے قدیم عربی نام ہی سے رائج ہے۔"

تاہم یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ وادی میں آنے والے سیاح کی نظر میں کشمیری کی بدنامی کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس کا واسطہ زیادہ تر نچلے طبقے کے کشمیری سے پڑتا ہے—ہانجی یعنی ملاح سے اور پھیری والے سے، اور بعض صورتوں میں اُس نیم تعلیم یافتہ کشمیری پنڈت سے جو مغربی سیاح کے ہاں بابو، منشی یا اتالیق کے طور پر کام کرتا رہا ہے، اور جسے آلڈس ہکسلے کے بقول جسمانی محنت سے ہسپانویوں سے بھی بڑھ کر نفرت ہے۔ چنانچہ کشمیری کے کردار پر کی جانے والی بیشتر عام تنقید بے جا اور ناروا ہے۔ عام کشمیری اپنے اردو لہجے کے باعث ہنسی کا نشانہ بنتا ہے اور یوں اجنبی کے لیے تفریح کا سامان مہیا کرتا ہے۔ انگریزی میں بھی اس کا لہجہ قدرے نرالا ہے۔

۱۔ میجک لداخ (Magic Ladakh)، از میجر ایم ایل اے گومپرٹز (Major M. L. A. Gompertz)، سیلی سروس اینڈ کمپنی لمیٹڈ، لندن، ۱۹۲۸ء، ص 26، جہاں "ویئر تھری ایمپائرز میٹ" (Where Three Empires Meet)، لانگ مینز، لندن، ۱۸۹۳ء، ص 111 کے مصنف ای ایف نائٹ (E. F. Knight) کا قول دہرایا گیا ہے۔ بے چارہ کشمیری کم از کم اُس نوع کے جرم سے تو بری ہے جس کا ذکر لیفٹیننٹ کرنل آرتھر آسبرن (Lieutenant-Colonel Arthur Osburn) نے کیا ہے: "کچھ ہی عرصہ قبل یہ بیان

کیا گیا کہ نوجوان انگریز لڑکیوں کی آبروریزی کے کل واقعات میں سے تیس فیصد باپ اور بیٹی کے مابین محرمات کی خلاف ورزی کے واقعات تھے۔" — مسٹ انگلینڈ لوز انڈیا؟ (Must England Lose India?)، الفریڈ اے نوف، لندن، ۱۹۳۰ء، دوسرا ایڈیشن جون ۱۹۳۰ء، ص 106، سطر 16-19۔ ۲۔ اے ہسٹری آف دی انٹلکچوئل ڈیولپمنٹ آف یورپ (A History of the Intellectual Development of Europe)، از جان ولیم ڈریپر (John William Draper)، ایم ڈی، ایل ایل ڈی، پروفیسر جامعہ نیویارک، نظر ثانی شدہ ایڈیشن، جارج بیل، لندن، ۱۸۷۵ء، جلد دوم، ص 33-34۔

مستقبل

حاصلِ کلام کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے: "اگرچہ توہم پرستی نے گھر بیٹھے رہنے والے اوسط درجے کے کشمیری کو بزدل بنا دیا ہے، جبر و استبداد نے اسے پست ہمت جھوٹا بنا ڈالا ہے، اور طبعی آفات نے اسے خود غرض اور قنوطی کر دیا ہے، اور قریب کے زمانے تک کاشتکار بیگار (جبری باربرداری یا جبری مشقت) کے نظام تلے زندگی بسر کرتا رہا، اور املاک کا کوئی تحفظ نہ ہونے کے باعث اس کے پاس محنت کی کوئی ترغیب نہ تھی، اور جان کا تحفظ نہ ہونے کے سبب وہ ایک آزاد انسان کی خود مختاری کھو بیٹھا"؛ تاہم یہ امر واضح ہے کہ خوش قسمتی سے حالات بدل رہے ہیں، جدید زندگی کے اثرات مرتب ہو رہے ہیں، اور سیاحوں اور بیرونی اداروں کی آمد بتدریج بیداری پیدا کر رہی ہے۔ چنانچہ مستقبل امید سے خالی نہیں، کیونکہ کشمیری کے اندر وہ اوصاف موجود ہیں جو ایک عظیم قوم بنا سکتے ہیں۔ اپنے بے شمار نامور فرزندوں میں کشمیری قوم متحدہ صوبہ جات کے ایک فاضل ماہرِ قانون اور ممتاز سیاست دان کو، پنجاب کے ایک شاعر و فلسفی کو، ڈھاکہ کے ایک بڑے زمیندار کو، اور دیگر

مقامات پر ایک عظیم مصلح، ایک قابل منتظم اور ایک سرکردہ امیر التجار کو شمار کر سکتی ہے۔ کشمیری نے عظیم یورپی یعنی عالمی جنگوں میں بھی حصہ لیا ہے۔ اس نے جولائی ۱۹۲۴ء میں سری نگر میں ریاستی رسالے کے حملوں کا بالکل نہتے مقابلہ کر کے، اور ۱۹۳۲ء میں وادی کے ہنگاموں کے دوران، اپنی خودداری کا جوہر دکھایا ہے۔ اور اس نے خاصی قربانیوں کی قیمت پر ایک ایسا دستور حاصل کیا ہے جس کے تحت ۱۸ ؍ اکتوبر ۱۹۳۴ء کو پرجا سبھا یعنی قانون ساز اسمبلی کا افتتاح عمل میں آیا۔ تاہم یہ اسمبلی محض ایک سفارشی ادارہ ہے جو مجلسِ وزرا کے تابع ہے۔

پنجاب، لکھنؤ، پٹنہ یا ڈھاکہ کا تعلیم یافتہ کشمیری عقل و دانش، تہذیب اور شائستگی میں، نیز عمومی وضع قطع، جسمانی ساخت اور مردانہ اوصاف میں، ترقی یافتہ سے ترقی یافتہ ہندوستانی کے مقابل اپنا لوہا منواتا ہے۔

[کلہن کے بیان کے مطابق]

گونند اول — دامودر اول (تخت نشینی کا مفروضہ آغاز: کلی سموت ۶۵۳، لوکِک سموت ۶۲۸) — یشووتی — گونند دوم — پینتیس "گم شدہ" بادشاہ — لَو — کُش — کھگیندر — سریندر — گودھر — جنک — شچی نر — اشوک — جلوک — دامودر دوم — ہشک، جشک، کنشک — ابھی منیو اول۔

[مندرجہ بالا سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein) کے راج ترنگنی کے انگریزی ترجمے، جلد اول، ص 134-135 کے مطابق ہے۔]

گونند خاندان کے بادشاہ — پہلا گروہ

۱۔ گونند اول — ۱۱۸۴ ق م ۲۔ بھیشن اول — ۱۱۴۹ ق م ۳۔ اندرجیت — ۱۰۹۵ ق م ۴۔ راون — ۱۰۶۰ ق م ۵۔ بھیشن دوم — ۱۰۳۰ ق م ۶۔ نر اول عرف کنر — ۹۹۴ ق م ۷۔ سدھ — ۹۵۵ ق م ۸۔ اتپلاکش — ۸۹۵ ق م ۹۔ ہرنیاکش — ۸۶۴ ق م ۱۰۔ ہرنیہ کل — ۸۲۷ ق م ۱۱۔ واسوکل — ۷۶۷ ق م ۱۲۔ مہرکل عرف ترکوٹیہا (تین کروڑ انسانوں کا قاتل) — ۷۰۷ ق م ۱۳۔ بک — ۶۳۷ ق م ۱۴۔ کشتی نند — ۵۷۴ ق م ۱۵۔ واسونند — ۵۴۴ ق م ۱۶۔ نردوم — ۴۹۱ ق م ۱۷۔ اکش — ۴۳۱ ق م ۱۸۔ گوپادتیہ — ۳۷۱ ق م ۱۹۔ گوکرن — ۳۱۱ ق م ۲۰۔ نریندر اول عرف کھنکھل — ۲۵۳ ق م ۲۱۔ یدھشٹھر اول — ۲۱۷ ق م (مدتِ حکومت مذکور نہیں)

پہلے گروہ کے گونند بادشاہوں کی کل مدت: ۱۰۱۴ برس۔

وکرمادتیہ خاندان — دوسرا گروہ

۲۲۔ پرتاپادتیہ اول — ۱۶۹ ق م ۲۳۔ جلوک — ۱۳۷ ق م ۲۴۔ تنجین اول — ۱۰۵ ق م ۲۵۔ وجے ۲۶۔ جیندر ۲۷۔ سندھی متی عرف آریہ راج (جیندر کا وزیر) — اس پر خاندان کا خاتمہ ہوا اور خاندان بدل گیا (”انیہ کل ج راجہ“ یعنی کسی دوسرے خاندان کا راجہ)

دوسرے گروہ — وکرمادتیہ خاندان اور دیگر — کی کل مدت: ۱۹۲ برس۔

گونند خاندان کی بحالی — تیسرا گروہ

۲۸۔ میگھ واہن ۲۹۔ پرورسین اول عرف تنجین دوم ۳۰۔ ہرنیہ اور تورمان (سلسلۂ خاندان منقطع ہوا) ۳۱۔ ماترگپت شاعر (اجین کے اُس عظیم وکرمادتیہ کا پروردہ جس نے شکوں کو

شکست دی) ۳۲۔ پرورسین دوم — ۱۲۳ء ۳۳۔ یدھشٹھر دوم — ۱۸۳ء ۳۴۔ نریندرادتیہ عرف لکھن — ۲۰۴ء ۳۵۔ رنادتیہ عرف تنجین سوم — ۲۱۷ء ۳۶۔ وکرمادتیہ — ۵۱۷ء ۳۷۔ بالادتیہ — ۵۵۹ء

پہلی بحالی کے بعد گونند بادشاہوں (تیسرے گروہ) کی کل مدت: ۵۷۲ برس۔

کرکوٹا یا ناگ خاندان — چوتھا گروہ

۳۸۔ درلبھ وردھن عرف پرگیادتیہ — ۵۹۶ء ۳۹۔ درلبھک عرف پرتاپادتیہ دوم — ۶۳۲ء ۴۰۔ چندراپیڑ — ۶۸۲ء ۴۱۔ تاراپیڑ — ۶۹۱ء

تاراپیڑ کے عہد کے اختتام تک کرکوٹا بادشاہوں کی کل مدت: ۹۸ برس ۸ ماہ ۲۴ دن۔ تاراپیڑ کے عہد کے اختتام تک میزانِ کل: ۱۸۷۸ برس۔

۴۲۔ مکتاپیڑ عرف للتادتیہ — ۶۹۵ء ۴۳۔ کوولیاپیڑ — ۷۳۲ء ۴۴۔ وجرادتیہ بپیک عرف للتادتیہ — ۷۳۳ء ۴۵۔ پرتھوی پیڑ — ۷۴۰ء ۴۶۔ سنگرام پیڑ — ۷۴۴ء ۴۷۔ جیاپیڑ — ۷۵۱ء ۴۸۔ ججّا (جیاپیڑ کا برادرِ نسبتی اور وزیر؛ غاصب) ۴۹۔ للتاپیڑ — ۷۸۵ء ۵۰۔ پرتھوی پیڑ دوم عرف سنگرام پیڑ دوم — ۷۹۷ء ۵۱۔ چپٹ جیاپیڑ عرف برہسپتی (ایک کنیز کے بطن سے للتاپیڑ کا بیٹا) — ۸۰۴ء ۵۲۔ اجیت پیڑ (چپٹ کے بھائی کا بیٹا؛ معزول کیا گیا) — ۸۱۶ء ۵۳۔ اننگ پیڑ (سنگرام پیڑ کا بیٹا) — جو اس کا جانشین ہوا ۵۴۔ اتپل پیڑ (اجیت پیڑ کا بیٹا)

چوتھے ترنگ کے اختتام تک کل مدت: ۲۶۰ برس۔

تبدیلیِ خاندان — پانچواں گروہ

۵۵۔ اونتی ورمن (سکھ ورمن کا بیٹا، جو مذکورہ بالا کنیز کے بھائی اتپل کا بیٹا تھا)؛ پھالگن کرشن ۱، لوکِک ۳۱ سے آشاڑھ شکل ۳، لوکِک ۵۹ تک — ۸۵۷ء ۵۶۔ شنکر ورمن، پھالگن کرشن ۷، لوکِک ۷۷ تک — ۸۸۴ء ۵۷۔ گوپال ورمن — ۹۰۳ء ۵۸۔ سنکٹ ورمن ۵۹۔ ملکہ سوگندھا — ۹۰۵ء

تبدیلیِ خاندان:

۶۰۔ نرجیت ورمن عرف پنگو (شور ورمن کا پوتا) — ۹۲۴ء؛ اس نے برائے نام ہی حکومت کی، اور ۶۱۔ اس کا دس سالہ بیٹا پارتھ اس کا جانشین ہوا، پوش کرشن ۱، لوکِک ۹۷ تک، یعنی ۱۹ برس ۹ ماہ ۲۳ دن، جن میں سے گوپال ورمن، سنکٹ ورمن اور سوگندھا کے ۴ برس ۱۰ دن منہا ہیں؛ پھر نرجیت ورمن عرف پنگو دوبارہ، ماگھ کرشن ۱، لوکِک ۹۸ تک — ۹۳۵ء ۶۲۔ چکر ورمن، ماگھ کرشن ۱، لوکِک ۹۹ تک — ۹۳۶ء ۶۳۔ شور ورمن، آشاڑھ کرشن ۱ تک — ۹۳۶ء ۶۴۔ پارتھ دوبارہ، آشاڑھ کرشن ۱ تک — ۹۳۸ء؛ پھر چکر ورمن دوبارہ، جیشٹھ شکل ۸ تک؛ اور اُنمت اونتی، لوکِک ۱۵ تک

(پانچویں گروہ کا خاتمہ — پانچویں ترنگ کا اختتام)

تبدیلیِ خاندان — چھٹا گروہ

۶۵۔ یشسکر، بھادوں کرشن ۳، لوکِک ۲۴ تک ۶۶۔ ورنٹ (جس نے یشسکر کی وفات سے چند روز پیشتر حکومت کی) — ۹۴۸ء ۶۷۔ سنگرام دیو، پھالگن کرشن ۱۰ تک ۶۸۔ پرو گپت، آشاڑھ، لوکِک ۲۶ تک — ۹۵۰ء ۶۹۔ کشیم گپت، پوش شکل ۱، لوکِک ۳۴ تک — ۹۵۱ء ۷۰۔ ابھی منیو، کارتک شکل ۳، لوکِک ۴۸ تک — ۹۶۰ء ۷۱۔ نندی گپت، لوکِک ۴۹ تک —

۷۲ء۹۷۳۔ تری بھون، مارگ شیرش شکل ۵، لوکِک ۵۱ تک — ۷۳ء۹۷۵۔ بھیم گپت — ۷۴ء۹۷۶۔ ملکہ دِدّا، بھادوں شکل ۸ تک — ۹۸۱ء

(چھٹے گروہ کا خاتمہ — چھٹے ترنگ کا اختتام)

تبدیلیِ خاندان — ساتواں گروہ

۷۵۔ سنگرام راج — ۷۶ء۱۰۰۴۔ ہری راج، آشاڑھ شکل ۸ تک — ۷۷ء۱۰۲۹۔ اننت، کارتک شکل ۶، لوکِک ۳۹ تک — ۱۰۲۹ء، جب اس نے اپنے بیٹے کلش کی تاج پوشی کی ۷۸۔ کلش، مارگ شیرش شکل ۶، لوکِک ۶۵ تک — ۷۹ء۱۰۶۴۔ اُتکرش اور ہرش، بھادوں شکل ۵ تک — ۱۰۹۰ء

(ساتویں گروہ کا خاتمہ — ساتویں ترنگ کا اختتام)

تبدیلیِ خاندان — آٹھواں گروہ

۸۰۔ اُچل، پوش شکل ۶، لوکِک ۸۷ تک — ۸۱ء۱۱۰۲۔ ردّا عرف شنکھ — ۸۲ء۱۱۱۳۔ سلہن، بیساکھ شکل ۳، لوکِک ۸۸ تک — ۸۳ء۱۱۱۳۔ سُسل، پھالگن کے چاند کی پہلی تاریخ تک — ۱۱۱۳ء (جس میں ۸۴۔ بھکشاچر کے ۶ ماہ ۱۲ دن شامل ہیں) — ۱۵ برس ۹ ماہ ۲۷ دن ۸۵۔ وجے سنہ — ۱۱۲۹ء؛ جو اپنے عہد کے پچیسویں برس، یعنی ۱۱۵۱ء مطابق شاکا ۱۰۷۲، میں بدستور تخت نشین تھا

شاکا ۱۰۷۲ یعنی ۱۱۵۱ء کے اختتام تک کل مدت: ۴۸ برس ۵ ماہ ۲۵ دن۔

[مندرجہ بالا آنجہانی مسٹر آر ایس پنڈت (R. S. Pandit) کے "دریائے شاہاں" (River of Kings) کے انگریزی ترجمے، ص 581-582 اور 585-586 کے مطابق ہے۔]

[جون راج کے بیان کے مطابق]

جے سنہ (یہی کلہن کا سنہ دیو ہے) — ۱۱۲۷ء پرمانک — ۱۱۵۴ء ونتی دیو — ۱۱۶۴ء وویہ دیو — ۱۱۷۱ء جسک — ۱۱۸۰ء جگ دیو — ۱۱۹۸ء راج دیو — ۱۲۱۳ء سنگرام دیو — ۱۲۳۶ء رام دیو — ۱۲۵۲ء لکشمن دیو — ۱۲۷۳ء سنہ دیو — ۱۲۸۶ء سہ دیو — ۱۳۰۱ء رام چندر — ۱۳۲۰ء اُدیان دیو — ۱۳۲۳ء کوٹا (رانی) — ۱۳۳۸ء

[مندرجہ بالا جوگیش چندر دت (Jogesh Chander Dutt) کے جون راج کی "راجاولی" کے انگریزی ترجمے، جلد سوم، ص XXI (کتاب کے آخر میں) کے مطابق ہے۔]

باب دوم — قبل از اسلام کا دور

کشمیر کے قدیم ترین معلوم بادشاہ

چونکہ اس باب میں تاریخِ کشمیر کے اس دور کا بیان ہے جب وادی پر ہندو — برہمن اور غیر برہمن — اور بدھ مت کے پیروکار وغیرہ حکمران رہے، اس لیے ہم اسے تاریخِ کشمیر کا قبل از اسلام دور کہتے ہیں۔ چونکہ آنجہانی سر مارک اورل سٹائن (Sir Mark Aurel Stein) نے راج ترنگنی کے اپنے انگریزی ترجمے میں اس عہد کی نہایت جامع و مبسوط تشریح کر دی ہے، اس لیے "کشیر" کے قاری کے سامنے اس دور کا صرف ایک مختصر خاکہ پیش کیا جاتا ہے۔

گونند اول

گونند اول پہلا حکمران ہے جس کے عہد سے تاریخِ کشمیر کی زمانی ترتیب کی کسی قدر صورت شروع ہوتی ہے۔ اس کا زمانۂ حکومت جنگِ مہابھارت سے بیس برس قبل بتایا جاتا ہے۔ گونند اول اپنے عزیز جراسندھ، فرمانروائے مگدھ، کی حمایت میں کرشن کے خلاف جنگ پر نکلا اور اس نے متھرا شہر کا محاصرہ کیا، مگر لڑائی میں مارا گیا۔

روایت ہمیں رامائن کے ہیرو رام چندر کے زمانے تک لے جاتی ہے، جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انھوں نے کشمیر فتح کیا اور یہاں آئے، مگر ان کے متعلق اس سے زیادہ کچھ منقول نہیں۔ روایت کے مطابق جب ملک مستقل طور پر آباد ہو گیا تو وہ برہمنوں کی قائم کردہ بے شمار چھوٹی چھوٹی ریاستوں یا "کٹہ راجوں" میں بٹ گیا، جو وقت گزرنے کے ساتھ

آپس میں لڑنے لگیں، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ لوگوں نے علاقۂ جموں سے دیا کرن نامی ایک راجپوت کو بلایا تاکہ وہ ملک میں امن بحال کرے اور حکومت کرے [گلاب نامہ، صفحہ 52]۔ دیا کرن، پورن کرن کا بیٹا اور جمبو لوچن کا پوتا تھا، جو جموں شہر کا بانی اور راجپوتوں کے جموال خاندان کا مورثِ اعلیٰ تھا۔ بعض مؤرخین اسے متھرا کے راجاؤں کے سلسلے سے جوڑتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ دیا کرن اور اس کے سلسلے کے پینتیس راجاؤں نے یہاں حکومت کی۔ سر اورل سٹائن کا کہنا ہے کہ روایت کا یہ آخری حصہ کسی کشمیری پنڈت نے جموں سے تعلق رکھنے والے کشمیر کے موجودہ حکمرانوں کی خوشنودی کے لیے بڑھا دیا ہے — راج ترنگنی کا دیباچہ، جلد اول۔

نیز دیکھیے "گلاب سنگھ" از کے۔ ایم۔ پنیکر (K. M. Pannikar)، صفحہ 14۔

کلہن اپنے زمانی حساب کا نقطۂ آغاز اس روایتی تاریخ کو قرار دیتا ہے جو وراہ مہر کی برہت سنہتا میں رزمیہ داستانوں کے پانڈو ہیرو یدھشٹر کی تاج پوشی کے لیے بتائی گئی ہے۔ اسی افسانوی واقعے کی تاریخ کو وہ گونند اول کی تخت نشینی کے لیے بھی قبول کرتا ہے، جو کشمیر کے "گم شدہ" بادشاہوں میں پہلا ہے اور جس کا نام، جیسا کہ ہمیں بتایا گیا ہے، مؤرخ (یا اس کے پیش رووں) نے نیلمت پران سے برآمد کیا تھا۔ ان تاریخوں کو باہم ملانے کی صریح وجہ کہیں بیان نہیں ہوئی، مگر معلوم ہوتا ہے کہ نیلمت کے اُس قدیم ترمتن میں، جو کلہن کے پیشِ نظر تھا، گونند اول کو عمومی انداز میں کورووں اور پانڈووں کا ہم عصر ظاہر کیا گیا تھا — سٹائن، کلہن کی راج ترنگنی کے انگریزی ترجمے کا دیباچہ، جلد اول، صفحہ 59۔

دامودر اول

گونند اول کے بعد اس کا بیٹا دامودر اول تخت نشین ہوا، جس نے اپنے باپ کے خون کا بدلہ لینے کے جذبے سے مغلوب ہو کر کرشن پر اس سوئمبر کے موقع پر حملہ کیا جو گندھارا کے راجا نے منعقد کیا تھا — گندھارا، جو ہندوستان کی گزرگاہ اور دریائے سندھ کے کناروں پر واقع خطہ تھا۔ دامودر مارا گیا، جس پر کرشن نے مرحوم بادشاہ کی حاملہ بیوہ یشووتی کو تخت پر بٹھا دیا۔ ملکہ کے ہاں بیٹا پیدا ہوا جو شیر خوارگی ہی میں گونند دوم کے نام سے تخت نشین کر دیا گیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد جنگِ مہابھارت برپا ہوئی، مگر چونکہ کشمیر کا بادشاہ ابھی شیر خوار تھا، اس لیے نہ کوروؤں نے اس سے اتحاد کا طالب ہونا گوارا کیا اور نہ پانڈووں نے۔

(ب) پانڈو خاندان

پینتیس بادشاہوں کا خلا

پھر یکے بعد دیگرے پینتیس بادشاہ آئے جن کے نام اور کارنامے، کلہن کے بقول، دستاویزات کی تباہی کے باعث ضائع ہو گئے۔ تاہم ایک معروف مقامی مسلمان مؤرخ پیر حسن شاہ پانڈو خاندان کے بائیس بادشاہوں کو ایک ہزار برس کی حکومت دے کر یہ خلا پُر کرتا ہے۔ اگر ہم موجودہ دور کے کشمیریوں میں رائج ان روایات کو قابلِ اعتبار مانیں — جو ہر قدیم عمارت کو پانڈووں سے منسوب کر کے اسے ”پانڈو لریٹھ“ یعنی پانڈووں کی تعمیر کہتے ہیں — تو پیر حسن شاہ کے بیان کو وہی وقعت دی جا سکتی ہے جو عیسوی آٹھویں صدی کے وسط تک کلہن کے بیان کو حاصل ہے۔ کشمیری لوک ادب کی دو نہایت مقبول عشقیہ داستانوں کی

نامور ہیروئنیں، ہیمال اور لولرے، اسی عہد سے تعلق رکھتی تھیں۔ ہیمال کا عاشق ناگرائے تھا اور لولرے کا عاشق بمبور۔

کہا جاتا ہے کہ زین العابدین (۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء) نے قدیم مخطوطات کی تلاش کا اہتمام کیا اور بعض تواریخ کے نسخے دستیاب ہوئے۔ ان میں کلہن کی تاریخ سب سے زیادہ اہم تھی، مگر ابتدائی ہندو بادشاہوں میں سے پینتیس کی تاریخ بدستور مفقود تھی۔ بعد ازاں بھوج پتر پر لکھا ہوا ایک قدیم مخطوطہ دریافت ہوا۔ یہ رتناکر پران کہلایا اور خاص طور پر اس لیے دلچسپی کا حامل تھا کہ اس میں انھی بادشاہوں کا ذکر محفوظ تھا جن کے ادوارِ حکومت کلہن کی تاریخ سے ساقط تھے۔

زین العابدین نے اس کا فارسی ترجمہ کرایا، مگر یہ ترجمہ اور اصل متن، دونوں ناپید ہو چکے ہیں، اگرچہ کہا جاتا ہے کہ مؤرخ پیر حسن شاہ کو اس ترجمے کا ایک نسخہ ہاتھ آگیا تھا۔ تاہم اس روایت کی صحت کی ضمانت دینا ممکن نہیں۔

پیر حسن شاہ کے اسی بیان کے مطابق پانڈووں کی نسل کے ایک فرد ہرن دیو نے گونند دوم کی ملازمت اختیار کی اور ترقی کرتے کرتے بادشاہ کی وزارت کے منصب تک جا پہنچا۔ جیسا کہ اُن دنوں اکثر ہوا کرتا تھا، ہرن دیو نے بوڑھے راجا کو قتل کر کے تخت پر قبضہ کر لیا اور اپنا ایک الگ خاندان قائم کیا۔

رام دیو

اس خاندان کے دوسرے حکمران رام دیو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ بڑا فاتح تھا؛ اس نے پانچ سو کے قریب بادشاہوں کو زیر کیا اور بحیرۂ عرب سے خلیج بنگال تک پورا ہندوستان

اپنے زیرِ نگیں کر لیا۔ اس نے مالِ گزاری کل پیداوار کے دسویں حصے کے حساب سے مقرر کی، جسے اس کے ایک جانشین نے بڑھا کر پانچواں حصہ کر دیا۔

سندر سین

اس سلسلے کے بائیسویں حکمران سندر سین کے عہد میں ایک عظیم زلزلے نے دارالحکومت سندھی مت نگر کے وسط میں زمین کو شق کر دیا اور پورا شہر اپنے بادشاہ اور باشندوں سمیت غرق ہو گیا۔ اس شہر کی جگہ اب وولر (ولر) جھیل ہے۔ اس کے بعد لَو، جو لولاہ یا لولاوَ (موجودہ لولاب) کا سردار تھا—یعنی وہ خوبصورت اور زرخیز، بیضوی شکل کی وادی جو کشمیر کے شمال مشرق میں واقع ہے—بادشاہ منتخب ہوا۔

(ج) موریہ خاندان

اشوک

اگلے بیس بادشاہوں کو، جن کے صرف نام محفوظ ہیں کارنامے نہیں، نظر انداز کر کے ہم اشوک تک آتے ہیں۔ اس کے برخلاف متعدد قیاس آرائیوں کے باوجود مؤرخین کا اس امر پر اتفاق ہے کہ کشمیر کی تاریخ کا اشوک وہی مگدھ کا شہنشاہ اشوک ہے جس نے ۲۷۲ ق م سے ۲۳۱ ق م تک حکومت کی اور جس کی سلطنت مشرق میں بنگال اور مغرب میں ہندوکش تک پھیلی ہوئی تھی۔ اشوک بدھ مت کا پیرو تھا جس نے بہت سے وہار یعنی خانقاہیں اور ستوپ یعنی مقدس گنبد تعمیر کرائے۔ اس نے مذہبی رواداری کی روش اختیار کی اور تمام مذاہب کی سرپرستی کی۔

کشمیر کے اشوک کا زمانی مقام اور نسبی روابط، جیسا کہ کلہن نے بیان کیے ہیں، اسے ہندوستان کے اشوک سے مختلف اور اس سے تقریباً ایک ہزار برس قبل کا فرد ظاہر کرتے ہیں۔ مگر عیسوی نویں صدی سے پہلے کی کلہن کی زمانی ترتیب قطعاً ناقابلِ اعتبار ہے، جب کہ اس کے بیان کردہ نسبی روابط محض بادشاہوں کو ایک ہی سلسلۂ نسب میں پرو دینے کی کوششیں ہیں — سٹائن، کلہن کی راج ترنگنی کے انگریزی ترجمے کا دیباچہ، جلد 1، صفحہ 64۔

اشوک نے اپنی رعایا کو جو عظیم ترین اسباق سکھائے ان میں سے ایک یہ تھا کہ "ہر طرح کی کاہلی پر قابو پاؤ"، اور اس نے خود بھی کبھی کسی محنت سے دریغ نہیں کیا۔ شہنشاہ اشوک کا یہ سراپا اس بیان سے پوری طرح مطابقت رکھتا ہے جو کلہن نے دیا ہے، اگرچہ کلہن کی زمانی ترتیب اس قدر مبہم تھی کہ وہ کشمیری اشوک کو اسی نام کے عظیم ہندوستانی شہنشاہ سے ایک ہزار برس پہلے کے زمانے میں رکھتا ہے۔

شہنشاہ اشوک کی کشمیر پر حکومت اس ملک کی تاریخ کا پہلا عظیم سنگِ میل ہے۔ اس زمانے میں یہاں کا نظم و نسق ایک نائب کے ذریعے چلایا جاتا تھا جس کی حکومت کا صدر مقام ٹیکسلا (پالی میں تکّسِلا یا تکش شِلا) تھا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ ہے جب روم اور قرطاجنہ پیونک جنگوں میں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہونے لگے تھے۔ اشوک نے سری نگر کا اصل شہر موجودہ دارالحکومت سے تقریباً چار میل بالائی جانب اس مقام پر بسایا جہاں اب پران ادھشٹھان (پرانا دارالحکومت) یا پاندریتھن نامی ایک چھوٹا سا گاؤں آباد ہے۔ "اس نے برہمنیت کی زنجیر توڑ ڈالی تھی اور یونان اور مصر سے دوستانہ روابط قائم کر لیے تھے، اور کشمیر میں سنگی فنِ تعمیر اور سنگ تراشی کا آغاز اسی تعلق کا رہینِ منت ہے۔" بدھ مت نے، جو بیک وقت بلند تر اخلاقیات اور دل نشین استدلال پیش کرتا تھا، برہمنوں کی مخالفت

کو بے اثر کر دیا اور تیزی سے پھیل گیا۔ اس نے کشمیری سیرت پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ ہیضے اور زلزلے جیسی قدرت کی سخت ترین آفتوں میں کشمیری جس غیر معمولی صبر کا مظاہرہ کرتا ہے اس کا سراغ صاف طور پر اسی ابتدائی بدھ اثر میں ملتا ہے۔ موجودہ دور کی بیشتر مسلم درگاہوں کی ظاہری وضع بدھ پگوڈوں سے کچھ زیادہ مختلف نہیں، اگرچہ ان کی تمام تفصیلات خالصتاً اسلامی طرز (سراسینی) کی ہیں، جیسا کہ ہم فنِ تعمیر کے باب میں دیکھیں گے۔ بدھ مت وادی میں کلہن کے زمانے تک باقی رہا، جو خود شیو مت کا پیرو ہونے کے باوجود بدھ کا مداح تھا۔

جلوکا کے زمانے میں، جو اشوک کا مبینہ بیٹا اور جانشین تھا، کلہن کے بیان کے مطابق بدھ "طاقتور اور کامرانی کے نشے سے سرشار" تھے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ اشوک ہی نے بدھ مت کو ایک مقامی فرقے کے درجے سے اٹھا کر دنیا کے عظیم مذاہب کی صف میں شامل کیا اور اسی نے کشمیر میں مبلغ بھیجے۔ اگر ہم کلہن کی زمانی ترتیب تسلیم کر لیں تو ہمیں کشمیر کے اشوک کو شہنشاہ اشوک کے زمانے سے کم از کم ایک ہزار برس پہلے رکھنا پڑے گا اور اس مضحکہ خیز زمانی الٹ پھیر میں مبتلا ہونے کا پورا امکان ہے کہ ہم بدھ مت کو اس کے بانی کی پیدائش سے پورے آٹھ سو برس پہلے کشمیر میں داخل کر بیٹھیں — سٹائن، راج ترنگنی کے انگریزی ترجمے کا دیباچہ، جلد اول، صفحہ 64۔ نیز دیکھیے "ارلی ہسٹری آف انڈیا" از وی۔ اے۔ سمتھ (V. A. Smith)، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۱۴ء، صفحہ 164۔ پاندریتھن کا اصل نام پران ادھشٹھان تھا — سٹائن کا راج ترنگنی کا انگریزی ترجمہ، کتاب اول، صفحہ 19۔

جس تالاب میں پاندریتھن کا مندر تعمیر ہوا تھا اس کا پانی اب خشک کر دیا گیا ہے اور اس کی کرسی کی کھدائی کر لی گئی ہے۔ اس کی گنبد نما چھت سنگ تراشی کا عمدہ نمونہ ہے۔ یہ مندر

تقریباً اٹھارہ فٹ مربع ہے اور اس کے آگے کو نکلے ہوئے برآمدے ہیں۔ اسے ۹۲۱ء میں راجا پارتھ نے تعمیر کرایا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

جلوکا

اشوک کے بعد جلوک یا جلوکا تخت نشین ہوا، جسے کلہن — شاید ناموں کی صوتی مماثلت یا یکے بعد دیگرے قریبی جانشینی کی بنا پر — اشوک کا بیٹا قرار دیتا ہے۔ تاہم اس کا نام ہندوستانی تاریخ میں بالکل غیر معروف ہے۔ ممکن ہے وہ کشمیر ہی کا کوئی مقامی بادشاہ رہا ہو۔ ہو سکتا ہے وہ کسی ایسی ہی ناگہانی قوت آزمائی کے ذریعے تخت پر پہنچا ہو جیسی چندر گپت موریہ کی تھی، جس نے سکندرِ اعظم کی واپسی پر مغربی ہندوستان میں پھیلے ہوئے مکمل انتشار اور بدنظمی سے فائدہ اٹھایا اور اس عظیم مقدونی فاتح کی توڑی پھوڑی چھوٹی ریاستوں کے ملبے پر سلطنتِ موریہ قائم کر دی۔

اشوک کے آخری برسوں میں ملک ملیچھوں کے ہاتھوں پریشان رہا — غالباً وسطی ایشیا کے میدانوں کے وہ بے چین منگول قبیلے جو نئی چراگاہوں اور نئے مسکنوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہتے تھے۔ کچھ ہی عرصے بعد شہنشاہ کا مضبوط ہاتھ موت نے اٹھا لیا۔ گرد و پیش کے دشوار گزار علاقے اور پہلے ہی سے بے قابو حد تک پھیلی ہوئی سلطنت کے بکھیڑوں نے شاید اس کے جانشین کو کشمیر کی بازیابی کی کسی کوشش سے باز رکھا۔ بہرحال کشمیر میں بدامنی اور انتشار کا دور دورہ تھا اور وقت اس امر کے لیے سازگار تھا کہ مقامی مہم جو جلوک یا جلوکا غیر ملکی لٹیروں سے زور آزمائی کرے، اور اس میں وہ کامیاب رہا۔ جلوکا ایک ہر دلعزیز ہیرو اور شیو کا پجاری تھا۔ میدان سے تقریباً ایک ہزار فٹ بلند اُس الگ تھلگ پہاڑی پر، جو

تختِ سلیمان کے نام سے معروف ہے اور جسے ہندو شنکر آچاریہ کہتے ہیں (اس کا پرانا نام گوپادری یعنی "گوپا کی پہاڑی" تھا)، پہلی مذہبی عمارت جلوک ہی نے تقریباً ۲۰۰ ق م میں تعمیر کرائی۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ مندر عیسوی چھٹی صدی میں راجا گوپادتیہ نے از سرِ نو تعمیر کرایا۔ جلوک پہلے بدھوں کا مخالف تھا مگر آخرکار ان کا دوست بن گیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے قنوج اور گندھارا فتح کیے اور وہاں سے اہلِ قانون اور دوسرے لوگ لا کر ملک میں آباد کیے۔ کلہن ملک کے نظم و نسق کے بارے میں مفید معلومات فراہم کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ جلوک کے زمانے تک حکومت سات بڑے ریاستی عہدے داروں پر مشتمل تھی — وزیرِ اعظم، قاضی، ناظمِ مالیات، خزانچی، سپہ سالار، پروہت (مذہبی امور کا وزیر) اور نجومی۔ جلوکا نے یہ تعداد بڑھا کر اٹھارہ کر دی، مگر ان کی کوئی تفصیل نہیں ملتی۔

یہ اٹھارہ عہدے دار بظاہر ان اٹھارہ "تیرتھوں" یا درباری عہدے داروں کے مماثل ہیں جن کا ذکر مہابھارت میں آیا ہے — سٹائن کی راج ترنگنی، کتاب اول، شلوک 120 کا حاشیہ، صفحات 22-23۔

دامودر دوم

جلوکا کے بعد دامودر دوم تخت نشین ہوا، جس کے قصے دامودر اُودر کے گرد گھومتے ہیں — سری نگر سے تقریباً آٹھ میل جنوب میں واقع ایک خشک آبرفتی سطحِ مرتفع، جو اس کے شہر گڈسوتھ تک پانی پہنچانے کے لیے بند کا کام دیتی تھی۔ گڈسوتھ اب اسی سطحِ مرتفع پر واقع 476 نفوس کی ایک چھوٹی سی بستی ہے۔ دامودر اُودر پر ایک ہوائی اڈا موجود ہے۔

دامودر کریوہ (دامودر اُودر) کو کلہن دامودر سودا کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ”اُودر“ فارسی لفظ کریوہ (سطحِ مرتفع) کا کشمیری مترادف ہے۔

کیا مسیح کشمیر میں؟ — سندھی متی

”کشیر“ کے اس مرحلے پر، اگرچہ ہماری زمانی ترتیب کلہن سے مختلف ہے، تاہم چونکہ عہد وہی ہے، اس لیے ہم ایک غیر معمولی دلچسپی کے حامل واقعے کے ذکر سے گریز نہیں کر سکتے۔ کلہن کی راج ترنگنی کے دوسرے ترنگ میں ایک شلوک (نمبر 90) ہے جس میں ایک وزیر سندھی متی آریہ راج کا ذکر آتا ہے، جو ”حکما میں سب سے بڑا“ اور جیندر (۶۱ ق م تا ۲۴ء) کا وزیر تھا۔ سر اورل سٹائن اور مسٹر پنڈت دونوں اپنے تراجم میں بیان کرتے ہیں کہ اس نے فقر و فاقہ کی زندگی گزاری، طویل قید بھگتی اور ”سولی پر موت“ پائی، پھر دوبارہ زندہ ہوا اور ”شہریوں کی التجائیں قبول کر کے“ سینتالیس برس کشمیر پر حکومت کی۔ آخر کار یہ سندھی متی سنیاسی ہو گیا، مگر وہ کدھر گیا، اس کا ہمیں کچھ علم نہیں، اور نہ ہی کلہن کی تاریخ اس نکتے پر کوئی روشنی ڈالتی ہے۔ یہ شخص افسانوی نہیں؛ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک تاریخی وجود رکھتا تھا۔

ایک نہایت مستقل روایت چلی آتی ہے — جسے گاہے گاہے ان اتفاقی واقعات سے تقویت ملتی رہتی ہے جنھیں اہلِ قلم کا ایک خاص طبقہ نمایاں کر کے پیش کرتا ہے — کہ حضرت مسیح سری نگر میں مدفون ہیں؛ بعض تو یہاں تک کہتے ہیں کہ وہی حضرت یوز آسف ہیں اور سری نگر کے محلہ خانیار میں ان کی قبر کی نشان دہی کرتے ہیں۔ مگر یوز آسف، جنھیں حضرت موسیٰ کی اولاد میں سے بتایا جاتا ہے، مصر کے فرمانروا کی جانب سے بادشاہ کے دربار میں سفیر

بنا کر بھیجے گئے تھے۔ عربی حروف میں لکھے ہوئے "یوز آسف" کو "بودھی ستوا" بھی پڑھا جا سکتا ہے۔ حضرت مسیح کی ہندوستان آمد کا کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہیں۔

درحقیقت یہ تاریخِ عالم کا ایک عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مسیح کو بھی کسی قدر ویسی ہی حیاتِ نو نصیب ہوئی جیسی سندھی متی کو، اگرچہ یقیناً بعینہٖ ویسی نہیں۔ سندھی متی اور مسیح کے زمانے بھی تقریباً ایک ہی ہیں۔ یہ کہنا کہ سندھی متی خود مسیح ہی کی ذات ہے، ایک نہایت جسارت آمیز دعویٰ ہوگا، مگر یہ حقیقت اپنی جگہ قائم ہے کہ گلیل کے عظیم پیغمبر اور کشمیر کے وزیر میں بعض نمایاں مشابہتیں پائی جاتی ہیں، اور دونوں شخصیتیں ایک ہی عہد میں زندہ رہیں، اگرچہ فلسطین اور کشمیر کی طرح ایک دوسرے سے بہت دور۔ یہ راقم کے لیے یقیناً ایک معما ہے، جیسا کہ قاری کے لیے بھی ہوگا۔

اور ہم اس معاملے کو یہیں چھوڑتے ہیں۔

(د) کُشان خاندان

یوچی

اب ہم یوچیوں کی طرف آتے ہیں، جو ایک ترک نسل تھی۔ انھوں نے وادیٔ آمو (آکسس) میں اپنے قدم جما لیے تھے اور مسیح سے دوسری صدی قبل باختر کی یونانی سلطنت کا تختہ الٹ دیا تھا۔ مغلوب قوم جنوب کی جانب بڑھی اور اس نے پورے شمالی ہندوستان کو فتح کر لیا، جو اس کے قبضے میں اس وقت تک رہا جب تک یوچیوں کی کُشان شاخ نے اسے نیست و نابود نہ کر دیا۔

کدفیسس اول، ۱۵ء

تقریباً ۱۵ء میں یوچی قوم کے کُشان قبیلے کے سردار کدفیسس اول نے یوچی قوم کے تمام دھڑوں کو یکجا کیا اور افغانستان فتح کر لیا۔ اس کے بعد تقریباً ۴۵ء میں اس کا بیٹا کدفیسس دوم اس کا جانشین ہوا، جس نے مشرقی ترکستان کی تسخیر کے لیے ایک لشکر روانہ کیا۔ یہ مہم تباہی پر منتج ہوئی اور وہ چین کو خراج دینے پر مجبور ہو گیا۔ [ونسنٹ اے سمتھ (Vincent A. Smith) کا قیاس ہے کہ چین کے خلاف لڑنے والی افواج کدفیسس دوم کی نہیں بلکہ کنشک کی تھیں — ارلی ہسٹری آف انڈیا، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۱۴ء، صفحہ 253۔] بعد ازاں اس نے بنارس تک شمالی ہندوستان فتح کر لیا۔

کنشک، ۷۸ء

۷۸ء میں کنشک، کدفیسس دوم کا جانشین ہوا اور اس نے اپنی سلطنت کو جنوب میں کوہِ وندھیا اور بالائی سندھ تک وسعت دی۔ اس نے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا، اور یہیں سے ہم اس ملک کی تاریخ میں ایک بار پھر مستند تاریخی ریکارڈ کی ٹھوس زمین پر پہنچتے ہیں۔ وہ بدھ مت کا پیرو تھا اور اس کا دارالحکومت پشاور تھا، جہاں اس کی بعض یادگاروں کے آثار کھدائی میں برآمد ہوئے ہیں۔ اس نے کشمیر میں بے شمار یادگار عمارتیں تعمیر کرائیں اور کنشک پور نامی شہر بسایا، جو بارہ مولہ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر واقع موجودہ گاؤں کانس پور ہے [سٹائن کا کلہن کی راج ترنگنی کا انگریزی ترجمہ، جلد اول، کتاب اول، صفحہ 30، حاشیہ 168]۔ اسی کی سرپرستی میں بدھ مذہب کی تیسری مجلس (کونسل) منعقد ہوئی، جس نے تقریباً ۱۰۰ء میں کشمیر میں ہاروَن کے قریب کھنڈل وَن وہار میں ناگارجن کی صدارت

میں اپنے مباحث جاری رکھے اور شمالی مسلک کا مجموعۂ کتب یعنی "مہایان — قانون کی بڑی سواری" مرتب کیا۔

عظیم بودھی ستوا ناگارجن اسی کے عہد میں شالامار سے اوپر ہاروَن میں مقیم تھا۔ [بعض بدھ روایات کے مطابق شمالی ہندوستان کا باختری بادشاہ مینندر (۱۵۵ ق م) ناگارجن سے مناظروں میں لطف اندوز ہوتا تھا (اینشنٹ انڈیا از آر سی دت (R. C. Dutt)، صفحہ 119)؛ مگر مقامی مؤرخ مینندر کے بارے میں خاموش ہیں۔ حالیہ کھدائیوں سے ہاروَن میں قدیم ترین یادگاروں میں سے ایک برآمد ہوئی ہے، جس میں اپنی نوعیت کے وہ آثار محفوظ ہیں جو پورے ہندوستان میں اور کہیں نہیں ملتے۔ ایک مندر اور چند کتبے دریافت ہوئے ہیں، جن سے یہ یادگار عہدِ کُشان سے متعلق ٹھہرتی ہے، جب کشمیر وسطی ایشیا سے گہرے روابط رکھتا تھا۔ یہ آثار سری نگر کے قریب ہاروَن کے آبی ذخیرے سے صرف چند فرلانگ نیچے واقع ہیں — جموں و کشمیر کی سالانہ انتظامی رپورٹ برائے ۱۹۴۰-۴۱ء، مطبوعہ ۱۹۴۲ء، صفحہ 9۔]

ناگارجن ایک نہایت مشہور بدھ کیمیا گر تھا۔ وہ سرزمینِ ودربھ (برار) میں ایک دولت مند برہمن کے ہاں پیدا ہوا جو برسوں بے اولاد رہا تھا۔ نجومی بلائے گئے تو انھوں نے بتایا کہ بچے کی عمر صرف سات برس ہو سکتی ہے۔ ساتویں برس کے اختتام سے پہلے اس کے والدین نے، تاکہ انھیں بچے کی پیش گوئی شدہ موت کا جانکاہ منظر نہ دیکھنا پڑے، اسے دوسرے مقامات کے سفر پر روانہ کر دیا، یہاں تک کہ وہ نالندہ پہنچا اور آچاریہ راہُل سے ملا۔

نالندہ میں وہ بھکشو بن گیا اور مذہبی علوم کے لیے وقف ہو گیا۔ اس نے برہمنوں کے عقائد کی تردید کی اور نالندہ کے بھکشوؤں کو تعلیم دی۔ ناگ لوگ نوعمر لڑکوں کے بھیس میں اس کے وعظوں میں شریک ہوا کرتے تھے۔ ناگوں کی دعوت پر وہ تین ماہ ان کے مسکن میں

مقیم رہا۔ ناگوں سے انھی روابط کی بنا پر اسے ناگارجن کا نام ملا۔ ایک روایت یہ ہے کہ اس کی ماں نے اسے ارجن نامی درخت کے نیچے جنم دیا تھا؛ چنانچہ ناگ اور ارجن مل کر ناگارجن بن گئے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ناگارجن پوری بدھ کلیسیا کا سربراہ بن گیا۔ اکثر ماخذ اس امر پر متفق ہیں کہ ناگارجن کا عروج عیسوی عہد کی پہلی صدی میں ہوا۔ وہ ان نامور معلموں میں سے ہے جنھیں بودھی ستوا کے مرتبے پر فائز کیا گیا، اور اسی کو مہایان مسلک کا بانی بتایا جاتا ہے، جسے کہا جاتا ہے کہ اس نے تبت میں متعارف کرایا [دی لائف آف ناگارجن فرام ٹبیٹن اینڈ چائنیز سورسز از ایم والیزر (M. Walleser)، پروبستھائن اینڈ کمپنی، لندن]۔

اسے بیک وقت ایک شاعر، فلسفی، طبیب اور نہایت قابل مصنف کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ شاید مختلف ناگارجن ایک ہی شخصیت میں گڈمڈ ہو گئے ہیں۔

کنشک نے کاشغر، یارقند اور ختن فتح کیے، جو اس زمانے میں چین کے باج گزار علاقے تھے۔

ہوِشک، ۱۲۳ء

غالب گمان یہ ہے کہ کنشک کے بیٹے وسشک اور ہوِشک یکے بعد دیگرے نائب السلطنت کے فرائض انجام دیتے رہے، مگر معلوم ہوتا ہے کہ وسشک اپنے باپ کی زندگی ہی میں چل بسا [ونسنٹ اے سمتھ، ارلی ہسٹری آف انڈیا، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۱۴ء، صفحہ 270]، اور ۱۲۳ء میں پوری سلطنت میں کنشک کی جانشینی ہوِشک کو ملی۔

ہوِشک نے ہُشک پور بسایا، جو وہ مولہ یعنی موجودہ بارہ مولہ کے قریب واقع ایک چھوٹا سا گاؤں، موجودہ اُشکر ہے۔ اس کی حکومت تقریباً ۱۴۰ء تک قائم رہی۔

واسودیو یا جُشک، ۱۴۰ء

اس کا جانشین واسودیو ہوا، جسے جُشک بھی کہتے ہیں۔ اس کا انتقال تقریباً ۱۷۸ء میں ہوا اور اسی کے ساتھ کشمیر میں کُشان اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ تاہم یہ خاندان کابل اور پنجاب میں اس وقت تک قائم رہا جب تک پانچویں صدی عیسوی میں ہنوں کی یلغار نے اسے بہا نہ دیا۔ واضح رہے کہ کُشان عہد کی زمانی ترتیب ابھی تک پوری طرح متعین نہیں ہو سکی۔

ابھی منیو اول

جُشک کا جانشین ابھی منیو اول ہوا، جس کے عہد میں کشمیر میں بدھ مت کو زک پہنچی۔

(۵) گوناند خاندان

گوناند سوم

ابھی منیو اول کے بعد گوناند خاندان کا بانی گوناند سوم تخت نشین ہوا۔

نار

گوناند سوم نے برہمن مت کا احیا کیا اور بدھ مت کے خلاف رد عمل کا آغاز ہو گیا۔ اس سلسلے کے چھٹے بادشاہ نار کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے ”ہزاروں وہار (خانقاہیں)“ نذرِ آتش کر دیے۔ اس وقت سے کشمیر میں بدھ مت مسلسل رو بہ زوال رہا۔

(و) سفید ہُن

مہر کل، ۵۲۸ء

اگلے چار بادشاہوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ہم سفید ہُن مہر کل تک آتے ہیں، جس نے ۵۲۸ء میں کشمیر کے تخت پر قبضہ کیا۔ اس کے باپ تورمان کے عہد میں پانچویں صدی کے نصفِ آخر میں افغانستان اور مغربی ہندوستان میں ہنوں کی سلطنت قائم ہو چکی تھی [سفید ہُن یا ہفتالی اصلاً مشرقی ترکستان سے آئے تھے — ارلی ہسٹری آف انڈیا از وی اے سمتھ، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۱۴ء، صفحات 315-16]۔ مہر کل ۵۱۰ء میں تخت نشین ہوا۔ اس کا دارالحکومت پنجاب میں ساکل (چکل) تھا، جسے فلیٹ (Fleet) کے نزدیک سیالکوٹ سے، یا ضلع شیخوپورہ کی سنگلہ پہاڑی سے، یا آنسپاخ (Anspach) کے مطابق پنجاب کے ضلع امرتسر کے جنڈیالہ سے منطبق کیا جا سکتا ہے [جغرافیائی اور صوتی مماثلت کے لحاظ سے چکلہ (یا راولپنڈی کے قریب موجودہ چکلالہ) شاید زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتا ہے]۔ وہ "پرتشدد افعال والا اور موت سے مشابہ آدمی" تھا، جس کی آمد کا حال لوگوں کو "ان گدھوں، کووں اور دوسرے پرندوں کو دیکھ کر معلوم ہو جاتا تھا جو اس کے آگے آگے اڑتے جاتے تھے، تاکہ مقتول ہونے والوں پر شکم سیری کریں۔" اس کے سنگ دلانہ افعال اس قدر قابلِ نفرت ہو گئے کہ دیسی راجاؤں نے ایک اتحاد قائم کیا اور مگدھ کے بالادتیہ اور وسطی ہندوستان کے یشودھرمن کی قیادت میں اسے فیصلہ کن شکست دی۔ مہر کل بھاگ کر کشمیر پہنچا، جہاں بادشاہ نے اس کی خاطر تواضع کی اور اسے ایک چھوٹے سے علاقے کی سرداری سونپ دی۔ اس نے بادشاہ کے احسان کا بدلہ یہ دیا کہ اس کا تخت چھین لیا اور اسے قتل کر ڈالا۔ پھر کشمیر سے نکل کر مہر کل نے گندھارا پر حملہ کر کے اسے فتح کیا اور خلقِ خدا کے

انبوہ دریائے سندھ میں غرق کر دیے۔ کلہن اس کی سفاکی کی سیاہ ترین تصویر کھینچتا ہے کہ وہ شب و روز ہزاروں مقتول انسانوں میں گھرا رہتا تھا۔ مہر کل کو ظلم و ستم میں لذت ملتی تھی، اور لوگ آج بھی پیر پنجال (پیر پنتسال) کے سلسلے میں "علی آباد سرائے" کے قریب ایک چوٹی کی طرف اشارہ کرتے ہیں — ہستی وَنج، ہستی یعنی ہاتھی اور ونج یعنی جانا، ہاتھیوں کی گزرگاہ — جہاں بادشاہ نے محض اپنی تفریح کے لیے ایک سو ہاتھی کھائی میں گرا دیے اور ان کی چیخوں سے لطف اندوز ہوتا رہا [علی آباد سرائے، ہستی ونج سے تقریباً نصف میل اوپر اور سری نگر سے 46 میل کے فاصلے پر، پیر پنجال کے درے کے شمال میں ایک پڑاؤ ہے۔ یہ سرائے، جو مسافروں کو کچھ نہ کچھ قیام کی سہولت دیتی ہے اور ویران و اداس تنہائی میں کھڑی ہے، ایک مغل مسافر خانہ تھی۔ سال کے سرد حصے میں یہ برف میں دبی رہتی ہے اور کوئی ادھر کا رخ نہیں کرتا]۔

وہ برہمنوں پر مہربان تھا اور بدھ مت سے نفرت رکھتا تھا۔ اس نے چھٹی صدی کے وسط کے لگ بھگ خودکشی کر لی؛ غالباً اپنے ہی کرتوتوں کے احساس نے اسے مغلوب کر دیا تھا۔ [پیر پنجال کا درہ سطحِ سمندر سے ۱۱٬۴۰۰ فٹ بلند ہے اور گرد و نواح کی چوٹیاں ۱۶٬۰۰۰ فٹ سے تجاوز کرتی ہیں۔ گلمرگ ان بے شمار کوہستانی مرغزاروں میں سے صرف ایک ہے جو پیر پنجال کے شمالی ڈھلوانوں پر مختلف بلندیوں پر پائے جاتے ہیں۔ کوثر ناگ — کشمیر کی سب سے بڑی پہاڑی جھیل، سطحِ سمندر سے ۱۳٬۰۰۰ فٹ بلند اور دو میل سے زیادہ طویل — پیر پنجال ہی کے سلسلے میں واقع ہے۔ یہ جھیل ہمالیہ کی خوش منظر ترین چوٹیوں میں سے بعض کے حصار میں ہے۔ ان میں سے تین چوٹیاں، جن میں سے ہر ایک تقریباً ۱۵٬۵۰۰ فٹ بلند ہے، کوثر ناگ پر سایہ فگن ہیں۔ جی ٹی وین (G. T. Vigne) اپنے سفرنامے ٹریولز، جلد اول، صفحہ 265 میں لکھتا ہے: "پنجال ایک فارسی لفظ ہے جس کے معنی پہاڑوں کے سلسلے کے

ہیں۔ کشمیری اسے پنسال کہتے ہیں، جس کے صحیح تر معنی اس مقام کے ہیں جہاں مسافروں کے لیے پانی مہیا کیا جاتا ہو۔" فارسی زبان کی نصف درجن مستند لغات سے رجوع کرنے پر وین کے بتائے ہوئے ان معنوں کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ گریئرسن (Grierson) کی کشمیری زبان کی لغت میں بھی وین کے بیان کردہ معنی درج نہیں۔ سٹائن کا کہنا ہے کہ موجودہ لفظ پنتسال کی اصل پنچال ہے (راج ترنگنی، جلد دوم، صفحہ 396)۔ جموں کے حبیب کیفوت نے پیر پنجال پر اپنے اشعار سے کشمیریوں میں وطن پرستانہ جذبات ابھارے ہیں، جن میں سے چند مصرعے یہ ہیں:

تری عظمت تری ھیبت جہاں وطن کی

تری آغوش مس سوے ھن بادل

پادشاہ نامہ میں بھی پیر پنجال کے بارے میں (ملا شاہ لاہوری سے منسوب) فارسی اشعار ملتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ صاف مطلع کے دنوں میں پیر پنجال کے درے کی چوٹی سے لاہور کے مینار دکھائی دیتے ہیں، جو خطِ مستقیم میں 130 میل کے فاصلے پر ہے — برنیئر (Bernier) کے سفرنامے کا وی اے سمتھ کا مرتبہ ایڈیشن، ۱۹۱۴ء، صفحہ 407 کا حاشیہ۔]

کالی داس

خیال کیا جاتا ہے کہ ہنوں کے انھی پُرآشوب زمانوں میں ہندوستان کے عظیم ترین شعرا میں سے ایک، کالی داس، کشمیر میں پیدا ہوا۔ اس کا زمانۂ عروج پانچویں صدی عیسوی کا نصفِ آخر یا چھٹی صدی کا نصفِ اول ہے۔ کالی داس کو یہ زمانہ اس بنا پر دیا جاتا ہے کہ اس نے رگھوونش میں کشمیر میں ہنوں کا ذکر کیا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ کالی داس نے ہنوں کے قبضے

کے ابتری کے دنوں میں کشمیر میں اپنا گھر چھوڑا اور طول و عرضِ ملک کی سیاحت کی، اور غالباً دوسرے مقامات کی نسبت اُجین میں کہیں زیادہ عرصہ قیام کیا۔ [پنڈت لچھمی دھر کے نزدیک درج ذیل نکات اس رائے کے حق میں قوی قرینہ فراہم کرتے ہیں کہ کالی داس کشمیر کا باشندہ تھا: (۱) دھان کے کھیتوں اور ان کھیتوں سے وابستہ گیتوں کا اس کا والہانہ بیان۔ (۲) زعفران کے اُگتے ہوئے پودے کا اس کا بیان، جو کشمیر میں کاشت ہوتا ہے اور جس کا بیان کسی غیر کشمیری مصنف سے منقول نہیں۔ عورتوں کے سینوں کو زعفران کے لیپ سے رنگنے کا وہ رواج، جس کا کالی داس بار بار ذکر کرتا ہے، قدیم کشمیر میں فی الواقع رائج تھا۔ (۳) دیودار کے جنگلوں، جھیلوں، پہاڑی تالابوں، سبزہ زاروں، شیروں والے غاروں اور پہاڑوں کی بلندیوں پر مشک نافوں والے ہرنوں کا اس کا بیان—یہ سب اسی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ کالی داس کا وطن کشمیر تھا۔

مزید یہ دلائل اس امر کی قوی نشان دہی کرتے ہیں کہ کالی داس پیدائشی کشمیری تھا: (۱) کالی داس کشمیر کے بعض ایسے کم اہمیت مقامات کا ذکر کرتا ہے جنھیں حال تک خیالی سمجھا جاتا رہا، مگر جدید تحقیق نے ان مقامات کو ان کے قدیم ناموں کے ساتھ متعین کر دیا ہے۔ یہ مقامات محض مقامی اہمیت کے حامل ہیں اور کسی ایسے شخص کو معلوم نہیں ہو سکتے تھے جو کشمیر سے گہرا تعلق نہ رکھتا ہو۔ یہ مقامات وادیٔ سندھ (سند) میں واقع ہیں۔ (۲) کالی داس شکنتلا میں کشمیر کے بیان کے ضمن میں کشمیر کے جھیل سے برآمد ہونے کی اس روایت کا ذکر کرتا ہے جو کشمیریوں میں عام ہے۔ وہ کشمیر کے لیے اپنی خاص رغبت ظاہر کرتا ہے۔ (۳) بعض ایسے کشمیری قصوں کا حوالہ ملتا ہے، مثلاً نِکمبھ کا قصہ، جو صرف کشمیری مصنفین کو معلوم ہیں۔ (۴) کالی داس کا ذاتی مذہب وہ کشمیری شیو مت تھا جو پرتیہ ابھگیا فلسفے کے عقیدے پر مبنی ہے اور کشمیر سے باہر غیر معروف ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ یہ ایک قابلِ ذکر

دریافت ہے کہ ڈراما شکنتلا کشمیر کے پرتیہ ابھگیا فلسفے کے عقائد کی ایک تمثیل ہے۔ حال ہی میں یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ شکنتلا میں اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ کالی داس کے زمانے میں کہیں پرتیہ ابھگیا فلسفہ موجود تھا، کیونکہ یہ فلسفہ کشمیر میں نویں صدی عیسوی کے نصفِ اول میں وجود میں آیا اور سومانند اس نظام کا بانی تھا۔ تاہم اس میں شک نہیں کہ فکر کا یہ رجحان سومانند کے ہاتھوں مرتب و منظم ہونے سے پہلے پروان چڑھ رہا ہوگا۔ (۵) میگھ دوت کا استدلال بھی کشمیر ہی کو کالی داس کا وطن ٹھہراتا ہے۔ — مہا مہوپادھیائے پنڈت لچھمی دھر، ایم اے، ایم او ایل، شاستری، صدر شعبۂ سنسکرت، دہلی یونیورسٹی، کے مارچ ۱۹۲۵ء میں "کالی داس کی جائے پیدائش" کے موضوع پر دیے گئے یونیورسٹی خطبات۔ یہ خطبات ۱۹۲۶ء میں یونیورسٹی نے کتابی صورت میں شائع کیے۔]

یودھشٹھر اول

گونند سلسلے کا آخری بادشاہ یودھشٹھر اول ایک نکما حکمران تھا۔ اسے خود اس کی رعایا نے نکال باہر کیا اور ایک بیرونی بادشاہ کو بلا لیا، اور بعد ازاں کشمیر اُجینی (اُجین) کے وکرمادتیہ ہرش کی بالادستی میں چلا گیا۔

وکرمادتیہ

تاہم پہلی صدی میں وکرمادتیہ کے وجود کا کتبوں اور سکوں کی صورت میں کوئی ناقابلِ تردید ثبوت موجود نہیں۔ جس سنہ (سمبت) کا اسے بانی مانا جاتا ہے، وہ دسویں صدی عیسوی تک اس کے نام سے موسوم نہیں ہوا تھا۔

پرورسین دوم، ۵۸۰ء

راجہ ہرش کی وفات پر، چھٹی صدی کی تیسری چوتھائی کے لگ بھگ، کشمیر کو مالوہ کے ایک شہزادے پرورسین دوم نے فتح کیا، جس کا عہد ۵۸۰ء کے آس پاس بتایا جاتا ہے۔ (پرورسین اول دراصل کرشٹھ سین عرف تنجینہ دوم ہے، جس کے متعلق روایت ہے کہ اس نے ۸۸ ق م سے ۵۸ ق م تک تیس برس حکومت کی۔) موجودہ شہر سری نگر، جو اس کے نام پر پرورپورہ اور بعد ازاں پاندریتھن کہلایا، اسی کا بسایا ہوا ہے۔ کلہن کے تیسرے ترنگ کے شلوک 354 کے مطابق اسی بادشاہ نے کشمیر میں پہلی بار کشتیوں سے بنا ہوا ”عظیم پل“ تعمیر کرایا۔

[سری نگر، یعنی شاہی شہر، اس شہر کا قدیم اور موجودہ نام ہے۔ مسلم عہدِ حکومت میں یہ ”کشمیر“ یا مقامی تلفظ میں ”کشیر“ کہلاتا تھا، چنانچہ البیرونی اسی مناسبت سے لکھتا ہے کہ ”شہرِ کشمیر چار فرسخ کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے“ (سچاؤ (Sachau)، جلد اول، صفحہ 207)۔ لیکن جب ۱۸۱۹ء میں سکھوں نے کشمیر پر قبضہ کیا تو انہوں نے پرانا نام سری نگر بحال کر دیا، جس کی اصل ”شری نگر“ یا ”شری نگری“ ہے، اور جو کلہن کے بیان کے مطابق موجودہ شہر کے قریب ایک مقام پر اشوک نے بسایا تھا۔ موجودہ شہر کی جگہ کا انتخاب پرورسین دوم نے کیا، جس نے اسے پرورسین پورہ کا نام دیا جو مختصر ہو کر پرورپورہ ہو گیا۔ ”نگر“ کے معنی شہر کے ہیں

* ”دی ڈاکٹرین آف ری ٹگنیشن“ (مخطوطہ)، از آر کے کاؤ (R. K. Kaw)، ایم اے۔

اور "شری" دیوی للکشمی کا نام ہے، جس سے دولت، حسن یا اقتدار مراد لی جا سکتی ہے۔ یہاں "شری" سے سوریہ یعنی سورج مراد نہیں، اور سری نگر کو "شہرِ آفتاب" کہنا ایک غلطی ہے۔

سری نگر کا رقبہ چار میل طول اور دو میل عرض پر مشتمل ہے۔

یہ شہر وادیِ کشمیر کے تقریباً وسط میں واقع ہے اور دریائے جہلم کے دونوں کناروں پر پھیلا ہوا ہے، جس پر سات پل بنے ہوئے ہیں۔ دریا اوسطاً اسّی گز کی چوڑائی کے ساتھ بل کھاتا ہوا شہر میں سے گزرتا ہے۔ شہر کا بیشتر حصہ دائیں کنارے پر واقع ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ یہاں کوئی دو عمارتیں ایک جیسی نہیں۔ شہر سطحِ سمندر سے ۵۲۵۰ فٹ بلند ہے۔

اس بلندی کے باوجود جولائی اور اگست کے مہینے گرم اور قدرے مرطوب ہوتے ہیں، البتہ بہار اور خزاں کے موسم نہایت خوشگوار ہوتے ہیں۔ اوسط درجۂ حرارت جنوری میں ۳۵ درجے اور جولائی میں ۸۰ درجے رہتا ہے۔

سالانہ بارش شاذ و نادر ہی ۲۷ انچ سے متجاوز ہوتی ہے۔

۱۹۳۱ء کی مردم شماری کے مطابق سری نگر کی آبادی ۱٬۷۳٬۵۱۳ تھی، جس میں ۱٬۳۸٬۷۶۴ مسلمان، ۳۳٬۶۷۰ ہندو، ۸۷۰ سکھ، ۲۵۷ عیسائی، ۵ بدھ، ۴ زرتشتی اور ۳ جینی تھے۔
۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں سری نگر کی آبادی ۲٬۰۷٬۷۸۷ درج ہے، یعنی گزشتہ دس برسوں میں ۳۴٬۲۱۴ نفوس یا ۱۹٫۷۱ فیصد کا اضافہ ہوا۔

سری نگر وسطِ ایشیا کے تجارتی راستوں میں سے ایک کا آخری پڑاؤ ہے۔ اکثر قدیم دار الحکومتوں کی طرح یہ شہر بھی مختلف زمانوں میں اور مختلف مقامات پر بار بار بسایا اور از سرِ

نو تعمیر کیا گیا ہے۔ ”سری نگر کے مضافات اپنی دستار پوش مسلم قبروں، فطرت کی سرسبز فراوانی اور فن کی خستہ حال مفلسی کے ساتھ قسطنطنیہ کے مضافات کی یاد دلاتے ہیں، مگر جوں جوں آپ شہر کے قریب پہنچتے ہیں یہ خیالی مشابہت گھٹتی چلی جاتی ہے۔ شہر میں داخل ہونے کے لیے آپ کسی شاہی فصیل یا عظیم الشان دروازوں سے نہیں گزرتے، بلکہ رفتہ رفتہ مکانات ایک دوسرے سے سمٹتے چلے جاتے ہیں اور آخرکار ایک ایسی گلی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جو اتنی تنگ، گندی اور پتھریلی ہے کہ استنبول کی خواب آلود یادیں پھر تازہ ہو جائیں، اور جا بجا کوئی بلند خد و خال والا چہرہ اور شاندار قامت، کشادہ دستار اور ڈھیلے چغے میں ملبوس، پاس سے گزر کر اس فریبِ نظر کو قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ مگر اب آپ کے دائیں ہاتھ مکانوں کی دیوار میں ایک شگاف سے تاریک اور آلودہ راہ گزر پر گرم روشنی کی ایک دھار آ پڑتی ہے، اور اس میں سے آپ کو قریب ہی نہ تو پُرفضا باسفورس کا کشادہ سینہ دکھائی دیتا ہے اور نہ گولڈن ہارن کا پُرہجوم پانی، بلکہ ایک سست رَو دریا نظر آتا ہے جو دھوپ میں چمک رہا ہے اور چھوٹی بڑی ہر قسم کی کشتیوں سے ڈھکا ہوا ہے؛ کچھ بھاری لدے ہوئے بجرے آہستہ آہستہ بانسوں کے زور پر دھارے کے مخالف کھیے جا رہے ہیں، جب کہ ہلکی ساخت کی دوسری کشتیاں آدھ درجن چپوؤں کی تیز ضربوں سے شادمانی کے ساتھ پھسلتی چلی جاتی ہیں—یہ ایک مصروف منظر ہے۔

اور دریا کے دوسرے کنارے پر آپ کو گویا آئینے میں اسی کنارے کا عکس دکھائی دیتا ہے جس پر آپ کھڑے ہیں—وہی مکانات، وہی گھاٹ، وہی لوگ—کیونکہ یہ دریائے جہلم ہے جس پر آپ کی نظر ہے، اور اس کے دائیں اور بائیں دونوں کناروں پر دارالحکومتِ کشمیر یعنی سری نگر کی گنجان آبادیاں کھڑی ہیں۔“ (کرنل ٹورنس (Col. Torrens) کا سفرنامہ، صفحات 246-47)۔ لیکن آج کا سیاح استنبول اور سری نگر میں بہت بڑا فرق پائے گا۔

استنبول سمٹ گیا ہے جب کہ سری نگر خاصا پھیل گیا ہے۔ استنبول یورپی رنگ میں رنگا جا چکا ہے؛ سری نگر بھی بدلا ہے مگر اپنی اصل میں اب بھی ایشیائی ہے۔

مائسمہ وہ جزیرہ ہے جو تسونت کول نہر سے بنتا ہے۔ ایک زمانے میں اسے یورپی محلہ کہا جاتا تھا، کیونکہ ریزیڈنسی، ہوٹل، کلب، ڈاک و تار کے دفاتر اور سری نگر کی بعض یورپی دکانیں اور بینک یہیں واقع تھے۔]

بالادتیہ

سفید ہونوں کا یہ خاندان تقریباً نصف صدی تک قائم رہا؛ اس سلسلے کا آخری فرمانروا بالادتیہ لاولد فوت ہوا۔

کرکوٹا خاندان: درلبھ وردھن، ۶۲۷ء–۶۶۳ء

تخت بالادتیہ کے داماد درلبھ وردھن کو منتقل ہوا، جو ادنیٰ حسب نسب کا آدمی تھا اور جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ناگ کا بیٹا تھا۔ اس کا خاندان مار پرستی یعنی سانپ کی پوجا میں منہمک تھا، جو قدیم ترین زمانے سے کشمیر کا رائج مذہب چلا آتا تھا (الیگزینڈر کننگھم (Alexander Cunningham) کی ”دی اینشنٹ جیوگرافی آف انڈیا“، صفحہ 92)۔ وہی ناگ یا کرکوٹا خاندان کا بانی ہوا۔ [کرکوٹا کا لفظ بطور اسمِ صفت مختلف پودوں پر دلالت کرتا ہے؛ یہ ایک غالباً غیر آریائی قبیلے کے نام کے طور پر بھی ملتا ہے۔ ناگ نام ”کرکوٹا“ اور لفظ ”چرکوٹا“ میں غالباً کوئی تعلق ہے، جو اتھرو وید میں کسی قسم کے زہریلے سانپ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ رزمیہ ادب میں پائی جانے والی بڑے ناگوں کی فہرستوں میں ناگ راج

کرکوٹک کو معزز مقام حاصل ہے۔ وہی اس شاہی خاندان کا جدِ امجد ہے۔ نیپال کی سلطنت میں کرکوٹا عوامی پوجا اور روایت میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے اور نیپال کے ناگوں میں سب سے مقدم سمجھا جاتا ہے۔ متھرا کے گرد و نواح کا علاقہ کبھی ناگ پرستش کا بہت بڑا مرکز رہا ہو گا۔ وسطی صوبوں کے جنوب مشرقی گوشے کی باج گزار ریاست بستر پر ایک ناگ خاندان حکمران ہے۔ اسی صوبے کے بیشتر گونڈ سردار ناگ ونش سے اپنے نسب کے مدعی ہیں۔ بنگال کے کائستھوں کی ایک ذات اپنی اصل ایک ناگ راجا سے بیان کرتی ہے۔ آسام کی وادیِ سرما کے ایک ضلعے کا نام ناگا پہاڑیاں ہے۔ ہند بعید میں ہمیں ایسے شاہی قبیلے ملتے ہیں جن کے متعلق اعتقاد ہے کہ وہ ایک ناگن جدہ کی اولاد ہیں۔ ناگن جدہ کی یہ کہانی اقصائے مشرق میں چین اور جاپان تک پھیلی ہوئی ہے۔ ناگا فلپائن کے جزیرے لوزون کے صوبے کیمرینس سور کے صدر مقام کا نام بھی ہے۔

1۔ ان بڑے شاہی خاندانوں کی مانند جو اپنا نسب سورج یا چاند سے ملاتے ہیں۔ جاپان کا مکادو اس کی ایک جدید مثال ہے۔

2۔ ”انڈین سرپنٹ لور، آر دی ناگاز اِن ہندو لیجنڈ اینڈ آرٹ“، از جے پی ایچ فوگل (J. Ph. Vogel)، پی ایچ ڈی، پروفیسر سنسکرت و ہندوستانی آثارِ قدیمہ، جامعہ لائیڈن، ہالینڈ، سابق سپرنٹنڈنٹ آرکیالوجیکل سروے آف انڈیا — آرتھر پروبستھین، لندن، ۱۹۲۶ء، صفحات 15-214۔

بدھ مت اور برہمنی روایات دونوں میں ناگوں کی جو غیر معمولی اہمیت ہے اس کا عکس سنگ تراشی اور مصوری کے فن میں بھی ملتا ہے۔ اجنتا کے دیواری نقوش میں ناگوں کی متعدد تصویریں موجود ہیں۔

ناگ پرستش کی اصل اور معنویت کے بارے میں آرا میں نہایت نمایاں اختلاف پایا جاتا ہے۔ جیمز فرگوسن (James Fergusson) کے نزدیک ناگ اصلاً سانپ نہیں بلکہ سانپ کے پجاری تھے — تورانی نسل کی ایک قدیم قوم، جو شمالی ہندوستان میں آباد تھی اور جسے آریاؤں نے مغلوب کر لیا۔ ڈاکٹر سی ایف اولڈھم (C. F. Oldham) کی رائے ہے کہ ناگ اپنے آپ کو سورج کی اولاد کہتے تھے اور پھن دار سانپ ان کا قبائلی نشان (ٹوٹم) تھا۔ اس کے بقول تکش شلا (ٹیکسلا) ناگ قوم کا صدر مقام تھا اور تکشک ان کے سرداروں میں سے ایک تھا۔

ناگ کسی نہ کسی صورت شیو مت کے ساتھ بھی خلط ملط ہو گیا ہے۔ تصور یہ ہے کہ شیو اپنے زیوروں کے لیے ناگوں یعنی سانپوں کا محتاج تھا۔ اور یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ جنوبی ہند کا شیو مت شمالی ہندوستان کی طرف منتقل ہوا اور جنوب میں اپنے بقایا ناگروں یا نائروں کی صورت میں چھوڑ گیا۔ ناگ قبیلے کی ہندوستان کے مختلف حصوں میں طاقتور سلطنتیں قائم تھیں، جس کی شہادت ملک کے کئی حصوں میں ناگ پور نامی اہم شہروں کے ناموں سے ملتی ہے۔ ("دی اوریجن آف شیوازم"، از کے آر سبرامنین (K. R. Subramanian)، ایم اے، جامعہ مدراس، ۱۹۲۹ء)۔

خیال کیا جاتا ہے کہ کشمیر کا درلبھ وردھن فی الحقیقت اسی ناگ کرکوٹک کی نسل سے تھا جس کا ذکر ابتدائی سطور میں آیا ہے۔]

کرکوٹا خاندان کے قیام کے ساتھ ہم نسبتاً مستند تاریخ کی ٹھوس زمین پر قدم رکھتے ہیں۔ درلبھ وردھن نے ۶۲۷ء سے ۶۶۳ء تک حکومت کی۔ چینی زائر یوان چوانگ (ہیون تسانگ) کی کشمیر آمد (۶۳۱ء–۶۳۳ء) اسی بادشاہ کے عہد میں ہوئی، جس نے زائر کا پُرتپاک خیر مقدم

کیا۔ ہیون تسانگ "پورے دو برس ایک معزز مہمان کی حیثیت سے وادی میں مقیم رہا۔ یہ دو سالہ قیام اس کسی بھی پڑاؤ سے طویل تر تھا جس کی اجازت اس متقی سیاح نے سارے ہندوستان اور وسطِ ایشیا میں اپنی سولہ سالہ سیاحت کے دوران خود کو دی۔ اس عظیم چینی زائر کے سفری بیانات میں کشمیر کا وہ سب سے مفصل اور سب سے صحیح بیان محفوظ ہے جو اس عہد میں کسی غیر ملکی قلم سے ہم تک پہنچا ہے۔" اہلِ کشمیر کے متعلق ہیون تسانگ کا بیان یوں ہے: "یہ لوگ سبک مزاج اور غیر سنجیدہ ہیں، اور کمزور و بزدل طبیعت رکھتے ہیں۔ صورت کے اچھے ہیں مگر عیاری کی طرف مائل ہیں۔ علم سے محبت رکھتے ہیں اور خوب تعلیم یافتہ ہیں۔"

1۔ "ٹری اینڈ سرپنٹ ورشپ"، ۱۸۷۳ء۔

2۔ "دی سن اینڈ دی سرپنٹ"، ۱۹۰۵ء۔ 3۔ اس نام کی نصف درجن سے زائد صورتیں ملتی ہیں۔

4۔ ڈاکٹر سٹائن (Dr. Stein) کی "دی اینشنٹ جیوگرافی آف کشمیر"، صفحہ 14۔

بدھ مت کی اشاعت اور ارتقا کی تاریخ میں کشمیر نہایت اہم اور مشہور ترین سرزمینوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس مذہب کے لٹریچر میں دار الحکومت اور بالعموم اس ملک کا ذکر بار بار مدح و ستائش کے کلمات میں ملتا ہے۔ لیکن ہیون تسانگ نے دیکھا کہ "یہ سلطنت مذہب کی زیادہ پابند نہیں، اور بدعقیدوں کے مندر ہی ان کا واحد دھیان ہیں۔" ملک خوشحال اور پُرامن تھا۔ کشمیر کا سیاسی اقتدار مغرب اور جنوب کے تمام ملحقہ علاقوں تک پھیلا ہوا تھا، جن میں راجہ پوری (راجوری)، پرنوتسہ (پونچھ)، بھمبر، اُرشا (ہزارہ)، تکش شلا (ٹیکسلا) اور سنگھ پورہ شامل تھے، اور اس آخر الذکر میں بظاہر کوہستانِ نمک بھی شامل تھا۔

درلبھک، ۶۶۳ء–۷۱۳ء

درلبھ وردھن کا بیٹا اور جانشین درلبھک یا پرتاپ آدتیہ دوم تھا۔ ضمناً یہ ذکر مناسب ہے کہ پرتاپ آدتیہ اول (۱۶۹ ق م–۱۳۷ ق م) راجہ وکرمادتیہ کا رشتہ دار تھا، اور کہا جاتا ہے کہ اسے کشمیر کے ناراض وزیر باہر سے لائے تھے۔ درلبھک نے ۶۶۳ء سے ۷۱۳ء تک پچاس برس حکومت کی۔ ”یہ مغرب کی جانب چینی پیش قدمی کا زمانہ تھا، جس میں ترکستان اور مغربی تبت فتح کر کے ‘آسمانی’ سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔“ [ستمبر ۱۹۴۲ء میں ریاست جموں و کشمیر کے محکمۂ آثارِ قدیمہ نے تاپر—قدیم پرتاپ پورہ، جو پرتاپ آدتیہ دوم کا بسایا ہوا ہے—میں کھدائیاں شروع کیں جو جاری ہیں۔ گاؤں تاپر سری نگر سے ۲۲ میل کے فاصلے پر، یعنی پٹن سے ۴ میل نیچے واقع ہے۔ کھدائی میں ایک مندر کی بنیاد، اس کے دروازے، اس کے صحن اور احاطے کی دیوار کی کرسی کے کھنڈر دریافت ہوئے ہیں۔ تعمیری مواد پتھر کے ایسے بڑے بڑے تختے ہیں جیسے اس عہد کے دوسرے مندروں میں عام ملتے ہیں۔ مندر وشنو کے لیے وقف ہے۔ دروازے کی غالباً کارنس کی چنائی کے بعض پتھروں پر شاردا رسم الخط میں کندہ سنسکرت کتبے کے ٹکڑوں کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس تعمیر کا کسی نہ کسی طور ایک برہمن، گگّھ کے بیٹے، سے تعلق ہے، اور معمار کا نام لکشمن درج ہے۔ کتبے میں بعد کی تواریخ کے منادیو (پرمانند دیو) یا پرمانو دیو (جے سنگھ کے بیٹے) کے عہد کا جو حوالہ آیا ہے اس سے زمانہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ ”مندر اور بیرونی احاطہ دونوں اندرونی اور بیرونی اعتبار سے مربع نقشے پر ہیں۔ پتھر کے مواد کی ضخامت، اسلوب کی سادگی اور تراش خراش کی نفاست میں یہ کشمیر کے دوسرے تمام مندروں سے مشابہ ہے۔“ کلہن پرتاپ پورہ

شہر کی بنیاد کا ذکر کرتے ہوئے پرتاپ آدتیہ کے کسی مندر کی تعمیر کے بارے میں کچھ نہیں کہتا۔ — نوٹ از پنڈت مدھوسودن کول، سپرنٹنڈنٹ آثارِ قدیمہ، سری نگر]

* ”یوان چوانگز ٹریولز اِن انڈیا (۶۲۹ء–۶۴۵ء)“، از تھامس واٹرس (Thomas Watters)، مرتبہ رائس ڈیوڈز (Rhys Davids) و ڈبلیو بشیل (W. Bushell) — رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن، ۱۹۰۴ء، صفحہ 264۔

چندراپیڈ، ۷۱۳ء–۷۲۱ء

درلبھک کا بیٹا چندراپیڈ ۷۱۳ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے شہنشاہِ چین کے دربار میں ایک سفارت بھیجی اور اسی سے خلعتِ شاہی حاصل کر کے شہنشاہ کا باج گزار بن گیا۔

تاراپیڈ، ۷۲۱ء–۷۲۵ء

۷۲۱ء میں اس کا چھوٹا بھائی تاراپیڈ اس کا جانشین ہوا، جس نے چار برس کی ظالمانہ حکومت کے بعد ۷۲۵ء میں اپنے دن پورے کیے۔

للتادتیہ مکتاپیڈ، ۷۲۵ء–۷۵۳ء

اس کے بعد پرتاپ آدتیہ کے سب سے چھوٹے بیٹے للتادتیہ مکتاپیڈ کی شان دار حکمرانی کا زمانہ آیا۔

وہ عظیم فتوحات کا ہیرو ہے۔ کلہن اسے ایک ایسا عالمگیر فرمانروا دکھاتا ہے جو سورج کی طرح زمین کے گرد گردش کرتا ہے۔ اس نے یقیناً پنجاب کے بعض حصے مسخر کیے اور ۷۴۰ء

میں کنیا لبج (قنوج) کے یشوورمن کو شکست دے کر تخت سے اتارا۔ وہ مشہور شاعر بھوبھوتی کو بھی، جو ودربھ (برار) کا باشندہ تھا، اپنے دربار میں لے آیا۔ اس سے قبل وہ بلتستان کے بھوٹوں کے خلاف ایک کامیاب مہم کی قیادت کر چکا تھا، جنہیں اس نے دریائے سندھ کے کناروں پر شکست دی۔ ۷۳۳ء میں اس نے چینی شہنشاہ ہسوان تسنگ (۷۱۸ء–۷۵۵ء) کے دربار میں سفارت بھیجی تاکہ "تبتیوں پر اپنی فتوحات" کی اطلاع دے اور ساتھ ہی ولر جھیل کے کنارے چینی فوجوں کی ایک چھاؤنی کے قیام کی درخواست کرے۔ مکتاپیڈ نے چینی شہنشاہ سے ان عربوں کے خلاف بھی مدد چاہی جو سندھ اور ملتان میں اپنے مرکز سے پیش قدمی کر رہے تھے اور جن کا ذکر تاریخِ کشمیر کے سلسلے میں ہمیں پہلی بار ملتا ہے۔ [عیسوی سنہ ۷۳۳ء ہجری سنہ ۱۱۵ھ کے مطابق ہے۔] لیکن "خاقانِ الٰہی" نے بس اس قدر اکتفا کیا کہ سفیر کی شان دار ضیافت کا حکم دیا اور مکتاپیڈ کو بادشاہ کے خطاب سے سرفراز کر دیا۔ جالندھر، کانگڑہ اور پونچھ کے سردار مکتاپیڈ کے باج گزاروں میں شامل تھے۔ وہ تاریخِ کشمیر کی سب سے نمایاں شخصیت ہے۔ اس نے اپنے ملک کو عظمت کی اس بلندی تک پہنچایا جہاں وہ پہلے کبھی نہیں پہنچا تھا۔ اننت ناگ یا اسلام آباد سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر مارتنڈ کے مندر کے کھنڈر، اور سری نگر سے چودہ میل دور اس کے بسائے ہوئے شہر پری ہاس پورہ کے آثار، اس کی عظمت کی بلیغ شہادت دیتے ہیں۔ 1۔ "ارلی ہسٹری آف انڈیا"، از وی اے سمتھ (V. A. Smith)، تیسرا ایڈیشن، ۱۹۱۴ء، صفحہ 372۔ 2۔ "اینشنٹ انڈیا"، از آر سی دت (R. C. Dutt)، صفحات 149-150۔ 3۔ "دی اینشنٹ جیوگرافی آف انڈیا"، از میجر جنرل الیگزینڈر کننگھم، ٹریوبنر اینڈ کمپنی، لندن، ۱۸۷۱ء، صفحہ 90۔

مارتنڈ کا مشہور و معروف مندر اپنے حجم و وسعت کے اعتبار سے کشمیر کے تمام موجودہ مندروں سے کہیں زیادہ پُرشکوہ ہے؛ اس کا طول ۶۳ فٹ ہے، اور مندر کے گرد ستون دار صحن ۲۲۰ فٹ لمبا اور ۱۴۲ فٹ چوڑا ہے۔ اس کی سنگ تراشی فی الواقع نہایت عمدہ ہے۔ سیاح جی ٹی وین (G. T. Vigne) لکھتا ہے: ”ایک تنہا کھنڈر کی حیثیت سے یہ عمارت اپنی منفرد اور عظیم الشان ہیبت کے باعث اس امر کی مستحق ہے کہ اسے نہ صرف کشمیر میں اپنی نوع کا اوّلین کھنڈر شمار کیا جائے بلکہ عہدِ قدیم کے ان تعمیراتی آثار میں، جو دنیا کے کسی بھی ملک میں دیکھے جا سکتے ہیں، اسے شریف ترین یادگاروں میں جگہ دی جائے۔“ ایک اور رائے — جو سر فرانسس ینگ ہسبنڈ (Sir Francis Younghusband) کی کتاب ”کشمیر“ (۱۹۱۷ء، صفحہ 115) میں ملتی ہے — یہ ہے کہ اس عمارت میں کچھ تو مصری مندر کی سی صلابت و قوت ہے اور کچھ یونان کی سی لطافت۔ اگرچہ یہ ہندو مندر ہے، مگر عام ہندو طرزوں سے مختلف ہے، اور امتیازی طور پر کشمیری طرز کہلاتا ہے اور گندھارا کے اثرات کا بہت حد تک رہینِ منت ہے۔ تاہم یہ قطعی طور پر ہندو عبادت گاہ ہے، نہ بدھ نہ جین؛ جب کہ اس کی مجسمہ سازی، مارشل (Marshall) کے بقول، گپت عہدِ متاخر کے مخصوص ہندو فن سے گہرا ربط ظاہر کرتی ہے۔ مارتنڈ کا یہ عظیم سورج مندر کشمیر کے بعد کے تمام برہمنی مندروں کے لیے نمونہ قرار پایا۔ مکتاپیڈ کے احکام کے تحت نکاسیِ آب کے وسیع کام بھی انجام دیے گئے،

اور بڑے بڑے رقبے حاصل کر کے قابلِ کاشت بنائے گئے۔ مکتاپیڈ نے درباری عہدوں کی تعداد — جو جلوک کے عہد میں ۱۸ تھی — بڑھا کر ۲۳ کر دی؛ پانچ نئے عہدے یہ تھے: میر مجلسِ اعلیٰ، وزیرِ امورِ خارجہ، میر آخور، داروغۂ خزانہ اور میر کارِ اعلیٰ۔ اس کا انجام پردۂ اسرار میں پوشیدہ ہے۔ غالباً وہ شمال کی جانب کسی مہم کے دوران فوت ہوا۔

اپنی آخری مہم میں مصروف ہونے کے زمانے میں مکتاپیڈ نے فنِ حکمرانی سے متعلق ایک طرح کا ہدایت نامہ جاری کیا۔

اس نے اپنی کشمیری رعایا کو باہمی نفاق سے، اور قلعوں کی مرمت اور رسد کے معاملے میں غفلت برتنے سے خبردار کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ کوہستانی باشندوں کو گاہے گاہے سزا دیتے رہنا چاہیے تاکہ وہ طاقتور اور فتنہ انگیز نہ بننے پائیں۔ ”پوری احتیاط برتی جائے کہ دیہاتیوں کے پاس ایک برس کے صرف سے زائد غلہ نہ چھوڑا جائے، اور نہ ان کے کھیتوں کی زراعت کی ضرورت سے زیادہ بیل۔ کیونکہ اگر وہ زیادہ دولت جمع رکھیں گے تو ایک ہی برس میں نہایت زبردست ڈامر یعنی جاگیردار بن جائیں گے اور اتنے طاقتور ہو جائیں گے کہ بادشاہ کے احکام کو خاطر میں نہ لائیں۔“

کاشتکار کا معیارِ زندگی شہری باشندوں سے لازماً پست رہنا چاہیے۔ عہدے خاندانی گروہوں کے قبضے میں نہ ہوں، اور فوج کسی ایک ہی ضلعے سے بھرتی نہ کی جائے۔ للتادتیہ کی حکومت ۷۵۳ء میں ختم ہوئی اور اس کے بعد چار مختصر عہدِ حکومت آئے۔

وجرادتیہ

تاریخِ کشمیر میں مسلمانوں کا ذکر دوسری بار اس وقت آتا ہے جب کلہن، للتادتیہ مکتاپیڈ کے چھوٹے بیٹے اور دوسرے جانشین وجرادتیہ — جو بپّیک کے نام سے بھی معروف ہے — کے بارے میں بیان کرتا ہے کہ اس نے بہت سے آدمی ملیچھوں یعنی مسلمانوں کے ہاتھ فروخت کیے اور ملک میں ایسے طور طریقے رائج کیے جو ملیچھوں یعنی مسلمانوں کے شایاں تھے۔ [سٹائن (Stein) کا بیان ہے کہ ڈامر کی اصطلاح کلہن کی تواریخ میں کثرت سے آتی

ہے، اور جن اشخاص پر اس کا اطلاق ہوتا ہے وہ بیانیے کے آخری حصوں میں نمایاں کردار ادا کرتے ہیں۔ لفظ ڈامر، جس معنی میں یہ راج ترنگنی اور بعد کی تواریخ میں استعمال ہوا ہے، کشمیر سے باہر اب تک کہیں نہیں ملا۔ تاریخِ کشمیر کے ہندو عہد میں ڈامر سے مراد خوش حال زمیندار اشرافیہ یا جاگیردار امرا ہیں۔ رنجیت ایس پنڈت (Ranjit S. Pandit) اضافہ کرتا ہے: کشمیر کے یہ امرا یا دیہی اشرافیہ سماجی درجہ بندی میں راجپوتروں کے برابر نہ تھے، پھر بھی کلہن ان کے باہمی رشتوں ناتوں کی، اور ڈامروں اور کشمیر کے حکمران خاندان کے درمیان مناکحت کی مثالیں بیان کرتا ہے۔ ہر وہ شخص ڈامر بن سکتا تھا جو "بظاہر ایک خوش حال کاشتکار کی حیثیت سے آغاز کرتا تھا۔ وہ وقت گزرنے کے ساتھ ایسا طاقتور جاگیردار بن سکتا تھا جو بادشاہ کے پہلو کا کانٹا بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔" کلہن ان کے لیے لاوئیہ کی اصطلاح بھی استعمال کرتا ہے۔ ہرش کی ڈامروں کو کچلنے کی کوششیں خود اس کی حکومت اور جان کے خاتمے پر منتج ہوئیں۔ موجودہ کشمیر میں ڈار اپنا نسب انہی ڈامروں سے بیان کرتے ہیں۔]

جیاپیڈ، ۷۵۱ء–۷۸۲ء

اب للتادتیہ مکتاپیڈ کے پوتے جیاپیڈ کی اکتیس برس کی طاقتور حکومت کا ذکر آتا ہے، جو ۷۵۱ء میں تخت نشین ہوا۔ اس نے وادیِ گنگا کی طرف فتوحات کی مہم کی اور وہاں قنوج کے راجا کو شکست دی۔

تاہم اسے جلد واپس لوٹنا پڑا کیونکہ اس کی غیر حاضری میں اس کے برادرِ نسبتی نے تخت پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ بادشاہ علم و فضل کا فیاض سرپرست تھا اور بہت سے شعرا اور اہلِ علم

اس کے دربار میں جمع ہو گئے تھے۔ اس نے موجودہ سمبل کے قریب جیاپور اندرکوٹ کا قصبہ آباد کیا۔ اپنے عہدِ حکومت کے

آخر میں وہ ایک ظالم اور حریص جابر بن گیا۔ اس کا سبب سٹائن نے بیان نہیں کیا، لیکن پنڈت بربل کاچرو کی روایت — رانی کی ایک برہمن نوجوان سے محبت، دونوں کی ملاقات، اور شوہر کی غیر موجودگی میں گناہ کے خوف سے رانی کا بالآخر خود سوزی کر لینا، اور جیاپیڈ کا وہ غیظ و غضب جس نے اسے اپنی رانی کے المیے کا انتقام برہمنوں کے قتل سے لینے پر اکسایا — اس خلا کو پُر کرتی ہے جس کی سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein) نے کوئی توضیح نہیں کی۔ (یہ روایت پنڈت بربل کاچرو کی مختصر التواریخ میں ملتی ہے، جو کشمیر کے ایک سکھ گورنر کرنل مہان سنگھ کے زمانے میں لکھی گئی؛ قلمی نسخہ، اوراق 42-44۔) جیاپیڈ کے بعد ۷۹۵ء میں ایک کاہل اور فضول خرچ شہزادہ تخت نشین ہوا جس نے بارہ برس کی حکومت میں اپنے باپ کی جمع کی ہوئی دولت اڑا دی۔

اونتی ورمن، ۸۵۵ء–۸۸۳ء

اگلی نصف صدی کی تاریخ کٹھ پتلی بادشاہوں کی تخت نشینی و معزولی اور دربار کے حریف دھڑوں کی رقابتوں اور سازشوں کی داستان ہے، یہاں تک کہ ہم اتپل خاندان کے بانی اونتی ورمن (۸۵۵ء–۸۸۳ء) کے عہد تک پہنچتے ہیں۔ کرکوٹ خاندان کے آخری برسوں میں کوہِ پنجال کے جنوب کے علاقے نے تختِ کشمیر کی اطاعت سے گردن نکال لی تھی، اور راجوری اور دیگر مقامات پر چھوٹی چھوٹی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی تھیں۔ سلطنتِ کشمیر اپنی قدرتی حدود میں محدود ہو کر رہ گئی تھی اور بارہ مولا سے نیچے صرف چار منزل تک

پھیلی ہوئی تھی۔ اونتی ورمن نے دانش مندی سے بیرونی فتوحات سے گریز کیا اور اپنی پوری توجہ ملک کے اندرونی استحکام اور ترقی پر صرف کی، جو گزشتہ ادوار کی بدنظمیوں، طاقتور جاگیرداروں کی باہمی عداوتوں اور کائستھوں یعنی محرروں کی حریصانہ انتظام کاری کے باعث معاشی اور سیاسی طور پر سخت زبوں حال ہو چکا تھا۔

ملک شدید سیلابوں اور قحطوں کی زد میں رہتا تھا۔ وادیِ کشمیر دلدل زدہ حالت میں تھی۔ کاشتکاری کا حال ابتر تھا۔ اونتی ورمن کے قابل مہندس سویا نے وادی کی نکاسیِ آب کا بیڑا اٹھایا۔ اس نے — جیسا کہ ہمارے اپنے زمانے کے جدید مہندسوں نے بھی دیکھا ہے — یہ محسوس کیا کہ وادی کے سیلابوں کا سبب یہ تھا کہ بارہ مولا کے تنگنائے میں دریائے جہلم کا گزر اُس گاد اور پتھروں سے مسدود ہو گیا تھا جو ایک قریبی نالے سے اس میں آ گرے تھے۔ (ای ہنٹنگٹن (E. Huntington) کی "پلس آف ایشیا"، صفحات 39-40۔)

سویا نے یہ رکاوٹ دور کر دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قابلِ کاشت زمین میں بڑا اضافہ ہوا اور سیلابوں سے تحفظ بڑھ گیا۔ پھر اس نے بادشاہ کے حکم سے نکاسیِ آب اور آب پاشی کے دیگر وسیع کام انجام دیے؛ اور کچھ تعجب نہیں کہ مقامی مؤرخ ملک کی اس معاشی خوش حالی پر نازاں ہے جو انہی ہندسی منصوبوں کا براہِ راست ثمر تھی۔ موجودہ گاؤں سوپور (قدیم سویاپور) اس عظیم مہندس کے نام کی یادگار ہے۔ اسے سویا ہی نے اس مقام پر آباد کیا تھا جہاں جہلم ولر جھیل سے نکلتا ہے۔ بادشاہ کی یاد بھی آج تک اونتی پور (ونتی پور) کے گاؤں میں محفوظ ہے، جو سری نگر سے ایک منزل بالائی جانب واقع ہے۔

[سوپور کی آبادی ۱۹۳۱ء میں 10,982 اور ۱۹۴۱ء میں 11,770 تھی۔ زین العابدین نے یہاں ۱۴۶۰ء میں جہلم پر ایک پل تعمیر کیا۔ شری ور نے سلطان حسن شاہ کے ہاتھوں

سویاپور میں ایک نئی شاہی اقامت گاہ کی تعمیر کا ذکر کیا ہے۔ موجودہ قصبہ، جو دریا کے دونوں کناروں پر واقع ہے، سری نگر سے کشتی کے ذریعے ایک دن کی مسافت پر ہے۔ یہ تجارت کا بڑا مرکز ہے، مگر میونسپلٹی نہیں؛ یہاں صرف ٹاؤن ایریا کمیٹی ہے۔ اونتی پور اب ایک گاؤں ہے جو سری نگر سے 18 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں کئی مندروں کے کھنڈر ہیں جن میں سے دو نمایاں ہیں اور جن کی تفصیل رائے بہادر رام چندر کاک (Ram Chandra Kak) نے اپنی کتاب اینشنٹ مانومنٹس آف کشمیر (۱۹۳۳ء) میں بیان کی ہے۔ اس کی آبادی ۱۹۴۱ء میں 1,487 تھی۔]

اونتی پور کے قدیم مندروں کے کھنڈر، سٹائن کے نزدیک، قدیم کشمیری فنِ تعمیر کی سب سے پُرشکوہ یادگاروں میں شمار ہوتے ہیں اور اپنے بانی کے وسائل پر شاہدِ عادل ہیں۔ وشنو اور شیو کے لیے وقف کیے گئے دو مندروں — اونتی سوامن اور اونتیشور — میں سے پہلا اونتی ورمن نے اپنی تخت نشینی سے قبل اور دوسرا اس کے بعد تعمیر کرایا۔

کشمیر میں برہمنی فنِ تعمیر کا قرونِ وسطائی ارتقا دو زریں ادوار سے عبارت ہے، یا زیادہ صحیح الفاظ میں، دو نمایاں تعمیر پسند حکمرانوں کے زیرِ سایہ اپنی معراج کو پہنچا: للتادتیہ، جس نے آٹھویں صدی کے وسط میں اس طرز کو وجود بخشا، اور اونتی ورمن، جس کے عہد میں نویں صدی کے نصفِ آخر میں اس نے اپنی نفیس ترین صورت اختیار کی۔ (پرسی براؤن (Percy Brown)، انڈین آرکیٹکچر، ٹاراپوروالا، بمبئی، ۱۹۴۲ء، صفحہ 180۔)

اونتی ورمن کے عہد میں کشمیر میں سنسکرت علوم کا بھی ایک شاندار احیا ہوا۔ شیو سوامن اونتی ورمن کے دربار کے گوہروں میں سے تھا۔ دیگر میں یہ نام شامل تھے: رتناکر، جس نے پچاس سرگوں پر مشتمل ہروجیہ لکھی اور جو دو بادشاہوں یعنی جیاپیڈ اور اونتی ورمن کے عہد

میں زندہ رہا؛ آنند وردھن، دھونیا لوک کا مصنف؛ اور کلٹ، وسوگپت کا عظیم شاگرد، جو کشمیر کے سپند شاستر مکتب کا بانی تھا۔ شیو

سوامن کو سات مہاکاویوں، متعدد ڈراموں، نثری تصانیف اور دیگر تحریروں کا مصنف مانا جاتا ہے۔ لیکن اب صرف کپھن ابھیودیہ اور چند متفرق اشعار ہی وہ کل سرمایہ ہیں جو طالبِ علم کے پڑھنے اور داد دینے کے لیے باقی رہ گیا ہے۔ شیو سوامن کی یہ تصنیف ''سنسکرت ادب کی عمومی تاریخ میں اور بالخصوص کشمیر کی ادبی تاریخ میں اس لحاظ سے اہمیت اختیار کر لیتی ہے کہ اس سے کشمیر میں کاویہ کے ارتقا اور رتنا کر کے اپنے معاصرین پر اثر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔'' اس کا موضوع نہ پرانی ہے، نہ رزمیہ، نہ تاریخی، بلکہ یہ راجا کپھن کی بدھ روایت سے بحث کرتی ہے، جو بدھ کے بارہ بڑے شاگردوں میں سے ایک تھا۔ کپھن ابھیودیہ، جو تقریباً گزشتہ ایک ہزار برس سے گمنامی میں پڑی تھی، اب پنجاب یونیورسٹی کے اہتمام سے دستیاب ہو گئی ہے؛ اس کی پہلی بار تنقیدی تدوین پنڈت گوری شنکر، ایم اے، بی لٹ (اوکسن)، لیکچرر گورنمنٹ کالج لاہور نے ۱۹۳۷ء میں کی ہے۔

شنکر ورمن، ۸۸۳ء–۹۰۲ء

اونتی ورمن کے بیٹے اور جانشین شنکر ورمن (۸۸۳ء–۹۰۲ء) نے مالیاتی جبر کی ایک نرالی اسکیم رائج کر کے اپنی رعایا کو حیران و پریشان کر دیا۔ اس نے مندروں کے خزانے لوٹے اور بے حد و حساب اور سفاکانہ اخّاذی کا مرتکب ہوا۔ اپنی یاد کو دوام بخشنے کے لیے اس نے شنکر پور کا قصبہ — موجودہ پٹن (جس کی آبادی اب 3,032 ہے) — اور اس کے مندر انہی مصالح سے تعمیر کرائے جو اس نے پری ہاس پور کے قصبے اور مندروں کی لوٹ مار سے

حاصل کیے تھے۔ لیکن یہ قصبہ پنپ نہ سکا۔ دو مندروں کے کھنڈر آج بھی پٹن میں کھڑے ہیں، جو سری نگر سے 17 میل کے فاصلے پر بارہ مولا کی سڑک پر واقع ہے۔ ایک مندر بادشاہ نے تعمیر کرایا تھا اور دوسرا اس کی ملکہ سگندھا نے۔ شنکر ورمن نے راجوری، گجرات، کانگڑہ اور ہزارہ کے علاقوں پر فوج کشی کی، مگر اس کا کوئی پائیدار نتیجہ نہ نکلا، کیونکہ اس کی سلطنت بہرحال اپنی قدرتی حدود ہی میں محدود رہی۔ وہ ہزارہ کی مہم کے دوران فوت ہوا۔ ”اس عہد سے آگے کی تاریخ حکمرانوں اور غاصب چچاؤں، عم زادوں، بھائیوں، وزیروں، امیروں اور سپاہیوں کے مابین کشمکش کا ایک طویل تسلسل ہے۔“ ۹۰۲ء کے بعد کی صدی کے دوران سلطنت کا اقتدار اٹھارہ مرتبہ ہاتھ بدلتا رہا۔ ایک دعوے دار دوسرے کو کئی کئی بار معزول کرتا رہا، جیسے پارتھ اور چکرورمن۔ چکرورمن ایک ڈومبہ لڑکی کے حجرے میں قتل کیا گیا، اور درباری اخلاق کی پستی کا یہ عالم تھا کہ جب وہ ڈومبہ لڑکی کی آغوش میں جاں بہ لب پڑا تھا تو خود بادشاہ کی بیویاں قاتلوں کو برابر اکساتی رہیں کہ ایک بڑے پتھر سے اس کے گھٹنے کچل دیں (۹۳۷ء)۔ (ڈاکٹر آر سی مجمدار (R. C. Majumdar) کی آؤٹ لائن آف اینشنٹ انڈین ہسٹری اینڈ سولائزیشن، ۱۹۲۷ء، صفحات 438-39۔)

یشسکر، ۹۳۹ء–۹۴۸ء

ملک امرا اور وزرا کے مظالم سے تباہ حال تھا، اور اس مختصر سکون کے وقفے کے سوا جو ملک کو یشسکر کی نو برس (۹۳۹ء–۹۴۸ء) کی نرم حکومت میں میسر آیا، ہر طرف مکمل انتشار اور بدنظمی کا دور دورہ رہا۔ پھر بادشاہ دو دو برس میں آتے اور رخصت ہوتے رہے۔

(۱) پہلا لوہار خاندان

لشیم گپت، ۹۵۰ء–۹۵۸ء

کشیم گپت کی حکومت ۹۵۰ء سے ۹۵۸ء تک رہی۔ اس نے دِدّا سے شادی کی جو اپنی ماں کی طرف سے اودبھانڈ (اوہند) کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔

ابھیمنیو دوم، ۹۵۸ء–۹۷۲ء

ملکہ دِدّا (۹۸۰ء–۱۰۰۸ء) بے اصول مگر زبردست کردار کی عورت تھی۔ اس نے نصف صدی تک اس بدنصیب ملک پر بدانتظامی سے حکومت کی۔ وہ ۹۵۰ء سے ۹۵۸ء تک ملکۂ عہد رہی۔ ۹۵۹ء سے ۹۸۰ء تک وہ کشیم گپت کے شیرخوار بیٹے ابھیمنیو کی نیابت میں نائب السلطنت رہی۔ ابھیمنیو کا عہدِ حکومت ۹۵۸ء سے ۹۷۲ء تک بتایا جاتا ہے، جس زمانے میں ایک ہولناک آتش زدگی نے بازار سے لے کر وشنو کے مندر تک بہت سی عمارتیں بھسم کر دیں۔

دِدّا، ۹۸۰ء–۱۰۰۳ء

دِدّا بالآخر ۲۳ برس تک خود مختار حکمران کی حیثیت سے تخت نشین رہی۔ اس نے تمام حریف جماعتوں کو بے دردی سے کچل ڈالا؛ گرفتار شدہ باغیوں کو قتل کراتی اور ان کے خاندانوں کا استیصال کر دیتی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تخت بلا مزاحمت دِدّا کے بھتیجے سنگرام راج (۱۰۰۳ء–۱۰۲۸ء) کو منتقل ہو گیا، جسے اس نے اپنی زندگی ہی میں نامزد کر دیا تھا اور جو لوہار خاندان کا بانی بنا۔

تاہم وہ ایک کمزور حکمران تھا۔

[موجودہ لوہرن پونچھ کی ایک وادی ہے۔ ملکہ دِدّا اپنی ماں کی طرف سے راجا بھیم شاہی کی پوتی تھی، جس کا ذکر البیرونی کی کابل کے ہندو شاہیوں کی فہرست میں آتا ہے۔ شاہی سلطنت محمود غزنوی کے ہاتھوں تباہ ہوئی — سٹائن کا دیباچہ، راج ترنگنی کا انگریزی ترجمہ، جلد اول، صفحہ 104۔]

سلطان محمود کی فوج کشی

اس راجا کا عہدِ حکومت صرف اس اعتبار سے قابلِ ذکر ہے کہ ۱۰۱۵ء میں ہمّیر — سلطان محمود غزنوی کے لیے کلہن کا اختیار کردہ نام، جو بظاہر امیر المومنین کے لقب ہی کی ایک بگڑی ہوئی صورت ہے — نے کشمیر پر فوج کشی کی۔

کشمیری فوجوں کو حملہ آور کے ہاتھوں شکست ہوئی، لیکن ہمّیر کو موسم کی سختی اور کوہستانی رکاوٹوں کی دشوار گزاری کے باعث پسپا ہونا پڑا۔ اگرچہ محمود کبھی کشمیر میں داخل نہ ہو سکا، تاہم اس کے ہم عصر ابوالحسن علی فرخی (متوفی ۴۲۹ھ = ۱۰۳۷ء) نے — جو قنوج، سومنات اور غالباً کشمیر کی مہمات میں اس کے ہمرکاب رہا — محمود کی اسی حسرت بھری آرزو کا اظہار کیا ہے:

را رہ کشمر می آرزو

خویش ما ز آرژو

کنم از سر بتکو از دست

کا است کہ پکبارہ بہ کشمر خرامم

امیر محمد سے، جو محمود کا بیٹا اور مسعود کا توام بھائی تھا، فرخی کہتا ہے:

الشکر ساختہ خویش بکشمیر بری

اش کا با پدر خویش بکشمیر شوی

ہری راج، ۱۰۲۸ء؛ اننت، ۱۰۲۸ء–۱۰۶۳ء؛ کلش، ۱۰۶۳ء–۱۰۸۹ء

سنگرام راج کے بعد ہری راج تخت نشین ہوا جو صرف ۲۲ دن حکومت کر کے رخصت ہوا اور اس کے بعد اننت والیٔ کشمیر بنا۔ ڈامروں یعنی جاگیردار امرا کی بغاوت کو بادشاہ نے بڑی جواں مردی سے فرو کیا۔ اس نے راجۂ چمبہ پر فتح پائی، مگر کوہستانی ریاست ہزارہ کے خلاف اس کی مہم ذلت آمیز ناکامی سے دوچار ہوئی۔ وہ ذاتی طور پر کمزور حکمران تھا اور امورِ سلطنت میں اس کی بیشتر کامیابی اس کی دین دار اور بلند ہمت ملکہ سوریہ متی کی مرہونِ منت تھی۔ ملکہ چاہتی تھی کہ ملک کی زمامِ کار زیادہ مضبوط ہاتھوں میں ہو، چنانچہ اسی کے مشورے پر اننت نے اپنے بیٹے کلش کے حق میں تخت سے دست برداری اختیار کر لی۔ لیکن کلش (۱۰۶۳ء–۱۰۸۹ء) بدکردار اور عیاش مصاحبوں کی صحبت میں مبتلا تھا۔ اگرچہ رعایا اس کے ظلم سے سخت پریشان رہی، تاہم وہ ہزارہ سے چمبہ تک گرد و نواح کی ریاستوں پر اپنی قوت کا سکہ بٹھانے میں کامیاب رہا۔ اس کا جانشین صرف ۲۲ دن مسندِ شاہی پر رہا، اور اس کے بعد ہرش (۱۰۸۹ء–۱۱۰۱ء) تخت نشین ہوا۔

ابھنو گپت — شیو فلسفی

کشمیر کا عظیم شیو فلسفی اور نقادِ ادب ابھنو گپت ۹۵۰ء اور ۹۶۰ء کے درمیان ایک ایسے برہمن خاندان میں پیدا ہوا جو راجہ للتادتیہ کے عہد میں قنوج سے ہجرت کر کے کشمیر آ بسا تھا۔ ابھنو گپت کئی علوم — فنِ درامہ، علمِ بیان، فلسفہ اور فلسفۂ شاعری — پر کثیر التصانیف مصنف تھا۔ شیو فلسفے میں اس کا حصہ کمیت اور اہمیت دونوں اعتبار سے فی الواقع بہت بڑا ہے۔ ڈاکٹر کانتی چندر پانڈے (Dr. Kanti Chandra Pandey) کا بیان ہے کہ بعض قدیم پنڈت خاندانوں اور بعض پرانے مسلمان گھرانوں میں رائج روایت کے مطابق ابھنو گپت اپنے بارہ سو شاگردوں کے ہمراہ بھیرو غار میں داخل ہوا — جو ماگام سے تقریباً پانچ میل کے فاصلے پر، سری نگر اور گلمرگ کے وسط میں واقع ہے — اور پھر کبھی دکھائی نہ دیا۔

[نوٹ: ڈاکٹر وی۔ راگھون (Dr. V. Raghavan) نے ابھنو گپت کی تصانیف کی تفصیل جرنل آف اورینٹل ریسرچ، مدراس، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۴۰ء میں بیان کی ہے۔]

کشیمندر

کشیمندر، جو کشمیر کے سنسکرت شعرا کی آبرو تھا، اننت کے عہد میں ڈل جھیل کے کنارے اس مقام پر پیدا ہوا جہاں اب نشاط باغ واقع ہے۔ کشیمندر کا باپ پرکاشیندر ایک دولت مند، فیاض طبع اور صاحبِ علم برہمن تھا۔ کشیمندر کی ولادت کی صحیح تاریخ معلوم نہیں، لیکن اس کا ادبی دور ۱۰۳۷ء سے ۱۰۶۶ء تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ اپنے باپ کے تین بیٹوں میں سے ایک تھا۔ کشیمندر نے متعدد اساتذہ سے کسبِ فیض کیا، جن میں سب سے نامور گنگک تھا۔ کشیمندر کا مطالعہ نہایت وسیع تھا اور ہندو قانون، سنسکرت صرف و نحو، آیوروید، سیاست، موسیقی اور مصوری تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نے دستکاری کی تربیت بھی حاصل

کی اور پچیس برس کی عمر تک بڑھئی اور لوہار کے کام سے بھی واقف ہو چکا تھا۔ پھر کشمیندر نے شادی کی اور اس کے ہاں سوئیندر نامی بیٹا پیدا ہوا۔ اننت نے اسے اپنے بیٹے کلش کی تعلیم پر مامور کیا۔

کشمیندر اپنے علم و دولت، اپنی فراست، اقامتی مدارس کی سرپرستی میں فیاضی اور اپنے تواضع کے باعث مشہور تھا۔ وہ زندگی سے لطف اندوز بھی ہوتا تھا۔ اس کی کتابیں درپ دلن (غرور کا سر نیچا) اور دیش اُپدیش (بیرونی طلبہ کے لیے ملک کے بارے میں نصیحت) معروف ہیں۔ وہ بہت سی کتابوں کا مصنف مانا جاتا ہے، جن میں سے چونتیس دستیاب خیال کی جاتی ہیں اور بیشتر نرنے ساگر پریس، بمبئی سے شائع ہو چکی ہیں۔ کلہن نے اس کی ایک تصنیف پر اس کی علمی لغزش کے باعث نکتہ چینی کی ہے اور اس پر "مسلسل بے احتیاطی" کا الزام بھی لگایا ہے۔ کیتھ (Keith) نے کشمیندر کی برہت کتھا منجری اور دیگر تصانیف پر خاصی تفصیل سے بحث کی ہے۔

بلہن

بلہن، جو ایک بڑا شاعر اور عمر میں کلہن سے بڑا تھا، سری نگر سے چھ میل کے فاصلے پر واقع کھنہ موش یا کھنہ موہ میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ جیشٹھ کلش ایک صاحبِ علم برہمن تھا جو خاص طور پر سنسکرت صرف و نحو میں اپنے کمال کے لیے مشہور تھا۔ بلہن جیشٹھ کا تیسرا بیٹا تھا۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد کلش کی جابرانہ حکومت کے سبب جب اسے اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھانے کا کوئی موقع نہ ملا تو کہا جاتا ہے کہ بلہن سولہ برس کی عمر میں پونچھ کے راستے کشمیر سے نکل کر پنجاب میں داخل ہوا اور لاہور اور جالندھر کی سیر کی۔ پھر وہ متھرا اور قنوج گیا

اور کاشی میں قیام کیا، جہاں بحیثیت نحوی اس کی شہرت نے لوگوں کو متوجہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چھترکوٹ، پریاگ، انہل واڑ اور ناسک بھی گیا۔ دکن کے مقام کلیان میں راجہ کی بیٹی سے، جس کی تعلیم پر بلہن مامور ہوا تھا، ایک مختصر سی داستانِ محبت کا سراغ ملتا ہے۔ ایک کشمیری پنڈت اور اس حیثیت سے یقیناً ایک خوب رو، باکمال اور صاحبِ علم نوجوان ہونے کے ناتے وہ شہزادی کا دل اور راجہ کی رضامندی جیتنے میں کیوں کر ناکام رہتا، چنانچہ بلہن کی شادی ہو گئی۔ بالآخر بلہن گدی کا وارث بھی بنا۔ لیکن کیتھ اس داستانِ محبت کے بارے میں خاموش ہے۔ بلہن (۱) وکرمانک دیو چرت، (۲) کرن سندری اور (۳) چور پنچاشکا کا مصنف ہے۔ ان میں سے پہلی تصنیف کا سراغ جنرل کننگھم (General Cunningham) نے اور دوسری کا ڈاکٹر بوہلر (Dr. Bühler) نے لگایا۔ جب بلہن کے دل میں کشمیر واپسی کی خواہش نے پھر انگڑائی لی تو ہرش کلش کو معزول کر چکا تھا۔ روایت ہے کہ وہ اپنے گاؤں کھنہ موش لوٹ آیا اور اسی برس کی عمر میں وہیں وفات پائی، لیکن اس دعوے کے اثبات کے لیے کوئی مؤثر شہادت موجود نہیں۔

[نوٹ: یہ قصہ سر ایڈون آرنلڈ (Sir Edwin Arnold) نے اپنی چورپنچاشکا میں برتا ہے اور پروفیسر پی۔ سیشادری (Professor P. Seshadri) نے تقریباً آٹھ سو مصرعوں کی ایک بیانیہ نظم میں اسے از سرِ نو بیان کیا ہے۔]

بلہن تاریخ نویسی میں کچھ زیادہ کامیاب نہیں۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جس کی زبان سادہ اور شفاف ہے۔ اپنی وکرمانک دیو چرت کے آٹھویں باب کے اشلوکوں میں، جو وکرم کی مہمات سے متعلق ہیں، اس نے اپنے زمانے کے سری نگر کی ایک دلکش جھلک دکھائی ہے۔

ہرش (۱۰۸۹ء–۱۱۰۱ء)

ہرش جسمانی اعتبار سے قوی الجثہ، نہایت خوب صورت، جری اور نمود و نمائش کا دلدادہ تھا۔ وہ مختلف علوم میں دستگاہ رکھتا تھا اور موسیقی اور فنونِ لطیفہ کا شیدائی تھا۔ لیکن اس کا ذہن کسی قدر مختل تھا اور اس کا کردار متضاد عناصر کا مجموعہ تھا۔ ”سنگ دلی اور رحم دلی، فیاضی اور حرص، شدید خود رائی اور بے پروا تساہل، عیاری اور بے تدبیری—یہ اور اسی نوع کی دیگر بظاہر ناقابلِ جمع صفتیں ہرش کی نشیب و فراز سے بھرپور زندگی میں باری باری نمایاں ہوتی رہتی ہیں۔“ تاہم اس کے ابتدائی دورِ حکومت کا امتیاز تدبر تھا اور اہلِ علم پر اس کی فیاضانہ نوازشوں نے دوسرے ملکوں سے بہت سے اہلِ کمال کو کھینچ لیا۔ کلہن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرش ترشک (مسلمان) صد سالاروں کو مالی سرپرستی دیتا تھا، یا بہ الفاظِ سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein) ہرش کی ملازمت میں ”محمڈن فوجی سالار“ موجود تھے۔ لیکن لباس اور زیورات میں ہرش کے پرتکلف اطوار اور اس کی گوناگوں فضول خرچیوں نے اسے جلد ہی قرض کے بھاری بوجھ تلے دبا دیا، جس سے نجات پانے کے لیے اس نے مندروں کی تاراج گری کا راستہ اختیار کیا۔ اس نے ان کے خزانے لوٹ لیے، مگر یہیں پر بس نہ کی۔ اس کے میلانات اسے مورتیوں کی ضبطی تک لے گئے تاکہ وہ اس قیمتی دھات پر قبضہ کر سکے جس سے وہ بنی تھیں۔ مزید برآں وہ نئے اور جابرانہ محاصل عائد کرنے پر مجبور ہوا؛ یہاں تک کہ غلاظتِ شب بھی محصول کا موضوع بن گئی۔ ہرش زیادہ سے زیادہ ہر نوع کی بے اعتدالیوں اور حماقتوں میں غرق ہوتا گیا۔ ملک پر بہت سی آفتیں نازل ہوئیں: طاعون نے آبادی گھٹا دی، رہزنوں کے جتھوں نے راستے ناپاک کر دیے، اور سیلابوں نے قحط اور عام ابتلا برپا کی۔ مگر بادشاہ کی مالی چیرہ دستیاں جوں کی توں جاری رہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ بیرونِ ملک اس کی فوجیں ذلیل ہوئیں اور اندرونِ ملک وہ سازشوں کے نرغے میں آ گیا۔ جب ہرش کے بھتیجوں اُچھل اور سسل نے علمِ بغاوت بلند کیا تو سب اس کے گرد جمع ہو

گئے۔ محل نذرِ آتش کر دیا گیا، ملکائیں جل کر ہلاک ہوئیں، ولی عہد قتل ہوا۔ بادشاہ کا تعاقب کر کے اسے ۱۱۰۱ء میں بے رحمی سے مار ڈالا گیا اور اس کی لاش کو، جو "کسی مفلس کی لاش کی طرح برہنہ" تھی، ایک رحم دل لکڑی فروش نے نذرِ آتش کیا۔

(ج) لوہارہ خاندانِ ثانی

اُچھل (۱۱۰۱ء–۱۱۱۱ء)

ہرش کا سب سے بڑا بھتیجا اُچھل اس کا جانشین ہوا۔ اس نے ڈامروں یعنی جاگیردار امرا کو ایک دوسرے کے خلاف بھڑکا کر ان کی قوت توڑ دی اور بالآخر انھیں یکے بعد دیگرے کچل ڈالا۔ بادشاہ کے خلاف پھر ایک سازش ہوئی اور وہ ۱۱۱۱ء میں قتل کر دیا گیا۔

دو صدیوں کی ابتری

بعد کی دو صدیوں کی تاریخ مختصر عہدِ حکومتوں، قتلوں، خودکشیوں، ریشہ دوانیوں، سازشوں، بغاوتوں، مظالم اور مالی چیرہ دستیوں کی ایک قابلِ نفرت داستان ہے۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ (Sir Francis Younghusband) کے الفاظ میں: "پس ہم اس امر کو مستند مان سکتے ہیں کہ صدیوں تک کشمیر کی معمول کی حالت — سوائے ان وقفوں کے جب کوئی مضبوط اور مستحکم حکمران ابھر آتا — دائمی سازش اور قتل و غارت کی حالت تھی؛ تخت تک پہنچنے سے پہلے ہی بھائیوں، چچازادوں اور چچاؤں سے کشمکش کی؛ تخت پر بیٹھنے کے بعد وزیروں، فوج اور 'امرا' سے اقتدار کی چھینا جھپٹی کی؛ زہر خورانی اور قتل کے مسلسل کھٹکے کی؛ تھکا دینے والی چھوٹی چھوٹی خانہ جنگیوں کی؛ اور عمومی بے چینی، بے یقینی اور اضطراب کی

حالت تھی۔" اُچھل کے جانشین کی حکومت صرف ایک رات رہی اور اس کے سوتیلے بھائی کی چار مہینے۔

سسل (۱۱۱۲ء–۱۱۲۰ء)؛ بحالی (۱۱۲۱ء–۱۱۲۸ء)

اس کے بھائی سسل (۱۱۱۲ء–۱۱۲۰ء) کا دورِ حکومت باغی جاگیردار امرا یعنی ڈامروں کے پیدا کردہ اندرونی فسادات کا تسلسل تھا۔ ۱۱۲۰ء میں ایک بغاوت کے آگے اسے پونچھ بھاگنا پڑا۔ تاہم ۱۱۲۱ء میں امیدوارانِ اقتدار اور امرا نے اسے تخت و اختیار پر بحال کر دیا اور وہ ۱۱۲۸ء میں اپنے قتل تک حکمران رہا۔ بادشاہ نے عیارانہ سفارت کاری سے ڈامروں کی قوت توڑنے کی بڑی کوشش کی مگر کچھ خاص نتیجہ نہ نکلا۔

جے سمہا (۱۱۲۸ء–۱۱۵۵ء)

سسل کا سب سے بڑا بیٹا جے سمہا اس کا جانشین ہوا اور ۱۱۲۸ء سے ۱۱۵۵ء تک حکمران رہا۔ اسی عہد میں ہم سنچپال سیناپتی (سپہ سالار) کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ وہ "یونوں (مسلمانوں) کے ساتھ خیمہ زن" ہوا [سٹائن، جلد 2، صفحہ 175] — یہ وہی لوگ ہیں جن کا ذکر ہرش کے عہد میں "صد سالاروں" کے طور پر گزر چکا ہے۔

ممٹ اور اس عہد کے دیگر شعرا

بارہویں صدی عیسوی کے آغاز میں کشمیر کے ادبی افق پر ممٹ اور اس کے دو بھائی بلند مقام رکھتے ہیں۔ ممٹ، جو عالم جیّٹ بھٹ کا دوسرا بیٹا تھا، زعفران کے لیے مشہور پانپور

کے قریب گلندر کا باشندہ تھا۔ جیّٹ ممٹ کا بڑا اور اووٹ چھوٹا بھائی تھا۔ اگرچہ تینوں نامور ادیب تھے، مگر ممٹ سب سے ممتاز تھا۔ عروض و بلاغت پر اس کی کتاب کاویہ پرکاش اکثر سنسکرت زبان کے اعلیٰ امتحانات کے نصاب میں شامل کی جاتی ہے۔ کاویہ پرکاش پر ستاسی شرحیں لکھی جانی معلوم ہوئی ہیں جن میں سے ۲۵ دستیاب ہیں۔ ممٹ قنوج کے عظیم شاعر بادشاہ ہرش کا ماموں خیال کیا جاتا ہے؛ ممل دیوی ہرش کی ماں تھی۔ شبد ویاپار وچار، جس میں الفاظ کے استعمال پر بحث کی گئی ہے، ممٹ کی ایک اور معروف کتاب تھی۔ چنانچہ ہرش سری نگر کے سنسکرت اہلِ علم سے ربط ضبط کے لیے فطری طور پر کشمیر آتا رہا۔

منکھ

منکھ اس عہد کا ایک اور شاعر تھا۔ وہ اپنے باپ ویشوورت کا، جو پنڈت ممٹ کا بیٹا تھا، چوتھا بیٹا تھا۔ منکھ النکار سروسو کے مشہور مصنف رویک کا شاگرد تھا۔ منکھ ترقی کرتے کرتے دھرمارتھ کے ناظم اور وزیرِ خارجہ کے منصب تک پہنچا۔ راجہ سسل اسے ایک فلسفی کی نظر سے دیکھتا تھا۔ منکھ نے اپنی پہلی کتاب سری کنٹھ چرت پچیس برس کی عمر میں لکھی۔ یہ چودہ ابواب پر مشتمل ہے اور اس میں ڈھائی ہزار اشعار ہیں۔ جے سمہا کے زمانے میں منکھ ایک مدرسے کا مہتمم تھا۔ ملا طاہر غنی کی طرح وہ دوسروں کی خوشامد سے نفرت کرتا تھا اور خاصا آزاد منش ذہن رکھتا تھا۔

کلہن

کشمیر کی مشہور رزمیہ داستان راج ترنگنی کا مصنف کلہن پنڈت راجہ جے سمہا کا ہم عصر تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب انگلستان میں ملکہ ماٹلڈا جلاوطنی کی زندگی گزار رہی تھی اور جاگیردار امرا باہم برسرِپیکار تھے۔ کلہن کی منظوم تاریخِ راجہ ہائے کشمیر، جو ۱۰۷۰ شاکا یعنی ۱۱۴۸-۴۹ء یا ۴۴-۵۴۳ھ میں لکھی گئی، سنسکرت زبان کی ایک معروف تصنیف ہے۔ کلہن والیٔ کشمیر راجہ ہرش (۱۰۷۹ء–۱۱۰۱ء) کے وزیر چنپک کا بیٹا تھا۔ کلہن شاعر اور مؤرخ دونوں ہونے کا مدعی تھا اور بلاشبہ دونوں حیثیتوں میں مہارت رکھتا تھا۔ اس نے اپنے قارئین کو کشمیر کی مکمل تاریخ دینے کی کوشش کی اور اگرچہ اکثر قرونِ وسطیٰ کے مؤرخین کی طرح اس نے بھی حقیقت اور افسانے کو خلط ملط کیا، تاہم اس نے "تاریخ کے گوناگوں ماخذ سے استفادے کی مخلصانہ کوشش کی۔" وہ قدیم ہندوستان کی ادبی اور تاریخی روایات پر گہری نظر رکھتا تھا اور بجائے خود ایک فاضل عالم تھا۔ کلہن کے ابتدائی ابواب "مغشوش روایتوں اور خیالی تصورات کا ملغوبہ" ہیں، مگر اس نے "معاصر واقعات اور اشخاص کے باب میں — بشمول بادشاہوں، عمال اور پروہتوں کے — کامل غیر جانب داری اور بے لاگ تنقید کے ساتھ آزادانہ رائے" سے کام لیا۔ اس سب کے باوجود، سر اورل سٹائن کہتے ہیں کہ کلہن سے احتیاطِ تنقیدی کے ساتھ کام لینا چاہیے، کیونکہ "اس کی سنین شماری ناقابلِ اعتبار، اس کے ذرائع معلومات باہم متضاد اور اس کا ذہنی سانچہ ناصحانہ ہے۔" حاصلِ کلام یہ کہ ڈاکٹر گھوشال کے بقول اگرچہ راج ترنگنی صورت اور مادہ دونوں اعتبار سے مصنوعی شاعری کے ادب سے تعلق رکھتی ہے، تاہم بحیثیت تاریخی تصنیف اس کے محاسن بہت سے اور مسلمہ ہیں۔ کلہن ذات کا برہمن تھا۔ وہ شیو کا پجاری اور بدھ کا معتقد تھا۔ کلہن کا نام پراکرت کے لفظ کلیان کے واسطے سے سنسکرت کے کلیان سے ماخوذ ہے، جس کے معنی 'مسرت' اور 'سعادت' کے ہیں۔

راج ترنگنی

راج ترنگنی کا آغاز پنڈت کلہن نے ۴۹-۱۱۴۸ء میں کیا اور اگلے برس کسی وقت اسے مکمل کیا۔ پنڈت کے بقول یہ پرتھوی راج چوہان کی شکست سے کوئی نصف صدی قبل اور شاہ میری خاندان کی آمد سے تقریباً دو صدیاں پہلے لکھی گئی۔ یہ آٹھ ابواب پر مشتمل ہے؛ ہر باب ترنگ یعنی موج کہلاتا ہے۔ ہر باب یا ترنگ میں اشعار کی تعدادیوں ہے: (۱) ۳۷۳، (۲) ۱۷۱، (۳) ۵۳۰، (۴) ۷۲۰، (۵) ۴۸۳، (۶) ۳۶۸، (۷) ۱۷۳۲، (۸) ۳۴۴۹۔

راج ترنگنی کے ایک حصے کا اولین ترجمہ فارسی میں ہوا، جو سلطان زین العابدین کے حکم سے کیا گیا؛ سلطان نے اس ترجمے کا نام بحر الاسمار یعنی "قصوں کا سمندر" رکھا۔ اکبر نے ملا عبدالقادر بدایونی کو حکم دیا کہ اس ترجمے پر نظرِ ثانی کر کے اسے مکمل کرے۔ جہانگیر کے عہد میں حیدر ملک چاڈورہ نے راج ترنگنی کا ایک اختصار فارسی میں مرتب کیا۔ ۱۸۳۵ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، کلکتہ نے راج ترنگنی کا ایک نسخہ شائع کیا۔ یہ نسخہ اس نقل پر مبنی تھا جو ولیم مورکرافٹ (William Moorcroft) نے حاصل کی تھی — ایک نامور سیاح جس کا ذکر آگے آئے گا اور جو مہاراجہ رنجیت سنگھ کی اجازت سے، جس کی مملکت میں اس وقت کشمیر شامل تھا، ۱۸۲۳ء میں سری نگر پہنچا تھا۔

اصل سنسکرت سے پہلا مکمل ترجمہ ۱۸۵۲ء میں فرانسیسی زبان میں پیرس کی سوسیتے ایشیاتیک کے زیرِ اہتمام شائع ہوا۔ یہ ترجمہ کیپٹن اے۔ ٹرائر (Captain A. Troyer) نے، جو اس وقت کلکتہ سنسکرت کالج کے پرنسپل تھے، ۱۸۳۵ء کے سنسکرت متن سے کیا تھا۔ ۱۸۳۵ء کا متن ناقص بتایا جاتا ہے، چنانچہ آنجہانی سر اورل سٹائن نے ۱۸۹۲ء میں بمبئی سے راج ترنگنی کا ایک تنقیدی نسخہ شائع کیا۔ سر اورل سٹائن کا انگریزی ترجمۂ راج ترنگنی ۱۹۰۴ء میں

شائع ہوا، اگرچہ وہ اسے ۱۸ مئی ۱۹۰۰ء کو مکمل کر چکے تھے۔ مہاراشٹری برہمن عالم آنجہانی رنجیت سیتارام پنڈت (Ranjit Sitaram Pandit) کا کہنا ہے کہ سر اورل سٹائن کا طرزِ ترجمہ ان قارئین کو، جو اصل متن کا مطالعہ نہیں کر سکتے، راج ترنگنی کے بحیثیت ادبی تصنیف صحیح تصور سے بہرہ ور نہیں کرتا۔ سر اورل سٹائن نے ان اشعار کا ترجمہ بھی چھوڑ دیا جنھیں وہ "کاویہ اسلوب" کے خیال کرتے تھے، نیز ان کا بھی جو ان کے نزدیک "اصل بیانیے سے غیر متعلق" تھے۔

چنانچہ پنڈت نے اکتوبر ۱۹۳۵ء میں راج ترنگنی کا مکمل ترجمہ شائع کیا، جس کی اساس سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein) کے ۱۸۹۲ء کے تنقیدی بمبئی ایڈیشن پر ہے۔ رنجیت پنڈت کا یہ ترجمہ شاعری کو نثر میں پیش کرنے کی ایک کوشش ہے؛ یہ لفظی ترجمہ ہے اور اس کا دعویٰ ہے کہ اس میں حتی الامکان اصل متن کی ساخت برقرار رکھی گئی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ محبت کی ایک عظیم ریاضت ہے جو ستم ظریفیِ تقدیر سے ایک جیل میں، قید کی اُس سزا کے دوران انجام پائی جو قومیت کے جذبۂ سوزاں کی خاطر مول لی گئی تھی۔ کسی غیر کشمیری داماد نے اپنے کشمیری خسر کو اس سے زیادہ پُرمحبت، اس سے زیادہ خوب صورت، اس سے زیادہ موزوں اور اس سے زیادہ پائیدار تحفہ کبھی پیش نہیں کیا جو مرحوم رنجیت پنڈت نے مرحوم پنڈت موتی لال نہرو کو پیش کیا۔ لیکن یہ امر نہایت افسوس ناک بلکہ دل گداز ہے کہ موتی لال اتنی مدت زندہ نہ رہے کہ کلہن کی "دریائے شاہاں" کے ابواب کا رنجیت کا انگریزی ترجمہ پڑھ سکتے — وہ عظیم رزمیہ داستان جو خود موتی لال کی مادرِ وطن کی داستان ہے!

جے سمہا کے جانشین

جے سمہا کے بعد کی چھ حکومتیں تقریباً ڈیڑھ صدی کے عرصے پر محیط ہیں۔ یہ زوال کا زمانہ تھا، اور سیاسی انتشار، باہمی کشمکش، خانہ جنگی اور راہ زن گروہوں کی تاخت و تاراج کے باعث کشمیر کی قوت مسلسل روبہ انحطاط رہی۔ سٹائن کا بیان ہے کہ سلسلۂ لوہارا کی تخت نشینی سے کلہن کی تواریخ (کتب ہفتم و ہشتم، ۱۰۰۳ء تا ۱۱۵۰ء) کے زمانے تک جو ڈیڑھ صدی گزری، اس کا بیشتر حصہ ہر نوع کی بغاوتوں اور اندرونی فسادات کے تسلسل سے عبارت ہے۔

جون راج کے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلہن کے زمانے کے بعد تقریباً دو صدیوں تک کشمیر میں ہندو اقتدار قائم رہا۔ راجے کمزور اور بے بس تھے۔ اس کا بیان ہے کہ راج دیو (۱۲۱۳ء–۱۲۳۶ء) نے برہمنوں کی تحقیر کی، انھیں لوٹا اور انھیں یہ پکارنے پر مجبور کر دیا: ”میں برہمن نہیں ہوں، میں برہمن نہیں ہوں۔“ وادی کی مادی خوش حالی ماند پڑتی جا رہی تھی۔

سہا دیو، ۱۳۰۰ء–۱۳۱۹ء/۲۰ء

سمہا دیو (۱۲۸۶ء–۱۳۰۰ء) اور اس کے بھائی سہا دیو (۱۳۰۰ء–۱۳۱۹/۲۰ء) کے عہد میں کشمیر ”شرابیوں، جواریوں اور بدچلن عورتوں“ کا ملک بن چکا تھا۔ اسی آخری عہدِ حکومت میں دُلچہ نے—جسے کشمیر کی فارسی تواریخ میں زلچو لکھا گیا ہے—جو عظیم بادشاہ کرم سین کی فوج کا سپہ سالار تھا، ملک پر حملہ کیا۔

راجہ مردانہ وار اس کا مقابلہ کرنے کے بجائے کشتواڑ بھاگ گیا۔ [وادیٔ کشٹھ واٹ، یعنی موجودہ کشتواڑ، بالائی دریائے چناب پر کشمیر اور چمبہ کے درمیان شملہ کے راستے پر واقع

ہے۔ کلہن نے اس کا ذکر ایک الگ پہاڑی ریاست کے طور پر کیا ہے۔ غالباً اس کی بنیاد دسویں صدی عیسوی کے آغاز میں پڑی۔ اس کے راجے اورنگ زیب کے عہد تک ہندو رہے اور شاہ جہاں کے زمانے میں بغداد سے کشتواڑ آنے والے سید فرید الدین کے فیضِ صحبت سے مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان راجاؤں نے اپنی خودمختاری اُس وقت تک برقرار رکھی جب تک مہاراجہ گلاب سنگھ نے ان کے علاقے کو فتح نہ کر لیا۔ کشمیر کے چک خاندان کا آخری فرماں روا یعقوب شاہ چک ۱۵۸۶ء میں اکبر کی فوجوں کے ہاتھوں عاجز آکر پناہ کی غرض سے کشتواڑ آیا اور کشتواڑ کے سبزہ زار چوگان کے کنارے سرکوٹ میں مدفون ہے۔ مسٹر آٹو روتھ فیلڈ (Otto Rothfeld) کا کہنا ہے کہ کشتواڑ کے مناظر تقریباً بے مثال ہیں، اس کے باشندے نرالے ہیں، اس کے آثار تاحال ناخواندہ ہیں اور اس کا شکار غیر معمولی ہے۔ ("وِدپین اینڈ رائفل اِن کشتواڑ" از آٹو روتھ فیلڈ، دی ٹائمز آف انڈیا پریس، بمبئی، ۱۹۱۸ء)

کشتواڑ کی ہموار سطحِ مرتفع گول کے بجائے بیضوی شکل کی ہے اور بارہ مولہ سے مشابہ ہے۔ یہ میدان بلوط اور ہولی کے درختوں سے ڈھکے فلک بوس پہاڑوں میں گھرا ہوا ہے، جن کی چوٹیاں برف سے سفید اور صنوبر کے گھنے جنگلوں سے پوشیدہ ہیں۔

دلکش دیار کشتوار است ہس ماہ وش صد مار است

سطحِ مرتفع کا پھیلاؤ مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب چھ چھ میل تک ہے۔ اس کی زمین زرخیز اور اس کی کاشت کاری شاداب ہے۔ میدان میں جابجا گاؤں بکھرے ہوئے ہیں جن میں سے ہر ایک چناروں اور سفیدوں کے اپنے جھنڈ میں چھپا ہوا ہے۔ دریائے

وردوان وادیٔ وردوان سے گزر کر چندر بھاگا میں گرتا ہے، جو ملتان کے پاس سے گزرتا ہوا دریائے سندھ میں جا ملتا ہے۔

میری پیٹری (Mary Petrie) کے الفاظ میں: "کشتواڑ میں اور وردوان کی راہ پر ہر پہاڑ سرمائی شکوہ کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے اور دائمی برف باری سے سفید ہو رہا ہے، جب کہ اس کے قدموں میں پھولوں کی ایک وادی میں موسمِ گرما گلابی نیند سو رہا ہے۔" ("اِن دی لینڈ آف لالہ رُخ"، صفحہ 196)

کیا شاید یہی سبب تھا کہ جہانگیر کشتواڑ کے زعفران کو کشمیر کے زعفران سے بہتر خیال کرتا تھا؟ (بیوریج (Beveridge)، توزکِ جہانگیری کا انگریزی ترجمہ، جلد 2، صفحہ 138)۔ مذکورہ بالا دیہات میں سب سے بڑی بستی کشتواڑ کا چھوٹا سا قصبہ ہے، جو سطحِ سمندر سے 5,100 فٹ بلند ہے اور جس کی آبادی 3,235 ہے۔ یہ درۂ مربل کے راستے اسلام آباد سے تقریباً 74 میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔

یہاں دو زیارتیں ہیں: ایک بغداد کے بزرگ سید فرید الدین کی اور دوسری ان کے فرزند سید اسرار الدین کی؛ اسی بنا پر شاعر اسے دوسرا بغداد کہتا ہے۔

ذیل کے پہاڑی دوہے میں کوشُر (کشمیری) کشتواڑ کی مفلسی کا مضحکہ اڑاتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے: "کشتواڑ رنج و مصیبت کی گزرگاہ ہے، جہاں لوگ دن کو بھوکے رہتے ہیں اور رات کو ٹھٹھرتے ہیں۔ جو کوئی وہاں آتا ہے، جب واپس جاتا ہے تو کسی گوسائیں یا تارک الدنیا کے جھنڈے کے ڈنڈے کی طرح دبلا ہو کر جاتا ہے۔"

کشتواڑ کی تاریخ کا ایک خاکہ پنجاب ہسٹاریکل جرنل، جلد 6، شمارہ 1 میں ملے گا۔]

دُلچہ نے لوگوں کو لوٹا، غلام بنائے اور شہر سری نگر کو آگ لگا دی۔ آٹھ ماہ کے قیام کے دوران وادی کو کنگال کر دینے کے بعد جب حملہ آوروں نے دیکھا کہ رسد کم یاب ہو گئی ہے تو انھوں نے جنوبی درّوں کے راستے نکلنے کی کوشش کی؛ مگر برف نے انھیں آلیا اور پوری فوج اپنے سالار سمیت ہلاک ہو گئی۔ اس کے بعد کشتواڑ سے گدی (ہندو بکروال) لوٹ مار کی مہم پر وادی میں داخل ہوئے، مگر سہا دیو کے سپہ سالار رام چندر نے انھیں پیچھے دھکیل دیا۔ اس کے بعد سہا دیو منظر سے غائب ہو جاتا ہے۔ اب مغربی تبت یعنی لداخ کے بادشاہ کا بیٹا رنچن منظرِ عام پر آتا ہے—جس کا پورا نام لہاچن رگیل بو رنچن یعنی شہزادہ رنچن ہے، اور جو لہاچن دنگوس گروب کا [یا جون راج کی روایت کے مطابق واکاتنیہ، تبتی واکا کا] بیٹا تھا۔ رنچن کی رام چندر سے ان بن ہو گئی اور اس نے اسے قتل کر ڈالا۔ پھر اس نے رام چندر کی بیٹی کوٹا رانی سے شادی کی اور ۱۳۲۰ء میں اپنی بادشاہت کا اعلان کر دیا، اور شاہ میر کو، جو اس کا وفادار رہا تھا، اپنا وزیر مقرر کیا۔

رنچن، ۱۳۲۰ء–۱۳۲۳ء

رنچن بالآخر مشرف بہ اسلام ہوا اور اس نے سلطان صدر الدین کا لقب اختیار کیا۔

اُدیان دیو، ۱۳۲۳ء–۱۳۳۸ء

صرف ڈھائی برس کے مختصر عرصے کے بعد یہ مسلمان بادشاہ بروز جمعہ ۲۵ نومبر ۱۳۲۳ء کو وفات پا گیا، تو سمہا دیو کا بھائی اُدیان دیو اس کا جانشین ہوا اور اس نے اس کی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ اسی زمانے میں کشمیر پر اَچل نے حملہ کیا، جسے، جون راج کے الفاظ میں، ”مگدھ پورہ کے فرماں روا نے سپاہ مہیا کی تھی“۔ بادشاہ اُدیان دیو اپنے بھائی کی طرح اس حملے کے

آگے بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کے وزیر شاہ میر نے اس کی غیر موجودگی میں کامیابی کے ساتھ سلطنت کا دفاع کیا۔ راجہ واپس آیا اور کشمیر پر حکمران رہا، مگر برائے نام؛ اصل اقتدار پوری طرح شاہ میر کے ہاتھ میں تھا۔

مشہور زاہدہ لَلّہ اُدیان دیو ہی کے عہد میں ۷۳۵ھ مطابق ۱۳۳۵ء میں پیدا ہوئی۔

کوٹا رانی، ۱۳۳۸ء–۱۳۳۹ء

۱۳۳۸ء میں اُدیان دیو کی وفات پر ملکہ کوٹا رانی نے زمامِ اقتدار سنبھالی، مگر صرف پانچ ماہ سے کچھ زائد عرصے کے لیے۔

شمس الدین شاہ میر یا مرزا، ۱۳۳۹ء–۱۳۴۲ء

وزیر شاہ میر یا مرزا نے رانی کو معزول کر دیا اور ۱۳۳۹ء میں سلطان شمس الدین کے لقب کے ساتھ خود تخت نشین ہوا۔

کشمیر میں ہندو اقتدار کے زوال کے اسباب

یہاں ان اسباب کا خلاصہ کر دینا مناسب ہوگا جو کشمیر میں ہندو اقتدار کی تباہی کا باعث بنے۔ بدھ مت اور برہمنیت کی باہمی آویزش، بدکردار راجے اور بدچلن رانیاں، اور اہل کاروں میں سیرت و کردار کا فقدان سب سے نمایاں اسباب دکھائی دیتے ہیں۔ عیاشی اور سازش کے تخریبی عوامل سرِفہرست تھے۔ ان پر مستزاد فوج سے وہ غفلت تھی جو ملک کی قدرتی حصاربندیوں سے پیدا ہونے والے احساسِ تحفظ کا نتیجہ تھی۔ سازشیں اور بغاوتیں عام

تھیں اور حکمران ان طاقت ور وزیروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلیاں بنے ہوئے تھے جو اپنی جنم بھومی کی فلاح و بہبود کے بجائے اپنی ذات کا سوچتے تھے۔

برہمنوں کی علمی و ثقافتی خدمات کا خلاصہ

اگرچہ ہندو اقتدار مذکورہ بالا اسباب کے باعث ختم ہوا، تاہم ہمیں اس علم و ثقافت کو خراجِ تحسین پیش کرنے میں کوتاہی نہیں کرنی چاہیے جس سے کشمیر اس باب کے زیرِ بحث عہد میں بہرہ ور رہا۔ کشمیری برہمنوں نے، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، مسلم دورِ حکومت میں فارسی میں بڑی مہارت حاصل کی اور بلند پایہ شاعروں اور نثر نگاروں کی حیثیت سے امتیاز پایا۔ ایسے لوگوں نے فطری طور پر سنسکرت ادب کی بھی بڑی خدمت کی، اور کشمیر قدیم ہندوستان کے ممتاز ترین مراکزِ علم میں سے ایک تھا۔ طالبانِ علم دور دراز سے اپنی تعلیم کی تکمیل کے لیے یہاں آتے تھے۔

ہم ناگارجن، کالی داس، کشمیندر، بلہن، ممٹ اور اس کے بھائیوں، نیز منکھ اور کلہن کے عظیم ناموں کا ذکر پہلے کر چکے ہیں۔ فلسفۂ شعر کی ابتدا درحقیقت کشمیر ہی میں ہوئی۔ بلکہ بلہن کا دعویٰ ہے کہ زعفران شاعری کا بیج ہے، اور چوں کہ ہندوستان کے کسی اور صوبے میں زعفران پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کشمیر ہی شاعری کا اصل وطن ہے۔ سنسکرت شعر و نثر کے علاوہ علم کی جن شاخوں کو کشمیریوں کے قدیم اسلاف کی گراں قدر خدمات حاصل ہوئیں، ان میں عروض، صرف و نحو، شیو فلسفہ، بدھ فلسفہ، تاریخ، حکایات و داستانیں، سوانح، شیو مت کے تنتر یعنی مقدس صحیفے، آیورویدیعنی علمِ طب اور شرحیں شامل ہیں۔

ہندوستان کے سولہ مشہور ترین ماہرینِ بلاغت میں سے چودہ کشمیر نے پیدا کیے، اور باقی سارے ہندوستان نے صرف دو۔

ریتی مکتب کا بانی وامن (۷۵۰ء–۸۰۰ء)، تین ورتیوں کے نظریے کا معلم اُدبھٹ (۷۷۴ء–۸۱۳ء)، رس دھونی کے نظریے کا عظیم شارح ابھنو گپت، اور رس نظریے کا حامی ممٹ (۱۱۰۰ء)—یہ سب کشمیری تھے۔ درحقیقت بھٹ ہی جدید کشمیری میں بٹ ہے، جس سے مراد برہمن یا کشمیری پنڈت ہے۔ بھٹ سنسکرت لفظ بھرتار سے مشتق ہے، جس نے پراکرت میں بھٹ کی صورت اختیار کی؛ سنسکرت دانوں نے اسے برقرار رکھا اور یہ اسمائے معرفہ کے شروع یا آخر میں لگایا جاتا رہا۔ یہ "عالم" کے مفہوم میں مستعمل تھا اور اس سے مراد عالم برہمن یا بڑا استاد ہے۔

کشمیر کا ایک مصور مبلغ شہزادہ گن ورمن غالباً چین، کوریا اور جاپان کی جانب جنوبی ایشیائی راہ کا پیش رو تھا ("انڈیا اینڈ دی پیسفک ورلڈ" از ڈاکٹر کالی داس ناگ (Dr. Kalidas Nag)، کلکتہ، ۱۹۴۱ء، صفحہ 173)۔ اس کے عہد (۴۰۰ء) کا کشمیر بدھ درس گاہ کا مرکز بھی تھا، جہاں کمارا جیو کوچا کے تخارستان سے—جو ختن کے قریب ہے اور موجودہ بدخشاں سے تقریباً مطابقت رکھتا ہے—سنسکرت اور مختلف ہندوستانی علوم سیکھنے کے لیے اتنا طویل سفر طے کر کے آیا، اور بعد ازاں یہ علوم اپنے ساتھ چین لے گیا۔

روایت ہے کہ عظیم شنکر آچاریہ (۷۸۸ء–۸۲۰ء) باقی ہندوستان میں بدھ مت پر کاری ضربیں لگانے کے بعد نویں صدی عیسوی کے اوائل میں کشمیر آیا اور اسے اپنے ویدانتی فکر پر کشمیری شیو مت کی برتری تسلیم کرنے پر مجبور ہونا پڑا، حالاں کہ اس کی کسی بنیادی تصنیف میں اس امر کی کوئی داخلی شہادت موجود نہیں۔ ممکن ہے یہ کوئی اور شخص، اس کا کوئی ہم

نام، رہا ہو۔ [شنکر کے بارے میں — اور اس خیال کے حق میں وجوہ موجود ہیں — کہا جاتا ہے کہ وہ جنوبی ہند میں اسلام کے ابتدائی مبلغین سے ربط و تعلق کے زیرِ اثر آیا؛ وحدت پر اس کے زور، محض عقیدت کے بجائے عمل پر اصرار اور محض رسوم کے بجائے خلوصِ نیت کی تاکید میں اس اثر کے واضح اشارے ملتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ شنکر کے فکر کا ہر عنصر الگ الگ اپنشدی ماخذ سے اخذ کیا گیا ہو، لیکن ان عناصر کی اس مخصوص ترکیب اور فکر و عمل پر زور کی ان تبدیلیوں کی سب سے آسان توجیہ جنوب میں اسلامی مبلغین کے ساتھ انھی نئے روابط سے ہوتی ہے، جہاں کیرالہ میں شنکر کی جائے پیدائش کلاڈی یا کیلاتی کے فرماں روا نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ (”انفلوئنس آف اسلام آن انڈین کلچر“ از ڈاکٹر تارا چند (Dr. Tara Chand)، انڈین پریس، الٰہ آباد، ۱۹۳۶ء، صفحہ 107-111)]

کشمیری شیو مت

کشمیری شیو مت، جو ترِک شاسن، ترِک شاستر یا محض ترِک کہلاتا ہے، عینیت پسندانہ وحدت (ادویت) کی ایک صورت ہے۔ مسٹر جگدیش چندر چٹرجی (Jagadish Chandra Chatterji) اپنی کتاب ”کشمیر شیوازم“ (حصہ اول، سری نگر، ۱۹۱۴ء، صفحہ 3) میں لکھتے ہیں کہ یہ نویں صدی عیسوی کے آغاز میں، یا شاید آٹھویں صدی کے اواخر میں، پہلے پہل کشمیر میں نمودار ہوا۔ کشمیری شیو مت کی دو شاخیں ہیں: (1) سپند شاستر اور (2) پرتیبھگیا شاستر۔ سر رام کرشن جی بھنڈارکر (Sir Ramakrishna G. Bhandarkar) کا بیان ہے کہ پہلی شاخ کی تصنیف وسوگپت اور اس کے شاگرد کلّٹ سے منسوب ہے، جو اونتی ورمن (۸۵۵ء–۸۸۳ء) کے عہد میں گزرے۔ اس نظام کی دو بنیادی کتابیں شیو سوترم اور سپند کاریکا ہیں، جن میں مؤخر الذکر صرف اکاون اشلوکوں پر مشتمل ہے۔ کشمیری شیو مت

کے پرتیبھگیا مکتب کا بانی سومانند تھا، جس نے شیو درشٹی نامی کتاب بھی لکھی۔ لیکن اس مکتب کا بنیادی رسالہ اس کے شاگرد اُدے کرنے تصنیف کیا، جس میں وہ اشلوک شامل ہیں جو سوتر کہلاتے ہیں۔ سومانند کے شاگرد کا شاگرد وہی معروف ابھنو گپت تھا جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں۔ (''وشنو ازم، شیو ازم اینڈ مائنر ریلیجس سسٹمز''، کارل جے ٹریوبنر، سٹراسبرگ، ۱۹۱۳ء، صفحہ 129)

باب سوم — کشمیر میں اشاعتِ اسلام

گزشتہ باب میں ہمیں مکتاپیڈ کے عہد میں عربوں کے حوالے ملے، اور ہرش کے زیرِ حکومت مسلمان فوجی سالاروں کی ملازمت کا ذکر بھی ہمارے سامنے آیا۔

بعد ازاں ہماری ملاقات رنچن سے ہوئی اور ہم نے دیکھا کہ وہ اسلام قبول کر کے سلطان صدر الدین بنا۔ ہم نے شاہ میر کی بحیثیت وزیر تقرری دیکھی، اور کوٹا رانی کی شکست پر اسے والیٔ کشمیر کی حیثیت سے بھی دیکھا۔ قبل اس کے کہ ہم شاہ میر کو سلطان شمس الدین کی حیثیت سے موضوعِ بحث بنائیں اور اس کے قائم کردہ شاہ میری خاندان کا احوال بیان کریں، ضروری ہے کہ ہم یہ جانیں کہ اسلام وادیٔ کشمیر میں کیوں کر داخل ہوا اور اس حد تک پھیل گیا کہ اس باب میں صرف مصر، ایران، افغانستان یا وسطی ایشیا ہی اسے سبقت لے جا سکے۔

سٹائن (Stein) کا بیان ہے کہ اسلام کشمیر میں جبری فتح کے ذریعے نہیں بلکہ تدریجی قبولِ اسلام کے راستے داخل ہوا، جس کے لیے جنوب اور وسطی ایشیا دونوں سمتوں سے آنے والے غیر ملکی مہم جوؤں کی آمد نے زمین ہموار کر دی تھی۔ آبادی کی عظیم اکثریت میں قبولِ اسلام کا آغاز ہندو اقتدار کے اواخر میں ہوا اور چودھویں صدی عیسوی کے نصفِ آخر میں یہ ایک تکمیل شدہ حقیقت بن گیا۔

سندھ سے اولین رابطہ

آئیے اب لمحہ بھر کے لیے سندھ کی طرف رجوع کریں، کیونکہ عرب سے آنے والے اولین مسلمانوں کو سندھ ہی نے پہلے پہل قبول کیا۔ ہمارا ماخذ چچ نامہ ہے، جو ماؤنٹ سٹوارٹ ایلفنسٹن (Mountstuart Elphinstone) کے تخمینے کے مطابق عماد الدین محمد بن قاسم بن ابی عقیل ثقفی کی یورش اور "بعض سابقہ ہندو عہدہائے حکومت" کے "واقعات کا ایک مفصل اور مربوط بیان" اپنے اندر رکھتا ہے۔

چچ برہمن نے، جو سیلائج کا بیٹا اور راجہ داہر کا باپ تھا، ساہسی بن سیہرس بن دیوائج کی سلطنت غصب کر لی۔ ساہسی کی مملکت کی حدود مشرق میں کشمیر تک، مغرب میں مکران تک، جنوب میں ساحلِ سمندر اور دیبل تک، اور شمال میں کردان یا کاروان کے پہاڑوں اور قیقان تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے اپنی قلمرو میں چار ملک یعنی گورنر مقرر کر رکھے تھے۔ ان میں چوتھا گورنر "ملتان کے عظیم شہر میں متعین تھا، اور سکہ، برہم پور، کریر، اشہار اور کمبہ، حدودِ کشمیر تک، اس کی عمل داری میں تھے۔" اس ساری مملکت کا فرماں روا ساہسی رائے فوت ہوا تو اس کی جانشینی چچ برہمن نے کی، جو اسی فرماں روا کی ملازمت میں بطور حاجب داخل ہوا تھا۔ بالآخر چچ کا جانشین داہر ہوا۔

۱۔ راج ترنگنی کے انگریزی ترجمے پر سٹائن کا مقدمہ، جلد اول، صفحہ 130۔ ۲۔ چچ نامہ اس ناپید عربی تصنیف فتوح السند کا فارسی ترجمہ ہے جو علی بن حامد بن ابی بکر کوفی کی تالیف تھی۔ یہ فارسی ترجمہ ۶۱۳ھ مطابق ۱۲۱۶ء میں والیٔ سندھ امیر قباچہ کے عہد میں کیا گیا، جو دہلی کے التتمش کا حریف اور ہم عصر تھا۔

داہر ۹۳ھ کے ماہِ رمضان کی دسویں تاریخ بروز جمعرات، مطابق جون ۷۱۲ء، محمد بن قاسم کے ہاتھوں مارا گیا۔ داہر کا بیٹا جے سیہ رائے کشمیر کی خدمت میں حاضری کے لیے روانہ

ہوا۔ حمیم نامی ایک شخص، جو سامہ کا بیٹا اور شامی الاصل تھا، جے سیہ کے ہمراہ کشمیر گیا۔ رائے کشمیر نے حکم دیا کہ کشمیر کے متعلقہ علاقوں میں سے شکلہا نامی مقام جے سیہ کو تفویض کر دیا جائے۔ جنرل کننگھم (General Cunningham) کے مطابق یہ مقام غالباً کوہستانِ نمک کا کلر کہار ہو سکتا ہے، جو اس زمانے میں کشمیر کے زیرِ نگیں تھا۔ جے سیہ شکلہا ہی میں فوت ہوا اور حمیم بن سامہ اس کا جانشین ہوا۔ حمیم نے "وہاں مسجدیں تعمیر کیں اور بڑی عزت و توقیر حاصل کی۔ شاہِ کشمیر کے ہاں اس کا بہت احترام تھا۔" حمیم شامی کے اصل نسب اور ہندوستان میں اس کے مشن پر کوئی روشنی نہیں پڑتی۔ البتہ ایک اور مقام پر ہم محمد علافی یا علانی کا ذکر پڑھتے ہیں، جسے عرب اجرتی سپاہی کہا گیا ہے۔ وہ "بنو اسامہ کا ایک عرب تھا، جس نے عبدالرحمن بن اشعب کو میدانِ جنگ سے فرار ہونے کی پاداش میں قتل کیا تھا، اور پانچ سو عربوں کے ساتھ داہر سے آملا تھا۔" بعد ازاں داہر نے علافی کو برطرف کر دیا اور محمد بن قاسم نے علافی کو امان عطا کی۔ یہ امر خلافِ قیاس نہیں کہ حمیم علافی کے ہمراہیوں میں سے تھا۔ بظاہر یہی حمیم شامی وہ پہلا مسلمان ہے جو کشمیر میں داخل ہوا۔

ہمیں یہ بھی مدِنظر رکھنا ہے کہ محمد بن قاسم فتحِ سندھ کے بعد ملتان آیا۔ یہاں "اس نے ایک جامع مسجد اور مینار تعمیر کیے۔" اس نے امیر داؤد نصر بن ولید عمانی کو اس کا گورنر مقرر کیا۔ پھر ابن قاسم کشمیر کی اس سرحد کی جانب بڑھا جسے پنج ماہیات کہتے ہیں، جو دریائے جہلم کے بالائی بہاؤ پر، میدانوں میں اترنے کے مقام کے عین بعد واقع ہے۔ یہ تقریباً ولید اول کی خلافت (۸۶ھ تا ۹۶ھ مطابق ۷۰۵ء تا ۷۱۵ء) کا زمانہ ہے۔

چچ نامہ یا تاریخِ ہند و سند کے لیے دیکھیے ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹوریئنز (History of India as told by its own Historians)، عہدِ اسلامی، مرتبہ سر ایچ ایم ایلیٹ (Sir H. M. Elliott) اور پروفیسر جان ڈاؤسن (John Dowson)، جلد اول، لندن، ۱۸۶۷ء، صفحات 131 تا 207۔

کشمیر کی تاریخ کے قبل از اسلام دور کے اپنے مختصر خاکے کے دوران ہمارا سامنا للتادتیہ مکتاپیڈ سے ہوتا ہے، جس نے ۷۲۵ء سے ۷۵۳ء تک حکومت کی اور جس نے سندھ اور ملتان میں اپنے مراکز سے پیش قدمی کرتے ہوئے عربوں کے خلاف چینی شہنشاہ سے مدد کی درخواست کی؛ انہی عربوں کا ذکر تاریخِ کشمیر کے سلسلے میں ہمیں پہلی بار راج ترنگنی سے ملتا ہے۔ سٹائن کے بقول للتادتیہ مکتاپیڈ کا نام عربی حروف میں بگڑ کر "متیپیر" لکھا گیا ہے۔ اسلامی تقویم کے اعتبار سے اس کا عہدِ حکومت ۱۰۷ھ سے ۱۳۶ھ تک رہا۔ ضمناً یہ بھی نوٹ کر لیجیے کہ عربوں نے ۷۵۱ء مطابق ۱۳۴ھ میں چینیوں پر فتح حاصل کی اور گلگت اور دیگر علاقے اپنے قبضے میں لے لیے۔ مکتاپیڈ کے چھوٹے بیٹے اور دوسرے جانشین وجرادتیہ پیائیکا نے ۷۵۴ء سے ۷۶۱ء تک حکومت کی۔ اس کے عہد، یعنی ۱۳۷ھ تا ۱۴۴ھ، میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس حکمران نے بہت سے آدمی "ملیچھوں" (یعنی مسلمانوں) کے حوالے کیے اور "کشمیر میں ایسے طور طریقے رائج کیے جو ملیچھوں" (یعنی مسلمانوں) "کے شایانِ شان تھے۔" اس کے بعد ہرش کے زمانے میں ہمیں کشمیر میں ترشکوں یعنی مسلمانوں کا بحیثیت فوجی سالار ذکر ملتا ہے، یا کلہن کے الفاظ میں "صدہا سپاہیوں کے سرداروں" کی حیثیت سے۔ ہرش کی حکومت ۱۰۸۹ء سے ۱۱۰۱ء، مطابق ۴۸۲ھ تا ۴۹۵ھ، تک قائم رہی۔

وینس کا سیاح مارکو پولو (Marco Polo) بھی تقریباً ۱۲۷۷ء مطابق ۶۷۶ھ میں کشمیر میں مسلمانوں کی موجودگی کا ذکر کرتا ہے۔ کلہن اور جون راج کی زمانی ترتیب پر چلتے ہوئے ہم ۱۳۲۰ء تا ۱۳۲۳ء مطابق ۷۲۰ھ تا ۷۲۴ھ کے دوران رنچن تک پہنچتے ہیں، اور یہی کشمیر میں اسلام کی بطور ریاستی مذہب آمد کی ٹھوس اور مسلمہ زمین ہے۔ سٹائن ہمیں بتاتا ہے کہ عیسوی بارھویں صدی میں دریائے سندھ کے کنارے آباد درد قبائل کے بدھ مت سے اسلام کی طرف انتقال نے پہلے ہی خاصی پیش رفت کر لی تھی۔ یہ رنچن سے تقریباً دو صدیاں قبل کا زمانہ ہے — وہی رنچن جو سلطان صدر الدین بن کر کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران بنتا ہے۔

اسلام نے نہ کشمیر کی آزادی پر کوئی اثر ڈالا اور نہ ابتدا میں اس کے سیاسی اور تہذیبی حالات میں کوئی جوہری تبدیلی پیدا کی۔ سٹائن ہی کا اقتباس جاری رکھتے ہوئے: نظمِ حکومت حسبِ سابق روایتی دفتری طبقے یعنی برہمنوں کے ہاتھوں میں رہا، جن کے لیے تبدیلیٔ مذہب میں کوئی فائدہ نہ تھا اور اپنے پرانے عقیدے پر قائم رہنے سے بظاہر ان کے موروثی مرتبے کو کوئی زیاں نہ پہنچتا تھا۔ اس کا ثبوت ان متعدد حوالوں سے ملتا ہے جو جون راج اور شری ورا کی تواریخ میں ابتدائی سلاطین کے زیرِ سایہ اعلیٰ سرکاری مناصب پر فائز برہمنوں کے متعلق آئے ہیں۔ سنسکرت ہندو اقتدار کے خاتمے کے بعد بھی خاصی مدت تک کشمیر میں سرکاری خط و کتابت اور دستاویز نویسی کی زبان بنی رہی۔ سرکاری دستاویزات، رپورٹوں وغیرہ کے وہ مختلف نمونے جو کشمیری انتظامی معمولات کی رہنما کتاب لوک پرکاش میں شامل ہیں، ”ایک عجیب سنسکرت آمیزے میں لکھے گئے ہیں جو فارسی اور عربی الفاظ سے بھرا پڑا ہے — ایسے الفاظ جو یقیناً اسلام کی آمد کے تھوڑے ہی عرصے بعد کشمیر میں رائج ہو گئے ہوں گے۔“ خود مسلمانوں میں سنسکرت کے استعمال کی شہادت اس سنسکرت کتبے سے ملتی ہے جو سری نگر

میں ہری پربت کے دامن میں حضرت بہاء الدین لنج بخش کے قبرستان کی ایک قبر پر موجود ہے۔ یہ کتبہ سلطان محمد شاہ کے عہد میں، ۱۴۸۴ء مطابق ۸۸۹ھ کے لگ بھگ، نصب کیا گیا۔ سٹائن کو سری نگر میں، مارتنڈ کے قریب اور دیگر مقامات پر متعدد قدیم مسلم قبروں پر بغیر تاریخ کے مختصر سنسکرت کتبے بھی ملے ہیں۔ بلکہ بعض اشخاص کے ناموں تک میں قاری غیر مسلم اثرات محسوس کرے گا۔

۱۔ راج ترنگنی، جلد اول، مقدمہ، صفحہ 91۔ ۲۔ انڈین اینٹی کویری (The Indian Antiquary)، جولائی ۱۹۰۸ء، صفحہ 12۔ ۳۔ وینسی سیاح مارکو پولو کے سفرنامے (The Travels of Marco Polo)، مرتبہ مینوئل کومروف (Manuel Komroff)، نیو یارک، امریکہ، ۱۹۳۹ء، صفحہ 64۔ ۴۔ راج ترنگنی، جلد دوم، صفحہ 217، حاشیہ 2762-64۔

اسلام اور ہندو مت

آنجہانی سر ہربرٹ رزلی (Sir Herbert Risley) نے لکھا: ”اسلام ایک آتش فشاں قسم کی قوت ہے، ایک سوزاں اور یکجا کر دینے والی قوت، جو سازگار حالات میں ایک قوم تک تشکیل دے سکتی ہے۔ یہ قبیلوں کے پورے سلسلے کو پگھلا کر باہم پیوست کر دیتی ہے اور ان کی داخلی ساخت کو ایک ہی یکساں سانچے میں ڈھال دیتی ہے، جس میں پہلے سے موجود رسموں کی کوئی باقیات ڈھونڈے سے نہیں ملتیں۔ الگ الگ تہیں مٹ جاتی ہیں؛ ان کے مخصوص رکاز ایسے کچل دیے جاتے ہیں کہ پہچانے نہیں جاتے؛ اور ان کی جگہ شریعت اور روایت کا ایک ٹھوس پیکر لے لیتا ہے۔ ہندو مت، جو تصوف اور وجد آفریں عقیدت میں رچا بسا ہے اور جس کی بنیاد بالآخر مابعد الطبیعیاتی فلسفے کی باطنی تعلیمات پر ہے، کھلی تبلیغ یا

جبری تبدیلیٔ مذہب سے سرے سے آشنا ہی نہیں، اور اپنے مقاصد ایک مختلف اور کہیں لطیف تر انداز میں حاصل کرتا ہے، جس کی کوئی صحیح مثال عالمِ طبیعی میں نہیں ملتی۔ وہ موجود گروہوں کو بڑی حد تک جوں کا توں رہنے دیتا ہے، اور انہیں اسلام کے انداز میں بڑے مربوط مجموعوں میں پیوست کرنے کے بجائے الٹا نت نئے گروہوں کی ایک غیر معین تعداد پیدا کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے؛ لیکن جو قبیلہ بھی ہندو مت کے سحر آ گیں دائرے میں داخل ہو جاتا ہے وہ دیر یا سویر اپنی ابتدائی رسمیں ترک کرنے یا انہیں کسی برہمنی لبادے میں چھپا لینے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ کم سنی کی شادی اپنی تمام تر وابستہ قباحتوں سمیت رائج ہو جاتی ہے؛ بیواؤں پر دوبارہ نکاح کی ممانعت عائد ہو جاتی ہے؛ اور طلاق، جو قبائلی معاشرت میں بڑا اور بحیثیت مجموعی مفید کردار ادا کرتی ہے، یک قلم منسوخ کر دی جاتی ہے۔"

۱۔ راج ترنگنی، جلد اول، صفحہ 131، حاشیہ۔ ۲۔ دی پیپل آف انڈیا (The People of India)، طبع دوم، ۱۹۱۵ء، صفحہ 217۔

سر ہربرٹ قبولِ اسلام کے مختلف واقعات میں بیان کیے جانے والے محرکات پر بحث کرتے ہوئے یہ اسباب تجویز کرتے ہیں: "(۱) اسلام کی پاکیزگی اور سادگی پر حقیقی مذہبی یقین، جو اسلامی کتبِ مقدسہ کے مطالعے سے یا ان مولویوں کے وعظ سے پیدا ہوتا ہے جو گاؤں گاؤں پھرتے ہیں۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں — برہمنوں، راجپوتوں، کائستھوں وغیرہ — کا قبولِ اسلام عموماً اسی سبب سے منسوب کیا جاتا ہے۔ (۲) نچلی ہندو ذاتوں میں اپنی سماجی حیثیت بہتر بنانے کی بڑھتی ہوئی خواہش ان کے افراد کو ایک ایسا عقیدہ اختیار کرنے پر آمادہ کرتی ہے جو انہیں زندگی میں ایک منصفانہ موقع فراہم کرتا نظر آتا ہے۔ (۳) یہ کہاوت

کہ ”محبت ذات پات پر ہنستی ہے“ بھی بڑی تعداد میں تبدیلئ مذہب کا سبب بنتی ہے۔ (۴) کھانے پینے کی ممنوعات اور ذات برادری کی مختلف خلاف ورزیوں سے متعلق اسباب کو بھی پیشِ نظر رکھنا پڑتا ہے۔بیماری یا مصیبت میں ہندوؤں کی تیمارداری مسلمان کرتے ہیں اور وہ ان کے ہاتھ سے کھانا پانی لے لیتے ہیں؛ برادری انہیں خارج کر دیتی ہے اور وہ ایک زیادہ رحم دل دین کی صفوں میں شامل ہو جاتے ہیں۔“

کشمیر میں مسلمان اور ہندو کی خوراک میں کچھ زیادہ فرق نہیں، کیونکہ دونوں گوشت، مچھلی اور اڑنے والے پرندوں سے لطف اندوز ہوتے ہیں، اگرچہ مؤخر الذکر کے ہاں بعض پابندیاں بسا اوقات گراں گزرتی ہیں۔ مثلاً راسخ العقیدہ پنڈت ٹماٹر،پیاز، انڈا اور مرغی نہیں کھاتا، جس سے ہمیں وہ روایت یاد آتی ہے جس کی رو سے کتے کو بھوکا رکھا جا سکتا ہے یا مارا پیٹا جا سکتا ہے، مگر اسے ٹھوکر ہرگز نہیں ماری جا سکتی، کیونکہ وہ یدھشٹر کے ہمراہ جنت تک گیا تھا !

ایک اور تقابل

ہندو مت اور اسلام کا ایک چٹپٹا تقابل، جو نہ کسی ہندو کے قلم سے ہے نہ کسی مسلمان کے، بلکہ مغرب کے ایک عیسائی کے قلم سے، زیرِ بحث موضوع سے کچھ ایسا غیر متعلق نہیں۔ مسٹر گائے ونٹ (Guy Wint) انڈیا اینڈ ڈیموکریسی میں لکھتے ہیں: ”بچپن ہی سے ذات پات کے مسلمات کی فضا میں سانس لینے والے ہندوؤں نے انسانی عدم مساوات کو ایک مستقل اور ناقابلِ تنسیخ حقیقت کے طور پر قبول کر لیا؛ اسلام مساوات کے جوش سے سرشار ایک ہموار کر دینے والا دین تھا، جس کے آگے خود اس کے بادشاہ بھی وقتاً فوقتاً

سرنگوں کیے جاتے تھے۔ ہندو مت، جو اپنی خالص ترین شکل میں اگرچہ نہ بت پرست ہے نہ مشرک، اپنے عام پیروؤں میں پرستش کی خام ترین صورتوں کی اجازت دیتا رہا؛ اسلام ہمیشہ بت شکن رہا ہے۔ ہندوستان کی دنیاوی شان و شوکت کے باوجود ہندو مت نے تارک الدنیا کی تعظیم کی اور عقبیٰ بینوں سے مرعوب رہا؛ اسلام اپنے زاہدانہ فرقوں کے باوجود ایک لذت آشنا دین تھا۔ ہندو مت کی جذباتی تحریک سکون کی جستجو تھی؛ اسلام کی (تصورِ قسمت کے باوجود) عمل کی دھن۔ ہندو مت لطیف، پیچیدہ اور پر تکلف تھا؛ اسلام سادہ اور دوٹوک۔

"یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ دونوں تہذیبوں نے ایک دوسرے پر اثر ڈالا اور ایک دوسرے میں ترمیم کی۔ مثلاً جہاں اسلام پھلا پھولا وہاں ذات پات کا نظام کمزور پڑ گیا؛ اور ہندو اثر کے تحت اسلام کی درشتی میں کچھ کمی آ گئی۔ جن صدیوں میں ترک، افغان اور مغل شمالی ہندوستان پر حکمران رہے، دونوں فرقوں کے اعلیٰ طبقات ایک دوسرے کے قریب تر آ گئے، اور ان کے میل جول سے تھوڑی مدت کے لیے وہ چیز ابھری جسے اردو تہذیب کہا جا سکتا ہے — درباری حلقوں کی ایک ایسی تہذیب جو دونوں قوموں کی زندگی کے بہترین عناصر کا سچا امتزاج تھی اور جس کے وسیلے سے یہ امکان دکھائی دیتا تھا کہ ان میں مصالحت ہو جائے گی۔ عوام میں یہ رابطہ اس سے بھی گہرا تھا، کیونکہ نچلے طبقے کے مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہندوؤں کی پست ذاتوں سے مسلمان ہوئی تھی، اور ان لوگوں نے کم از کم جزوی طور پر ذات پات کی پابندیاں برقرار رکھیں، اس ہندو رسم پرستی کا کچھ حصہ محفوظ رکھا جو اصولاً ان کے نئے دین کو سخت ناگوار تھی، اور اپنی نسل کے قدیم توہمات سے دست بردار ہونے سے انکار کر دیا۔"

یہ آخری تبصرہ کشمیری مسلمان پر خاص طور سے صادق آتا ہے۔ پانچ سو برس کی مسلم حکمرانی تقریباً پندرہ سو برس کے بدھی اور برہمنی رچاؤ کے توہمات کی بیخ کنی کے لیے کافی ثابت نہ ہوئی۔ مسٹر ونٹ اپنی بات اس آخری جملے پر ختم کرتے ہیں: ”دونوں طرف راسخ الاعتقاد لوگوں کے ٹھوس گروہ باقی رہے — کٹر، اثر ناپذیر، بے لچک، اور اپنے اندر سخت ترین امتیاز و علیحدگی کی طرف واپسی کے حق میں شدید تبلیغی تحریکیں پیدا کر لینے کی صلاحیت رکھنے والے۔“ کشمیر کے معاملے میں یہی متعصب کشمیری پنڈت اور دقیانوسی ملا ہے۔

۱۔ دی پیپل آف انڈیا، صفحات 247 تا 248۔ ۲۔ انڈیا اینڈ ڈیموکریسی (India and Democracy)، از سر جارج شسٹر (Sir George Schuster)، سابق رکنِ مالیات حکومتِ ہند، اور گائے ونٹ، سیکرٹری اقتصادی مشنِ جمعیت الاقوام برائے چین، میکملن اینڈ کمپنی، لندن، ۱۹۴۱ء، صفحات 54 تا 55۔

فقیروں اور درویشوں کے ہاتھوں اسلام کی ابتدا

۱۹۳۱ء میں وادیٔ کشمیر کی آبادی تیرہ لاکھ سے متجاوز تھی، جس میں سے ساڑھے بارہ لاکھ سے زائد مسلمان تھے۔ ۱۹۴۱ء کی مردم شماری میں ۱۴٬۶۴٬۰۳۴ کی مجموعی آبادی میں مسلمانوں کی تعداد ۱۳٬۶۹٬۶۲۰ تھی۔ آنجہانی سر ٹامس آرنلڈ (Sir Thomas Arnold) کے ساتھ ہمیں بھی اس امر پر افسوس کرنا پڑتا ہے کہ وہ متعین تاریخی حقائق، جو کشمیر کی آبادی میں مسلمانوں کی ایسی غیر معمولی غالب اکثریت کے وجود کی واضح توجیہ میں ہماری مدد کر سکتے، خاصے کمیاب ہیں۔ یہی رائے ایک مرتبہ سر اورل سٹائن نے میرے سامنے ظاہر کی تھی۔ تاہم جو شہادت بھی دستیاب ہے وہ ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتی ہے کہ وادی میں اسلام کی

اشاعت بحیثیت مجموعی ایک طویل اور مسلسل تبلیغی تحریک کی مرہونِ منت ہے، جس کا آغاز اور نفاذ بنیادی طور پر فقیروں یا درویشوں اور علما یعنی اہلِ دین کے ہاتھوں ہوا، جن میں ایران کے صوبہ دیلم کے پہاڑی قلعے الموت سے آئے ہوئے اسماعیلی مبلغ بھی شامل تھے۔ اس کے علاوہ (۲) وادی کے رقبے کی سمٹی ہوئی یکجائی اور (۳) اس کے باشندوں کی غیر معمولی تقلیدی عادات بھی اس اجتماعی قبولِ اسلام کے اسباب میں شامل تھیں۔

اسلام اپنی اصل کے اعتبار سے، بدھ مت اور عیسائیت کی طرح، ایک تبلیغی مذہب ہے، اور مسلمان مبلغ — خواہ وہ پیر یعنی روحانی رہنما ہو یا واعظ — جس سرزمین میں قدم رکھتا ہے وہاں کے باشندوں تک اسلام کا پیغام پہنچاتا ہے۔ ''مبلغ کے دل میں موجزن روحِ صداقت اُس وقت تک چین نہیں پاتی جب تک وہ فکر، قول اور عمل میں ظاہر نہ ہو جائے۔'' اسی جذبے کے ساتھ مسلمان مبلغ وادیِ کشمیر میں داخل ہوا تاکہ اپنے نمونۂ عمل اور وعظ و تلقین کے ذاتی اسلوب سے وہاں کے لوگوں پر اثرانداز ہو، اور یہ وہ زمانہ تھا جب — لارنس (Lawrence) کے الفاظ میں — سہادیو کے عہدِ حکومت (۱۳۰۰ء تا ۲۰-۱۳۱۹ء) میں، یعنی اسلام کی آمد سے قبل، کشمیر ''شرابیوں اور جواریوں کا ملک'' تھا اور جہاں ''عورتوں کا حال بھی کچھ قابلِ رشک نہ تھا''۔

بلال شاہ المعروف بلبل شاہ کے ہاتھ پر رنچن کا قبولِ اسلام

سلطان صدرالدین، رنچن یا رنچنہ، کشمیر کا پہلا مسلمان حکمران اور انگلستان کے ایڈورڈ سوم کا ہم عصر، اصلاً لداخی تھا — جسے تبتی بھی کہا گیا ہے — اور اس کا تعلق مغربی تبت سے تھا۔ شاہ میر سے، جو اُس زمانے میں ریاستِ کشمیر کی ملازمت میں تھا، ربط و تعلق کے باعث وہ

اسلام کی جانب پہلے ہی سے مائل تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ رنچن نے فی الواقع چودھویں صدی عیسوی کے آغاز میں سید بلال (جن کا نام عرفِ عام میں بلبل ہو گیا) ہی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔

شیخ و مرشد... حق حضرت بلال شد بہ کشمر اول از دستش درخت دین نہال

بلال شاہ یا بلبل شاہ کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ وہ پہلی مرتبہ رنچن کے پیش رو راجہ سہادیو کے عہد میں کشمیر آئے۔ کہا جاتا ہے کہ بلبل شاہ کا اصل نام سید عبدالرحمٰن تھا، اگرچہ بعض کے نزدیک وہ سید شرف الدین تھے، جب کہ بعض دیگر انھیں شرف الدین سید عبدالرحمٰن ترکستانی لکھتے ہیں۔ اتنی بات یقینی ہے کہ وہ ترکستان کے ایک کثیر السیاحت موسوی سید تھے جنھوں نے بغداد میں طویل قیام کیا تھا۔ بلبل شاہ، شاہ نعمت اللہ ولی فارسی کے مریدِ روحانی تھے، جو سلسلۂ سہروردیہ کے خلیفہ تھے — صوفیہ کا وہ طریق یا مکتب جس کی بنیاد شیخ الشیوخ شیخ شہاب الدین سہروردی نے رکھی تھی۔ خواجہ محمد اعظم نے اپنی تاریخ میں کشمیر کے بارے میں حسبِ ذیل شعر شیخِ کبیر سے منقول کیا ہے، مگر حسن کے بقول یہ شعر شہاب الدین سندی کشمیری کا ہے:—

... جنات عدن ھی ..... کان الکشمر...

حاجی مسکین کی رائے یہ ہے کہ بلبل شاہ ملا احمد علامہ کے مرید تھے، جن کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ جب بلبل شاہ پہلی مرتبہ راجہ سہادیو کے عہد میں کشمیر آئے تو وہ اُن کے ہمراہ تھے۔ یہی مصنف ملا احمد علامہ کو سلطان شمس الدین کے عہدِ حکومت (۷۴۰ھ تا ۷۴۳ھ) کا شیخ الاسلام قرار دیتا ہے (حاجی محی الدین مسکین: تاریخِ کبیر، صفحہ 289)۔

تاہم مجھے اندیشہ ہے کہ یہ روایت قبول نہیں کی جا سکتی، کیونکہ یہ باور کرنا نہایت دشوار ہے کہ بلبل شاہ اپنے ہی پیر و مرشدِ روحانی کی موجودگی میں رنچن کے قبولِ اسلام میں پیش قدمی کرتے، اور یوں ایسے عظیم الشان موقع پر خود اُن کے مرشد کو ثانوی حیثیت پر قناعت کرنا پڑتی۔ دستیاب شواہد سے بظاہر یہی ثابت ہوتا ہے کہ بلبل شاہ، شاہ نعمت اللہ ولی فارسی ہی کے مریدِ روحانی تھے۔

سہرورد، جس کی آبادی کُرد تھی، زنجان کے جنوب میں ہمدان کی شاہراہ پر واقع ایک بڑا، فصیل دار اور خوب مستحکم قصبہ تھا۔ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) میں یہ ایران کا ایک قصبہ تھا اور آٹھویں صدی ہجری (چودھویں صدی عیسوی) میں بھی اسے کسی قدر اہمیت حاصل رہی۔ اب اس قصبے کے محلِ وقوع کا مکمل یقین کے ساتھ تعین ممکن نہیں۔

ملا احمد، بلبل شاہ کے دستِ راست تھے؛ اُن کا انتقال سلطان شہاب الدین کے عہد میں ہوا اور وہ بلبل شاہ کے پہلو میں مدفون ہیں۔ ملا موصوف پہلے شیخ الاسلام مقرر ہوئے اور دو کتابوں — فتاویٰ شہابی اور شہابِ ثاقب — کے مصنف تھے۔

بظاہر رنچن کے قبولِ اسلام کے اسباب ایک طرف بلبل شاہ کے دین کی سادگی کا اُس کے دل پر اثر اور دوسری طرف اُس مذہب سے اُس کی اپنی بے اطمینانی تھے جس پر اُس کے گرد وپیش کے لوگ اُس زمانے میں کاربند تھے۔ مختلف اصحاب نے رنچن کے قبولِ اسلام کے مختلف محرکات بیان کیے ہیں — مثلاً کرپا رام اور نارائن کول جیسے بعض مصنفین کا دعویٰ ہے کہ برہمنوں نے اسے ہندو مذہب میں داخل کرنے کی اس کی پیش کش مسترد کر دی تھی، لیکن ملک حیدر اور خواجہ اعظم جیسے دیگر حضرات اسے تسلیم نہیں کرتے — مگر ان

محرکات کی تفصیل میں جانے کی ہمیں ضرورت نہیں۔ اتنا کہنا کافی ہے کہ رنچن نے بلبل شاہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، سلطان صدرالدین کا نام اختیار کیا، اور کشمیر کے پہلے مسلمان حکمران کی حیثیت سے ہماری توجہ کا مستحق ہے۔ مسلمان مؤرخین اس کا نام رنچن ہی لکھتے ہیں۔

رنچن کے قبولِ اسلام کے بعد اُس کے برادرِ نسبتی اور سپہ سالار نیز متعدد دیگر اشخاص نے — ایک روایت کے مطابق دس ہزار افراد نے — بلبل شاہ کا دین اختیار کیا (بلبل شاہ صاحب از مفتی محمد شاہ سعادت، سری نگر، ۱۳۶۰ھ = ۱۹۴۱ء، صفحہ 23، بحوالہ پنج رن (رشی نامہ) از ملا بہاءالدین متو، متوفیٰ ۱۲۴۸ھ)۔ نومسلموں کے اجتماع کے لیے دریائے وِتستا کے کنارے ایک مقام قائم کیا گیا جو بلبل لنکر کہلاتا ہے — لنکر بظاہر "لنگر" بمعنی خانقاہ کی بگڑی ہوئی صورت ہے — اور یہی کشمیر کی پہلی مسجد بھی ہے جو اب بدقسمتی سے کھنڈر بن چکی ہے۔ بلبل لنکر دریائے جہلم کے داہنے کنارے، پانچویں پل علی کدل سے تقریباً دو سو گز نیچے، محلہ بلبل لنکر، سری نگر میں واقع ایک تین منزلہ بوسیدہ چوبی عمارت ہے۔ بلبل شاہ کا وصال ۷۲۷ھ مطابق ۱۳۲۷ء میں ہوا۔

تاریخ وصل شاہ بل قدس گفت؛ خاص الہ...

معلوم ہوتا ہے کہ یہ قطعۂ تاریخ سب سے پہلے خواجہ محمد اعظم نے کہا تھا (بلبل شاہ صاحب از مفتی محمد شاہ سعادت، صفحات 36–37)۔

سر وولزلی ہیگ (Sir Wolseley Haig) نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد اول، باب دوازدہم، صفحہ 277 میں بلبل شاہ کا کوئی ذکر نہیں کیا اور شمس الدین کی تخت نشینی کا سنہ

۱۳۴۶ء قرار دیا ہے، نیز وہ اسے معروف ترصورت شاہ میر کے بجائے شاہ مرزا لکھتے ہیں۔ شمس الدین کی تخت نشینی درحقیقت ۱۳۳۹ء (۷۴۰ھ) میں ہوئی۔

سادات کے ہاتھوں قبولِ اسلام

اہلِ کشمیر کے قبولِ اسلام کے سلسلے کو سادات کی ایک بڑی جماعت کی آمد سے مزید تقویت ملی۔ ان میں نمایاں یہ حضرات تھے: (۱) سید جلال الدین بخاری، جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے لقب سے معروف اور شیخ رکن الدین عالم کے مرید تھے؛ وہ ۷۴۸ھ میں وارد ہوئے اور مختصر قیام کے بعد کشمیر سے رخصت ہو گئے۔ (۲) سید تاج الدین — میر سید علی ہمدانی المعروف شاہ ہمدان کے عم زاد — جو سلطان شہاب الدین کے عہد میں ۷۶۰ھ میں آئے؛ اُن کے ہمراہ اُن کے مرید سید مسعود اور سید یوسف بھی تھے، جو سری نگر کے ایک محلے شہام پور میں اُن کے مزار کے قریب مدفون ہیں۔ (۳) سید حسین سمنانی، جو سید تاج الدین کے چھوٹے بھائی اور شیخ رکن الدین عالم کے مرید تھے، اور ۷۷۳ھ میں وارد ہوئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں بھائیوں — سید تاج الدین اور سید حسین سمنانی — کو سید علی ہمدانی نے، جو زہد و تقدس اور فضائلِ جلیلہ کے باعث محترم تھے، کشمیر بھیجا تھا؛ غالباً اس غرض سے کہ وہ اشاعتِ اسلام کے میدان کا جائزہ لیں اور تیمور کی دست برد سے بچ نکلنے کی کوئی راہ بھی تلاش کریں، جس کے متعلق یہ شبہ تھا کہ وہ سیاسی محرکات کے تحت اس بااثر خاندانِ سادات کے قتلِ عام کا ارادہ رکھتا ہے۔ سید حسین، اسلام آباد کی تحصیل کولگام میں ایک خوبصورت مزار میں آسودۂ خاک ہیں، جب کہ دوسرے بھائی اونتی پور کے قریب اسلام آباد کی شاہراہ کے بالکل متصل مدفون ہیں۔

میر سید علی ہمدانی

کشمیر میں اشاعتِ اسلام پر اُن کی شخصیت کے غیر معمولی اثر کے پیشِ نظر میرے نزدیک "رسول کشمیر" سید علی ہمدانی کا قدرے مفصل ذکر ضروری ہے۔ ہم انھیں "شاہ ہمدان" کہیں گے، کیونکہ کشمیر میں وہ اسی لقب سے سب سے زیادہ معروف ہیں۔

سر محمد اقبال نے جاوید نامہ میں اُن کے حضور ایک مناجات کی ہے۔

تہران (ایران) سے 145 میل مشرق میں ایک وسیع میدان کے عین وسط میں جزیرے کی مانند سمنان کا گاؤں واقع ہے۔ یہ ویران باغات کا ایک مجموعہ معلوم ہوتا ہے: مٹی کی فصیلوں کے اندر ایک غیر آباد بستی، جس میں جا بجا کوئی ندی یا مٹی کے پشتوں سے بندھا تالاب ہے، اور عین وسط میں نگینے کی مانند فیروزئی رنگ کا ایک ننھا سا گنبد۔ جب میں ۱۹۳۶ء کے اواخر میں ادھر سے گزرا تو جدید قصبے میں ایک کارخانۂ بافندگی اور ایک بیمارستان (ہسپتال) موجود تھا۔

سیدِ بزرگ، علی ہمدانی یا شاہِ ہمدان — جو امیرِ کبیر یعنی بڑے امیر اور علیِ ثانی یعنی دوسرے علی کے القاب سے بھی معروف ہیں — بروز پیر ۱۲ رجب ۷۱۴ھ (۱۳۱۴ء) کو ایران کے شہر ہمدان میں پیدا ہوئے۔ "رحمۃ اللہ" کے قطعۂ تاریخ سے اُن کی ولادت کا سنہ، یعنی ۷۱۴ھ، برآمد ہوتا ہے اور اسی کو اُن کا تاریخی نام سمجھنا چاہیے۔

اُن کی والدہ کا نام فاطمہ اور والد کا نام سید شہاب الدین بن میر سید محمد حسینی تھا۔ رسالہ خلاصۃ المناقب کے مطابق اُن کا نسب امام حسینؓ کے واسطے سے حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے، اور وہ علی بن ابی طالبؓ کی سولھویں پشت میں براہِ راست اُن کی اولاد میں سے تھے

(ڈاکٹر ہرمان ایتھے (Dr. Hermann Ethé) کی فہرستِ مخطوطاتِ کتب خانہ بوڈلین، آکسفرڈ یونیورسٹی پریس، ۱۸۸۹ء، حصہ اول، صفحہ 783)۔ سید علی ہمدانی نے عین لڑکپن ہی میں حفظِ قرآن کی سعادت حاصل کر لی۔ انھوں نے علومِ اسلامیہ کی تحصیل کی، کسبِ علم کیا، اور اپنے ماموں سید علاء الدین سمنانی کی تربیت میں تصوف یعنی صوفیہ کے علمِ باطن کی تعلیم پائی۔

وہ اول اول شیخ ابوالبرکات تقی الدین علی کے مرید ہوئے اور اُن کی وفات کے بعد رے میں شیخ شرف الدین محمود مزدقانی کے حلقۂ ارادت میں داخل ہوئے۔ شیخ مزدقانی کا شجرۂ طریقت خود شاہ ہمدان نے قلم بند کیا ہے۔

کشمیر میں شاہ ہمدان کی اہمیت کے پیشِ نظر اُن کے وطن ہمدان کا مختصر تعارف شاید ضروری ہے۔ ہمدان ایران کے ایک شہر اور ایک صوبے، دونوں کا نام ہے۔ یہ شہر اصفہان سے 260 میل شمال مغرب اور تہران سے 188 میل جنوب مغرب میں، 5,930 فٹ کی بلندی پر—یعنی سری نگر سے تقریباً 700 فٹ بلند—کوہِ الوند کے دامن کے قریب واقع ہے، جس کی چوٹی اس کے مغرب میں 11,900 فٹ کی بلندی تک اٹھتی ہے۔ یہ شہر اسلامی علم و ثقافت کا مرکز رہا ہے۔

ہمدان تقریباً ستر ہزار باشندوں کا ایک مصروف تجارتی مرکز ہے، جن میں چار ہزار یہودی اور تین سو آرمنی شامل ہیں؛ یہاں وسیع اور مالامال بازار اور متعدد چھوٹی بڑی کاروان سرائیں ہیں۔ یہاں کے دباغ خانوں میں ایسا چمڑا تیار ہوتا ہے جو پورے ملک میں نہایت قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کثیر مقدار میں دوسرے صوبوں کو برآمد کیا جاتا ہے۔ زینیں، ساز و یراق، صندوق اور دیگر چرمی اشیا یہاں تیار ہوتی ہیں۔ قالین، اونی اور سوتی کپڑے، نمدے

اور تانبے کے برتنوں ایسی صنعتیں فروغ پر ہیں۔ شاید اسی سے سمجھ میں آتا ہے کہ شاہ ہمدان نے کشمیر میں صنعت و حرفت کو کیونکر مہمیز دی۔ ہمدان کی آب و ہوا خوشگوار ہے، مگر سردیاں طویل اور سخت ہوتی ہیں اور برف خوب پڑتی ہے۔

خیال کیا جاتا ہے کہ ہمدان قدیم اکبتانا (Ecbatana) کے مقام پر آباد ہے۔

اس کے مزارات میں یہودی آج بھی شہر کے وسط میں ایک معمولی سی گنبد دار عمارت میں آستر اور مردکی — ایک سابق یہودی ملکہ اور امیر — کے منسوب مدفن دکھاتے ہیں۔ ہمدان میں ابو علی بن سینا (Avicenna) کی قبر بھی ہے، جن کا انتقال ۱۰۳۶ء میں ہوا۔ شاہ ہمدان نے ہمدان کے نام سے متعلق مسائل پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ ۱۹۳۶ء میں مجھے ہمدان میں شکستہ حال گنبدِ علویان دکھایا گیا، جو شاہ ہمدان، اُن کے اسلاف اور اُن کی اولاد کے مراقبوں سے منسوب ہے۔

شیخ مزدقانی نے اُن سے خواہش ظاہر کی کہ وہ دنیا کی وسیع سیاحت کے ذریعے اپنی تعلیم کی تکمیل کریں؛ چنانچہ شاہ ہمدان نے یہ سفر اختیار کیا اور نتیجتاً متعدد ممالک کی سیر کی۔ وہ لگ بھگ اکیس برس سفر میں رہے، اور یوں عہد کے متعدد صوفیہ (اہلِ باطن) اور علما سے ملے اور اُن کی صحبت سے فیض یاب ہوئے۔ امین احمد رازی کی ہفت اقلیم [تالیف ۱۰۰۲ھ = ۹۴-۱۵۹۳ء، یا بہ روایتِ دیگر ۱۰۲۸ھ = ۱۶۱۹ء] کے مطابق شاہ ہمدان نے تین مرتبہ تمام دنیا کا سفر کیا اور چودہ سو اولیا سے ملاقات کی۔ اسفار کی تکمیل کے بعد شاہ ہمدان اپنے وطن واپس آئے۔ اسی واپسی کے بعد تیمور کے عروج نے انھیں کشمیر کی راہ لینے پر مجبور کیا۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان شہاب الدین کے عہد میں ۷۷۴ھ (۱۳۷۲ء) میں سات سو سادات اُن کے ہمراہ وادی میں آئے۔ کشمیر کا فرماں روا شہاب الدین اُس وقت اوہند (یا اُنڈ، اٹک سے

سولہ میل بالائی جانب) کے حکمران کے خلاف مہم پر گیا ہوا تھا، اور سلطان کا بھائی قطب الدین، جو بعد ازاں اُس کا جانشین ہوا، اُس کی جگہ نظمِ حکومت چلا رہا تھا۔ چار ماہ کے قیام کے بعد شاہ ہمدان میدانِ جنگ کی جانب روانہ ہوئے اور فریقین کو صلح پر آمادہ کر لیا۔ اس کے بعد شاہ ہمدان مکہ تشریف لے گئے اور سلطان قطب الدین کے زمانے میں ۷۸۱ھ (۱۳۷۹ء) میں دوبارہ وادی میں وارد ہوئے۔ تقریباً ڈھائی برس کے قیام کے بعد وہ ۷۸۳ھ میں ترکستان جاتے ہوئے بہ راہِ لداخ روانہ ہو گئے۔ شاہ ہمدان کی تیسری آمد ۷۸۵ھ (۱۳۸۳ء) میں ہوئی۔

پروفیسر عبدالقادر کی فہرستِ مخطوطاتِ کتب خانہ جامعہ بمبئی، صفحہ 71۔ امین احمد، نواب اعتماد الدولہ — نورجہاں کے والد — کا عم زاد تھا۔

اور ۷۸۲ھ نہیں، جیسا کہ بیل (Beale) نے اپنی اورینٹل بایوگرافیکل ڈکشنری (اشاعت ۱۸۸۱ء، صفحہ 238) میں لکھا ہے، کیونکہ حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ سے ۷۷۴ھ برآمد ہوتا ہے:—

گفت از ... مقدم شریف ... سال ... مقدم او را ...

بعض مؤرخین نے اوہند کو ہند سمجھ لیا ہے، حتیٰ کہ کرنل ہیگ (جلد سوم، صفحہ 278) سے بھی یہی لغزش ہوئی ہے۔

ایک قطعۂ تاریخ کے مطابق:—

ھاتف غیب سال مقدم ... گفت ... آمد اینجا

یہ اور اس سے پہلے کے قطعاتِ تاریخ سید محمد خاوری کے ہیں، جو شاہ ہمدان کے فرزند سید محمد ہمدانی کے ہم عصر تھے (ملاحظہ ہو تاریخِ کبیر، صفحہ 12 اور صفحہ 28)۔

لیکن علالتِ طبع کے باعث انھیں کشمیر چھوڑنا پڑا، اور پکھلی کے حکمران—جس کا نام سلطان محمد تھا—کی درخواست پر انھوں نے وہاں دس روز قیام کیا۔ پکھلی سے شاہ ہمدان کنڑ (یا کافرستان میں نورگل سے ملحق کنڑ) کے نواح میں پہنچے، جہاں مختصر قیام کے بعد یکم ذی الحجہ ۷۸۶ھ (۱۳۸۴ء) کو اُن کے مرض نے پلٹا کھایا اور پانچ دن تک انھوں نے کچھ نہ کھایا۔ منگل ۵ ذی الحجہ کو انھوں نے کئی بار پانی نوش کیا اور اسی شب بہتّر برس کی عمر میں رحلت فرمائی۔

بسترِ مرگ پر اُن کی زبان پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم جاری تھا، اور عجب اتفاق ہے کہ اسی سے اُن کے وصال کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

تاریخ ... شاہ مدان ... ز ھجرت ھفتصد و ... برقت از عالم ... ار ھر دو عالم آل سین

[یعنی: خاتم الانبیا احمد ﷺ کے زمانے—یعنی ہجرت—سے ۷۸۶ برس پر، دونوں جہانوں کا سردار، آلِ یٰسین کا فرزند، اس عالمِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف رخصت ہوا۔]

شاہ ہمدان خُتلان میں سپردِ خاک ہوئے۔

۱۔ پکھلی پنجاب کا ایک قدیم ضلع تھا جو اب شمال مغربی سرحدی صوبے کے ضلع ہزارہ میں شامل ہے۔ بابر کے عہد میں یہ خطہ کھکھا اور بمبا قبائل کے قبضے میں تھا، جن کے سردار دریائے سندھ کے مشرقی علاقوں کے حکمران رہ چکے تھے، مگر باجوڑ اور سوات کے گبری سلاطین نے انہیں وہاں سے نکال باہر کیا تھا۔ اس علاقے کے باشندے آج بھی پشتو بولتے ہیں—بابر کی یادداشتوں کا کنگ ایڈیشن (King's Edition)، جلد دوم، صفحہ 201 کا حاشیہ۔ ابوالفضل کے بیان کے مطابق (جیرٹ (Jarrett) کا ترجمہ آئینِ اکبری، جلد دوم، ص 391)

سرکارِ سوات یا سوادتین اضلاع — بھمبر، سوات اور باجوڑ — پر مشتمل تھی۔ سوات کی لمبائی چالیس اور چوڑائی پانچ سے پندرہ کوس تھی؛ اس کے شمال میں کاشغر واقع ہے، اور سوات ہی حاکم کی اقامت گاہ تھا۔ دریائے سندھ کو (مشرق کی جانب) عبور کرنے کے بعد شمالی پہاڑوں میں ایسے علاقے واقع ہیں جو کشمیر سے متعلق ہیں اور کبھی اسی میں شامل تھے، اگرچہ ان میں سے اکثر — مثلاً پکھلی — اب اس کے تابع نہیں رہے — بیورج (Beveridge) کا ترجمہ بابرنامہ، ۱۹۲۱ء، جلد دوم، ص 484۔ ابوالفضل کے مطابق پکھلی اکبر کے عہد میں ایک سرکار تھی، جس کی لمبائی 35 اور چوڑائی 25 کوس تھی۔ تیمور نے اس خطے کی حفاظت کے لیے کچھ فوجی دستے چھوڑے تھے جن کی اولاد آج تک وہیں آباد ہے۔ اس ضلع کے حکمران کشمیر کو خراج ادا کرتے تھے — کرنل جیرٹ کا ترجمہ آئینِ اکبری، ۱۸۹۱ء، جلد دوم، صفحات 390-91۔

۲۔ ختلان، ختلاں یا ختل کی ریاست یا صوبے کا محلِ وقوع ۱۸۷۲ء میں سر ایچ یول (Sir H. Yule) نے موجودہ کولاب سے کچھ شمال اور دروازکے مغرب میں (ترکستان میں، افغانستان کی شمال مشرقی سرحد سے بالکل پرے) متعین کیا تھا؛ لیکن مسٹر مایف (Mayef)، جس نے تین برس بعد اس خطے کی سیاحت کی، کا خیال ہے کہ قدیم ختلان کا مرکز قرغان تپہ تھا، جو زیریں سرخاب (یا وخش) پر کولاب سے تھوڑے فاصلے پر مغرب میں واقع ہے۔ ختلان کم از کم پندرہویں صدی کے اواخر تک قائم رہا، کیونکہ ۱۴۹۸ء میں ہم دیکھتے ہیں کہ قندوز کا خسرو شاہ اس کی حکومت اپنے بھائی ولی کو عطا کرتا ہے۔

خزینۃ الاصفیاء (جلد اول، ص 293) اس امر کی وضاحت کرتی ہے کہ شاہ ہمدان کی تدفین ختلان میں کیونکر ہوئی: آپ کا انتقال ہزارہ (پکھلی) میں ہوا اور پکھلی کا سلطان چاہتا تھا کہ

تدفین وہیں ہو، مگر آپ کے مریدوں کی خواہش — جس کی کوئی وجہ بیان نہیں کی گئی — یہ تھی کہ تدفین ختلان میں کی جائے۔ فیصلے کے لیے انہوں نے سلطان کو دعوت دی کہ وہ میت سمیت جنازہ اٹھا کر دکھائے۔ جنازہ اپنی جگہ سے نہ ہل سکا؛ لیکن جب مریدوں میں سے صرف ایک نے اسے اٹھانا چاہا تو وہ تنہا ہی اسے اٹھانے اور اپنے سر پر رکھ کر لے جانے پر قادر ہوا۔ چنانچہ تدفین ختلان میں ہوئی۔ یہ وفات ۷۸۶ھ (۱۳۸۴ء) میں واقع ہوئی۔ سید موصوف کی ایک یادگار پکھلی میں قائم ہے، جو اب شمال مغربی سرحدی صوبے کے ضلع ہزارہ کی تحصیل مانسہرہ کا حصہ ہے۔

ابو الفضل کا بیان ہے (آئینِ اکبری، جیرٹ، جلد دوم، ص 392) کہ "امیر سید علی ہمدانی کا انتقال یہاں (سوات کے قریب باجوڑ میں) ہوا اور ان کی وصیت کے بموجب ان کی میت ختلان پہنچائی گئی۔" لیکن بابر لکھتا ہے: "میر سید علی ہمدانی (اللہ ان پر رحمت فرمائے!) سفر کے دوران یہاں (کافرستان میں کُنڑ مع نورگل) پہنچے اور کُنڑ سے دو میل (ایک شرعی فرسخ) اوپر انتقال فرما گئے۔ ان کے مریدوں نے ان کی میت ختلان پہنچائی۔ ان کی وفات کے معزز مقام پر ایک مزار تعمیر ہوا، جس کا میں نے — جب ۹۲۰ھ (۱۵۱۴ء) میں آ کر چغان سرائے فتح کیا — طواف کیا۔" — بابرنامہ، اے ایس بیورج کا انگریزی ترجمہ، جلد اول، ص 211۔ یہ ریاست اور اس کا نام دونوں اب مٹ چکے ہیں — الیاس اور راس (Elias and Ross) کا انگریزی ترجمہ تاریخِ رشیدی، ۱۸۹۵ء، ص 21، حاشیہ۔ بابر کے زمانے میں، بلکہ ابن حوقل کے عہد تک، ختل یا ختلان کا نام اس ملک پر بولا جاتا تھا جو دریائے آمو کی بالائی شاخ — حرات یا پنج — کے کنارے واقع تھا، جو اسے جنوب میں بدخشاں سے جدا کرتی تھی — بابر کی یادداشتیں، کنگ ایڈیشن، ۱۹۲۱ء، جلد اول، صفحات lxviii-lxix۔ وخشاب (جیحوں کے سب سے بڑے معاون دریا) اور جیحوں کے مابین زاویے میں واقع عظیم

کوہستانی خطہ "خُتّل" کہلاتا تھا؛ یہ نام مبہم طور پر خراسان کے مشرق و شمال کی تمام غیر مسلم سرزمینوں پر بھی بولا جاتا تھا۔ خُتّل اس علاقے میں شامل تھا جو وخش کے کنارے اس کے شمال میں واقع تھا، جہاں سے وخشاب نکلتا ہے۔ اصطخری لکھتا ہے کہ یہ خطہ نہایت زرخیز تھا اور اپنے عمدہ گھوڑوں اور باربردار جانوروں کے لیے مشہور تھا؛ اس کی متعدد ندیوں کے کناروں پر بہت سے بڑے شہر آباد تھے، جہاں غلے کے کھیت اور پھلوں کے باغات وافر پیداوار دیتے تھے۔ دسویں صدی عیسوی یعنی چوتھی صدی ہجری میں خُتّل کا دارالحکومت ہُلبک تھا۔ اس ملک کے نام کے بارے میں بہت التباس پایا جاتا ہے: خُتّل، ختلاں اور خُتّلان بلا امتیاز مستعمل ہیں۔ تاہم قزوینی (جلد دوم، ص 352) کے مطابق ختلاں ترکوں کے ایک شہر کا نام تھا جو پہاڑوں کے درمیان ایک درے میں واقع تھا اور جس کا محلِ وقوع اس نے متعین نہیں کیا۔ علی یزدی (جلد اول، ص 464 وغیرہ) تیمور کی مہمات کے بیان میں عموماً "ختلاں" لکھتا ہے — جی لی سٹرینج (G. Le Strange)، دی لینڈز آف دی ایسٹرن کیلی فیٹ، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۰۵ء، طبعِ ثانی ۱۹۳۰ء، ص 438۔

شاہ ہمدان کا تعلق صوفیہ کے سلسلۂ کبرویہ سے تھا، جس کے بانی خوارزم کے شیخ نجم الدین کبریٰ تھے، جن کی وفات ۶۱۸ھ = ۱۲۲۱ء میں ہوئی۔ کبروی سلسلہ سہروردی سلسلے کی ایک شاخ ہے۔ اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ وادی کے قبولِ اسلام کو شاہ ہمدان کی موجودگی سے تقویت پہنچی۔ آپ کے نمایاں رفقائے کار یہ تھے: ۱۔ میر سید حیدر، ۲۔ سید جمال الدین، ۳۔ سید کمالِ ثانی، ۴۔ سید جمال الدین علائی، ۵۔ سید رکن الدین، ۶۔ سید محمد، ۷۔ سید عزیز اللہ۔ انہوں نے ملک بھر میں خانقاہیں قائم کیں جو کشمیر کے گوشے گوشے میں اشاعتِ دین کے مراکز کا کام دیتی تھیں، اور ان بزرگوں کے اثر و رسوخ نے پیغمبرِ عرب صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کی قبولیت کو یقیناً فروغ دیا۔ نو مسلم لوگوں نے تبدیلیِ مذہب کے نتیجے میں

ازخود مندروں کو مسجدوں میں بدل دیا۔ دو مشہور واقعات — جن میں اس زمانے کے دو سرکردہ سنیاسیوں یعنی ہندو تارک الدنیا سادھوؤں نے اپنے پیروکاروں سمیت، اپنی "مافوق الفطرت" قوتوں کی آزمائش کے بعد، شاہ ہمدان کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا — نے بظاہر پروہتوں کے زیرِ اثر کشمیریوں کو سید موصوف کے دین کی عظمت کا قائل کر دیا۔ دریائے وتستا (جہلم) کے کنارے شاہ ہمدان کی موجودہ مسجد یا زیارت گاہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ ۷۹۸ھ = ۱۳۹۵ء میں اسی مقام پر تعمیر کی گئی جہاں ان آزمائشوں میں سے ایک پیش آئی تھی۔ یہ خانقاہ، جو پہلے پہل سلطان قطب الدین نے تعمیر کرائی، درحقیقت سیدِ بزرگ کے چلہ خانے یعنی گوشۂ عبادت و ریاضت کی نمائندگی کرتی ہے، نہ کہ ان کے مزار کی، جو ختلان میں ہے۔ یہ عمارت زیادہ تر دیودار کی لکڑی سے تعمیر کی گئی ہے، اس پر لکڑی کا مخروطی کلس ہے جس پر پیتل چڑھا ہوا ہے، اور مجموعی حیثیت میں یہ نہایت خوش منظر عمارت ہے۔

سلطان قطب الدین خود سید موصوف کی عظمت کا معترف تھا، جیسا کہ اس امر سے ظاہر ہے کہ سلطان نے — جس نے شریعتِ اسلامی کے خلاف دو بہنوں سے نکاح کر رکھا تھا — شاہ ہمدان کے ارشاد پر اپنی ایک بیوی کو طلاق دے دی۔ سلطان نے اسلامی ممالک میں اس وقت رائج لباس بھی اختیار کیا، اور سید کی عطا کردہ ٹوپی کی اس درجہ تعظیم کرتا تھا کہ اسے ہمیشہ اپنے تاج کے نیچے پہنے رکھتا۔ یہ ٹوپی بعد کے سلاطین کو منتقل ہوتی رہی، اور سلطان فتح شاہ کی وفات سے قبل اس کی خصوصی وصیت کے مطابق اس کی میت کے ساتھ دفن کر دی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ کسی نے پیش گوئی کی تھی کہ اس ٹوپی کا دفن ہونا خاندان کے دفن ہونے کی علامت ہو گا، اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ چکوں کے عروج کے ساتھ یہ خاندان واقعی ختم ہو گیا۔ شاہ ہمدان صرف ولی ہی نہیں بلکہ مصنف بھی تھے۔ انہوں نے فارسی زبان میں ذخیرۃ الملوک تصنیف کی، جو سیاسی اخلاقیات اور حسنِ حکمرانی کے اصولوں پر

ایک رسالہ ہے۔ اس کتاب کے برٹش میوزیم والے نسخے [Add. 7618، جلد دوم، ص 447] کے 250 ورق ہیں، ہر صفحے پر پندرہ سطریں ہیں، اور یہ خوش خط نستعلیق میں لکھا ہوا ہے۔ ذخیرۃ الملوک حسبِ ذیل دس ابواب پر مشتمل ہے: (۱) ایمان؛ (۲) انسان کے فرائض؛ (۳) اخلاقِ فاضلہ؛ (۴) والدین، بیویوں، شوہروں اور اولاد وغیرہ کے حقوق و فرائض؛ (۵) قواعدِ حکمرانی اور رعایا کے حقوق و فرائض؛ (۶) روحانی سلطنت؛ (۷) حلال پر عمل اور حرام سے اجتناب؛ (۸) شکر اور قناعت؛ (۹) مصائب پر صبر؛ (۱۰) غرور اور غصے کی مذمت اور تواضع و عفو کی فضیلت۔ ذخیرۃ الملوک کا لاطینی ترجمہ ارنسٹ فریڈرک کارل روزن ملر (Ernest Friedrick Carl Rosenmueller) نے ۱۸۲۵ء میں کیا اور فرانسیسی ترجمہ سی سولوینت (C. Solvent) نے ۱۸۲۹ء میں کیا۔ ہندوستان کے ابتدائی قبل از مغل عہد میں یہ کتاب اہلِ علم کی محبوب کتاب تھی۔

۱۔ یہ کتاب نیاز علی خان، امرتسر نے طبع کرائی۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۳۳۴ھ میں لاہور سے شائع ہوا۔ ۲۔ دی ایڈمنسٹریشن آف جسٹس اِن میڈیول انڈیا، از محمد بشیر احمد، ایم اے، ایم لٹ، آئی سی ایس، علی گڑھ یونیورسٹی سٹڈیز آن ہسٹری، ۱۹۴۱ء، ص 39۔

شاہ ہمدان کی فارسی اور عربی میں دیگر تصانیف بھی ہیں۔ ان میں ایک رسالہ مراقبے کے موضوع پر ہے۔ رسالہ مکتوبات میں امیرِ کبیر کے خطوط جمع ہیں۔ در معرفتِ صورت و سیرتِ انسان میں انسان کے جسمانی اور اخلاقی اوصاف سے بحث کی گئی ہے۔ در حقائقِ توبہ توبہ کی اصل حقیقت سے متعلق ہے۔ ایک رسالہ ابن العربی کی فصوص الحکم کی شرح ہے۔ شرح قصیدۂ خمریہ فارضیہ اس قصیدۂ خمریہ کی شرح ہے جو عمر ابن الفارض کی تصنیف ہے، جن کی وفات ۷۸۶ھ = ۱۳۸۵ء میں بیان ہوئی ہے۔ رسالہ الاصطلاحات صوفیانہ

اصطلاحات و تعبیرات پر ایک رسالہ ہے۔ ایک اور رسالہ (دہ قاعدہ) مراقبانہ زندگی کے دس قاعدے بیان کرتا ہے، اور ایک رسالہ علمِ قیافہ پر ہے۔ کتاب المودۃ میں اقارب کی باہمی محبت سے متعلق احادیث یکجا کی گئی ہیں۔ کتاب فی فضائل امیر المومنین میں حضرت علیؓ کی ستر خوبیاں بیان ہوئی ہیں۔ ایک رسالہ انسان کی اخروی زندگی کے بارے میں چالیس احادیث پر مشتمل ہے۔ ایک تصنیف شجاع الدین شیریہ کی ضخیم کتاب فردوس الاخبار کا انتخاب ہے۔ منازل السالکین تصوف کے موضوع پر ہے۔ اورادِ فتحیہ میں توحیدِ باری تعالیٰ اور صفاتِ الٰہی کا تصور پیش کیا گیا ہے۔ خلاصۃ المناقب مختلف صوفیانہ مسائل پر ایک عارفانہ رسالہ ہے، جس میں آیاتِ قرآنی اور احادیث سے استشہاد کیا گیا ہے اور شاہ ہمدان کی سیرت کے محاسن کی تشریح بھی شامل ہے۔ یہ شاہ ہمدان کے شاگرد مولانا نورالدین جعفر البدخشی کی تصنیف ہے۔

شاہ ہمدان شاعر بھی تھے۔ ان کی نظمیں فطری طور پر صوفیانہ رنگ رکھتی ہیں۔ چہل اسرار دینی اور عارفانہ نظموں کا ایک مختصر مجموعہ ہے، جس کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے:

ای گرفتارانِ عشقت فارغ از مال و منال

شاہ ہمدان کی حیات اور کارناموں کا خلاصہ سر محمد اقبال کے حسبِ ذیل اشعار سے بہتر انداز میں ممکن نہیں:

سید السادات سالارِ عجم دستِ او معمارِ تقدیرِ امم تا غزالی درسِ اللہ ہو گرفت ذکر و فکر از دودمانِ او گرفت میر و درویش و سلاطیں را مشیر خطہ را آں شاہِ دریا آستیں داد علم و صنعت و تہذیب و دیں آفرید آں مرد ایرانِ صغیر

[نوٹ: سید علی شاہ ہمدان کی حیات اور تصانیف کے مزید تذکروں کے لیے قاری حسبِ ذیل ماخذ ملاحظہ کر سکتا ہے: حبیب السیر، جلد ۳، جزو ۳، ص 87؛ نفحات الانس، ص 515؛ تذکرۂ دولت شاہ، ص 325؛ ہفت اقلیم، ورق 277 الف؛ تقی اوحدی، ورق 478 الف؛ مجمع النفائس، جلد ۲، ورق 306 الف؛ ریاض الشعراء، ورق 263؛ مخزن الغرائب، ورق 548؛ مفتاح التواریخ، ص 143؛ مجمع الفصحاء، جلد اول، ص 340؛ حاجی خلیفہ، جلد ۴، ص 426؛ ریو (Rieu) کا فارسی کیٹلاگ، جلد ۲، ص 447؛ ایتھے (Ethé) کا بودلین لائبریری کیٹلاگ، نمبر 1451-1453 اور نمبر 1241 (28)؛ جی فلوگل (G. Flügel) کا ویانا کیٹلاگ، جلد ۳، ص 420؛ بلوشے (Blochet) کا کیٹلاگ، پیرس، نمبر 156-157؛ ڈبلیو پرچ (W. Pertsch) کا برلن کیٹلاگ، ص 7، نمبر 5؛ ص 275، نمبر 4؛ نمبر 9، 7؛ برلن کیٹلاگ، ص 235، 5 اور 379، 2؛ فلائشر (Fleischer) کا کیٹلاگ، ڈریسڈن، نمبر 198، 20؛ بانکی پور کیٹلاگ آف پرشین مینوسکرپٹس، جلد اول، نمبر 150، ص 229-31، نیز جلد ۹، نمبر 943، ص 194-95؛ ڈبلیو ایوانوف (W. Ivanow) کا کیٹلاگ آف پرشین مینوسکرپٹس (بنگال ایشیاٹک سوسائٹی)، ۱۹۲۴ء، ص 659؛ پروفیسر براؤن (Browne) کا کیٹلاگ آف اورینٹل مینوسکرپٹس، کیمبرج، ص 156۔]

میر محمد ہمدانی

کشمیر میں شریعتِ اسلامی کے نفاذ کو تحریک دینے کے سلسلے میں شاہ ہمدان کے جانشین ان کے فرزند میر محمد ہمدانی ہوئے۔ میر محمد ۷۷۴ھ = ۱۳۷۲ء میں پیدا ہوئے اور والد کی وفات کے وقت ان کی عمر بارہ برس تھی۔ کہا جاتا ہے کہ شاہ ہمدان نے اپنی وفات (۱۳۸۴ء) سے قبل مولانا سرائی (سرائی خراسان، ایران کا ایک قصبہ ہے) کے سپرد بعض دستاویزات

کی تھیں تاکہ وہ انہیں ان کے دو ممتاز خلفاء — خواجہ اسحاق ختلانی اور مولانا نورالدین جعفر بدخشی — تک پہنچا دیں۔ ان دستاویزات میں ان کا وصیت نامہ (الوداعی نصیحت یا وصیت) اور خلافت نامہ (جانشینی کی سند) شامل تھے۔ خواجہ اسحاق اور مولانا نورالدین نے یہ دستاویزات میر محمد کے حوالے کر دیں، سوائے خلافت نامے یعنی جانشینی کی سند کے، جو خواجہ اسحاق نے یہ کہہ کر اپنے پاس رکھ لی کہ یہ صرف اسی شخص کے سپرد کی جا سکتی ہے جو اس کا اہل ثابت ہو۔ یہ بظاہر میر محمد کے لیے اشارہ تھا کہ وہ اپنے عظیم والد کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیے کوشاں ہوں۔ چنانچہ میر محمد نے اپنے والد کے انہی ممتاز معتقدین سے کسبِ فیض کیا اور وقت گزرنے کے ساتھ اپنے والد کی روحانی پیشوائی کے منصب کے جانشین قرار پائے۔ وہ تصوف پر ایک رسالے کے مصنف تھے اور انہوں نے منطق کی مشہور عربی کتاب شمسیہ کی شرح بھی لکھی۔

ملک سہہ بھٹ کا قبولِ اسلام

بائیس برس کی عمر میں میر محمد ۷۹۶ھ = ۱۳۹۳ء میں وادی میں وارد ہوئے۔ کشمیر پہنچنے پر سکندر نے ان کا نہایت اعزاز و اکرام کے ساتھ استقبال کیا۔ اس زمانے میں سکندر کا وزیرِ اعظم اور افواج کا سپہ سالار ملک سہہ بھٹ (سنہہ بھٹ) نامی ایک برہمن تھا، جو بظاہر میر محمد کی شخصیت اور ان کے دین، طرزِ زندگی اور تعلیمات کی سادگی سے متاثر ہوا اور اپنے پورے خاندان سمیت مشرف بہ اسلام ہو گیا۔ میر محمد کی پہلی بیوی بی بی تاج خاتون کا انتقال ہو چکا تھا؛ سہہ بھٹ نے قبولِ اسلام کے بعد اپنی بیٹی کا — جس کا نیا نام بی بی بارعہ رکھا گیا — رشتہ انہیں پیش کیا۔ سہہ بھٹ نے سیف الدین کا اسلامی نام اختیار کیا اور اسی

بنا پر ملک سیف الدین کے نام سے معروف ہوا۔ علی کدل کے قریب سہیار مسجد، سہیار بل اور محلہ سہیار آج بھی اس کی یاد تازہ رکھتے ہیں۔

میر محمد ہمدانی کی زوجہ بی بی بارعہ — جو دیدہ ماجی کے نام سے معروف ہیں — کا مزار سری نگر سے پانچ میل کے فاصلے پر، چرار شریف جانے والی سڑک پر، کوٹر (کرالہ پورہ) میں واقع ہے۔

میر محمد کے ارشاد پر شراب کی کشید اور اس کی خرید و فروخت اور استعمال ممنوع قرار دیے گئے۔ ستی (شوہر کی چتا پر بیوہ کی خود سوزی)...

ممنوع تھا۔ قمار بازی اور ناچ (لڑکیوں کا رقص) بھی ممنوع قرار دیے گئے۔ میر محمد کے پاس بدخشاں کا وہ لعل تھا جو انہوں نے سکندر کی نذر کر دیا۔ سلطان نے اس کے صلے میں تین بڑے گاؤں عطا کیے، یعنی: (۱) پرگنہ شاورہ سے واچی،

(۲) پرگنہ مارتنڈ سے نوناوانی اور (۳) پرگنہ اولر سے ترال — بطور جاگیر یعنی مستقل ملکیت، جنہیں سید موصوف نے اپنے لنگر خانے یعنی خانقاہ کے لیے وقف قرار دے دیا۔ یہ وقف نامہ، سلطان کی توثیق کے ساتھ، پیر حسن شاہ نے اپنی تاریخِ حسن میں نقل کیا ہے۔

میر محمد تقریباً بائیس برس کشمیر میں مقیم رہے اور پھر ۸۱۷ھ میں حج کے لیے روانہ ہو گئے۔ مکہ سے واپسی پر وہ ختلان لوٹ گئے، جہاں ۱۷ ربیع الاول ۸۵۴ھ (۱۴۵۰ء) کو ان کا انتقال ہوا اور وہ اپنے والد کے پہلو میں دفن ہوئے۔ میر محمد جب وادی میں داخل ہوئے تو ان کے ہمراہ تین سو سید تھے؛

ان کے والد شاہ ہمدان، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، سات سو سید اپنے ساتھ لائے تھے۔ اس طرح کشمیر میں ترکستان سے مجموعی طور پر ایک ہزار سیدوں کی آمد ہوئی۔

کہا جاتا ہے کہ شاہ ہمدان نے سینتیس ہزار افراد کو مشرف بہ اسلام کیا، جب کہ بلبل شاہ اس سے پہلے دس ہزار افراد کو حلقۂ اسلام میں داخل کر چکے تھے۔

یہ بیشتر اجتماعی قبولِ اسلام کے واقعات تھے۔

آفات و مصائب میں مذہبی دلچسپی کا احیا

آگے بڑھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس تغیر کی عظمت کا اندازہ کر لیا جائے جو اتنی بڑی تعداد میں سیدوں کی وادی میں آمد سے رونما ہوا۔

یہ سید اور ان کے پیروکار جس عہد اور جس سرزمین سے ہجرت کر کے آئے تھے، وہاں کے تصوف میں گہرے رنگے ہوئے تھے، اور معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس صوفیانہ میلان کو مہمیز دی جس کی راہ ویدانت اور بدھ مت پہلے ہی ہموار کر چکے تھے۔ یہاں ضمناً یہ کہہ دینا بے محل نہ ہو گا کہ اسلام اس مضمحل کر دینے والے تصوف کو روا نہیں رکھتا جس کی مذمت اقبال نے بھی اسرارِ خودی کے پہلے ایڈیشن میں ان الفاظ میں کی ہے:—

اغذر از گوسفندان

شاید تیمور کے ظلم اور جبروت سے دل برداشتہ ہو کر بھی ان سیدوں اور دیگر حضرات نے "مجرد فکر کے دائروں میں پناہ ڈھونڈی ہو تاکہ اس دنیوی جبر کا کچھ مداوا ہو سکے جس میں ان کا ملک اس وقت مبتلا تھا۔"

تاریخِ کبیر، صفحہ 52۔ بلبل شاہ صاحب از مفتی محمد شاہ سعادت، سری نگر۔ کرنل نیوال (Col. Newall) کہتے ہیں: ”یہ بات فراموش نہیں کی جا سکتی کہ جب جب جابر پھلتے پھولتے رہے ہیں، انسانی ذہن تصوف اور گوشہ نشینی کی طرف مائل ہوتا رہا ہے۔“ اس کی ایک نمایاں مثال ہمارا موجودہ زمانہ فراہم کرتا ہے۔ معروف ماہرِ نفسیات سی ای ایم جوڈ (C. E. M. Joad) برطانیہ کے بدلتے ہوئے ذہن پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ”مذہب اور فلسفے کے ان سوالات میں ازسرِنو دلچسپی پیدا ہو رہی ہے جو کائنات کی حقیقت اور اس میں انسان کے مقام و انجام سے متعلق ہیں۔ جب انسان کی روح مضطرب ہو تو لامحالہ اس کے خیالات بنیادی سوالات کی طرف پلٹتے ہیں۔ وہ جاننا چاہتا ہے کہ دنیا کے اجتماعی دکھ اور بدی کو ایک قادرِ مطلق اور رحیم ہستی کی فرماں روائی کے ساتھ کیوں کر ہم آہنگ کیا جائے؟ کیا خدا نے جنگ کا ارادہ کیا تھا؟ کیا اسی نے ہٹلر کو پیدا کیا؟ یہ بات تو قابلِ فہم ہے کہ دنیا میں شر اور مصائب کی موجودگی اور فراوانی کا احساس مذہب میں انسان کی دلچسپی کو ازسرِنو زندہ کر دے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو بھی تازہ کر دے۔ اس کے باوجود آج بہت سے انگریزوں میں، اور خصوصاً ان نوجوانوں میں جو ابھی ابھی سنِ شعور کو پہنچے ہیں، دنیا کے مذہبی تصور میں نئی دلچسپی پائی جاتی ہے، اور یہ آمادگی بھی کہ اس کی روشنی میں بنیادی سوالات کے ان روایتی جوابوں کا ازسرِنو جائزہ لیا جائے جو عیسائیت نے فراہم کیے تھے، مگر جنہیں ہم میں سے اکثر لوگ ایک نسل سے نظر انداز کرتے یا ان کا تمسخر اڑاتے چلے آئے ہیں۔ فرض کیجیے، مثال کے طور پر، کہ یہ جنگ نہ نااہل سیاست دانوں کا نتیجہ ہے، نہ فرسودہ سرمایہ دارانہ نظام کا، بلکہ انسان کے دل میں چھپی ہوئی بدی کا؟ فرض کیجیے کہ یہ اسی بدی کی سزا ہے۔ ان سوالات میں ازسرِنو دلچسپی ابھی گرجا گھروں کو بھر دینے میں کامیاب نہیں ہوئی، اور اس میں شبہ ہے کہ کبھی ہو گی۔ ممکن ہے کہ جو نئی شراب اس وقت خمیر اٹھا

رہی ہے وہ پرانی بوتلوں میں ڈھلنے سے انکار کر دے، لیکن مجھے اس میں ذرا شک نہیں کہ اس ملک کے لوگوں کے ذہنوں میں ایک روحانی احیا کے بیج پھوٹ رہے ہیں۔"

۱۸ جون ۱۹۴۲ء کو جنرل سمٹس (General Smuts) پکار اٹھتے ہیں: "آج ہم عالمی پیمانے پر سیاسی قوم پرستی اور مادیت کو انسانی روح کی گہری ضرورتوں کی تسکین میں ناکام ہوتے دیکھ رہے ہیں۔ یہ ناکامی، ہماری نسل کے ان گنت مصائب کے ساتھ مل کر، مذہبی ایمان کے احیا پر منتج ہوگی۔ مذہب کا بحران آیا چاہتا ہے۔ گلیل کا مرد (Man of Galilee) ہمارا واحد اور یکتا رہنما ہے اور رہے گا۔"

جرنل آف دی بنگال ایشیاٹک سوسائٹی (Journal of the Bengal Asiatic Society)، ۱۸۷۰ء، صفحہ 266۔

دی ورلڈ ریویو (The World Review) (بمبئی کرانیکل کے اتوار کے ایڈیشن، ۱۹ اپریل ۱۹۴۳ء میں دوبارہ شائع شدہ)۔

یہ امر بھی معنی خیز ہے کہ موجودہ زمانے کے دباؤ کے تحت عمر خیام کی رباعیات ایک بار پھر کثیر الاشاعت کتاب بن گئی ہے۔ شاید تیمور کا غضب انہی سیدوں اور صوفیوں کے خلاف بھڑکا تھا جنہوں نے قول و عمل میں ایک گونہ آزادی اختیار کرنے کی کوشش کی ہوگی، یا امن کی ایسی تبلیغ کی ہوگی جو اس عظیم فاتح کو ناگوار گزری، جیسا کہ اکمل الدین کامل بیگ خان بدخشی نے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

ریشیانِ کشمیر

اس قسم کے سیدوں کی موجودگی نے فطری طور پر کشمیر کے نمایاں تر مسلمان صوفیوں پر اثر ڈالا۔ یہ مسلمان صوفی، جو ریشی یا بابا یعنی تارک الدنیا درویشوں کے نام سے معروف ہیں، اپنی انتہائی پارسائی اور کامل نفس کشی کے ذریعے اشاعتِ اسلام میں نمایاں طور پر ممد ثابت ہوئے، کیونکہ ان کے اثر سے لوگ تبدیلیِ مذہب پر مائل ہوتے تھے۔ ابوالفضل نے واحد صوفی سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے۔ فیضی نے ابوالفضل کو اس بزرگ کی موجودگی کی اطلاع ان الفاظ میں دی تھی: "یہاں ایک روشن ضمیر گوشہ نشین میری نظر سے گزرا ہے۔ تیس برس سے وہ ایک گمنام گوشے میں، ایک پرانی بوریا پر بیٹھا سعادت سمیٹ رہا ہے۔ تصنع اور خودنمائی نے اس کے دامن کو چھوا تک نہیں..." ابوالفضل نے اکبر سے اس کا ذکر کیا، جس نے انہیں جا کر تحقیقِ حال کا حکم دیا۔ ابوالفضل لکھتے ہیں: "بڑی خوش بختی سے بزرگ سے میری ملاقات ہو گئی اور شوقِ الٰہی کا پرانا زخم پھر ہرا ہو گیا۔ وہ ایک مدت سے اویس اور کرخی کی طرح ایک ویران مکان میں رہ رہے تھے۔ خوشی اور غم دونوں سے الگ تھلگ رہتے تھے اور سوکھی روٹی کے سوا کسی سے کچھ نہ لیتے تھے۔ اگرچہ میں کشمیری زبان سے واقف نہ تھا، پھر بھی ایک ترجمان کے ذریعے میں نے بہت فیض حاصل کیا اور مجھ پر ایک نئی بصیرت کا در وا ہوا۔ چونکہ ان کا دل

برٹش کنٹری بیوشنز ٹو پرشین اسٹڈیز (British Contributions to Persian Studies) از ڈاکٹر اے جے آربری (Dr. A. J. Arberry)، ۱۹۴۲ء، صفحہ 18۔ یہاں جن ریشیوں کا ذکر ہے وہ مسلمان بزرگ تھے۔ روم ریشی، ریش بابا، میر حسین ریشی، صبور ریشی اور سلیمان ریشی خاصے معروف ہیں۔ کشمیری اس لفظ کو "ریشی" تلفظ کرتے ہیں، جس کی جمع "ریشیان" ہے۔

دیکھیے صفحہ 100 کا حاشیہ۔

ابو محفوظ معروف کرخی ابتدا میں مجوسی تھے۔

انہوں نے اپنے والد فیروز یا فیروزان کے ہمراہ علی بن موسیٰ الرضا کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور اپنے عہد کے نامور زاہد اور صوفی ہوئے۔ ان کا انتقال مامون کے زمانے میں ۲ یا ۸ محرم ۲۰۰ھ (۸۱۵ء) کو ہوا۔ معروف بطور ولی محترم مانے گئے اور بغداد میں مدفون ہیں۔
(ابوالفضل کے بیان کا سلسلہ:) خلق سے سخت کنارہ کش تھا، اس لیے وہ اپنے حجرے سے باہر نہ آسکتے تھے۔ حضورِ والا اس خبر سے نہایت محظوظ ہوئے اور عزم فرمایا کہ وہ بنفسِ نفیس تشریف لے جائیں گے۔"

جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے کہ "اگرچہ ان (مسلمان ریشیوں) کے پاس کسی قسم کا دینی علم یا فضل نہیں، تاہم ان میں سادگی ہے اور وہ بے تصنع ہیں۔ کسی کو برا نہیں کہتے۔ زبان کو خواہش سے اور پاؤں کو طلب سے روکے رکھتے ہیں۔ گوشت نہیں کھاتے،.بیویاں نہیں رکھتے، اور کھیتوں میں ہمیشہ پھل دار درخت لگاتے ہیں تاکہ لوگ ان سے فائدہ اٹھائیں، جب کہ خود انہیں کسی نفع کی خواہش نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کی تعداد تقریباً 2,000 ہے۔" فرشتہ اور ابوالفضل نے بھی ان کا ذکر بڑی تحسین کے ساتھ کیا ہے کہ وہ تعیش سے مجتنب رہتے اور پہاڑوں کے جنگلی پھلوں اور بیروں پر گزر اوقات کرتے تھے۔ ان میں سے بہتوں نے مراقبے اور گوشہ نشینی کی غرض سے وادی کے دور افتادہ گوشوں میں مسکن بنا لیے تھے۔ سکھ عہدِ حکومت میں سیاح جی ٹی وین (G. T. Vigne) کی ملاقات بابا سعید سے ہوئی جنہوں نے اس وقت کے والیِ کشمیر تک کے ہاں جانے سے انکار کر دیا۔ مہاراجہ پرتاب سنگھ شاہ عبدالرحیم صفاپوری کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ مہاراجہ نے جب پوچھا کہ کیا وہ بزرگ کی

کوئی خدمت انجام دے سکتے ہیں، تو بزرگ نے جواب دیا کہ مہاراجہ دوبارہ ملاقات کی زحمت نہ فرمائیں — ایک ایسا جواب جو دیوجانس (Diogenes) یعنی دیوجانس الکلبی کی یاد دلاتا ہے، جس نے سکندر کے یہ پوچھنے پر کہ وہ اس کی کوئی خدمت کر سکتا ہے، فاتحِ عالم سے کہا کہ وہ اسے دھوپ سے لطف اندوز ہونے دے۔ بعض صورتوں میں ان مسلمان ریشیوں نے زیارتیں یعنی مزارات تعمیر کیے، جن میں سے بہت سے آج تک قائم ہیں۔ یہ زیارتیں اپنے بانیوں کے زہد اور فضائل کی گواہ ہیں اور اپنی روایات کے اعتبار سے اہلِ اللہ یا پیرانِ مقامی کے حلقوں کے مراکز ہیں، جن کا اثر لوگوں کے لیے لازماً مفید ہوتا ہے، کیونکہ وہ انسانیت کے اصولوں اور اخلاقی فضائل کی ترویج کرتے ہیں۔ لارنس (Lawrence) کہتا ہے: ”چونکہ یہ زیارتیں پارسائی اور ایثارِ نفس کے اعمال سے وابستہ ہیں، اس لیے میلوں کے موقع پر یہ ملاقات کی خوش گوار جگہیں بن جاتی ہیں، اور ان کے محلِ وقوع اور گرد و پیش کا قدرتی حسن ان کی کشش کو دوچند کر دیتا ہے۔ چنار اور ایلم کے قدیم و محترم درختوں کی پروقار قطاریں، اور سفید چھال اور چاندی کی طرح جھلملاتے پتوں والا کابلی سفیدہ خوش گوار سایہ فراہم کرتے ہیں، اور پیاسے کے لیے وہاں ہمیشہ کوئی نہ کوئی چشمہ موجود ہوتا ہے“ (صفحات 287-8)۔

اکبرنامہ، فارسی متن، کلکتہ، ۱۸۸۶ء، صفحہ 549۔

ترجمہ از راجرز (Rogers) و بیوریج (Beveridge)، جلد دوم، صفحات 149-150۔

شیخ نورالدین، بابا نصرالدین، بابا بام الدین، شیخ حمزہ مخدوم، سید احمد کرمانی، سید محمد حصاری، بابا زین الدین، بابا لطیف الدین، شکور الدین (جو عرفِ عام میں شکر الدین مشہور ہیں)، حنیف الدین (جنہیں غلطی سے حنف الدین کہا جاتا ہے)، شاہ ولی بخاری،

سعید بابا اور خواجہ حسن قاری جیسے اولیا اور ریشیوں نے اپنے قول و عمل سے اسلام کی راہ ہموار کی، جس نے آہستہ آہستہ، مسلسل اور منظم انداز میں تقریباً پوری وادی کو حلقہ بگوشِ اسلام کر لیا۔ شیخ نورالدین — یعنی "دین کا نور" — کشمیر کے عظیم قومی ولی ہیں۔ اس لیے یہاں ان کے حالاتِ زندگی کا کچھ ذکر بے محل نہ ہو گا۔

شیخ نورالدین

شیخ نورالدین ۷۷۹ھ مطابق ۱۳۷۷ء میں عید الاضحیٰ کے دن کیموہ (قدیم نام کاٹی موشا) نامی گاؤں میں پیدا ہوئے، جو بجبہاڑہ سے دو میل مغرب میں واقع ہے، اور بجبہاڑہ سری نگر سے 28 میل جنوب مشرق میں ہے۔ ان کے والد کا نام شیخ سالار الدین تھا۔ ان کی والدہ سدرہ، سدرہ موجی یا سدرہ دیدی کہلاتی تھیں۔ کشمیری زبان میں "موجی" کے معنی ماں کے ہیں اور "دیدی" بزرگ خاتون کے لیے بولا جاتا ہے۔ والدین دونوں اپنی پارسائی کے لیے مشہور تھے۔ شیخ سالار الدین، جن کا اسلام سے پہلے کا نام سالار سانز تھا اور جو کشتواڑ کے راجاؤں کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے، نے یسمن ریشی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا، جو پلاسمن اور خلاصمن ریشیوں کے چھوٹے بھائی تھے۔ یسمن ریشی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے دور دور کی سیاحت کی۔ بعد ازاں وہ زیادہ تر جنگلوں میں رہے۔ کبھی کبھی وہ شیر کی سواری کیا کرتے تھے، جس سے سعدی کی گلستان کی وہ حکایت یاد آتی ہے:

یکی دیدم از عرصۂ رودبار کہ پیش آمدم مر پلنگے سوار

ان کی روزانہ کی خوراک جنگلی بکری کے دودھ کا ایک پیالہ تھی۔ سدرہ ایک اعلیٰ راجپوت خاندان کی بیٹی تھیں، مگر والدین کے بہت جلد انتقال کر جانے کے باعث ان کی پرورش

ان کی رضاعی ماں نے کی، اور وقت آنے پر ان کی شادی ایک معمولی حیثیت کے شخص سے کر دی گئی، جس سے ان کے دو بیٹے ہوئے — شُش (شیشو) اور گُندر (گندھرو)۔ چند برس بعد ان کے شوہر کا انتقال ہو گیا اور وہ تنہا رہ گئیں۔ فطرتاً مذہبی طبیعت رکھنے کے باعث وہ یسمن ریشی کے حلقۂ اثر میں آئیں اور اسلام قبول کر لیا، اور اپنے رضاعی باپ کے ایما پر اور یسمن ریشی کی ہدایت کے مطابق ان کا نکاحِ ثانی سالار الدین سے ہوا۔ سدرہ دیدی وفات کے بعد کیموہ میں دفن ہوئیں، جہاں اب ایک مشہور زیارت ہے۔ سالار الدین، جن کا عمامہ اس زیارت میں محفوظ ہے، نیز نورالدین کے فرزند حیدر الدین، ان کی اہلیہ زئی دید اور دختر زون دید بھی کیموہ ہی میں مدفون ہیں۔

ایک بار جب یسمن ریشی بیمار ہوئے تو سالار الدین اور سدرہ ان کی عیادت کو گئے۔ للہ عارفہ پہلے ہی سے وہاں موجود تھیں اور ریشی کے لیے پھولوں کا گلدستہ بطور ہدیہ لائی تھیں۔ ریشی نے سدرہ کی آمد پر للہ کا گلدستہ انہیں دے دیا۔ کہا جاتا ہے کہ جب نورالدین پیدا ہوئے اور انہوں نے اپنی ماں کا دودھ لینے سے انکار کر دیا تو للہ کو بلایا گیا، اور عجب بات یہ ہوئی کہ نورالدین نے ان کی گود میں جا کر ان کا دودھ پی لیا۔ اس طرح بچے کو للہ سے انسیت ہو گئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید حسین سمنانی کشمیر میں تھے۔ للہ ہی کے توسط سے یہ بچہ سید کی نظر میں آیا۔ بعد میں شاہ ہمدان بھی تشریف لائے۔ یوں نورالدین کی پرورش ایسے سعید ماحول میں ہوئی جو وادی کے ولیِ اعظم کی حیثیت سے ان کی آئندہ عظمت کا پیش خیمہ بنا۔ جب نورالدین جوان ہوئے تو ان کے سوتیلے بھائی انہیں ستانے لگے۔ وہ بدچلن تھے، جب کہ یہ درویش صفت تھے۔ ایک دو بار وہ کام کی تلاش میں ان کے ہمراہ گئے، مگر انہوں نے محسوس کیا کہ وہ ان کے ساتھ خوش نہیں رہ سکتے۔ پھر انہیں یکے بعد دیگرے دو تاجروں کے پاس کام سیکھنے کے لیے رکھا گیا۔ وہاں بھی دنیا کے طور طریقوں سے ان کی طبیعت مکدر

ہوئی اور ترکِ دنیا کا فیصلہ کر کے وہ تیس برس کی عمر میں مراقبے کی غرض سے غاروں میں گوشہ نشین ہو گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بارہ برس بیابانوں میں رہے۔ شاید اسی بنا پر دیہاتی اعتقاد میں کیموہ کی وجہ تسمیہ "کائی وَن" (وَن یا بَن بمعنی جنگل) بتائی جاتی ہے۔ مراقبے کا اصل غار کیموہ میں دکھایا جاتا ہے، جو تقریباً 10 فٹ گہرا ہے۔ آخری ایام میں یہ بزرگ روزانہ ایک پیالہ دودھ پر گزر بسر کرتے تھے۔ آخر کار انہوں نے صرف پانی پر اکتفا کر لیا اور سلطان زین العابدین کے عہد میں ۸۴۲ھ مطابق ۱۴۳۸ء میں تریسٹھ برس کی عمر میں وفات پائی۔ "شمس العارفین" ان کی تاریخِ وفات کا مادۂ تاریخ ہے۔ سلطان ان کے جنازے کے ہمراہ قبر تک گیا۔ نمازِ جنازہ عہد کے ایک جلیل القدر عالم مخدوم بابا عثمان اُچھپ گنائی نے پڑھائی۔ شیخ نورالدین کا مزار چرار شریف میں ہے، جو سری نگر سے 20 میل جنوب مغرب میں ایک خشک، بے آب و گیاہ پہاڑی پر آباد ایک چھوٹا سا قصبہ ہے؛ آج تک ہزاروں لوگ اس کی زیارت کو آتے ہیں۔

چرار شریف (یا تسرار) قصبے کی آبادی ۱۹۳۱ء میں 3,784 تھی۔ ۱۹۴۱ء میں یہ 4,037 ہو گئی۔ یہ قصبہ کم و بیش حرف X کی شکل میں بنا ہوا ہے اور ایک بے آب و گیاہ ریتلی چوٹی پر واقع ہے، جو پیدل راستے سے شوپیاں کے شمال مشرق میں 13 میل کے فاصلے پر ہے۔

چرار اب سڑک کے ذریعے سری نگر سے ملا ہوا ہے۔

زاھدے خوش بود، باحق داشت بسیار اشتغال

[شیخ نورالدین، تمام ریشیوں کے مرشد، ایک بڑے عابد تھے اور خدا کے ساتھ گہرا رابطہ رکھتے تھے۔

گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے کے علاوہ وہ ان لوگوں میں سے تھے جو ہمیشہ روزے سے رہتے ہیں۔ انہوں نے برسوں سے گوشت، پیاز، دودھ اور شہد کھانا ترک کر رکھا تھا۔

وہ صاحبِ وجدان تھے، روحانی قوتوں کے مالک تھے اور نہایت عمدہ اندازِ گفتگو رکھتے تھے۔ وہ اویس کی مانند تھے (یعنی ان کا کوئی معلوم مرشد نہ تھا)، جیسا کہ ایک فصیح راوی نے بیان کیا ہے۔

— قصیدۂ لامیہ یا ریشی نامہ (۹۸۴ھ، ۱۵۷۶ء) از بابا داؤد خاکی]

ہندو اس بزرگ کو نند رشی یا سہج آنند کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ ان کے اقوال "نور نامہ" میں محفوظ ہیں جو کشمیر میں عام طور پر دستیاب ہے۔ نور نامہ میں اس بزرگ کے حالاتِ زندگی بھی درج ہیں۔ یہ کتاب بابا نصیب الدین غازی نے شیخ نورالدین کی وفات کے تقریباً دو صدیاں بعد فارسی میں تصنیف کی تھی۔ فارسی شاعری کے باب میں اس کا ذکر آئے گا۔

معلوم ہوتا ہے کہ شیخ نورالدین نے زئی دید سے نکاح کیا تھا جس سے دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے۔ اولاد کی وفات پر زئی دید نے بھی ترکِ دنیا اختیار کیا اور گوشہ نشین ہو گئیں۔ وفات پر انہیں کیموہ میں سپردِ خاک کیا گیا۔

اویس قرنی ایک تارک الدنیا بزرگ اور پیغمبرِ اسلام کے معاصر تھے۔ اویس یمن کے باشندے تھے اور قبیلہ قرن سے تعلق رکھتے تھے۔ جو لوگ ان کی طلب میں آتے، ان سے فرمایا کرتے: "کیا تم خدا کے طالب ہو؟ اگر ہو تو میرے پاس کیوں آتے ہو؟ اور اگر خدا کے طالب نہیں تو مجھے تم سے کیا سروکار؟" حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ ان کی فرمائش کے مطابق

اویس سے ملنے گئے اور انہیں پیغمبرِ اسلام کا خرقہ عطا کیا۔ اویس کی وفات ۳۲ھ اور ۳۹ھ (۶۵۳ء تا ۶۵۹ء) کے درمیان ہوئی۔

شیخ نورالدین کی زندگی کی سادگی اور پاکیزگی نے اہلِ کشمیر پر گہرا اثر ڈالا ہے اور وہ اس بزرگ کی انتہائی تعظیم کرتے ہیں۔ درحقیقت افغان گورنر عطا محمد خان نے گویا عوامی جذبات ہی کی ترجمانی کی جب اس نے ۱۲۲۳ھ تا ۱۲۲۵ھ (۱۸۰۸ء تا ۱۸۱۰ء) میں شیخ نورالدین کے نام کے سکے ڈھلوائے۔

انسانی تاریخ میں شاید کسی اور بزرگ کے اعزاز میں کبھی سکے نہیں ڈھالے گئے۔

اس "سردارِ رشیاں" کی زندگی کے واقعات وادی بھر میں زبان زدِ عام ہیں۔ شیخ نورالدین کو باغات کی سیر کا معمول تھا۔ ایک مرتبہ ایک مرید کے ہمراہ کسی باغ کی طرف جاتے ہوئے وہ راستے میں رک گئے اور آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ مرید نے چلنے کی درخواست کی تو یہ جواب دیا: "جو گھڑی میں وہاں گزاروں گا وہ میرے قیامِ بہشت سے منہا کر لی جائے گی۔"

ایک اور موقع پر جب انہیں ایک ضیافت میں مدعو کیا گیا تو نورالدین مقررہ وقت سے پہلے پھٹے پرانے لباس میں پہنچ گئے۔ خادموں نے انہیں نہ پہچانا اور اندر جانے کی اجازت نہ دی، چنانچہ انہیں واپس جا کر گھر ہی پر کھانا کھانا پڑا۔

جب سب لوگ پُرتکلف دسترخوان پر بیٹھ چکے تو شیخ کو خاص طور پر بلوایا گیا۔ اب کی بار وہ ایک ڈھیلا ڈھالا چغہ پہن کر تشریف لائے اور انہیں صدر کی نشست دی گئی۔ مگر شیخ نے کھانے میں شریک ہونے کے بجائے اپنی آستینیں پھیلا کر طعام کی رکابیوں پر رکھ دیں۔ لوگ

یہ منظر دیکھ کر حیران ہوئے اور سبب دریافت کیا تو فرمایا: "یہ ضیافت درحقیقت نورالدین کے لیے نہیں بلکہ ان لمبی آستینوں کے لیے تھی!"

اس بزرگ کی ریاکاری پر تنقید خاصی دلچسپ ہے۔ فرماتے ہیں:

"محض جھکنے سے تو رشی نہیں بن سکتا؛ دھان کوٹنے والے موسل نے کبھی سر نہیں اٹھایا۔"

"غار میں بیٹھنے سے خدا حاصل نہیں ہو سکتا؛ نیولا اور چوہا اپنے بلوں سے کم ہی باہر نکلتے ہیں۔"

"نہانے سے دل پاک نہیں ہوگا؛ مچھلی اور اودبلاؤ کبھی کنارے پر نہیں چڑھتے۔" "اگر خدا فاقے سے راضی ہوتا تو مفلس کم ہی ہانڈی چڑھاتے۔"

شیخ نورالدین کے چار مرید تھے: نصرالدین، بام الدین، زین الدین اور لطیف الدین۔ صفحہ 98 کے مقابل تصویر میں بابا نصرالدین شیخ نورالدین کے پیچھے دکھائی دیتے ہیں۔ کشمیری انہیں بابا نصر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ شیخ نورالدین انہیں پیار سے "نصرو" کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ بابا نصر ایک مالدار گھرانے کے فرد تھے۔ ابتدائی زندگی میں تندرست و توانا تھے مگر معدے کے عارضے کے باعث بہت تکلیف اٹھائی۔ جب ان کی زندگی سے تقریباً مایوسی ہو چلی تو ان کا رابطہ نورالدین سے ہوا؛ انہوں نے عیش و آرام کی زندگی ترک کر دی اور ان کے وفادار مرید بن گئے۔ بابا نصر کا انتقال ۸۵۵ھ (۱۴۵۱ء) میں ہوا اور وہ چرار شریف میں اپنے مرشد کے قریب مدفون ہیں۔ مقامی روایت ہے کہ بابا بام الدین اصلاً ہندو تھے اور بھیم سادھ کہلاتے تھے، جس نام میں ڈاکٹر سٹائن (Dr. Stein) بھیم شاہی کی تحریف دیکھتے

ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ بابا لطیف الدین بھی ہندو اور مارو وردوان کے ایک عہدہ دار تھے اور شیخ نورالدین سے طویل مباحثے کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بابا زین الدین ضیا سنگھ کے نام سے معروف تھے اور کشتواڑ کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد دشمنوں کے ہاتھوں قتل ہوئے اوریوں ضیا سنگھ یتیم ہو گئے۔ بعد ازاں وہ شیخ نورالدین کے زیرِ اثر آئے اور مسلمان ہو گئے۔ فتوحاتِ کبرویہ میں شیخ نورالدین کے مریدوں یا خلفا کی ترتیب یوں دی گئی ہے: (1) بابا بام الدین (2) بابا زین الدین (3) بابا لطیف الدین اور (4) بابا نصرالدین (اوراق 326 تا 350)۔

1۔ مارو وردوان یا مڈواڈون اس وادی کا نام ہے جو کشمیر کی مشرقی سرحد کے مشرق میں واقع ہے اور زوجی لا سے تقریباً سیدھی جنوب کی سمت کشتواڑ تک چلی گئی ہے۔

2۔ فتوحاتِ کبرویہ، از شیخ عبدالوہاب نوری ابن رشید الدین الکشمیری (متوفی ۱۱۸۲ھ = ۱۷۶۸ء، سری نگر)، قلمی نسخہ، ورق 345۔ یہ مخطوطہ شیخ غلام محمد، ایم اے، ایم او ایل (پنجاب)، ریٹائرڈ رجسٹرار کوآپریٹو سوسائٹیز، جموں و کشمیر کے پاس محفوظ ہے۔

سلطان سکندر کا حصہ

کشمیر میں اشاعتِ اسلام کو سلطان سکندر کے عہد میں زبردست تقویت ملی، جب مغرب میں وکلف (Wyclif) انگلستان میں لولارڈ تحریک کی بنیاد رکھ رہا تھا۔ تاہم سکندر پر ”وادی کے ہندوؤں کی ایذا رسانی میں تعصب“ کا الزام لگایا گیا ہے اور ہندو اسے بت شکن کہتے ہیں۔ یہ الزام کہ کشمیر میں مندروں کی وسیع پیمانے پر تباہی سکندر کے ہاتھوں ہوئی، بظاہر بڑی حد تک غلط بیانی پر مبنی ہے — جس میں حقیقت کم اور افسانہ زیادہ ہے — اور متعدد غیر مسلم مصنفین

نے یکے بعد دیگرے اس سلطان کی مذمت میں اپنے اپنے حصے کی دشنام طرازی کی ہے۔ یہ بہتان اس حد تک راسخ ہو چکا ہے کہ اب سکندر ہمیں ہندو دیوتاؤں کے لیے تعمیر کی گئی تمام عالی شان عمارتوں کی بے رحمانہ تباہی کا مکروہ پیکر دکھائی دیتا ہے۔ یہ غلط بیانی اس قدر بڑھ چکی ہے کہ اس کا اصل کردار ہماری نگاہوں سے بالکل اوجھل ہو گیا ہے۔ چنانچہ زین العابدین کی مدح اور سکندر کی مذمت میں ہمیں اکثر اکبر اور اورنگ زیب کی یاد دلائی جاتی ہے، اور کشمیر کے ہر اُس سرسری سیاح کا، جو وادیِ خوش نما کے بارے میں اپنے تاثرات دنیا کے سامنے پیش کرنے کا مشتاق ہو، یہ وتیرہ بن گیا ہے کہ وہ مدح اور ذم کے لیے "کشمیر کے اکبر" اور "کشمیر کے اورنگ زیب" کو چن لے۔ میں سکندر کی وکالت نہیں کرتا۔ جو کچھ اس نے فی الواقع کیا اس کی ذمہ داری بلاشبہ اس پر ہے، مگر اس سے زیادہ کی نہیں۔

دریائے جہلم کے زیریں علاقوں میں، ہندوستان میں کہیں بھی، پرانے یا ویران مندر دیکھنے والے کو اکثر ان پڑھ گائیڈ یا جاہل پجاری یہی بتاتا ہے کہ ان کے بت اورنگ زیب نے توڑے تھے۔ اسی طرح جہلم کے بالائی علاقوں میں ایسے مقامات دیکھنے والے کو جھٹ بتا دیا جاتا ہے کہ مورتیوں کی یہ تباہی سکندر کے ہاتھوں ہوئی، اور ہر قابلِ تصور ظلم اسی کے سر منڈھ دیا جاتا ہے۔ ایسی بے بنیاد کہانیوں کے تسلسل کی مسلسل اور سختی سے حوصلہ شکنی ہونی چاہیے، کیونکہ یہ ہندوستان میں بسنے والی عظیم قوموں کے باہمی تعلقات میں ڈالی جانے والی دراڑ کا ایک نمایاں سبب ہیں۔ یہ سیاست کی بحث میں کوئی انحراف نہیں بلکہ اُس مسلسل فریب کے خلاف تنبیہ ہے جس میں افسانہ سچی اور معتبر تاریخ کا روپ دھارے پھرتا ہے۔ پنڈت پریم ناتھ بزاز لکھتے ہیں: "تاریخ کی اس غلط خوانی سے بہت نقصان پہنچا ہے۔ ماضی میں بہت سے نوجوان اُس عہد کے سیاسی اور معاشی حالات کے بارے میں مہمل خیالات سے گمراہ ہوئے جب کشمیر مسلمان بادشاہوں کے زیرِ نگیں تھا۔ بدقسمتی سے یہ

خیالات اب بھی قائم ہیں اور اس سے بھی بدتر یہ ہے کہ اس مفروضے پر کہ مسلمانوں نے ماضی میں ہندوؤں سے بدسلوکی کی، یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ دونوں قومیں نہ اب متحد ہو سکتی ہیں نہ آئندہ۔ اس کا ردِ عمل مسلمانوں کے ذہن میں پیدا ہوا ہے اور یوں بے اعتمادی اور باہمی عداوت نہ صرف قائم ہے بلکہ روز افزوں ہے۔ ہمارے وطن کا مفاد اسی میں ہے کہ ماضی کی تاریخ کا صحیح تجزیہ کیا جائے اور اسے تعصب یا کینے، جذباتی خوش فہمی یا نام نہاد وطن پرستانہ پردہ پوشی کے بغیر علمی انداز میں پڑھا جائے۔ بیشتر تاریخیں ایسے لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں جو اونچے طبقوں کے زیرِ اثر کام کرتے تھے۔ اگرچہ ان کی نیتیں اچھی تھیں، مگر یہ ماننا مشکل ہے کہ وہ واقعات پر غیر جانبداری سے حکم لگا سکتے تھے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ علمی تعبیر کے جو اصول اب ہمیں میسر ہیں ان کے مطابق حقائق کی چھان بین کریں۔ ہمیں حقائق کو ایک جامع اور ترکیبی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیے اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنی چاہیے کہ اُن دنوں صرف خواص ہی نہیں بلکہ عوام پر کیا گزری۔" (انسائیڈ کشمیر، ص 19-20)۔ آئیے سکندر کے قصے کا کسی قدر تفصیل سے جائزہ لیں۔

اگر سکندر نے اپنے دین کے جوش میں اعتدال کی حدوں سے تجاوز کیا بھی ہو، تب بھی اس پر یہ الزام یقیناً باطل ہے کہ اس نے کشمیر کے تمام ہندو مندر ڈھا دیے اور ہر پنڈت کو بے رحمی سے ستایا۔ سکندر کی پیدائش سے بہت پہلے کیا ہوا تھا؟ کیا بدھ مت اور برہمنیت کی کشمکش بہت سے معبدوں کی بربادی کا باعث نہیں بنی؟ اوکانگ (Ou-k'ong) یا ووکنگ، ایک مشہور چینی سیاح جو ہیون سانگ کے نقشِ قدم پر چلا، ۷۵۹ء میں کشمیر پہنچا اور کم و بیش چار برس سنسکرت کے مطالعے اور وادی کے مقدس مقامات کی زیارتوں میں گزارے۔ اس نے "مملکتِ کشمیر میں تین سو" سے زیادہ "خانقاہیں یا وہار" پائے۔ سٹائن

کے الفاظ میں اوکانگ "قابلِ اعتماد اور درست بیان" ہے۔ اب یہ وہار کہاں ہیں؟ کیا ان کا کوئی نشان بھی باقی ہے؟ اور انہیں ڈھایا کس نے؟ کیا وہ محض مٹی کی عمارتیں تھیں؟

1۔ حتیٰ کہ ریورنڈ سی ای ٹنڈیل بسکو (Rev. C. E. Tyndale-Biscoe) نے، جسے صداقت کا زیادہ پاس ہونا چاہیے تھا، ۱۹۲۲ء میں اپنی کتاب کشمیر اِن سن لائٹ اینڈ شیڈ کے صفحہ 71 پر لکھا: "سکندر نے ان (ہندوؤں) کے تمام مقدس مقامات تباہ کر دیے۔" موصوف محض سنی سنائی باتیں دہرا رہے ہیں اور انہوں نے خود کوئی تحقیق نہیں کی۔

2۔ نوٹس آن اوکانگز اکاؤنٹ آف کشمیر، از ایم اے سٹائن، پی ایچ ڈی، پرنسپل اورینٹل کالج لاہور — ویانا، ۱۸۹۶ء۔

3۔ ایضاً، صفحہ 3۔ 4۔ ایضاً، صفحہ 25۔

جے اپیڈ (۷۶۴ء تا ۷۹۵ء) نے "ایک کم سو برہمنوں کو پانی میں ڈوب مرنے پر مجبور کیا۔" شنکر ورمن (۸۸۳ء تا ۹۰۲ء) نے، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے (ملاحظہ ہو صفحہ 57)، مندروں کے خزانے لوٹے۔ اپنی یادگار قائم کرنے کے لیے اس نے پٹن کا قصبہ اور اس کا مندر اُس سامان سے تعمیر کیے جو اس نے پری ہاس پورہ کے قصبے اور مندروں کی لوٹ مار سے حاصل کیا تھا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ اس کے مندروں کی تباہی بھی عوام میں سکندر ہی سے منسوب ہے۔ سنسکرت کتبے والی تانبے کی ایک تختی دریافت ہوئی ہے جس میں پیش گوئی کی گئی ہے کہ "گیارہ سو برس گزرنے پر سکندر نامی ایک شخص کے ہاتھوں" مندر تباہ ہوگا۔ سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein) نشاندہی کرتے ہیں کہ واقعے کے بعد کی یہ پیش گوئی ظاہر کرتی ہے کہ اس کا مصنف، جو کوئی بھی رہا ہو، "تاریخی زمانہ شماری میں خاصا کمزور تھا۔ پری ہاس پورہ سکندر بت شکن کے زمانے سے صرف کوئی ساڑھے چھ صدیاں پہلے بسایا

گیا تھا۔ اٹھارہویں صدی کے آغاز میں یہ کھنڈر بظاہر اب کی نسبت کچھ بہتر حالت میں تھے۔ ”کیا ابھی منیو دوم (۹۵۸ء تا ۹۷۲ء) نے اپنے دارالحکومت کو آگ نہیں لگائی اور ”وردھن سوامی کے مندر سے لے کر بھکشوکی پارک“ (یعنی گداگروں کی پناہ گاہ) تک تمام عالی شان عمارتیں تباہ نہیں کیں؟ کننگھم (Cunningham) اس چونا پتھر کے مندر کے بچ جانے کو اس کے اُس خوش قسمت محلِ وقوع کا نتیجہ قرار دیتے ہیں کہ وہ تالاب کے پانی کے بیچ واقع تھا۔ ہرش (۱۰۸۹ء تا ۱۱۰۱ء) نے مندروں کی لوٹ مار شروع کی اور دیوتاؤں کی مورتیاں اس غرض سے ضبط کیں کہ ان قیمتی دھاتوں پر قبضہ کرے جن سے وہ بنی تھیں۔ پنڈت کلہن کے اصل الفاظ یہ ہیں: ”کسی گاؤں، قصبے یا شہر میں ایک بھی مندر ایسا نہ تھا جسے اُس ترشک راجہ ہرش نے اس کی مورتیوں سے محروم نہ کر دیا ہو۔“ یہی نہیں۔ کتاب ہفتم کے اشلوک 1091 تا 1094 پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس نے اُدے راج کو ”دیو مورتیوں کی سرنگونی کا افسر“ (devotpāṭananāyaka) مقرر کیا۔ دیوتاؤں کی مورتیوں کو ناپاک کرنے کے لیے وہ ایسے برہنہ گداگروں سے، جن کے ناک، پاؤں اور ہاتھ گل چکے تھے، ان کے چہروں پر بول و براز ڈلواتا تھا۔ ”دیو مورتیاں... غلاظت سے یوں ڈھانپ دی جاتیں گویا وہ لکڑی کے کندے ہوں... دیوتاؤں کی مورتیاں ٹخنوں میں رسیاں ڈال کر گھسیٹی جاتیں اور پھولوں کے بجائے ان پر تھوکا جاتا۔“ جون راج نے بھی راج دیو (۱۲۱۳ء تا ۱۲۳۶ء) کا ذکر کیا ہے جس نے بھٹوں کی توہین کی اور انہیں لوٹا۔ ”اور تب ان میں سے یہ پکار سنائی دی: ’میں بھٹ نہیں ہوں‘ (یعنی برہمن)، ’میں بھٹ نہیں ہوں‘۔“ پھر چودھویں صدی کے آغاز میں دلچہ کی یورش نے ”بے شمار دیوتاؤں“ پر تباہی ڈھائی۔ دلچہ نے لوگوں کا قتلِ عام کیا اور شہر سری نگر کو آگ لگا دی۔ یہ میری زبان نہیں، نہ میرا ترجمہ ہے اور نہ میری تعبیر۔ یہ کلہن اور جون راج کی زبان ہے۔ یہ سٹائن اور جے سی ڈٹ (J. C.

Dutt) کا ترجمہ ہے۔ اب کیا کوئی جے اپیڈ، شنکر ورمن، ابھی منیو، ہرش یا راج دیو جیسے ظالم راجاؤں کے بارے میں ایک لفظ بھی کہتا ہے؟

مگر تقریباً ہر ہندو بچہ سکندر پر لعنتیں بھیجنا سیکھتا ہے!

1۔ راج ترنگنی، انگریزی ترجمہ، اشلوک 638، جلد اول، صفحہ 178۔ 2۔ دی اینشنٹ جیوگرافی آف کشمیر — کلکتہ، ۱۸۹۹ء — صفحہ 195۔ 3۔ کننگھم، دی اینشنٹ جیوگرافی آف انڈیا، ۱۸۷۱ء، صفحہ 96۔ 4۔ سٹائن کا راج ترنگنی کا انگریزی ترجمہ، اشلوک 1095، کتاب ہفتم، جلد اول، صفحہ 353۔ 5۔ ایضاً، اشلوک 1091 تا 1094، کتاب ہفتم، جلد اول۔

سکندر کے عہد میں مندروں کی جو کچھ تباہی ہوئی اس کی ذمہ داری بظاہر اس کے وزیر ملک سوہ بھٹ پر عائد ہوتی ہے، کیونکہ تخت نشینی کے وقت سکندر خود کمسن تھا۔ سر ٹی ڈبلیو آرنلڈ (Sir T. W. Arnold) کے الفاظ میں، سوہ بھٹ نے اپنے پرانے مذہب کے پیروکاروں کی سخت ایذا رسانی کا سلسلہ شروع کیا؛ غالباً اس نے ایسا اس لیے کیا کہ اپنے نئے دین کے لیے اپنا جوش ظاہر کر سکے۔ رنجیت سیتا رام پنڈت نے بھی یہی بات کہی ہے۔ رنجیت لکھتے ہیں: ”سکندر نے سری شوبھا نامی ایک ہندو خاتون سے شادی کی تھی اور ابتدا میں وہ اپنے پیش روؤں کی طرح مذہبی معاملات میں روادار تھا، مگر اس کا طاقتور ہندو وزیر سوہ بھٹ، جو مرتد ہو گیا تھا، اپنے سابق ہم مذہبوں سے نو مسلم کی سی نفرت رکھتا تھا۔“ شاید یہ مندر ریاست کے خلاف سازشوں کے اڈوں کے طور پر بھی استعمال ہوتے رہے ہوں، جیسا کہ ایک مقامی مؤرخ نے نشاندہی کی ہے۔ مگر یہ بات صاف طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ اس نوع کا مذہبی جوش اسلام کی نگاہ میں قابلِ مذمت ہے؛ بلکہ اسلام اس سے قطعی منع کرتا ہے۔ یہ امر ریکارڈ پر موجود ہے کہ میر محمد ہمدانی نے سوہ بھٹ کو ایسے اقدام سے متنبہ کیا اور اسے

قرآن مجید (البقرہ، 256) کی وہ مشہور آیت یاد دلائی جس کا مفہوم ہے: "دین میں کوئی جبر نہیں۔" یہ درست ہے کہ الزام کا جو حصہ بجا طور پر سوہ بھٹ پر عائد ہوتا ہے اس میں اپنے حصے سے سکندر کو بری نہیں کیا جا سکتا، مگر یہ بات قطعاً غلط ہے کہ یہ سب کچھ کرنے والا سکندر ہی تھا۔

1۔ کنگز آف کشمیرا، صفحہ 10۔ 2۔ دی ویلی آف کشمیر، صفحہ 189۔ 3۔ سوہ بھٹ دراصل سنہ بھٹ یا سمہا بھٹ کا صحیح کشمیری تلفظ ہے۔ 4۔ دی پریچنگ آف اسلام، طبع دوم، صفحہ 292۔ 5۔ راج ترنگنی، مترجمہ رنجیت سیتا رام پنڈت، انڈین پریس، الٰہ آباد، ۱۹۳۵ء، صفحہ 628 (ضمیمہ K)۔

6۔ بلبل شاہ صاحب، از مفتی محمد شاہ سعادت، صفحہ 8۔

ہر ہندو کی مسلسل ایذا رسانی اور ہر مندر کی بے دردانہ تباہی کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے۔ شاید اس بحث میں یہ بات بے محل نہ ہو کہ ہم مرزا حیدر دغلت اور جہانگیر جیسی شخصیتوں کی وقیع شہادت کو پیشِ نظر رکھیں، جنہوں نے کشمیر کے مندروں کے بارے میں لکھا ہے اور جن کی گواہی ناقابلِ اعتراض ہے۔ مرزا حیدر دغلت نے، جس نے سکندر کی وفات (۱۴۱۴ء) کے مدتوں بعد ۱۵۳۱ء میں کشمیر پر لشکر کشی کی، اپنی تاریخِ رشیدی میں کشمیر کے مندروں کی خاصی تفصیل بیان کی ہے۔ امید ہے کہ اس سے ایک طویل اقتباس نقل کرنا معیوب نہ سمجھا جائے گا: "کشمیر کے عجائب میں اولین مقام یہاں کے بت کدوں کو حاصل ہے۔ کشمیر (یعنی سری نگر) اور اس کے گرد و نواح میں ڈیڑھ سو سے زائد مندر ہیں جو تراشے ہوئے پتھر کے تختوں سے بنے ہیں، اور یہ تختے ایک دوسرے پر اس صحت سے جمائے گئے ہیں کہ کہیں مطلق چونا استعمال نہیں ہوا۔ یہ پتھر بغیر گچ اور گارے کے اس احتیاط سے اپنی جگہ

بٹھائے گئے ہیں کہ جوڑوں کے درمیان سے کاغذ کا ورق تک نہیں گزر سکتا۔ تختوں کی لمبائی تین سے بیس گز تک ہے، موٹائی ایک گز، اور چوڑائی ایک سے پانچ گز تک۔ حیرت اس بات پر ہے کہ یہ پتھر کیوں کر ڈھو کر لائے گئے اور نصب کیے گئے۔ تقریباً تمام مندر ایک ہی نقشے پر بنے ہیں۔ ایک مربع احاطہ ہوتا ہے جس کی بلندی بعض مقامات پر تیس گز تک پہنچتی ہے، جب کہ اس کا ہر ضلع تقریباً تین سو گز طویل ہے۔ اس احاطے کے اندر ستون ہیں، اور ستونوں کے سروں پر مربع تاج ہیں؛ ان کے اوپر الگ الگ حصے ایک ہی تختۂ سنگ سے بنائے گئے ہیں۔ ستونوں پر محرابوں کے سہارے قائم ہیں، اور ہر محراب تین چار گز چوڑی ہے۔ محراب کے نیچے ایک ایوان اور ایک دروازہ ہے۔ محراب کے اندرونی اور بیرونی جانب چالیس پچاس گز بلند ستون ہیں جن کی کرسیاں اور تاج پتھر کے ہیں۔ ان کے اوپر ایک یا دو ٹکڑوں کے چار ستون رکھے گئے ہیں۔ ایوانوں کا اندرون اور بیرون دو برآمدوں کی صورت رکھتا ہے، اور یہ ایک یا دو پتھروں سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ ستونوں کے تاج، ابھرواں نقش و نگار، کارنسیں، دندانہ دار کام، اندرونی اور بیرونی پوشش — سب تصویروں اور نقاشیوں سے اس درجہ معمور ہیں کہ میں ان کے بیان سے قاصر ہوں۔ بعض میں ہنستی اور روتی صورتیں دکھائی گئی ہیں جو دیکھنے والے کو ششدر کر دیتی ہیں۔ وسط میں تراشے ہوئے پتھر کا ایک بلند تخت ہے، اور اس کے اوپر

1۔ تاریخِ رشیدی، انگریزی ترجمہ الیاس (Elias) و راس (Ross)، ۱۸۹۵ء، صفحہ 426۔ 2۔ یعنی سری نگر۔ 3۔ بابر کے عہد کا گز 26 تا 28 انچ کے برابر ہوتا تھا۔

سراسر پتھر کا بنا ہوا ایک گنبد ہے جس کا بیان میرے بس سے باہر ہے۔ باقی ساری دنیا میں ایسی ایک عمارت بھی نہ دیکھنے میں آتی ہے نہ سننے میں۔ کیا عجب بات ہے کہ یہاں ایسی

ڈیڑھ سو عمارتیں موجود ہیں۔" ہو سکتا ہے کہ مرزا حیدر سے تاریخِ کشمیر کے اپنے بیان میں غلطیاں سرزد ہوئی ہوں، مگر جو کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا وہ خیالی نہیں ہو سکتا۔

جہانگیر (۱۶۰۵ء–۱۶۲۷ء) نہایت صاف اور دو ٹوک الفاظ میں کہتا ہے: "وہ بلند و بالا بت کدے جو ظہورِ اسلام سے پہلے تعمیر ہوئے تھے اب تک موجود ہیں، اور سب کے سب ایسے پتھروں سے بنے ہیں جو بنیاد سے چھت تک بڑے بڑے اور تیس چالیس من وزنی ہیں اور ایک دوسرے پر رکھے ہوئے ہیں۔" جون راجہ کے بقول سکندر نے سوہ بھٹ کے اکسانے پر "مارتنڈ، وشیہ، ایشان، چکر بھرت، تری پوریشور، شیش، سوریشوری، وراہ اور دیگر کی مورتیاں توڑ ڈالیں۔" یہاں صرف لفظ "مورتیاں" قابلِ غور ہے۔ لہٰذا مندروں کی تباہی کا الزام ہمیں سکندر پر نہیں بلکہ اصل تباہ کاروں پر رکھنا چاہیے—

یعنی زمانہ اور عناصرِ فطرت، اور تعمیر کے وہ نقائص جو خشک چنائی کی عمارتوں کی بربادی کا اکثر سبب بنا کرتے ہیں۔ سٹائن (Stein) لکھتا ہے: "زلزلے اور پتھروں کی ناقص جڑائی، جو کشمیر کے تمام مندروں میں دیکھی جا سکتی ہے، مواد کی ضخامت کے باوجود اس مکمل بربادی کی توجیہ کے لیے کافی ہیں۔" لارنس (Lawrence) کہتا ہے: "سکندر بہادر اور صاحبِ علم و تہذیب تھا اور اس نے اہلِ علم مسلمانوں کو اپنے دربار کی طرف کھینچا۔" اس تمام تر شہادت کی موجودگی میں تعجب ہے کہ بہت سے لکھنے والے سکندر کو رسوا کرنے میں لطف لیتے ہیں۔ واقعات اس الزام کی تکذیب کرتے ہیں۔ دریائے جہلم کے بائیں کنارے بارہ مولا اور کوہالہ کے درمیانی علاقے میں آباد راجپوتوں کے قبیلوں کھکھا اور ہٹمال کا قبولِ اسلام سلطان زین العابدین کے عہد کا واقعہ بتایا جاتا ہے۔ ان کے سردار کھکھو اور

ہٹی، کھکھو خان اور حاتم خان کے ناموں سے موسوم ہوئے۔ انہوں نے سلطان کے دربار کی ملازمت اختیار کی، جس نے انہیں جاگیریں عطا کیں۔ ”مظفر آباد اور بارہ مولا کے درمیان کا ملک راجاؤں کے قبضے میں تھا“ —

1۔ توزکِ جہانگیری (میمائرز آف جہانگیر)، انگریزی ترجمہ راجرز (Rogers) و بیوریج (Beveridge)، جلد دوم، صفحہ 150۔ 2۔ کنگز آف کشمیرا، صفحہ 60۔ 3۔ پنڈت آنند کول نے اپنی

کتاب ”جموں اینڈ کشمیر سٹیٹ“ (۱۹۲۵ء) میں ۱۵۰۰ء سے ۱۸۸۴ء تک کے 12 شدید زلزلے شمار کرائے ہیں (ملاحظہ ہوں صفحات 98، 99 اور 100)۔ 4۔ دی ویلی آف کشمیر، حاشیہ، صفحہ 190۔

تاریخِ حسن، قلمی نسخہ۔

یعنی ۱۸۱۲ء–۱۳ء میں میر عزت اللہ کی آمد سے پہلے یہ ملک ”کہکہ اور بمبہ کے راجاؤں“ کے قبضے میں تھا۔ وہ مزید لکھتا ہے کہ اس زمانے میں یہ علاقہ ”کوہستانِ کشمیر“ کے نام سے معروف تھا۔

شیخ شمس الدین عراقی

پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر میں قبولِ اسلام کے سلسلے کو ایک نئی تحریک شیخ شمس الدین محمد الاصفہانی المعروف میر شمس الدین عراقی کی آمد سے ملی، جو بحیرۂ قزوین کے ساحلی علاقے طالش کا ایک مبلغ تھا۔ اس کی آمد ۱۴۸۷ء میں ہوئی، نہ کہ ۱۴۵۰ء میں، جیسا کہ

لارنس نے غلطی سے لکھا ہے۔ شمس الدین کے والد کا نام ابراہیم تھا، اور اس کی والدہ قزوین کے ایک موسوی سادات گھرانے سے تھیں۔ اپنے مریدوں کی اعانت سے میر شمس الدین نے بڑی تعداد میں لوگوں کو حلقہ بگوشِ اسلام کیا۔ مرزا حیدر دغلت کے بیان کے مطابق شمس الدین سلطان فتح شاہ کے پہلے عہدِ حکومت میں عراق سے وارد ہوا اور کئی ہزار آدمیوں کو مشرف بہ اسلام کیا۔ اس کے بعد بارہ اماموں کے نام پر اس کی تاج پوشی کی گئی۔ کشمیر کے شیعوں کا دعویٰ ہے کہ وہ سچا شیعہ تھا، اور یہ کہ "احوط" یعنی "جامع ترین" — عربی زبان کی وہ کتاب جس میں نور بخشی فرقے کے عقائد درج ہیں اور جو آج کل بلتستان میں رائج ہے — اس کی تصنیف نہیں۔

1۔ "ٹریولز اِن سنٹرل ایشیا"، از عزت اللہ، بابت سنین ۱۸۱۲ء–۱۳ء؛ فارسی میں تحریر شدہ؛ انگریزی ترجمہ کیپٹن ہینڈرسن (Captain Henderson)، کلکتہ، ۱۸۷۲ء، صفحہ 3۔

2۔ طالش ایرانی صوبہ گیلان کے شمال میں ایک ضلع اور ایک قوم کا نام ہے، جو ۱۸۱۳ء سے روس کے قبضے میں ہے۔ بحیرۂ قزوین کے جنوب مغربی گوشے سے شمال کی جانب چلی گئی ساحل اور کوہستانی ڈھلان کی وہ تنگ پٹی، جس کا رخ مشرق میں اسی سمندر کی طرف ہے، طالش کا علاقہ ہے۔ طالش نامی گاؤں اردبیل سے چھ فرسخ کے فاصلے پر واقع ہے۔ ایرانی عہدِ حکومت میں، اور اب بھی، لنکران اس کا صدر مقام ہے۔ یہ لوگ خود کو طالش کہتے ہیں اور ایک مقامی بولی بولتے ہیں۔ ۱۹۲۲ء کی مردم شماری کے مطابق روسی علاقے میں آباد طالشوں کی تعداد ۷۵٬۸۲۴ ہے۔ اہلِ گیلان کی طرح طالش بھی شیعہ ہیں۔ ان کی بولی گیلان کی بولی سے بہت کم مختلف ہے۔ 3۔ آرنلڈ (Arnold) کی "پریچنگ آف اسلام"، صفحہ 124۔ 4۔ تاریخِ رشیدی، انگریزی ترجمہ نے الیاس (Ney Elias) و ڈینیسن راس

(Denison Ross)، ۱۸۹۵ء، صفحہ 435۔ 5۔ نور بخشی فرقہ شیعہ اور سنی عقائد کے مابین ایک بیچ کی راہ نکالنے کی کوشش ہے۔ سردیوں میں نور بخشی سنیوں کی طرح ہاتھ باندھ کر نماز پڑھتے ہیں اور گرمیوں میں شیعوں کی طرح ہاتھ چھوڑ کر۔ سنیوں کی طرح وہ باجماعت نماز اور نمازِ جمعہ کا اہتمام کرتے ہیں، مگر نماز سے پہلے پاؤں نہیں دھوتے بلکہ شیعوں کی طرح صرف مسح کرتے ہیں۔ نزاع کی بنیادی صورت محرم میں پیدا ہوتی ہے، کیونکہ نور بخشیوں کا اصرار ہے کہ ماتم مسجد میں ہونا چاہیے، جب کہ شیعہ اسے روا نہیں رکھتے۔ نور بخشی فرقے کے مفصل احوال کے لیے خان بہادر مولوی محمد شفیع، ایم اے (کینٹب) کا مضمون، مطبوعہ اورینٹل کالج میگزین، بابت فروری و مئی ۱۹۲۵ء، ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ نور بخش کے لفظی معنی "روشنی بخشنے والا" کے ہیں۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ میر شمس الدین سید معین الدین علی المعروف شاہ قاسم زر بخش کا مرید تھا، جو خراسان کے سید محمد نور بخش کا بیٹا تھا، اور سید محمد خود خواجہ اسحاق

ختلانی کا مرید تھا (ملاحظہ ہو قبل ازیں صفحہ 92)۔

سر وولزلی ہیگ (Sir Wolseley Haig) کا کہنا ہے کہ شمس الدین بظاہر خود کو راسخ العقیدہ سنی ظاہر کرتا تھا، مگر "احوط" میں اس کے پیش کردہ عقائد کو کفر اور بدعت کا ایک انبار قرار دیا گیا ہے، جو نہ سنی مسلک کے مطابق ہے نہ شیعہ مسلک کے۔ شمس الدین پہلے تین خلفا اور حضرت عائشہ پر سب و شتم پر اصرار کرتا تھا۔

چنانچہ مرزا حیدر نے ہندوستان کے سنی فقہا کے ایک دینی فتوے کی بنا پر اس بدعت کے استیصال کا بیڑا اٹھایا۔ — کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم، صفحہ 286۔ ہیگ نے "احوط" کا املا غلط طور پر "احویط" لکھا ہے۔

خراسان، جس کے لفظی معنی "مطلعِ آفتاب" کے ہیں، ایران کے پانچ بڑے صوبوں میں سے ایک ہے۔ تھامس مور (Thomas Moore) اپنی "لالہ رخ" میں کہتا ہے: "آفتاب کے اُس دل کش صوبے میں، جو ایرانی سرزمینوں میں سب سے پہلے اس کی کرنوں سے منور ہوتا ہے، جہاں اس کی شعاعوں کے حسین ترین فرزند—پھول اور پھل—ہرندی کے کنارے پر شگفتہ ہیں۔"

سلطان فتح شاہ نے وہ تمام ضبط شدہ اراضی، جو سرکار کے قبضے میں آچکی تھیں، میر شمس الدین کے حوالے کر دیں، اور تھوڑے ہی عرصے میں چک اس کے ہاتھ پر اس کے مسلک میں داخل ہو گئے۔ تاہم شیعہ عقیدے کو اہلِ وادی میں زیادہ پذیرائی حاصل نہ ہو سکی۔ میر شمس الدین عراقی کی تدفین

سری نگر کے محلے زڈی بل میں ہوئی، جس کے قریب سلطان محمد شاہ کے عہد میں کاجی چک نے ایک بڑا امام باڑہ تعمیر کرایا۔ شیخ عراقی کی قبر کشمیر کے شیعوں کے موافقِ عراقی گروہ کے نزدیک نہایت واجب الاحترام ہے، کیونکہ مخالفِ عراقی گروہ اس کے سید ہونے ہی کا قائل نہیں۔

ملک حیدر چاڈورہ، جو خود ایک ممتاز شیعہ ہے، اپنی تاریخ میں اسے شیخ شمس الدین عراقی ہی لکھتا ہے۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ میر شمس الدین کی نعش غیر شیعوں کی بے حرمتی سے محفوظ رکھنے کے لیے چاڈورہ منتقل کر دی گئی تھی۔

شیخ شمس الدین عراقی کا مزار تسوڈور یعنی چاڈورہ میں واقع ہے، جس کا نام نور الدین جہانگیر اور نور جہاں کی نسبت سے نور پور بھی رکھا گیا۔

شیخ حمزہ مخدوم

میر شمس الدین عراقی کے ہاتھوں تشیع کی اشاعت نے سنیوں کو چونکا دیا۔ شیخ حمزہ مخدوم نے اپنے اثر و رسوخ اور تعلیم و تلقین سے شیعیت کی پیش قدمی کو خاصا روکے رکھا۔ شیخ حمزہ مخدوم بابا عثمان کے فرزند تھے اور ۹۰۰ھ (۱۴۹۴ء) میں پیدا ہوئے۔ یہ خاندان اصلاً چندر ونشی راجپوت تھا۔

شیخ حمزہ کے خلیفہ کا نام بابا علی رینہ ہے۔

اپنے گاؤں تجر میں قرآن کی ابتدائی تعلیم کے بعد شیخ حمزہ کو اپنے وقت کے مشہور عالم بابا اسماعیل کبروی کے پاس بھیجا گیا، جس نے انہیں کوہِ ماراں کے دامن میں واقع "دار الشفا" نامی مدرسے میں داخل کیا۔ قرآن، اس کی تفسیر، حدیث اور فقہ کے علاوہ شیخ حمزہ نے تصوف اور اس سے متعلق علوم کی تحصیل کی۔ ان کے نامور اساتذہ میں ایک آخوند ملا لطف اللہ تھے، اور دوسرے بابا اسماعیل کبروی کے فرزند ملا فتح اللہ حقانی۔

جب شیخ حمزہ ملک میں ایک مؤثر قوت بن گئے تو اس وقت کے شیعہ فرمانروا غازی شاہ چک نے انہیں شہر سری نگر سے نکال کر بیرو نامی گاؤں (سری نگر سے تقریباً 20 میل کے فاصلے پر، بذریعہ ماگام، تحصیل بڈگام) میں جلاوطن کر دیا۔ شیخ غازی شاہ کی موت کے بعد ہی شہر واپس آئے۔

شیخ حمزہ مخدوم کے ایک رفیقِ کار سری نگر کے خواجہ طاہر رفیق اشائی سہروردی تھے۔ خواجہ طاہر ابتدائی زمانے میں کپڑے کے تاجر تھے۔ بارہ برس کے عرصے کے بعد انہوں نے تجارت ترک کر کے خود کو دین کی خدمت کے لیے وقف کر دیا۔ پیر حسن شاہ کا بیان ہے کہ

یعقوب شاہ چک ان سے چھٹکارا پانا چاہتا تھا مگر اپنے ارادے کی تکمیل سے خائف رہا۔ شیخ حمزہ کی طرح خواجہ طاہر رفیق بھی سری نگر چھوڑ گئے اور انہوں نے اپنی زندگی کے نو برس مراج کی پہاڑیوں میں بسر کیے۔ بعد ازاں وہ

پرگنہ ویری ناگ کے ایک ممتاز برہمن آدر سہ کے ہاں مقیم رہے۔ آدر سہ نے اسلام قبول کر لیا۔ یہیں خواجہ طاہر کے مشورے سے شیخ یعقوب صرفی، بابا داؤد خاکی اور دیگر حضرات ہندوستان روانہ ہوئے تاکہ اکبر کو کشمیر پر لشکر کشی کی دعوت دیں اور اہلِ کشمیر کو چکوں کی جابرانہ شیعیت سے نجات دلائیں۔ شیخ حمزہ کے زیرِ اہتمام وادی میں بڑی تعداد میں مسجدیں قائم ہوئیں۔ انہیں اپنی سانس پر بھی قابو حاصل تھا، جسے وہ خاصی دیر تک روک سکتے تھے۔ اسی ملکے کی بدولت وہ برف باری کے موسم میں ٹھنڈے پانی کے غسل سے لطف اندوز ہو سکتے تھے، جس سے ان کے اس دردِ سر کو افاقہ ہوتا تھا جو طویل عبادت اور مراقبے کے باعث انہیں لاحق رہتا تھا۔

شیخ حمزہ نے ۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں، علی شاہ چک کے عہدِ حکومت میں، چوراسی برس کی عمر پا کر وفات پائی۔

نمازِ جنازہ خواجہ طاہر رفیق نے پڑھائی۔

شیخ کوہِ ماراں کی ایک ڈھلان پر اپنے پسندیدہ مقامِ مراقبہ ہی میں سپردِ خاک ہوئے۔ مغلیہ عہدِ حکومت کے صوبہ دار نواب عنایت اللہ خان نے ۱۱۲۵ھ (۱۷۱۳ء) میں مقبرہ تعمیر کرایا۔ وہ شکستہ ہو گیا۔

سکھ عہدِ حکومت کے گورنر شیخ غلام محی الدین نے اسے از سرِ نو تعمیر کرایا، اور وہ خود بھی احاطے کے مشرقی حصے میں مدفون ہے۔ ہر سال کوہِ ماراں کے دامن میں بادام کے شگوفے کھلنے کے موسم میں لوگ جوق در جوق اس بزرگ کے مزار پر جمع ہوتے ہیں، کھلے ہوئے پھولوں کا نظارہ کرتے ہیں، اور شیخ حمزہ مخدوم کے لیے فاتحہ خوانی کرتے ہیں — اس عظیم کارنامے کی یاد میں جو انہوں نے وادی کے دور افتادہ ترین گوشوں تک اپنے دوروں اور سفروں کے ذریعے اشاعتِ اسلام کی صورت میں انجام دیا۔ مرزا کمال الدین شیدا نے اپنی نظم میں شیخ حمزہ مخدوم کے لیے اہلِ کشمیر کی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

"تحفۂ محبوبی"، یعنی حضرت شیخ حمزہ مخدومی کے حالاتِ زندگی، اردو میں، از خواجہ غلام محی الدین، ایڈیٹر "کشمیر"، بیری پریس، امرتسر، ۱۹۳۱ء، مذکورہ بالا بیان کا بنیادی ماخذ ہے۔

مغلوں کے عہد میں اسلامی اثر و نفوذ کو ان بہت سے اہلِ علم کی آمد سے مزید تقویت پہنچی جو وادی میں وارد ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ اورنگ زیب کے عہدِ حکومت میں کشتواڑ کے راجپوت راجہ جے سنگھ نے سید شاہ فرید الدین قادری کی کرامات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا۔

...بغداد، اور اسے بختیار خان کا نام دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قبولِ اسلام کے بعد اس کی رعایا کی اکثریت نے بھی اسلام قبول کر لیا، اگرچہ اسلام جہانگیر اور شاہ جہاں ہی کے عہد میں اس خطے تک پہنچ چکا تھا۔ مغل بادشاہوں کے کشمیر کے اسفار کے دوران بھی راستے کے علاقوں میں پرامن طور پر قبولِ اسلام کے واقعات ہوتے رہے، چنانچہ آج بھی ہمیں ایسے راجے ملتے ہیں جو اُن راجپوتوں کی اولاد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔

شاہ فرید الدین قادری

سید محمد فرید الدین قادری، سید مصطفیٰ کے فرزند اور بغداد کے شیخ عبد القادر جیلانی کی اولاد میں سے تھے۔ وہ ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱ء) میں پیدا ہوئے۔ تحصیلِ علم، وسیع اسفار، حج، مکہ میں شیخ جلال الدین المغربی اور مصر میں شیخ محی الدین قادری سے ملاقات کے بعد وہ بغداد سے چل کر سندھ پہنچے۔ سندھ سے آگرہ گئے اور پھر شاہ جہاں کے عہد کے اواخر میں دہلی پہنچے۔ جب راجہ جَیا سنگھ، جو ۱۶۷۴ء میں کشتواڑ کی گدی پر بیٹھا تھا، حکمران تھا تو فرید الدین اپنے چار رفقاء — درویش محمد، شاہ ابدال، سید بہاء الدین سامانی اور یار محمد — کے ہمراہ ۱۰۷۵ھ میں پچھتر برس کی عمر میں وادیِ کشتواڑ میں تبلیغ و اشاعتِ اسلام کے لیے وارد ہوئے۔ ۱۶۸۱ء میں جیا سنگھ کا جانشین کیرت سنگھ بھی مسلمان ہو گیا اور ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب نے اسے سعادت یار خان کا نام عطا کیا۔ غیاث الدین کے فرزند حافظ ابو القاسم قریشی اکبرآبادی کشتواڑ کے شیخ الاسلام اور قاضی القضاۃ مقرر ہوئے۔ کیرت سنگھ کے نمونے نے اس کی رعایا کے لیے مزید مہمیز کا کام دیا۔ ۱۷۱۷ء میں کیرت کی بہن بھوپ دیوی شہنشاہِ دہلی فرخ سیر کے عقد میں آئی۔ کیرت کا چھوٹا بھائی میاں محمد خان تھا۔ شہر کے وسط میں واقع کشتواڑ کا مرکزی مندر مسجد میں تبدیل کر دیا گیا، اور اب اسی میں شاہ فرید الدین کا مزار ہے، جن کے پہلو میں ان کا سب سے چھوٹا فرزند انوار الدین مدفون ہے جو کم سنی ہی میں وفات پا گیا تھا۔ دوسرے حجرے میں اخیار الدین آسودۂ خاک ہیں۔ فرید الدین کے سب سے بڑے فرزند اسرار الدین کا مزار شہر کے دوسرے سرے پر چوگان کی جانب واقع ہے، جو کشتواڑ کا وسیع کھلا میدان ہے۔ اسرار الدین محض اٹھارہ برس کی عمر میں (۱۶۸۵ء) وفات پا گئے۔

دوسرے فرزند اخیار الدین اپنے والد کے بعد بقیدِ حیات رہے۔ اخیار نے ابتدائی تعلیم بٹالہ (ضلع گورداسپور، پنجاب) میں وہاں کے معروف صاحبِ ورع عالم سید بدر الدین، دیوانِ مسانیاں، سے حاصل کی، اور بعد ازاں لاہور، سیالکوٹ اور دہلی وغیرہ کے متعدد اساتذہ کی صحبت سے فیض اٹھایا۔ کشتواڑ واپس آ کر انہوں نے اشاعتِ اسلام میں ہاتھ بٹایا۔ اخیار کا انتقال ۷ ذوالحجہ ۱۱۸۸ھ کو ہوا۔ افغان عہدِ حکومت میں بھی نو مسلموں کی تعداد میں اضافے کا رجحان رہا۔ ایک برہمن نے، جو اصلاً راجوڑ کا اور بعد ازاں سری نگر کے قریب ساورہ کا باشندہ تھا، میر عبدالرشید بیہقی (متوفی ۱۱۸۰ھ = ۱۷۶۶ء) کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور شیخ عبداللہ کے نام سے موسوم ہوا؛ یہی شیخ عبداللہ عصرِ حاضر کے معروف رہنما شیخ محمد عبداللہ کے جدِّ اعلیٰ ہیں۔ ڈوگرہ عہد میں بھی قبولِ اسلام کی ایک نمایاں مثال ملتی ہے: کشمیر کے ایک تحصیل دار سردار وریام سنگھ نے شاہ عبدالرحیم صفاپوری کے زیرِ اثر اسلام قبول کیا۔

فقراء نے کشمیر میں اسلام پھیلایا

الغرض وادیِ کشمیر میں اشاعتِ اسلام کی مختصر تاریخ یہی ہے۔ اول تا آخر اسلام کا فروغ مجموعی طور پر عام طور سے پرامن ہی رہا ہے۔

بہرحال اسلام کو اس وادی میں نہ محمود جیسے کسی فاتح نے متعارف کرایا، نہ شہاب الدین جیسے کسی جنگجو نے، اور نہ محمد بن قاسم جیسے کسی سپہ سالار نے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہاں معاملہ اس کے برعکس رہا۔ اسلام کو بلبل شاہ نامی ایک سادہ فقیر یا درویش نے متعارف کرایا، جس کی سادگی اور تقویٰ نے اس وقت کے فرماں روا رنچن یا رنچنہ کو متاثر کیا۔ پھر یہ

کام فقیروں ہی نے سنبھالا اور جاری رکھا؛ اور اگرچہ لبھی کبھار، سلطان سکندر جیسے حکمران کے عہد میں، ملک سیف الدین جیسے نو مسلم کے جوش نے اسے مہمیز دی، تاہم اس کی وسیع اور پرامن سرایت انہی مسلمان ریشیوں اور اولیاء کے تقویٰ، پاکیزگی اور سادگی کی مرہونِ منت تھی جنہوں نے خود کو لذتوں سے محروم رکھا اور دوسروں کے لیے کام کیا۔ یوں اس عَظیم پیغمبر نے، جنہیں فقر پر فخر تھا، وادیِ کشمیر میں اپنے دین کی اشاعت کے لیے فقراء (فقیر یا درویش) پائے۔

مذکورہ بالا بیان کے ماخذیہ ہیں: (۱) روضۃ العارفین، فارسی مخطوطہ، جو کشتواڑ کے حافظ ضیاء الدین ابن حافظ نصر الدین نے ۱۲۵۹ھ = ۱۸۴۳ء میں مکمل کیا؛ (۲) جے۔ ہچی سن (J. Hutchison) اور جے۔ پی۔ ووگل (J. P. Vogel) کی تصنیف ہسٹری آف کشتواڑ اسٹیٹ، مطبوعہ جرنل آف دی پنجاب ہسٹاریکل سوسائٹی، جلد 4، شمارہ 1، ۱۹۱۶ء؛ (۳) سید نجم الدین شاہ آبادی کی تصنیف، پرتاپ اسٹیم پریس، سری نگر، ۱۳۳۴ھ؛ نیز حیاتِ رحیم از ابوالامین پیر غلام احمد، راوی پرنٹنگ ورکس، لاہور، ۱۳۴۰ھ = ۱۹۲۱ء، صفحہ 120۔

ضمیمۂ باب اول: میر سید علی ہمدانی کا مزار بمقام ختلان (موجودہ کولاب)، تاجک سوویت جمہوریہ

کتاب کا شر کے صفحہ 87 کے حاشیہ نمبر 2 میں ختلان کے اس محلِ وقوع کا بیان موجود ہے جہاں میر سید علی ہمدانی المعروف شاہ ہمدان مدفون ہوئے۔

لیکن ابتدا میں ان کے مزار کی تصاویر کے حصول کی میری کوششیں کامیاب نہ ہو سکیں۔ اوائل ۱۹۴۷ء میں تاج ہوٹل، بمبئی میں میری ملاقات مسٹر سلطان عمروف، ریکٹر سنٹرل

ایشین یونیورسٹی تاشقند، سے ہوئی، جنہوں نے مجھے سوویت اکادمی علوم کے رکن پروفیسر ای۔ این۔ پاولووسکی (E. N. Pavlovsky) سے متعارف کرایا؛ یہ دونوں حضرات دسمبر ۱۹۴۶ء میں نئی دہلی میں منعقدہ سائنس کانگریس میں شرکت کے لیے ہندوستان آئے تھے۔ پروفیسر پاولووسکی سرکاری طور پر اپنا سال ماسکو، لینن گراڈ اور اسٹالن آباد کے مابین تقسیم کرتے ہیں۔

انہی کے حسنِ التفات سے مجھے وہ تصاویر میسر آئیں، جس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔ امید ہے کہ انہوں نے جو معلومات فراہم کی ہیں، قارئین انہیں دلچسپی اور لطف کے ساتھ پڑھیں گے۔

ذیل میں ان کے دو خطوط کے اقتباسات درج ہیں، جن کے بعد ختلان یا خُتل کے موجودہ نام کولاب کے مزار پر مسٹر کولپاکوف (Kolpakoff) کا توضیحی مضمون دیا گیا ہے۔

۹۲۰ھ = ۱۵۱۴ء میں شہنشاہ بابر نے شاہ ہمدان کے مزار کا طواف کیا تھا، جس کے قریب نارنگی اور ترنج کے باغ تھے۔

مکتوب محررہ لینن گراڈ، ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء:

”محترم ڈاکٹر صوفی، آپ کو جن تصاویر کی ضرورت تھی ان کا ایک حصہ مجھے موصول ہو گیا ہے۔ یہ تصاویر اسٹالن آباد میں اکادمی علوم کی تاجکستان شاخ کے ایک کارکن اے۔ سیمینوف (A. Semenov) نے اتاری ہیں۔ انہوں نے ایک اور مستشرق کے ہمراہ کولاب جا کر یہ تصاویر لیں۔ فی الحال مجھے صرف میر سید علی ہمدانی کے مزار کی تصاویر ملی ہیں، جن میں سے سات اس خط کے ہمراہ ارسال کر رہا ہوں۔ افسوس کہ ان کا معیار کچھ زیادہ بلند

نہیں، تاہم امید ہے کہ ان میں سے بعض آپ کو بلاک تیار کرانے کے لیے موزوں معلوم ہوں گی۔ اگر مجھے ان میں سے مزید موصول ہوئیں تو یقیناً فوراً آپ کو روانہ کر دوں گا۔ تصاویر شائع کرتے وقت ان کے ذیل میں براہِ کرم یہ ضرور درج کیجیے کہ یہ تصاویر مسٹر اے۔ سیمینوف نے اتاری ہیں۔ ختلان اب عام طور پر کولاب کے نام سے معروف ہے (روسی زبان میں اس کا تلفظ کولیاب کیا جاتا ہے)۔ یہ تاجک سوویت اشتراکی جمہوریہ کا ایک شہر ہے، جس کا نشان آپ اس لفافے کے ڈاک ٹکٹوں میں سے ایک پر دیکھ سکتے ہیں۔

میں تاجکستان جا رہا ہوں اور اسٹالن آباد میں قیام کے دوران آپ کی دلچسپی کے مزارات کے متعلق مزید معلومات حاصل کر کے آپ کو لکھوں گا۔

آپ کا مخلص، ای۔ پاولووسکی"

(لینن گراڈ سے ۱۰ ستمبر ۱۹۴۷ء کا یہ مذکورہ بالا خط روسی زبان میں لکھا گیا تھا، جس کا ترجمہ ازراہِ کرم مسٹر ڈبلیو۔ ایوانوف (W. Ivanow)، کولابہ، بمبئی نے میرے لیے کر دیا۔)

مکتوب محررہ اسٹالن آباد، ۵ اکتوبر ۱۹۴۷ء:

"محترم ڈاکٹر صوفی، جیسا کہ میں آپ کو لکھ چکا ہوں، میں اس وقت اسٹالن آباد (تاجکستان) میں ہوں، جہاں وہ قدیم شہر کولاب واقع ہے جس سے آپ کو دلچسپی ہے۔ آپ کی دلچسپی کے مزار کی کچھ تصاویر میں نے ہوائی ڈاک سے آپ کو بھیج دی ہیں۔ کولاب میں صرف یہی ایک مزار موجود ہے۔ اس میں گیارہ حجرے اور قبروں کی ایک قطار ہے۔

مجھے یہاں کچھ نیگیٹو حاصل کرنے میں کامیابی ہوئی ہے جو میں نے بڑی تصاویر بنوانے کے لیے ماسکو بھیج دیے ہیں۔ ماسکو سے موصول ہوتے ہی میں وہ تصاویر آپ کو روانہ کر دوں گا۔

آپ کو مزار کی موجودہ حالت کا جو بیان درکار تھا، اس کے لیے میں اس خط کے ہمراہ مقامی اخبار کولاب ٹروتھ (The Kolab Truth) کا ایک تراشہ بھیج رہا ہوں، جس میں میرے رفیقِ کار مسٹر کولپاکوف کا مضمون شامل ہے؛ انہوں نے مزار کے معائنے اور اس کی تصاویر اتارنے کی غرض سے کولاب کا سفر کیا تھا۔

یہ مضمون یقیناً بہت جامع نہیں، تاہم اس سے آپ کو مزار کا کچھ نہ کچھ اندازہ بہرحال ہو جائے گا۔

مسٹر کولپاکوف ان دنوں ایک زیادہ مفصل علمی تصنیف کی ترتیب میں مصروف ہیں، جو طبع ہونے پر آپ کو بھیج دی جائے گی۔

سوویت اکادمی علوم کی تاجک شاخ میں تاریخ، لسانیات اور ادبیات کا ایک خصوصی ادارہ قائم ہے۔ اس کے رفقائے کار مشرق اور بالخصوص ہندوستان کے ادبیات سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں آپ کا نہایت ممنون ہوں گا اگر آپ اپنی تمام تصانیف، نیز ان دیگر اہلِ علم کی کتابیں بھی، جو نہ صرف انگریزی بلکہ مشرقی زبانوں میں بھی اپنی تصانیف ہمیں دینے پر آمادہ ہوں، ازراہِ کرم مجھے ارسال کر دیں۔ اگر تاریخ یا ادب سے متعلق کوئی چیز ہمیں بھیجنا ممکن ہو اور اس سلسلے میں ہماری اعانت آپ کے لیے باعثِ زحمت نہ ہو تو براہِ کرم اپنی مراسلت اس پتے پر بھیجیے: لینن گراڈ، شاہراہ کارل مارکس، مکان نمبر 5، فلیٹ نمبر 5، ای۔ این۔ پاولووسکی، رکن اکادمی علوم۔ ہمارا خلوص آمیز سلام اور آپ کی علمی مساعی کی کامیابی کے لیے ہماری نیک خواہشات قبول کیجیے۔ احترام کے ساتھ،

دستخط: ای۔ پاولووسکی، رکن اکادمی“

مزارِ میر سید علی ہمدانی واقع کولاب (تاجکستان، سوویت یونین) پر مسٹر کولپاکوف کا مضمون، مطبوعہ اخبار کولاب ٹروتھ، ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء

شہر کولاب کے مشرقی جانب واقع یہ مزار، جو مزار امیر سید علی ہمدانی کے نام سے معروف ہے، ۵۹۶ برس قبل تعمیر ہوا تھا اور ہمارے عہد کی چودھویں صدی عیسوی کے تاجک طرزِ تعمیر کی نہایت قابلِ ذکر یادگاروں میں شمار ہوتا ہے۔

یہ عمارت بنیاد ہی سے اینٹوں کی بنی ہے، جنہیں گچ کے مائع مسالے سے جوڑا گیا ہے، اور اس کی دیواروں کی بیرونی اور اندرونی سطحوں کی تکمیل بھی گچ ہی سے کی گئی ہے۔ اپنے صدیوں پر محیط وجود کے دوران اس عمارت کی مرمت شاذ و نادر ہی ہوئی ہے اور اس کی گچ کاری خاصی حد تک جھڑ چکی ہے۔

مزار کے چار دروازے ہیں: دو شمال کی جانب اور ایک ایک مشرقی اور جنوبی اطراف میں۔ تمام دروازوں پر تیر نما نوک دار محرابیں بنی ہیں۔ مزار کے اندر گیارہ حجرے ہیں، جن میں سے دو بڑے اور نو چھوٹے ہیں۔ ان میں سے ہر حجرے پر ایک کروی گنبد قائم ہے۔ اس یادگار کا طرزِ تعمیر نہایت دلچسپ ہے۔

معمار کا تصور نہایت انوکھے انداز میں بروئے کار لایا گیا ہے: بنیاد میں مربع عمارت اوپر جا کر بارہ پہلوؤں والی ساخت میں ڈھل جاتی ہے، جس پر اینٹوں کا بنا ہوا کروی گنبد قائم ہے؛ یہ اینٹیں صرف گچ سے جوڑی گئی ہیں اور ان میں لکڑی یا دھات کی کوئی کمک استعمال نہیں ہوئی۔ چھ صدیوں کے دوران متعدد زلزلے آئے، لیکن بعض چھوٹے گنبدوں کی اِکا دُکا دراڑوں سے قطعِ نظر یہ عمارت اب بھی تقریباً سلامت کھڑی ہے۔ مزار کے مرکزی حجرے

میں مسلمان عالم امیر سید علی ہمدانی مدفون ہیں۔ وہ اصلاً ہمدان کے رہنے والے تھے اور تیمور کے عہد میں بخارا میں مقیم رہے۔ سید علی ہمدانی کا سالِ ولادت ۱۳۱۴ء بتایا گیا ہے۔ تیمور سے کسی اختلاف کے نتیجے میں امیر سید علی ہمدانی بخارا سے نکل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے مشرق کے تمام ممالک کی وسیع سیاحت کی۔ طلبِ علم میں عرب ممالک گئے۔ مکہ اور مدینہ میں عبادت کی، پھر ہندوستان روانہ ہوئے، جہاں بہت سے شہر دیکھے۔ کچھ عرصہ کشمیر میں مقیم رہے۔ یہاں ان کی ملاقات بت پرستوں سے ہوئی، جنہیں انہوں نے مشرف بہ اسلام کیا۔

کشمیر میں ان کی تعمیر کردہ ایک مسجد آج تک موجود ہے۔

سید علی ہمدانی بدخشاں بھی تشریف لے گئے۔ اپنی سیاحتوں کے اختتام پر امیر سید علی ہمدانی کولاب میں سکونت پذیر ہو گئے، جہاں انہوں نے مسجد اور مزار کی تعمیر کے لیے زمین کا ایک بڑا قطعہ حاصل کیا۔

شمالی ہندوستان کی آبادی پر سید علی ہمدانی کا اثر خاصا گہرا تھا۔ انہی کی مساعی اور تبلیغ کے نتیجے میں اہلِ کشمیر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ ان کے بعد ان کی ایک دینی تصنیف اورادِ شریف کے نام سے یادگار ہے۔

۱۳۸۴ء میں سید علی ہمدانی کولاب کے اسی مزار میں دفن ہوئے، جو بعد ازاں ان کی اولاد کی بھی آخری آرام گاہ بنا۔ ان کی بہن ماہِ خراسانی اور آفتابِ پنہانی نامی ایک خاتون، نیز سید علی کی اولاد کے دس سے زائد دیگر افراد اسی مزار میں مدفون ہیں۔ وہیں شوئی تالیکونی نامی ایک شیخ بھی مدفون ہیں، جو شہر تالقان کے باشندے تھے [تالقان کا طول بلد 69°27 اور عرض بلد 36°45 ہے اور یہ شمالی افغانستان میں مزار شریف کے جنوب مغرب میں واقع ہے] اور

مسجد اور مزار کے متولی کی حیثیت سے کولاب میں مقیم تھے۔ مزار کے جنوب مغرب میں، عمارت کے کونے سے ۲۰ میٹر کے فاصلے پر، زمین میں ایک ابھار ہے جس پر نہایت نادر کاریگری کا سنگِ مرمر کا ایک پتھر رکھا ہے، جس پر عربی زبان کا ایک کتبہ سید علی کے احوال سے متعلق ہے۔ مصقول سنگِ مرمر کا یہ پتھر، جس کا وزن ایک ٹن ہے، ایک قدیم روایت کے مطابق ہندوستان سے ہاتھیوں پر کولاب لایا گیا تھا۔ یہ لوحِ مزار اس مزار کے اندر نہیں رکھی گئی جہاں سید علی دفن ہیں، بلکہ زمین کے اس ابھار پر ہے جہاں مشہور فاتح تیمور—جو اہلِ یورپ میں تیمور لنگ (Tamerlane) کے نام سے معروف ہے—کے پوتوں میں سے ایک کی قبر واقع ہے۔ نادر کاریگری کی یہ لوحِ مزار بعض مقامات سے خاصی مجروح ہو چکی ہے، اور سنگِ مرمر کی وہ سل، جو پہلے اس کے اوپر رکھی تھی اور ۱۹۳۹ء تک سلامت تھی، اب کئی ٹکڑوں میں ٹوٹ چکی ہے۔ وہ اس وقت اسی حالت میں مزار کے اندر پڑی ہے اور اس پر بھی عربی میں کوئی کتبہ ہے، جس کا پڑھنا اس وقت نہایت دشوار ہے۔ کولاب میں تاجک فنِ تعمیر کی یہ یادگار—مزارِ ہمدانی اور اس کے قریب کی مرمریں لوحِ مزار—بلاشبہ خاصی تاریخی قدر و قیمت رکھتی ہے۔ مقامی حکام کو مزار کی مرمت اور لوحِ مزار کے تحفظ کی جانب سنجیدہ توجہ دینی چاہیے۔

دستخط: اے۔ کولپاکوف، امیدوارِ ڈاکٹری برائے علومِ تاریخ۔

کولاب ٹروتھ، ۱۱ اگست ۱۹۴۷ء، شمارہ 93/276۔

(اسٹالن آباد کا خط اور کولاب ٹروتھ کا مضمون، جو روسی زبان میں تھے، ان کا ترجمہ ازراہِ کرم میسرز والکارٹ برادرز، کراچی، پاکستان کے مسٹر اے۔ ایلسنگرے (A. Elsingre) نے میرے لیے کر دیا۔)

باب چہارم — سلاطینِ کشمیر

سلاطین سے قبل کشمیر میں ہندو اقتدار کا آخری دور

جیسا کہ باب دوم کے اختتام پر اشارہ ہو چکا ہے، کشمیر میں ہندو اقتدار راجہ سہدیو کے عہدِ حکومت کے خاتمے کے ساتھ ختم ہو گیا۔ جون راجہ اسے "راجہ کے روپ میں راکشس" یعنی دیو قرار دیتا ہے اور مزید لکھتا ہے کہ وہ "انیس برس، تین ماہ اور پچیس دن" (۱۳۰۰ء تا ۱۳۲۰ء) اس ملک کو "نگلتا" رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نظمِ حکومت مفلوج ہو کر رہ گیا۔ بداخلاقی کی وبا اس سے پھیل کر رعایا میں سرایت کر گئی۔ عیاشی اور بے راہ روی کا دور دورہ تھا۔ اقتدار کی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی تھیں۔ کسی مالی یا معاشی بہتری کے بجائے سہدیو کا دورِ حکومت عمومی زوال سے عبارت تھا۔

دُلچہ کی یورش

ایسی حالت پڑوسی سرداروں کی نگاہوں سے پوشیدہ نہ رہ سکتی تھی۔ چودھویں صدی کے آغاز میں دُلچہ — جسے کشمیری مؤرخین زُلچی لکھتے ہیں — اور جسے "عظیم بادشاہ کرم سین کی فوج کا سپہ سالار" بیان کیا جا چکا ہے، ساٹھ ہزار سواروں کا لشکر لے کر اترا اور سہدیو کے برائے نام اقتدار کے آخری ایام میں درۂ زوجی لا کے راستے کشمیر میں داخل ہوا۔ سہدیو میں اتنی سکت نہ تھی کہ دُلچہ کا سامنا کرتا اور اسے میدانِ جنگ میں روکتا۔ اس نے فرار میں عافیت ڈھونڈی اور دُلچہ کو فاتح اور حالات کا مختارِ کل چھوڑ گیا۔ کامیابی کے نشے میں سرشار دُلچہ کے

لشکریوں نے جی بھر کر خلقِ خدا پر ظلم ڈھائے اور لوٹ مار کی۔ شہر، قصبے اور دیہات تخریب و بربریت کی ناقابلِ بیان ہولناکیوں سے دوچار ہوئے۔ بے شمار باشندے، بلا لحاظِ عمر و جنس، بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ ''ان گنت دیوتا توڑ ڈالے گئے۔'' خونریزی اور قتلِ عام کے علاوہ دُلچہ ''ملک کے تنومند مردوں کو بھی پکڑ کر لے گیا۔'' الغرض کشمیر میں دُلچہ کی آمد چنگیز اور ہلاکو کی خونیں غارت گریوں سے مشابہ تھی۔

دُلچہ نے یہ زمانہ کشمیر میں ۱۳۱۹ء میں بسر کیا۔ اہلِ کشمیر کی خوش قسمتی سے کشمیر کی شدید سردی نے اس خونخوار حملہ آور کو ہراساں کر دیا۔

سخت سرما کے بے رحم شکنجے اور غالباً فاقہ کشی سے بھی نجات کی کوئی اور صورت نہ پا کر دُلچہ اس سرزمین سے نکل گیا۔ پنڈت بیربل کچرو نے دُلچہ کی یورش کا نقشہ نہایت موزوں طور پر ان مختصر لفظوں میں کھینچا ہے: ''آیا، لوٹا، قتل کیا، پکڑا اور چلا گیا۔'' دُلچہ—جسے وہ زُلچی کہتا ہے—کی اس ہولناک آمد کی اس سے زیادہ مؤثر تصویر کشی ممکن نہیں۔

بعض مؤرخین نے دُلچہ یا زُلچی کو ترک، منگول یا تاتاری نژاد قرار دیا ہے، اور ساتھ ہی اسے ذوالقدر خان کا نام بھی دیا ہے۔ یہ بات ہرگز ثابت نہیں کہ وہ مسلمان تھا۔

البتہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ بدھ مت کا پیرو تھا، کیونکہ اس کا بادشاہ کرم سین تھا۔ اپنی درندگی کے باعث دُلچہ یا زُلچی بجا طور پر ہن کہلانے کا مستحق ہے۔

دُلچہ کے کشمیر سے چلے جانے پر ملک حکمران اور مرکزی حکومت دونوں سے محروم ہو گیا۔ ہر طرف خودمختار سرداروں کے دھڑے ابھر آئے جو کسی کا اقتدار تسلیم نہ کرتے تھے۔ یہیں رنچنہ نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے، جس کا ذکر ہم عنقریب کریں گے۔

سہدیو اپنی تمام تر سنگدلی اور خودغرضی کے باوجود مہمان نوازی کی خوبی سے نمایاں حد تک بہرہ ور تھا۔ وہ ذات پات اور مذہب و ملت کے امتیاز کے بغیر فیاض تھا۔ اس کے عہدِ حکومت میں، جو جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے انیس برس، تین ماہ اور پچیس دن پر محیط تھا، دو ایسی شخصیتیں اس کی مملکت میں داخل ہوئیں جو آئندہ چل کر صاحبِ اقتدار ہونے والی تھیں، اور اس نے زمینیں اور جاگیریں عطا کر کے دونوں کی گزر اوقات کا معقول بندوبست کر دیا۔ پہلا شخص جس نے راجہ کے ہاں مہمان نوازی پائی لنکر چک تھا، جو ان چکوں کا جدِ امجد تھا جو شاہ میری سلاطین کے بعد کشمیر کے اقتدار کے وارث ہوئے۔ اپنے بھائی سے شکست کھا کر لنکر دردو یعنی دردستان سے بھاگا اور کشمیر میں اسے فوری اور پرتپاک پناہ میسر آئی۔ دوسرا واقعہ جو مؤرخین نے قلمبند کیا ہے وہ شاہ میر بن طاہر کا ہے۔

شاہ میر پنچ گہورا سے آیا تھا، جس کی شناخت سر اورل سٹائن (Sir Aurel Stein) نے قدیم کشمیر کے اپنے نقشے میں اس وادی سے کی ہے جو بڈل اور راجوری کے درمیان واقع ہے اور جسے پنچ گہوراندی سیراب کرتی ہے۔ لیکن بعض تواریخ سوات یا سوادگیر کا ذکر کرتی ہیں۔ سہدیو نے اسے مہربانی سے شرفِ باریابی بخشا اور اس کے نام ایک گاؤں کر دیا۔

رنچنہ مغربی تبت یعنی لداخ کے حکمران خاندان کا ایک فرزند تھا۔ جب درباری امرا کی بغاوت میں اس کا باپ قتل کر دیا گیا تو وہ ملک چھوڑ کر اپنے رفیقوں اور سپاہیوں سمیت دُلچہ کی یورش کے زمانے میں کشمیر آپہنچا۔ بلکہ جون راجہ تو اسے دُلچہ کے ساتھ شریکِ یورش قرار دیتا ہے۔ دیگر مؤرخین رنچنہ کی آمد کی مختلف روایتیں بیان کرتے ہیں۔ وہ بھی زوجی لا ہی کے راستے داخل ہوا، جس طرح ۱۵۳۲ء میں مرزا حیدر دوغلت داخل ہوا تھا۔

یہی راستہ کشمیر کو لداخ سے اور آگے تبت اور چین سے ملاتا تھا۔ ذیل کی تصویر اس وقت کی ہے جب میں ۱۹۴۸ء میں زوجی لا سے گزرا۔

رنچن، رنچنہ یا رنیان

رنچنہ کے نام کے بارے میں مؤرخین کے مابین کچھ اختلافِ رائے پایا جاتا ہے۔ بعض نے رتن جو یا رنجو شاہ اختیار کیا ہے، بعض نے ریچن، رینچن یا رین چن شاہ، جبکہ بعض اسے رنج پو یا رتن چن بھی کہتے ہیں۔ رنچن ہی کو درست ماننے کو جی چاہتا ہے، کیونکہ اس کے تبتی یا لداخی نژاد ہونے میں کوئی اختلاف نہیں۔ تبتی زبان میں رنچن کے معنی "بڑا دیوتا" کے ہیں۔ رنچن شاہ کا نام آج بھی لداخ میں مستعمل ہے۔ البتہ کشمیری اسے رنتن بولتے ہیں اور رنتن شاہ کہتے ہیں۔ اس امر کی شہادت خواجہ محمد اعظم کی تصنیف واقعاتِ کشمیر المعروف تاریخِ کشمیر اعظمی (محمدی پریس، لاہور، صفحہ 60) میں بھی موجود ہے، جس میں مذکور ہے کہ ایک مسجد اب تک "بادشاہ رنتن کی مسجد" کے نام سے موسوم ہے۔ لوگ آج بھی اسے رنتن شاہ کی مسجد کہتے ہیں۔ اس نام کی سنسکرت صورت رنچنہ ہے جسے سر اورل سٹائن نے اختیار کیا ہے۔ ہم بھی اسے رنچنہ ہی لکھیں گے۔

رنچنہ کشمیر کا فرماں روا بنتا ہے

ہمیں وہ افراتفری فراموش نہ کرنی چاہیے جو دُلچہ کی یورش کے سبب اس وقت کشمیر میں برپا تھی۔ ملک کا کوئی حکمران نہ تھا۔ اس کا پرانا راجہ سہدیو، جو ایک بزدل اور پست ہمت انسان تھا، غائب ہو چکا تھا۔ اس کا سپہ سالار رام چندر گگن گیر کے قلعے کی فصیلوں کے پیچھے جا بیٹھا تھا۔ ظاہر ہے کہ کشمیر کو ایک مضبوط اور باصلاحیت حکمران کی ضرورت تھی۔

رنچنہ، جو جون راجہ کے بقول "مردوں میں شیر" تھا اور اپنی بلند دانش کے باعث محترم سمجھا جاتا تھا، عین موقع پر موجود تھا۔ وہ ان سب کے دل پہلے ہی جیت چکا تھا جن سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ اس کے حامیوں اور جاں نثاروں کی تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، یہاں تک کہ وہ اتنا طاقتور ہو گیا کہ تخت پر قبضہ کر کے اپنا اقتدار منوا سکے۔

۱۔ گگن گیر، جس کا قدیم نام گنگن گیری ہے، اب کشمیر کی وادیِ سندھ کے پرگنہ لار کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے، جو دریا کے دائیں کنارے پر، سونا مرگ سے تقریباً دس میل مغرب میں، نہایت خوش منظر مقام پر واقع ہے۔ آبادی 398۔ ۲۔ جون راجہ کی سنسکرت تاریخ موسوم بہ "کنگز آف کشمیرا" (Kings of Kashmira) کا انگریزی ترجمہ از جوگیش چندر دت (Jogesh Chunder Dutt)، کلکتہ، ۱۸۹۸ء، جلد سوم۔

اس کی تخت نشینی کسی غاصبانہ اقدام کا نتیجہ نہ تھی، بلکہ اسے قریب قریب عوامی تائید و استقبال حاصل تھا۔ تخت نشینی کے کچھ ہی عرصہ بعد وہ پوری تندہی سے ملک کو ان مفاسد سے پاک کرنے میں مصروف ہو گیا جو مناسب نظمِ حکومت کے فقدان اور مضبوط مرکزی اقتدار کی تقریباً مکمل عدم موجودگی کے سبب اس زمانے میں پھیل چکے تھے۔

تاہم خود کو بے حریف سمجھنے میں رنچنہ نے غلط اندازہ لگایا۔ اس کے تخت پر سرفراز ہونے سے رام چندر کے دل میں فطری طور پر حسد اور جاہ طلبی کے شدید جذبات بھڑک اٹھے۔ چنانچہ اس نے رنچنہ کا اقتدار تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ رنچنہ نے دانشمندی سے کام لیتے ہوئے اس کے خلاف کوئی کھلی مزاحمت نہ کی، کیونکہ وہ خوب جانتا تھا کہ ملک جنگ کی تباہ کاریوں سے پہلے ہی بہت کچھ سہہ چکا ہے۔ علاوہ ازیں وہ ان نفاقوں سے بھی بخوبی آگاہ تھا

جنہوں نے ملک کو دھڑوں میں بانٹ رکھا تھا، اور امن کی قدر و قیمت سمجھتا تھا۔ لہٰذا اس نے ایک تدبیر سے کام لیا۔

ایک مدت تک وہ اپنی تبتی یا لداخی رعایا کو تاجروں کے بھیس میں گگن گیر بھیجتا رہا، جو اپنا مالِ تجارت نہایت ارزاں نرخوں پر فروخت کرتے تھے۔ جب اس طرح اس نے شکوک و شبہات دور کر دیے تو اس نے اپنے آدمیوں کو، جنہیں ضروری ہدایات پہلے ہی دے دی گئی تھیں، حکم دیا کہ جس لمحے وہ خود وہاں پہنچے، بغاوت پر اٹھ کھڑے ہوں۔

اس شب خون کے نتیجے میں رام چندر مارا گیا اور اس کا بیٹا راون چندر اپنے عزیزوں سمیت گرفتار ہو گیا۔ اس طرح ۱۳۲۰ء میں رنچنہ کشمیر کا بلا شرکتِ غیرے فرماں روا بن گیا۔

اپنی حیثیت مزید مستحکم کرنے کے لیے رنچنہ نے "ملکہ کوٹا کو اپنے سینے سے لگا لیا"، یعنی رام چندر کی بیٹی کوٹا رانی سے شادی کر لی، اور اس کے بیٹے راون چندر کو فوج کا سپہ سالار مقرر کر کے مغربی تبت اور لار اس کی جاگیر میں دے دیے۔ اس اقدام سے یہ مقصد بھی پیشِ نظر تھا کہ راون چندر کے دل سے انتقام کی ہر خواہش نکل جائے۔ یہ مقصد پوری طرح حاصل ہوا، کیونکہ وہ دونوں کامل قربت اور مخلصانہ دوستی کے ساتھ رہنے لگے۔ ملک حیدر چاڈورہ ہمیں بتاتا ہے کہ رنچنہ نے کشمیر کے قدیم دستور کے مطابق اظہارِ تکریم کے لیے راون چندر کو "جی دِست" کا لقب عطا کیا۔ کوٹا کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام سلطان صدر الدین نے — کیونکہ رنچنہ مسلمان ہو کر یہی نام پا چکا تھا — حیدر رکھا۔

رنچنہ کا احساسِ عدل

رنچنہ حکمت اور انصاف کی صفات سے متصف تھا اور معاملات کے فیصلے ہمیشہ کامل غیر جانبداری سے کرتا تھا؛ نہ اسے اقتدار کی پروا تھی نہ دولت کی۔ جون راجہ نے حسبِ ذیل دو مقدمے قلمبند کیے ہیں جو، اپنی تمام تر عجیب و غریب نوعیت کے باوجود، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اسے انصاف کا کس قدر پاس تھا اور وہ ان مقدمات کے فیصلے میں کیسی حاضر دماغی سے کام لیتا تھا جو بسا اوقات بڑے بڑے داناؤں کو بھی چکرا دیتے۔

ایک دن رنچنہ کے ایک پرانے رفیق ٹکہ یا تُکہ کے بھائی تِمی نے ایک گوالن سے زبردستی دودھ چھین لیا۔

اس نے رنچنہ کے حضور فریاد کی۔

اس نے حکم دیا کہ تِمی کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ ملزم کے پیش ہونے پر رنچنہ نے اس سے دریافت کیا کہ آیا گوالن کی شکایت درست ہے۔ ملزم نے الزام سے قطعی انکار کر دیا۔

جب مزید ثبوت طلب کیا گیا تو گوالن نے کہا:

۱۔ تاریخِ کشمیر از رئیس الملک ملک حیدر چاڈورہ، قلمی نسخہ، صفحہ 121۔ اس مصنف کے مطابق کشمیر میں "جی" — یعنی آقا یا مخدوم — کا لفظ کسی شخص کی تعظیم و تکریم کے اظہار کے لیے استعمال ہوتا تھا، اور "دِست" کے معنی دوست کے ہیں؛ چنانچہ "جی دِست" کا مطلب ہوا "معزز دوست"۔ ۲۔ جون راجہ کی سنسکرت تاریخ "کنگز آف کشمیرا" کا انگریزی ترجمہ از جو گیش چندر دت، کلکتہ، ۱۸۹۸ء، جلد سوم، صفحہ 20۔ ۳۔ تُکہ غالباً تبتی لفظ ہے جس کا تلفظ ڈُگپا ہے (دی انڈین اینٹی کویری، بمبئی، جلد XXXVI، جولائی ۱۹۰۸ء)۔

"اسی وقت اس شخص کا پیٹ چاک کر دیجیے، اور اگر اس میں دودھ نہ نکلے تو مجھے اور میرے بیٹے کو قتل کر دیا جائے۔" پیٹ چاک کیا گیا تو اس میں دودھ موجود پایا گیا۔ مہذب معاشرے کے تقاضوں کی رو سے انصاف کا یہ طریقہ سراسر ظالمانہ اور وحشیانہ ہے، مگر اس زمانے میں یہ اس معاشرے کو، جو تہذیبی معیار میں بہت پیچھے تھا اور جس کی رہنمائی کے لیے کوئی متعین ضابطۂ قوانین موجود نہ تھا، کچھ ایسا انوکھا محسوس نہ ہوا؛ ورنہ رنچنہ، جو خود عدل کا شیدائی تھا، اسے کبھی اختیار نہ کرتا۔ علاوہ ازیں یہ واقعہ اس کی کامل غیر جانبداری کے ساتھ ساتھ فریقین کے نسبی مرتبے سے اس کی مکمل بے نیازی کو بھی صاف ظاہر کرتا ہے۔ مزید برآں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ رعایا کو اس تک کیسی رسائی حاصل تھی کہ ایسے چھوٹے چھوٹے معاملات بھی اس کے حضور پیش ہو سکتے تھے۔ اس کے در سے انصاف طلب کرنے والوں کی راہ میں کوئی روک ٹوک نہ تھی۔

دوسرا مقدمہ یوں تھا۔ تحصیل بڈگام کے ایک گاؤں ون بل کے دو باشندوں نے اپنی گھوڑیاں مع بچھیروں کے ایک چرواہے کے سپرد کر رکھی تھیں۔ بچھیروں کی عجیب بات یہ تھی کہ وہ ہم عمر تھے اور ان کا رنگ بالکل یکساں تھا۔ جب گھوڑیاں اور بچھیرے سرمائی ٹھکانوں سے گرمائی چراگاہ کی طرف لے جائے گئے تو ایک بچھیرا مر گیا، یا ایک اور روایت کے مطابق "اسے جنگل میں شیر نے مار ڈالا۔" دونوں گھوڑیاں یہ نہ جان سکیں کہ ان میں سے کس کا بچہ ضائع ہوا ہے، اور نتیجہ یہ نکلا کہ بچ رہنے والا بچھیرا جب جی چاہتا دونوں کا دودھ پیتا۔ چرواہا بھی نہ بتا سکتا تھا کہ کس مالک کی گھوڑی کا بچھیرا مرا ہے۔ چنانچہ بچ جانے والے بچھیرے کی ملکیت دونوں گھوڑیوں کے مالکوں کے مابین جھگڑے کا باعث بن گئی۔ مقدمہ بادشاہ کے حضور پہنچا، جس نے مالکوں کو حکم دیا کہ گھوڑیاں اور بچھیرا شہر کے قریب کشتیوں کے پل پر لائے جائیں۔ جب ایسا کر دیا گیا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ بچھیرے کو دریا

میں پھینک دیا جائے۔ اس پر بچھیرے کی ماں بھی دریا میں کود پڑی؛ دوسری صرف ہنہنا کر رہ گئی۔ اس عمدہ تدبیر سے بادشاہ نے بچھیرا اس کے حقیقی مالک کو دلوا دیا۔ جب رنچنہ مشتبہ مقدمات کے فیصلے اس انداز سے کرتا تو لوگ سمجھتے کہ گویا "سنہری دور لوٹ آیا ہے۔" جاگیردار امرا، جنہیں ڈامر کہا جاتا تھا اور جو بعض اوقات سابق حکمرانوں کے لیے خاصی زحمت کا باعث بنتے تھے، پوری طرح قابو میں لے آئے گئے۔ الغرض رنچنہ نے انصاف رسانی میں کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہ کیا اور اپنی زندگی کے باقی ایام اسی نظمِ عدل کے لیے وقف کر دیے۔

اسی طرح اس نے اپنے تمام عہدہ داروں کو سخت ہدایات جاری کیں۔ جون راجہ کے الفاظ میں "نامور رنچنہ (سلطان) نے اس ملک کو، جو فتنہ و انتشار سے تھک چکا تھا، اپنے بازوئے حمایت کی پناہ میں لے لیا۔" لوگوں نے وہ تمام جشن اور تہوار پھر دیکھے جن سے وہ اپنے سابق بادشاہوں کے عہد میں مانوس تھے ("کنگز آف کشمیرا"، صفحہ 19؛ نیز دی انڈین اینٹی کویری، جولائی ۱۹۰۸ء، صفحہ 183)۔

ملک میں امن و امان بحال کرنے کے بعد رنچنہ نے مذہبی امور کی طرف توجہ کی۔ اگرچہ اس زمانے میں بدھ مت برائے نام غالب مذہب تھا، مگر ملک فرقوں کے باہمی نزاعوں سے پریشان تھا، جن کے متضاد اور متحارب دعوے مذہبی صداقت کے اس متلاشی کو الجھن میں ڈالے دیتے تھے جو قومی مذہب سے مطمئن نہ تھا۔ پہلے بادشاہ نے ہندو مذہب کے دانا اور فاضل پروہتوں سے رہنمائی چاہی۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ کے بقول — جو ظاہر ہے جون راجہ ہی کی سند پر ہے، اور جون راجہ اس ضمن میں سری دیو سوامی کا نام لیتا ہے — انہوں نے اس کی رہنمائی کرنے یا اسے شیو مت میں داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ پنڈت

بیربل کچرو اور رئیس الملک ملک حیدر چاڈورہ کے مطابق انہوں نے اس موضوع پر اسے سمجھانے کی ہر ممکن کوشش کی، مگر اسے مطمئن نہ کر سکے۔ مذہب کے بارے میں ان کے گوناگوں خیالات اور ایک دوسرے سے متصادم عقائد نے اسے مزید الجھا دیا۔ اس ناکامی سے ہمت ہارے بغیر اس نے اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ کہا جاتا ہے کہ بہت اضطرابِ قلب اور مسلسل دعاؤں کے بعد ایک رات اس نے خواب دیکھا کہ کوئی اس سے کہہ رہا ہے: "کل صبح سویرے جس شخص پر تیری پہلی نظر پڑے، وہی تیرا رہنما ہے۔" اس نے اس ہدایت پر عمل کیا اور اگلی صبح اپنے محل کی چھت سے ایک ایسے شخص کو دیکھا جس کا رخ مغرب کی جانب تھا اور جو بظاہر ایک ایسے طریقے سے عبادت میں مشغول تھا جو اس کے لیے اس وقت تک نامانوس تھا۔

۱۔ جیرٹ (Jarrett)، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، نمبر 1، ۱۸۸۰ء، صفحہ 17۔ ۲۔ گلدستۂ کشمیر از پنڈت ہرگوپال کول، آریہ پریس، لاہور، ۱۸۸۳ء، حصہ دوم، صفحہ 101۔ پنڈت ہرگوپال کول خستہ، وکیل، کو مہاراجہ رنبیر سنگھ مرحوم نے ۱۲۹۴ھ مطابق ۱۸۷۷ء میں "حضور والا کے خلاف جھوٹ گھڑنے" کی پاداش میں کشمیر سے جلا وطن کر دیا تھا۔ ۳۔ تاریخِ کشمیر (فارسی، قلمی) از پنڈت بیربل کچرو، صفحہ 64، ملکیت خان بہادر پیرزادہ محمد حسین عارف مرحوم، سی آئی ای، سابق چیف جسٹس کشمیر؛ نیز تاریخِ کشمیر (فارسی، قلمی) از رئیس الملک ملک حیدر چاڈورہ، ملکیت خان بہادر مولوی ظفر حسن، ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل آثارِ قدیمہ، نشیمن، دہلی گیٹ، دہلی، صفحہ 126۔

رنچن فوراً اس شخص کے پاس پہنچا اور اس سے اس کا نام اور مذہب دریافت کیا، نیز یہ بھی پوچھا کہ وہ کس پیغمبر کا پیرو ہے۔ ان سوالات کے جواب میں اس اجنبی نے یوں کہا:

”میرا نام عبد الرحمٰن ہے؛ میرا دین اسلام ہے؛ میں اُس ایک خدا کی عبادت کرتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں، اور میں اُس پیغمبر کا پیرو ہوں جس کا پیغام تمام سابقہ پیغامات اور احکام کو منسوخ کر چکا ہے۔“ یہ بزرگ، جیسا کہ باب سوم میں بیان ہو چکا ہے، عام طور پر بلبل شاہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے بعد ان بزرگ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعدد واقعات بیان کیے اور آپ کی بعثت کا مختصر احوال سنایا۔ اسلام کی اس واضح اور سادہ تشریح سے راجا کے دل پر گہرا اثر ہوا اور اس نے یہ دین قبول کر کے اپنا اسلامی نام صدر الدین اختیار کیا۔ یہ قبولِ اسلام، جو ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں واقع ہوا، کشمیر میں مسلم اقتدار کا نقطۂ آغاز ہے۔

جونا راجا (Jonaraja) رنچن کے قبولِ اسلام کا ذکر نہیں کرتا، تاہم وہ اسے سورتران (ص 19) کے لقب سے یاد کرتا ہے جو لفظ ”سلطان“ کی سنسکرت صورت ہے۔ وہ رنچن کے بیٹے کو ہیدر (ص 23) بھی لکھتا ہے۔ شاہ میر نے کشمیری سنہ کی بنیاد اسی سال سے رکھی، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے۔ اگر یہ سال رنچن کے قبولِ اسلام کے باعث تاریخِ کشمیر میں اہمیت نہ رکھتا، تو شاہ میر کشمیری سنہ کا آغاز اپنی جلوس نشینی یعنی ۷۴۰ھ (۱۳۳۹ء) سے بھی کر سکتا تھا، جو اس واقعے سے کوئی بیس برس بعد کا زمانہ ہے۔ عمومی جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دہلی پر سلطان غیاث الدین تغلق شاہ حکمران تھا اور ہرات پر اسی نام کا ایک اور فرماں روا۔ مغل ایل خان ابو سعید ۱۳۱۷ء تا ۱۳۳۴ء خراسان پر حکومت کرتا رہا۔ مصر کا حکمران سلطان ناصر تھا۔ ہسپانیہ میں ملوک الطوائف یعنی چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کا سلسلہ جاری تھا۔ انگلستان پر ایڈورڈ دوم کی حکومت تھی، فرانس میں شارل چہارم، جرمنی میں باویریا کا لڈوگ، اور اسکاٹ لینڈ میں رابرٹ اول برسرِ اقتدار تھے۔ پوپ یوحنا کی وفات کے بعد بینیڈکٹ دوازدہم مسندِ پاپائیت پر متمکن ہوا۔

رنچن کے بعد اس کے برادرِ نسبتی اور سپہ سالار راون چندر نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ اس کی تقلید میں بہت سے امرا مشرف بہ اسلام ہوئے، اور اسلام کو ایسی مقبولیت حاصل ہوئی کہ کوئی دو برس کے عرصے میں اس کے پیروکاروں کی تعداد خاصی ہو گئی۔

اپنے مختصر عہدِ حکومت میں صدر الدین نے کشمیر میں متعدد عمارتیں تعمیر کرائیں۔ قبولِ اسلام کے فوراً بعد اس نے بلبل شاہ کی خواہش کے مطابق ایک عظیم الشان خانقاہ تعمیر کرائی، اور اس کے لیے کئی گاؤں وقف کیے تاکہ ان کی آمدنی سے خانقاہ کے اخراجات اور ان لوگوں کی ضروریات پوری ہو سکیں جو وہاں آتے جاتے یا کچھ عرصے کے لیے قیام کرتے تھے۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ مرورِ زمانہ کے ساتھ اس خانقاہ کا نام، یعنی بلبل لنکر، خود اس محلے کے لیے مستعمل ہو گیا۔ ملک حیدر چاڈورہ، جس نے جہانگیر کے عہد میں ۱۰۲۷ھ کے لگ بھگ اپنی تاریخ لکھی، اس مقام کے بارے میں لکھتا ہے: ”یہ محلہ اب تک آباد ہے اور خانقاہ بھی، جس کی حال ہی میں مرمت ہوئی ہے، اپنی اصل حالت پر قائم ہے۔“ جونا راجا نے رنچن کے بسائے ہوئے شہر رنچن پور کا جو ذکر کیا ہے، اس سے بظاہر اسی محلے کے گرد و نواح کی بستی مراد ہے جو اب سری نگر کا محلہ بلبل لنکر کہلاتا ہے۔

صدر الدین نے ایک جامع مسجد بھی تعمیر کرائی جس میں جمعہ اور معمول کی پنج وقتہ نمازیں ادا کی جاتی تھیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دینِ اسلام کتنی تیزی سے پھیل رہا تھا۔ (واضح رہے کہ کشمیر میں خانقاہ سے مراد مسجد یا عبادت و ریاضت کی جگہ ہے، جب کہ زیارت سے کسی بزرگ کی عبادت گاہ، قبر، مزار یا مسکن مراد لیا جاتا ہے۔)

اپنے ذاتی استعمال کے لیے سلطان صدر الدین نے ایک محل اور ایک مسجد تعمیر کرائی جس میں کشمیر کا مشہور پتھر "دیور کین" استعمال ہوا۔ کشمیری زبان میں "کین" پتھر کو کہتے ہیں۔ خواجہ محمد اعظم، جو بارہویں صدی ہجری یعنی اٹھارویں صدی عیسوی میں گزرے ہیں، اپنی تاریخِ کشمیر میں لکھتے ہیں کہ "یہ پتھر اب بھی ملبے کے نیچے دبے ہوئے ملتے ہیں۔" وہ اور ان سے پہلے گیارہویں صدی ہجری میں گزرنے والے ملک حیدر چاڈورہ، دونوں لکھتے ہیں کہ سلطان صدر الدین کی تعمیر کردہ اصل مسجد آتش زدگی سے تباہ ہو گئی اور اسی جگہ ایک چھوٹی مسجد تعمیر کی گئی جو "راجا رنتن کی مسجد" کے نام سے معروف ہوئی؛ اس میں پہلی مسجد کے پتھر کام میں لائے گئے۔ خواجہ محمد اعظم مزید بتاتے ہیں کہ ان کے زمانے میں بھی یہ مسجد خوب آباد تھی اور اس میں معمول کی نمازیں ادا کی جاتی تھیں۔

اب یہ مسجد بلبل لنکر میں حضرت سید محمد امین اویسی کی زیارت یعنی مزار کے قریب ویران اور شکستہ حالت میں کھڑی ہے۔

سلطان صدر الدین کی وفات

سلطان نے تین برس ایک ماہ اور انیس دن حکومت کی۔ اس عرصے میں اس نے بڑی مہارت سے کشمیر کو ایک منظم سلطنت کی صورت دی۔ اس کا انتقال بروز جمعہ ۲۵ نومبر ۱۳۲۳ء (۷۲۳ھ) کو ہوا۔ روایت ہے کہ اس کی موت کا سبب موسمِ سرما کی شدید ٹھنڈ سے پیدا ہونے والا بادی کا عارضہ تھا۔ اسے خانقاہِ بلبل لنکر کے جنوب میں ایک مقام پر دفن کیا گیا جو دریائے جہلم کے داہنے کنارے پر علی کدل اور نوکدل کے درمیان، سری نگر میں محمد امین اویسی کی زیارت سے کچھ نیچے واقع ہے۔ ہزہائینس کی حکومت کے مورخہ ۲ ستمبر

۱۹۴۱ء کے اعلامیے کے ذریعے اس قبر کو محفوظ آثار قرار دیا جا چکا ہے، اور یہ محلہ بلبل لنکر میں واقع ہے۔ (حوالہ: راج ترنگنی میں کشمیر کے بھوٹوں یا بھوٹیوں کا ذکر، سنسکرت متن کا ترجمہ اور حواشی از پنڈت دیا رام ساہنی، مع تبتی دستاویزات سے حواشی از اے ایچ فرانکے (A. H. Francke)۔ دی انڈین اینٹی کویری، بمبئی، جلد XXXVII، جولائی 1908ء، ص 186۔)

سلطان کے مرشد بلبل شاہ کی وفات ۷ رجب ۷۲۷ھ (۱۳۲۶ء) کو اُدیان دیو کے عہد میں ہوئی۔

سلطان کے خاندان کے پس ماندگان میں صرف اس کا شیر خوار بیٹا حیدر خان، جسے جونا راجا ہیدر لکھتا ہے، اور اس کی ملکہ کوٹا رانی رہ گئے تھے، جس کے بارے میں یہ ماننے کی معقول وجوہ موجود ہیں کہ وہ دل سے ہندو ہی رہی۔ صدر الدین ایک پیشگی انتظام کے تحت اپنے بیٹے کو اپنے معتمد مشیر شاہ میر کی ذاتی نگرانی اور سرپرستی میں چھوڑ گیا تھا، جسے اس نے اپنے بیٹے کی پرورش اور تعلیم و تربیت کے لیے منتخب کیا تھا۔ شاہ میر ہی کی بیوی نے شیر خوار بادشاہ کے لیے رضاعی ماں کے فرائض انجام دیے؛ اسی بنا پر بعض مؤرخین نے شاہ میر کو رضاعی باپ کا لقب دیا ہے۔ شاہ میر کا مزید احوال اپنے موقع پر بیان ہو گا۔

کشمیر میں انتشار: اسلام کو زوال کا سامنا

مذکورہ بالا مختصر عہدِ حکومت کے بعد سلطان صدر الدین، جو پہلے رنچن یا رنتن کہلاتا تھا، کشمیر میں اسلام کو متعارف کرا کے رحلت کر گیا۔ اس کا شیر خوار بیٹا حیدر خان چونکہ زمامِ حکومت سنبھالنے کے قابل نہ تھا، اس لیے کوٹا رانی ملکہ نائبِ سلطنت بنی۔

کوٹا رانی کا مذہب

یہ امر واقعی نہایت عجیب ہے کہ ایک راسخ العقیدہ مسلمان کی بیوی ہونے کے باوجود کوٹا رانی نے آگے چل کر ایسی روش اختیار کی جو دینِ اسلام سے اس کی وابستگی کو سخت مشکوک بنا دیتی ہے۔ لیکن یہ بھی اتنا ہی ناممکن ہے کہ پورے وثوق سے یہ کہا جا سکے کہ وہ مسلمان نہیں تھی۔ راجا رنچن کے اعلانیہ قبولِ اسلام کے بعد وہ، اسلامی احکام کی رو سے، ایک مسلمان کی بیوی ہوتے ہوئے ہندو نہیں رہ سکتی تھی، کیونکہ اسلام کسی مسلمان اور غیر مسلم کے مابین نکاح یا جائز ازدواجی تعلق کو روا نہیں رکھتا، الا یہ کہ عورت کتابیہ ہو (عربی میں یہ لفظ ''اہلِ کتاب'' میں سے کسی فرد کے لیے صیغۂ تانیث میں مستعمل ہے)۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ صدر الدین جیسا دیندار مسلمان کسی غیر کتابیہ کو اپنی زوجیت میں کیوں کر رکھ سکتا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اس نے اپنی لاعلمی کے باعث اس تعلق کو گوارا کیا، تو ساتھ ہی یہ بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ صدر الدین پر کوٹا کو جبراً مسلمان کرنے کا الزام بے بنیاد ہے۔ پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ کوٹا رانی نے اپنی جان کی سلامتی اور اپنے منصب کے تحفظ کو اظہارِ اسلام میں مضمر سمجھ کر شاید اسلام کا اظہار کر دیا ہو، مگر دل سے ہندو ہی رہی۔ بہرحال اس کی بعد کی حکمتِ عملی اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتی کہ اس کا اظہارِ اسلام محض مصلحتاً تھا۔

اس نے گندھارا سے راجا سہدیو کے بھائی اُدیان دیو کو بلوایا اور اس سے شادی کر لی، اور شاہ میر کی تائید سے اسے شاہی اختیارات سونپ دیے۔ (گندھارا، جو ہندوستان کی گزرگاہ ہے اور اب صوبہ سرحد کہلاتا ہے، وادیِ کابل کا وہ صوبہ تھا جس میں کافرستان یا لمغان کے اضلاع، جلال آباد، ننگرہار سے تقریباً سو میل مشرق تک کا علاقہ، کابل اور کوہستان کی جانب

کا شمالی خطہ، اور خود گندھارا کا ضلع شامل تھے؛ یہ آخر الذکر پہلے پرشاپورہ کہلاتا تھا، اس زمانے میں پرشاور، اور آج پشاور، جو نام اسے اکبر نے دیا۔) بیوہ کی یہ دوسری شادی، اور وہ بھی شوہر کے بھائی سے، اس عہد کے عام ہندو معاشرے میں پسندیدہ نہ سمجھی جاتی، اگرچہ دروپدی کا اپنے شوہر کے بھائی سے بیاہ ایک قدیم کلاسیکی مثال ضرور ہے۔ لہٰذا یہ بعید از قیاس نہیں کہ کوٹا کم از کم پوری طرح ہندو نہیں تھی۔

اُدیان دیو کی واپسی: اس کا عہدِ حکومت ۱۳۲۳ء تا ۱۳۳۸ء

دلچہ کے حملے اور ۱۳۱۹ء میں کشمیر میں اس کے قیام کے نتیجے میں اُدیان دیو سوات یا گندھارا کی طرف فرار ہو گیا تھا اور وہیں مقیم رہا، یہاں تک کہ شاہ میر نے اسے واپس بلا کر تختِ کشمیر پر بٹھایا۔ جونا راجا کے الفاظ یہ ہیں: ”شاہ میر نے اُدیان دیو کو ملکہ سری کوٹا سمیت کشمیر کا ملک عطا کیا“ (ص 24)۔ یہ ہرگز دانش مندانہ انتخاب نہ تھا، کیونکہ رانی کا یہ شوہر ان اعلیٰ صفات سے محروم تھا جو عموماً بادشاہوں سے متوقع ہوتی ہیں۔ وہ بزدل تھا اور عقل و اہلیت دونوں سے عاری۔ تاہم رانی میں یہ دور اندیشی موجود تھی کہ اس نے اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھا اور شوہر کو محض برائے نام بادشاہ رہنے دیا۔ شاہ میر اور بھکشن بھٹ عرف پاچا بٹ کاکا پوری — پہلا سپہ سالار کی حیثیت سے اور دوسرا وزیر کی حیثیت سے — ملک کا نظمِ حکومت چلاتے رہے۔ اُدیان دیو سے کوٹا کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کا نام بولا رتن تھا؛ اسے رانی نے بھکشن کی نگرانی میں دیا جو شہزادے کا اتالیق بھی تھا اور رضاعی باپ بھی، جب کہ اس کی بیوی نے رضاعی ماں کے فرائض انجام دیے۔ جونا راجا کے بقول شاہ میر حیدر کی اور بھکشن دوسرے بچے کی دیکھ بھال کرتا تھا، اور کوٹا فطری طور پر ”اپنے دونوں بیٹوں پر

مہربان" تھی (ص 26)۔ لیکن ان دونوں بچوں کے انجام کے بارے میں ہمیں اس کے سوا کچھ معلوم نہیں کہ شاہ میر نے "ملکہ کے دونوں بیٹوں کو قید کر دیا" (ص 32)۔

اچل عرف اروَن یا اردل کا حملہ: اُدیان دیو کا فرار

اُدیان دیو کی واپسی اور تخت نشینی کے کچھ ہی عرصے بعد کشمیر کو حملہ آوروں کے ایک اور جتھے کا سامنا کرنا پڑا جس کا سربراہ اروَن تھا، جسے بعض مؤرخین اردل اور جونا راجا اچل لکھتا ہے۔ اُدیان دیو نے حسبِ سابق مغربی تبت یعنی لداخ کی طرف فرار میں عافیت ڈھونڈی۔ یہاں یہ ذکر بے محل نہ ہو گا کہ گلدستۂ کشمیر کے مصنف پنڈت ہرگوپال کول خستہ اس فرار کو اُدیان دیو کی گھبراہٹ اور خوف زدگی کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ اس نے اروَن یا اردل کو، جو راجوری کی سمت آمد و رفت کی گزرگاہ ہیرا پور کے راستے پیش قدمی کرتا آیا تھا، دلچہ سمجھ لیا تھا۔

تاہم قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ رانی کسی ایسے وہم کا شکار نہیں ہوئی۔

کوٹا رانی کی رعایا سے اپیل: متحدہ مزاحمت اور حملہ آور کی پسپائی

جب کوٹا رانی نے دیکھا کہ اس کا شوہر اسے بے یار و مددگار چھوڑ گیا ہے تو اس نے اپنی تمام قوتیں مجتمع کیں۔ شاہ میر کے مشورے سے اس نے تمام عمال اور عوام سے اپیل کی کہ وہ حملہ آوروں کے خلاف متحدہ محاذ قائم کر کے اپنی اور ملک کی حفاظت کریں۔ اس اپیل میں اس نے انہیں وہ ابتر حالات یاد دلائے جو دلچہ کے حملے کے بعد کشمیر پر گزرے تھے۔ (حوالہ: تاریخِ کشمیر از ملک حیدر چاڈورہ، قلمی نسخہ، ص 128۔) اس اپیل کا فوری اثر ہوا اور رعایا میں

حب الوطنی کے جذبات بیدار ہو گئے؛ لوگوں نے اپنی مادرِ وطن کے دفاع کے لیے رضاکارانہ خدمات پیش کیں۔ چنانچہ انہوں نے دشمن کا مقابلہ کیا، جسے پسپا ہو کر صلح کی درخواست کرنا پڑی، اور اسے بلا تعرض ملک سے نکل جانے کی اجازت دے دی گئی۔ یہ ایک عظیم کارنامہ تھا جس کا سہرا کوٹا رانی کے سر رہا، جس نے کشمیر کی باہمت ملکہ کی حیثیت سے شہرت پائی۔

اُدیان دیو کی کشمیر میں دوبارہ آمد

اُدیان دیو نے جس بے وفائی سے رانی کو تنہا چھوڑا تھا، اس کے باوجود دشمن کے ملک سے نکل جانے کے بعد کوٹا رانی نے اپنے شوہر کو واپس بلا کر دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔ تاہم عوام اُدیان دیو سے برگشتہ رہے اور انہوں نے اسے وہ احترام دینے سے انکار کر دیا جو ایک بادشاہ کا حق ہوتا ہے۔

اُدیان دیو کا عہدِ حکومت پندرہ برس دو ماہ اور دو دن پر محیط رہا۔ اس پورے عرصے کے بارے میں مؤرخین نے انتشار اور ابتری کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ اس امر کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ اس دورِ حکومت میں مشیر وہی تھے جو سابقہ دور میں تھے، لیکن بادشاہ کا اپنا طرزِ عمل ایسا تھا کہ ان کے مشورے ملک کے لیے کم ہی سود مند ہو سکے۔ بحرانی لمحات میں جب ان کا مشورہ کارگر ہوا، جیسے اچل کے حملے کے موقع پر، تو ملک کو فائدہ پہنچا۔ اروَن یا اچل کی پسپائی کے بارے میں تمام مؤرخین متفق ہیں کہ یہ شاہ میر کی جرأت اور مردم شناسی و تدبیر کا نتیجہ تھی۔ اس کے صلے میں شاہ میر کو امورِ مملکت میں پہلے سے کہیں زیادہ عمل دخل حاصل ہو گیا۔ اب وہ رانی کا دستِ راست اور اُدیان دیو کی برائے نام حکومت کے دوران سلطنت کا اصل سہارا بن چکا تھا۔

کوٹا رانی کی حکومت ۱۳۳۸ء تا ۱۳۳۹ء

اُدیان دیو کا انتقال ۱۳۳۸ء میں ہوا۔ کوٹا نے خود تخت سنبھال لیا اور دربار کو قلعے میں منتقل کر دیا۔ مزید برآں، کشمیر کی واحد فرماں روا کی حیثیت سے جو ذمہ داریاں اب اس پر عائد ہوئی تھیں، انہیں کامیابی سے نبھانے کے لیے اس نے شاہ میر کو نظر انداز کر کے بھکشن کو اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا، جس پر شاہ میر نے فطری طور پر علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ کوٹا نے تقریباً پانچ ماہ ملک پر حکومت کی۔

شاہ میر کی بغاوت کچھ وضاحت چاہتی ہے۔ گزشتہ بیان سے ظاہر ہے کہ اُدیان دیو شاہ میر کی مضبوط اور فعال تائید کے بغیر اپنے متزلزل تخت پر قائم رہنے کے قابل نہ تھا، اور شاہ میر اپنی تدبیر، شجاعت اور معاملہ فہمی سے عوام کے دل جیت چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کوٹا رانی اندر کوٹ میں قیام اختیار کر کے اور اپنے وزیرِ اعظم بھکشن کے ذریعے شاہ میر کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کا سدِباب کرنا چاہتی تھی۔ شاید اسے شاہ میر کے مستقبل کے عروج کا اندازہ ہو چکا تھا، اسی لیے اس نے یہ قدم اٹھایا جسے شاہ میر نے کھلے چیلنج کے مترادف سمجھا۔ چنانچہ اس احسان فراموشی پر شاہ میر کا فطری طور پر مشتعل ہونا بجا تھا، خصوصاً ان خدمات کے پیشِ نظر جو اس نے انجام دی تھیں اور اس وفاداری کے پیشِ نظر جو اس نے ایسے وقت میں نبھائی تھی جب وہ بآسانی تخت پر قبضہ کر سکتا تھا۔ اب کوٹا رانی کی اس ناسپاسی نے اسے انتہائی سخت اقدام پر آمادہ کر دیا۔ سلطنت انتشار اور بدنظمی کا شکار ہوتی جا رہی تھی، اور یہ امر بھی اس کے لیے اقتدار خود سنبھال لینے کا ایک اور محرک بنا۔

شاہ میر طاہر کا بیٹا اور قاؤر شاہ کا پوتا تھا، جس کے بارے میں جونا راجہ کا بیان ہے کہ وہ "ایک شریف خاندان میں پیدا ہوا تھا"۔ بخشی نظام الدین احمد اسے شاہ میر بن طاہر بن شہاب بن کرشاسب ابن نکروز کے نام سے یاد کرتا ہے اور اس کا سلسلۂ نسب "پانڈووں میں سے ایک، ارجن" تک پہنچاتا ہے۔ فرشتہ اسے شاہ مرزا لکھتا ہے۔ ایک مرتبہ شاہ میر کسی جنگل میں سرگرداں تھا کہ اسے نیند آگئی اور خواب میں ایک شخص نے اسے یہ پیشین گوئی سنائی کہ اس کی اولاد کشمیر کی بادشاہت کے منصب تک سرفراز ہو گی۔

1۔ اندرکوٹ — قدیم اندرکوٹھ اور عہدِ قدیم کا جے پورہ، یعنی للتادتیہ کے پوتے راجہ جےپیڈ (۷۶۴ء–۷۹۵ء) کا پایۂ تخت — سومبل سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر، دریائے جہلم کے پل سے بائیں کنارے پر اور شادی پور سے پانچ میل نیچے واقع ایک گاؤں ہے۔ اندرکوٹ اب ۱۴۳ مکانات پر مشتمل ہے اور اس کی آبادی ۱۱۷۱ نفوس ہے، جو تمام کی تمام مسلمان ہے — نصف شیعہ اور نصف سنی۔ اندرکوٹ ہی میں سلطان شمس الدین شاہ میر کی قبر ایک تنگ سی کوٹھری میں واقع ہے جو تقریباً بیس فٹ مربع ہے اور جس کی دیواریں نیم پختہ اینٹوں کی ہیں۔

2۔ ترکی زبان میں "قاؤر" کے معنی لوہا، یا کوئی آلہ، یا ہتھیار کے ہیں۔

یہ اندازہ کرنا مشکل نہیں کہ اس نوعیت کی پیشین گوئی شاہ میر کے حوصلۂ اقتدار کو مہمیز دیے بغیر نہ رہ سکتی تھی، جو اپنے منصب اور قوت کے لحاظ سے برسرِ اقتدار فرماں روا کے اختیار کو کامیابی کے ساتھ چیلنج کر کے بالائے طاق رکھ سکتا تھا۔ وہ ۱۳۱۳ء میں سہ دیو کے عہدِ حکومت میں کشمیر آیا تھا اور پچیس برس سے اس سرزمین سے آشنا تھا۔ جونا راجہ سے ہمیں

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت شاہ میر کے پوتے — شیر آشامک اور ہندال — موجود تھے، جس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ وہ خاصا سِن رسیدہ ہو چکا تھا۔

کوٹا رانی کا انجام

اس پر بھی شاہ میر نے کھلی بغاوت کی راہ اختیار نہ کی۔ اس نے پہلے پہل دو بار بیوہ ہونے والی ملکہ کو نکاح کے پیغامات بھیجے، جنہیں اس نے حقارت کے ساتھ ٹھکرا دیا۔ کوٹا رانی کے اس انکار کی کئی توجیہیں کی جا سکتی ہیں۔ ممکن ہے اسے اپنے بیٹے حیدر خان کے رضاعی باپ سے نکاح سے کراہت محسوس ہوئی ہو، اگرچہ اسلام نے ایسے رشتے پر کوئی پابندی عائد نہیں کی۔ یہ احتمال بھی ہے کہ اس نے ریاست کے ایک خادم سے شادی کو اپنی شان کے منافی سمجھا ہو۔ لیکن پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ وہ رنچن کی بیوی رہ چکی تھی، جو ایک زمانے میں اس کے ملک پر حملہ آور اور اس کے باپ رام چندر کا قاتل تھا۔ کوٹا رانی کے شاہ میر کے پیغامات ٹھکرا دینے کا ایک ہی نتیجہ ہو سکتا تھا، اور وہ فوراً ظاہر ہو گیا۔ شاہ میر نے ایک بڑی فوج کے ساتھ اندرکوٹھ — جو اب اندرکوٹ کہلاتا ہے (اور جو راجہ جےپیڈ کے پایۂ تخت جے پور یا جےپیڈ پور کا محلِ وقوع ہے) — کا محاصرہ کر لیا۔ رانی کا وزیرِ اعظم بھکشن شاہ میر کے ہاتھوں ایک چال کے ذریعے مارا گیا۔ اس کا بھتیجا اچل دیو، جو راون چند کا بیٹا تھا، ابھی نابالغ تھا۔ رعایا کی اکثریت شاہ میر کی طرف دار تھی، چنانچہ کچھ تعجب کی بات نہیں کہ کوٹا رانی کے بعض حامیوں نے بھی اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اسے شاہ میر کے غالب ارادے کے آگے سرِ تسلیم خم کرنا پڑا اور اس نے نکاح پر نیم دلانہ رضامندی ظاہر کر دی۔ ملک حیدر چاڈورہ اس امر کی وضاحت نہیں کرتا کہ کوٹا کے نکاح کے فوراً بعد کیا کچھ پیش آیا۔ اس کا بیان ہے کہ اندرکوٹ کے باشندے کوٹا کی خودکشی کی تصدیق کرتے ہیں، اور یہ بات جونا راجہ

کے بیان سے میل کھاتی ہے جو لکھتا ہے کہ کوٹا رانی نے شاہ میر کی بیوی کی حیثیت سے ایک رات بسر کی اور اگلے ہی روز — ۳۹۱۵ لوکِکا کے شراون (ساون) مہینے کی دسویں روشن قمری تاریخ کو — اسے گرفتار کر کے "قید میں ڈال دیا گیا"۔ ممکن ہے کہ اس نے قید ہی میں اپنی جان لے لی ہو۔ اس کے دونوں بیٹے بھی، جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، قید کر دیے گئے۔

* کنگز آف کشمیرا (Kings of Kashmira)، ۱۸۹۸ء، جلد سوم، صفحہ 32۔

سلطان شمس الدین [۷۴۰ھ تا ۷۴۳ھ / ۱۳۳۹ء تا ۱۳۴۲ء]

شاہ میر — جونا راجہ کا "شری شمس دین" — ملک حیدر کے بیان کے مطابق ۷۵۳ھ (۱۳۵۲ء) میں تخت نشین ہوا۔ بیربل کاچرو شاہ میر کی جلوس آرائی ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) میں اور اس کی وفات ۷۴۷ھ (۱۳۴۶ء) میں بتاتا ہے۔ خواجہ محمد اعظم نے اپنی واقعاتِ کشمیر میں اور پیر حسن شاہ نے اپنی تاریخِ کشمیر میں یہی تاریخیں دی ہیں۔ ملک حیدر چاڈورہ شاہ میر کی وفات کی تاریخ درج نہیں کرتا؛ وہ صرف اس قدر کہنے پر اکتفا کرتا ہے کہ شاہ میر نے تین برس پانچ ماہ حکومت کی۔ یہ مدت بڑی حد تک جونا راجہ کی بیان کردہ مدت سے ملتی جلتی ہے، جو تین برس پانچ دن لکھتا ہے، جب کہ ابوالفضل کے نزدیک یہ مدت دو برس گیارہ ماہ اور پچیس دن ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سہو ہے، اور ہم جونا راجہ کی شہادت پر شاہ میر کی تخت نشینی کی تاریخ بلا تامل ۷۴۰ھ یعنی ۱۳۳۹ء قرار دے سکتے ہیں، کیونکہ وہ کوٹا رانی کی معزولی کی تاریخ ۱۰ شراون شُدی لوکِکا، یعنی قدیم کشمیری سموت ۳۹۱۵، دیتا ہے جو ۱۳۳۹ء کے مطابق ہے۔ شاہ میر کی تخت نشینی اس اعتبار سے خاص طور پر لائقِ ذکر ہے کہ اس سے کشمیر میں مسلم اقتدار کا، اپنے دینی اور دنیوی دونوں پہلوؤں میں، مستحکم قیام عمل میں آیا۔ بلاشبہ رنچن کے قبولِ

اسلام سے کشمیر براہِ راست اسلامی اثر کے تحت آ چکا تھا، مگر اس بادشاہ کی وفات اور کوٹا اور اُدیان دیو کے عہد کی ابتری سے اس کا تسلسل منقطع ہو گیا تھا۔ شاہ میر اگرچہ کشمیر کے لیے ایک بدیسی تھا، تاہم یہ بات اس کے کھاتے میں لکھی جانی چاہیے کہ اس نے کشمیر کو بیرونی جارحیت سے بچایا۔ اس نے اسے تغلق آباد یا دہلی کے تغلقوں کا صوبہ بننے سے بھی محفوظ رکھا۔ کشمیر شاید اپنی خودمختاری کھو چکا تھا؛ مگر یہ شاہ میر ہی تھا جس نے اس کی آزادی بچائی، اور اس کی اولاد نے دو صدیوں سے زائد عرصے تک اس آزادی کو برقرار رکھا۔ اس نے سلطان شمس الدین کا لقب اختیار کیا۔

شاہ میر شمس الدین کی اولاد، جو کشمیر میں شاہ میری کہلاتی ہے، دو صدیوں سے زیادہ عرصے تک کشمیر پر حاکمانہ اقتدار رکھتی رہی۔ شاہ میر کا عہد کشمیر کے لیے مفید ثابت ہوا، کیونکہ اس نے امن اور مستحکم نظمِ حکومت قائم کیا، یا بقول جونا راجہ اس نے ”کشمیر کے دکھوں کا مداوا کیا اور اس کی حالت بدل دی“۔ اس نے اپنے پیش رووں کے جبری محاصل ختم کر دیے۔ اس نے اس تباہی کی تلافی کی جو زلچو کی یورش اور لوٹ کھسوٹ سے برپا ہوئی تھی اور جس کی تاخت کے آثار نسلوں تک باقی رہے تھے۔ سلطان نے تحریری فرامین کے ذریعے پیداوار کا چھٹا حصہ مال گزاری مقرر کیا۔ سلطان شمس الدین نے وہ سنہ رائج کیا جو کشمیری سنہ کہلاتا ہے اور جس کی ابتدا ۷۲۰ھ (۱۳۲۰ء) میں رنچن کی تخت نشینی اور قبولِ اسلام سے ہوئی؛ یہ سنہ وادی میں ۱۵۸۶ء میں مغلیہ اقتدار کے آغاز تک رائج رہا۔ اس نئے کشمیری سنہ نے سرکاری طور پر اس قدیم کشمیری سنہ کی جگہ لے لی جو ہندو عہدِ حکومت میں لوکِکا یا سپت رشی سنہ کہلاتا تھا۔ یہ نیا سنہ سرکاری دستاویزوں اور قبروں کے کتبوں پر استعمال ہوتا تھا، جن میں سے بعض کتبے آج تک اپنی تحریریں محفوظ رکھے ہوئے ہیں۔ مجھے یہ جان کر دلچسپی ہوئی کہ کشمیری زمیندار اب بھی یہی کشمیری تقویم استعمال کرتے ہیں۔ یہ ایک شمسی

قمری نظام ہے اور ۱۹۴۴ء یعنی ۱۳۶۳ھ میں ۶۲۵ پر ہے۔ سلطان نے دو خاندانوں کو — چک (تواریخ کے چکریچہ یا چکر) اور ماگرے (تواریخ کے مار گیش، نہ کہ کرنل ہیگ (Colonel Haig) وغیرہ کے "مکرے") — عروج بخشا اور انہی میں سے اپنے سپہ سالار اور سپاہی منتخب کیے۔ ولزلی ہیگ (Wolseley Haig) کے الفاظ میں شاہ میر نے "اپنے حاصل کردہ اقتدار کو دانش مندی اور خیر اندیشی کے ساتھ استعمال کیا۔ ہندو راجے سفاک جابر تھے، جن کی اعلانیہ حکمتِ عملی یہ تھی کہ رعایا کے پاس بقدرِ سدِّ رمق گزارے کے سوا کچھ نہ چھوڑا جائے۔ اس نے زیادہ فراخ دلانہ اصولوں پر حکومت کی۔"

*پنڈت بیربل کاچرو نے اپنی تاریخ ۱۲۵۱ھ یعنی ۱۸۳۵ء میں لکھی، جب کشمیر رنجیت سنگھ کے زیرِ نگیں تھا۔ بیربل فارسی کا بڑا عالم تھا اور شاعر بھی۔ پنڈت آنند کول بامزئی کی تصریح کے مطابق "کاچرو" یا "کچرو" کا لاحقہ اس کے نام کے ساتھ غالباً اس بنا پر لگا کہ وہ اسی نام کے ایک پنڈت خاندان کی ملازمت میں رہا تھا۔

تاریخِ ہادی کا مصنف گویا کرنل ہیگ کے اس بیان کا ترجمہ اس شعر میں کرتا ہے:

موشگافی کرد شاہ شمس دیں در عدالت حق او را بود نظر

(تاریخِ ہادی)

شمس الدین کا انتقال ۱۸ (۳۹۱۸) لوکِکا کے اساڑھ (آشاڑھ) مہینے کی پورن ماشی کو ہوا، جو ۱۳۴۲ء یعنی ۷۴۳ھ کے مطابق ہے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے:

آمدہ شمس از زر سحاب

[سورج اس وقت بادل کی اوٹ میں آگیا۔]

اندرکوٹ نزد سومبل میں سلطان شمس الدین کا مقبرہ ۱۹۴۱ء میں محفوظ آثار قرار دیا گیا۔ اصل قبر تقریباً پانچ فٹ لمبی ہے اور اس پر جالی دار لکڑی کا غلاف ہے۔

کنگز آف کشمیرا، از جوگیش چندر دت (Jogesh Chunder Dutt)، کلکتہ، ۱۸۹۸ء، جلد سوم، صفحہ 32۔

دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا (The Cambridge History of India)، ۱۹۲۸ء، جلد سوم، صفحہ 277۔

اندرکوٹ کے لوگ اس قبر کو "سلطان بادشاہ" — یعنی کسی بزرگ — کی قبر کہتے ہیں اور انہیں کم ہی خبر ہے کہ یہ وہی شخص ہے جو کشمیر میں مسلم اقتدار کا بانی تھا اور جس کے بارے میں بخشی نظام الدین احمد نے کہا تھا:

رایتِ پادشاہِ دیں پرور سایہ افگند بر جہاں یکسر تنِ آشوب گشت زار و نزار خانۂ ظلم گشت زیر و زبر

[دیں پرور بادشاہ کے علم نے تمام عالم پر اپنا عظیم سایہ ڈال دیا؛ آسمان کے قاصدوں نے اس کے عدل کی خبر سب ملکوں تک پہنچا دی۔ فتنہ و آشوب کا بدن زار و نزار ہو گیا، اور ظلم کا گھر ویران ہو کر ڈھے پڑا۔]

(طبقاتِ اکبری، از خواجہ نظام الدین، جلد سوم، صفحہ ۲۳۱)

سلطان جمشید [۷۴۳ھ / ۱۳۴۲ء]

شمس الدین نے اسّی برس کی عمر میں وفات پائی۔ اس کا سب سے بڑا بیٹا جمشید ۷۴۳ھ یعنی ۱۳۴۲ء میں اس کا جانشین ہوا، مگر جلد ہی اس کے اور اس کے چھوٹے بھائی علی شیر کے درمیان جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ نزاع کچھ عرصہ چلتا رہا، یہاں تک کہ جمشید ونتی پور (اونتی پور) کے مقام پر شکست کھا گیا۔ علی شیر نے اسی سال، یعنی ۷۴۳ھ (۱۳۴۲ء) میں، سلطان علاء الدین کا لقب اختیار کیا۔ البتہ جمشید اپنی معزولی کے بعد ایک برس دس ماہ تک زندہ رہا۔ طبقاتِ اکبری میں ہے کہ شاہ میر کے دو اور بیٹے بھی تھے — ایک شیر آشامک اور دوسرا ہندال — اور وہ بھی بلند مرتبے کے خواہاں تھے۔ جمشید کے مختصر عہدِ حکومت کے بارے میں مؤرخین نے اس کے سوا کوئی قابلِ ذکر بات درج نہیں کی کہ اس نے سوپور میں ایک پل تعمیر کرایا۔ تاریخِ کشمیر اعظمی کا مصنف تین گوشہ نشین بزرگوں کے نام دیتا ہے — خلاصمن، پلاسمن اور یاسمن — جو آپس میں بھائی تھے اور جنہوں نے اپنی زندگیاں عبادت اور گوشہ نشینی میں بسر کیں۔

* طبقاتِ اکبری کا انگریزی ترجمہ ازبی ڈی (B. De)، جلد سوم، صفحہ 636۔

سلطان علاء الدین [۷۴۳ھ تا ۷۵۵ھ / ۱۳۴۲ء تا ۱۳۵۴ء]

سلطان علاء الدین نے بارہ برس آٹھ ماہ اور تیرہ دن حکومت کی۔ اس کا عہد بنیادی طور پر امن اور داخلی اصلاحات کا دور تھا، جس کا مقصد ان مصائب کا ازالہ اور ان سخت حالات کی اصلاح تھا جو زلچو اور اچل کی یورشوں کا براہِ راست نتیجہ تھے۔ جو قصبے اور شہر ویران ہو چکے تھے، وہ دوبارہ آباد کیے گئے۔ سری نگر میں علاء الدین پور کے نام سے ایک بستی بسائی گئی۔ علاء الدین پور بعد میں سری نگر کے اس محلے کا نام بن گیا جس پر اب ”خانقاہِ معلیٰ“ اور

ملک افغان کے محلے واقع ہیں۔ سماجی قانون سازی کے میدان میں سلطان اپنے زمانے سے آگے ثابت ہوا، جب اس نے یہ قانون نافذ کیا کہ کوئی بدچلن اور بے اولاد بیوہ اپنے خسر سے شوہر کی جائیداد میں کوئی حصہ نہ پائے گی۔ اس کے عہدِ حکومت کے دوسرے سال ایک سخت قحط پڑا۔ بادشاہ نے قحط زدہ علاقے کے لوگوں کی مشکلات کم کرنے کی غرض سے ان کی دست گیری کی۔ اسی عہد میں لل عارفہ نے عام شہرت پائی۔ جونا راجہ لکھتا ہے: ”اس بزرگ اور دانا بادشاہ نے جےپیڈ پور کو اپنا پایۂ تخت بنایا اور شری رنچن پورہ میں بدھ گیر نامی ایک عمارت تعمیر کرائی۔“ بدھ گیر اب سری نگر میں علی کدل کے قریب ایک محلہ ہے۔ علاء الدین کی تعمیر کردہ یہ عمارت اس کے عہد میں اور اس کے بعد بھی مسافروں کی قیام گاہ کے طور پر استعمال ہوتی رہی، اور معلوم ہوتا ہے کہ لداخ اور بلتستان کے تاجر اس سے فائدہ اٹھاتے رہے۔

سلطان نے ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء) میں وفات پائی اور علاء الدین پور میں دفن ہوا۔ اس نے دو بیٹے چھوڑے: سیامک، جو بعد میں سلطان شہاب الدین کے نام سے مشہور ہوا، اور ہندال، جو بعد میں سلطان قطب الدین کہلایا۔ بعض مؤرخین نے شہاب الدین اور قطب الدین کو سلطان علاء الدین کے بھائی لکھا ہے؛ یہ درست نہیں۔ علاء الدین کے بعد شہاب الدین تخت نشین ہوا۔

لقبِ سلطان

مسلمان حکمرانوں کے لقبِ ”سلطان“ اختیار کرنے کی توجیہ قدرے دشوار ہے۔ سر ٹامس آرنلڈ (Sir Thomas Arnold) کا کہنا ہے کہ اس کی مکمل وضاحت آج تک نہیں کی جا

سکی۔ خود یہ لفظ قرآن میں محض "قوت" یا "اختیار" کے مجرد مفہوم میں آیا ہے، لیکن پہلی صدی ہجری کے اواخر ہی میں یہ مصری پیپائری دستاویزوں میں صوبے کے والی کے لیے عام اصطلاح کے طور پر استعمال ہونے لگا تھا۔ سر ٹامس مزید لکھتے ہیں کہ یوں یہ لفظ اس عہدے دار کے لیے مستعمل ہوا جسے اقتدار تفویض کیا گیا ہو۔ جب سلطنت کے صوبوں میں خودمختار حکمران اٹھ کھڑے ہوئے تو ان میں "سلطان" کا لقب اختیار کرنا عام ہو گیا۔ اس ضمن میں سلجوقیوں نے مثال قائم کی معلوم ہوتی ہے، اگرچہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ محمود غزنوی (۹۹۸ء–۱۰۳۰ء) پہلا اہم مسلمان فرماں روا تھا جس نے یہ لقب اختیار کیا۔ بہت سے دوسرے القاب کی طرح لفظِ سلطان کو بھی بڑے اور طاقت ور بادشاہوں کے اختیار کرنے سے وقار حاصل ہوا، جب کہ چھوٹے چھوٹے علاقوں کے حکمران ملک اور خان وغیرہ کے الفاظ ہی پر قانع رہے۔ چنانچہ کشمیر میں اس اصطلاح کے رواج کا سبب بظاہر ترکستان کا اثر ہے۔ البتہ چکوں نے ہندوستان کے مغل شہنشاہوں کی ہمسری میں "بادشاہ" کا لقب اختیار کیا۔

کنگز آف کشمیرا، جلد سوم، صفحہ 37۔

الخلافہ (The Caliphate) از سر ٹامس آرنلڈ، کلیرینڈن پریس، آکسفورڈ، ۱۹۲۴ء، صفحہ 202۔

سلطان شہاب الدین [۷۵۵ھ تا ۷۷۵ھ / ۱۳۵۴ء تا ۱۳۷۳ء]

شہاب الدین — جونا راجہ کا "شاہاو دین" — ۷۵۵ھ (۱۳۵۴ء) میں اپنے باپ علاء الدین کا جانشین ہوا۔ زمامِ حکومت سنبھالنے سے پہلے اس کا عرفی نام سیامک تھا، جو "شیر آشامک"

یعنی ننھے دودھ پینے والے کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ جونا راجہ نے شہاب الدین کے ابتدائی نام شیر ہشتک اور شِو سوامک لکھے ہیں، اور سیر المتاخرین (جلد اول، صفحہ 194) کا "میر آشا تک" بھی غالباً اسی عرفیت کی مختلف صورتیں سمجھی جانی چاہئیں۔

شہاب الدین کا عہد کشمیر کے سلاطین کی فرماں روائی کا شان دار ترین دور ہے۔ یہ کشمیریوں کے فوجی جوہر دکھانے کا زمانہ تھا۔ شہاب الدین کشمیری مسلمان فرماں رواؤں میں پہلا شخص تھا جو بیرونی فتوحات کے ارادے سے ملک سے باہر نکلا۔ وہ ان مختصر وقفوں کو ضائع شدہ شمار کرتا تھا جن میں اسے کوئی فتح حاصل نہ ہوتی۔

جونا راجہ لکھتا ہے: "نہ آہو چشم عورتیں اس کے دل کو لبھاتی تھیں، نہ بادہ نوشی کی لذتیں اور نہ چاندنی۔" وہ مزید لکھتا ہے کہ صرف فوج کے ساتھ پیش قدمی ہی بادشاہ کی توجہ کا مرکز تھی۔ "نہ گرمی نہ سردی، نہ شام نہ رات، نہ بھوک نہ پیاس — کوئی چیز اس کی پیش قدمی میں حائل نہ ہوتی تھی۔ جب یہ پُرغرور بادشاہ راہ پیمائی پر ہوتا تو اتھاہ دریاؤں، دشوار گزار پہاڑوں اور بے آب و گیاہ صحراؤں کو عبور کرنا اسے کچھ دشوار نہ معلوم ہوتا تھا۔"

کشمیر کی تاریخ میں شہاب الدین کا مقام للتادتیہ مکتاپیڈ کے بعد آتا ہے۔ جونا راجہ مزید لکھتا ہے: "موتیوں اور ہار سے آراستہ یہ بادشاہ گزشتہ اور آئندہ تمام بڑے بادشاہوں میں اسی طرح نمایاں تھا جس طرح ہار میں درمیانی نگینہ نمایاں ہوتا ہے۔"

* کنگز آف کشمیرا، جلد سوم، صفحہ 38۔

سر محمد اقبال نے اپنے جاوید نامہ میں اسی رائے کی بازگشت سنائی ہے۔ جونا راجہ کے بیان کے مطابق سلطان کے ماتحت سپہ سالار چندر ڈامر (ڈار)، لولا ڈامر اور شیرا تھے۔ مسلمان

مؤرخین ان میں سید حسن بہادر کا اضافہ کرتے ہیں۔

سلطان شہاب الدین کے سپہ سالار اَچل یا عبدال رینہ، المعروف ملک صاحب، کا مقبرہ چھاڈورہ کے قریب واقع ہے۔ سید تاج الدین ہمدانی کو وزیرِ جنگ مقرر کیا گیا تھا، اور "فتوحات" کی روایت کے مطابق سید حسن سلطان کا داماد تھا۔ اَچل یا عبدال راینہ (رینہ)، جو پہلے اَچل دیو کہلاتا تھا اور اُس راون چندر کا بیٹا تھا جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں، عہدے داروں میں ایک اور اضافہ ہے۔

تخت نشینی کے کچھ ہی عرصے بعد شہاب الدین نے اپنی عسکری قوت کی از سرِ نو مکمل تنظیم کی۔ کشمیری افواج کی ترکیب میں پونچھ، راجوری اور بِڈل (جو سری نگر سے اکھنور جانے والے راستے پر واقع ہے) کے کوہستانی علاقوں نیز مظفر آباد اور بارہمولہ کے درمیانی خطوں کے لوگ شامل رہے ہوں گے، جنہیں کوہستانِ کشمیر کہا جاتا ہے۔

شہاب الدین نے کاشغر کے حکمران سے تبت فتح کیا، جس میں تبتِ کلاں یعنی لداخ اور تبتِ خرد یعنی بلتستان شامل تھے۔ کشتواڑ اور جموں بھی سلطنت میں شامل کر لیے گئے۔

اس کے بعد وہ پچاس ہزار سوار اور پانچ لاکھ پیادہ پر مشتمل لشکر لے کر پنجاب سے گزرا اور دریائے سندھ کے کنارے خیمہ زن ہوا، جہاں جامِ سندھ نے اس کا مقابلہ کیا (بریگز (Briggs) کا ترجمۂ فرشتہ، جلد چہارم، صفحہ 458)، جسے اس نے مکمل شکست دی۔ غالباً یہ جام بنہٹیا تھا جس نے ۱۳۴۴ء سے ۱۳۵۹ء تک حکومت کی۔

اس عہد کی تاریخِ سندھ محفوظ نہیں رہی، اس لیے سندھ کے مآخذ سے شہاب الدین کی اس فتح کی تصدیق ممکن نہیں۔ ایلیٹ (Elliot) اور ڈاؤسن (Dowson) نے بھی تاریخِ سندھ

کے اس حصے کے خلا پر اظہارِ افسوس کیا ہے (دیکھیے جلد اول، صفحہ 484)۔ تاہم جون راجہ نے اس کا ذکر کیا ہے۔ سر وولزلی ہیگ (Sir Wolseley Haig) کیمبرج ہسٹری آف انڈیا (جلد سوم، صفحہ 278) میں لکھتے ہیں: ”اپنے عہدِ حکومت کے آغاز میں اس نے سندھ کی سرحدوں کی طرف لشکر کشی کی اور دریائے سندھ کے کنارے جام کو شکست دی۔“ جام کی شکست ایسی عبرت ناک تھی کہ جب اس کی خبر قندھار اور غزنی کی سلطنتوں تک پہنچی تو وہاں کے حکمران اس اندیشے میں مبتلا ہو گئے کہ کہیں اگلی یورش انہی پر نہ ہو۔ بہرحال شہاب الدین نے اُنڈ پر—جسے اوہند یا ویہند بھی کہتے ہیں اور جسے پٹھان ”ہند“ تلفظ کرتے ہیں—قبضہ کر لیا۔

اُنڈ قدیم زمانے میں اُدبھانڈ کہلاتا تھا اور گندھارا کا دارالحکومت تھا؛ یہ اٹک سے سولہ میل بالائی جانب واقع ہے۔ پشاور میں اس نے افغانوں کو شکست دی اور مزاحمت کرنے والے بہت سے باشندوں کو تہِ تیغ کیا۔ وہاں سے وہ ہندوکش کے دروں سے گزرتا ہوا کاشغر، بدخشاں اور کابل کو مطیع کرتا چلا گیا۔

[یہاں قاری کو یہ یاد دلانے کی ضرورت نہیں کہ ”وہ ملک جو اب افغانستان کہلاتا ہے، محض چھوٹی چھوٹی ریاستوں کا مجموعہ تھا جن پر جابر سردار حکمران تھے اور جو آئے دن ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہتے تھے۔ بعد ازاں یہ خطہ عظیم سلطنتوں کے صوبوں میں بدل گیا جن پر بیرونی فاتحین اور ان کی اولاد کی حکومت رہی۔ پھر یہ ایک منقسم ملک بن گیا جس کے صوبے تین ہمسایہ ریاستوں“—ایران، ترکستان اور ہندوستان—”کے قبضے میں تھے۔“ اپنی پُر نشیب و فراز تاریخ میں پہلی بار افغانستان احمد شاہ درانی (۱۷۲۴ء–۱۷۷۳ء) کے عہد

میں ایک خودمختار ریاست بنا، جس نے کشمیر فتح کر کے گویا سلطان شہاب الدین کی فتحِ کابل کا پلہ برابر کر دیا۔]

شہاب الدین نے اپنی فتوحات کے دوران فتح کے متعدد ستون تعمیر کرائے۔ واپسی پر اس نے دریائے ستلج کے کنارے میدانی علاقے میں ایک چھاؤنی قائم کی۔ یہیں ۱۳۶۱ء (۷۶۳ھ) میں نگرکوٹ (کانگڑہ) کا راجہ اُدک پتی اس کی خدمت میں حاضر ہوا، جو دہلی کے گرد و نواح میں فیروز تغلق کے علاقے میں لوٹ مار کی مہم سے پلٹا تھا۔ اُدک پتی مالِ غنیمت سے لدا پھندا آیا تھا؛ اس نے سارا مال شہاب الدین کے قدموں میں نچھاور کر دیا اور اس کی اطاعت قبول کی۔ کشمیری کے اسی دور کی جانب سر محمد اقبال نے اشارہ کیا ہے—

چبرہ و حاناز و بردم بودہ است در ژما دہ صف شکن بودہ است

قابلِ ذکر ہے کہ اپنی فتوحات کے بعد شہاب الدین کا طرزِ عمل ہمیشہ ایک بہادر سپاہی کا سا رہا اور وہ فیاضی کے ساتھ اپنے شکست خوردہ حریف کو اس کی سلطنت واپس کر دیتا تھا۔

شہاب الدین کے لیے یہ امر باعثِ افتخار ہے کہ وہ صرف عظیم فاتح ہی نہیں بلکہ عظیم معمار بھی تھا۔ اس نے (۱) لچھمی نگر بسایا، جو اس کی ملکہ لکشمی کے نام پر ہری پربت کے دامن میں تقریباً وہیں واقع تھا جہاں اب شاریکا دیوی کا مندر کھڑا ہے؛ (۲) شہاب الدین پور، جو آج کا شادی پور ہے۔ سری نگر کا ایک محلہ شہاب پور—جسے حسن کے بقول اب شہام پور کہا جاتا ہے—بھی اسی سے منسوب ہے۔ ۲۸ خرداد کو اکبر شہاب الدین پور کی سیر کو گیا۔ ابوالفضل اکبرنامہ میں لکھتا ہے: ”یہ دریائے بہت کے کنارے ایک دل کش مقام ہے۔ وہاں کے چنار آسمان سے سر بلند کیے کھڑے ہیں اور سبزہ آنکھوں کو مسحور کر دیتا ہے۔“ جہانگیر نے بھی لکھا: ”یہ گاؤں (شہاب الدین پور) کشمیر کے مشہور مقامات میں سے ہے اور

دریائے بہت پر واقع ہے۔ خوش اندام ساخت کے تقریباً سو چنار ایک ہی سرسبز و شاداب قطعۂ زمین پر اس طرح جھرمٹ بنائے یک جا کھڑے ہیں کہ پورا قطعہ ان کے سائے میں آگیا ہے، اور زمین کی ساری سطح گھاس اور سہ برگہ سے ڈھکی ہے، یہاں تک کہ اس پر قالین بچھانا زائد از ضرورت اور خلافِ ذوق معلوم ہوتا۔"

اپنے سپاہیوں کے لیے شہاب الدین نے بارکیں تعمیر کرائیں۔

اس نے نہایت انہماک کے ساتھ اپنے والد کے اس تعمیری کام کو دوبارہ جاری رکھا جو دُلچہ اور اَچل کی یورشوں کی تباہ کاریوں کی — جنہوں نے ملک کو کنگال کر دیا تھا — تلافی کے لیے شروع کیا گیا تھا۔ مالِ گزاری کا تعین مناسب طریق پر کیا گیا۔ سلطان، شاہِ ہمدان کے بھیجے ہوئے سید تاج الدین کا مرید ہوا، اس نے علم و فضل کی سرپرستی کی اور سب کے لیے قوانین کے منصفانہ نفاذ کو اپنا شعار بنایا۔

اپنے وزیرِ اعظم اُدے شری کی اس تجویز پر کہ برہد بدھ (بدھِ کلاں) کی پیتل کی مورتی کو پگھلا کر اس دھات کے سکے ڈھالے جائیں، شہاب الدین کا اظہارِ برہمی اس کی حکمرانی کے روادارانہ مزاج کی بلیغ شہادت ہے۔

جون راجہ نے سلطان کے جن وزیروں کا ذکر کیا ہے وہ کوٹ بھٹ (مکتاپیڈ کے وزیر کی نسل سے) اور اُدے شری ہیں۔ کوٹ بھٹ کو سلطان کی بہت سی عنایات حاصل ہوئیں، مگر بعد ازاں اس نے ترکِ دنیا کر کے جنگل کی راہ لی۔ اُدے شری کا ذکر بار بار آتا ہے؛ غالباً وہی وزیرِ اعظم تھا، کم از کم کوٹ بھٹ کے ترکِ دنیا کے بعد تو ضرور۔ جون راجہ نے اُدے شری کو "دیوتاؤں کا دشمن" لکھا ہے، جس سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہ مسلمان تھا۔

سلطان کے چھوٹے بھائی ہندال کو ولی عہد بنایا گیا۔ شہاب الدین کے دونوں بیٹے، حسن خان اور علی خان، سلطان کی دوسری بیوی لاسہ کے اکسانے پر باغی قرار پا کر سلطنت سے نکال دیے گئے اور دہلی جا پناہ گزیں ہوئے۔ لاسہ ملکہ لکشمی کی بہن کی بیٹی تھی۔ وہ یقیناً غیر معمولی حسین رہی ہو گی کہ اپنی ماں کی بہن کی جگہ سلطان کی محبوبہ بن بیٹھی۔ پھر فطری طور پر رشک و حسد نے خالہ اور بھانجی کے تعلقات میں تلخی گھول دی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بوڑھی ملکہ نے اپنے پیارے بیٹوں کی جلاوطنی اپنی آنکھوں سے دیکھی۔ اگرچہ آخرکار شہاب الدین نے اپنے ہاتھ سے بیٹوں کو واپس آنے کے خطوط لکھے، مگر وہ بروقت نہ پہنچ سکے۔ چنانچہ تاج ہندال کو منتقل ہو گیا۔

سلطان شہاب الدین نے تقریباً انیس برس حکومت کی۔ وہ ۷۷۵ھ (۱۳۷۳ء) میں رحلت کر گیا، اور خیال کیا جاتا ہے کہ سری نگر میں مہاراج گنج کے ذیلی ڈاک خانے کے نیچے مدفون ہے۔ اس روایت کی سند کوئی معمولی شخص نہیں بلکہ خواجہ اعظم دیدہ مری ہے، جس کا بیان ہے کہ یہ مقام بڈ شاہ کی قبر کے پڑوس میں تھا اور شہاب الدین کی قبر پر ایک گنبد تھا جو اس کے زمانے میں جزوی طور پر منہدم ہو چکا تھا۔ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ایسے عظیم سلطان کی — جو کشمیر کی پوری شاہی روایت کا فخر و زیور تھا — قبر ایک معمولی پوسٹ ماسٹر کی کرسی کے نیچے دبی ہو! اگر واقعی ایسا ہے تو کشمیری کی قومی حمیت کی اس سے بڑی توہین کا تصور بھی محال ہے!

شہاب الدین اپنے وطن میں اپنے عادلانہ اور انسان دوست نظم و نسق کے باعث محبوب تھا اور بیرونِ ملک اپنے بازوئے شمشیر زن کی شجاعت اور افواج کی قوت کے سبب اس کا رعب چھایا ہوا تھا۔ اس کی حکمرانی نے کشمیر اور کشمیریوں کو عظیم اقتدار عطا کیا۔ جموں،

تبت، پنجاب، سندھ، نگر کوٹ (کانگڑہ)، غزنی، قندھار، کاشغر اور بدخشاں اس کے مطیع ہوئے اور انہوں نے اس کی اطاعت قبول کی۔ شہاب الدین کی وفات کے بعد کشمیری بحیثیت قوم پھر کبھی اتنے طاقت ور نہ ہو سکے۔

سر محمد اقبال کا مصرع اور پنڈت جون راجہ کا قول، دونوں اس عظیم فرماں روا کی عظمت کو ایک نہایت مستحق خراجِ تحسین ہیں۔

لیکن کشمیری کی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے سلطان شہاب الدین کے عہد کی اس کی عسکری قوت محض ایک افسانہ معلوم ہوتی ہے! چھ صدیوں کے عرصے میں فتح مندی سے بزدلی تک کا یہ سفر انتہائی ذلت آمیز ہے۔ کشمیری قوم کی پستی اس سے بڑھ کر اور کیا ہو گی کہ جموں کے سابق راجہ کی — جسے ہم اوپر کشمیر کا باج گزار دیکھ چکے ہیں — موجودہ نسل، یعنی ہز ہائینس مہاراجہ بہادر جموں و کشمیر، نے کشمیری رجمنٹ قائم کرنے کے خیال کا یہ کہہ کر مذاق اڑایا کہ اس کے مارچ کے لیے "پولیس کی حفاظت" درکار ہو گی، حالانکہ ہز ہائینس کے آرمی ممبر نے کشمیریوں کو ہز ہائینس کی فوج میں بھرتی کرنے کی سفارش کی تھی!

فاعتبروا یا اولی الابصار [پس عبرت حاصل کرو، اے دیدۂ بینا رکھنے والو!]

اس موضوع کی مزید تفصیل قاری کو "کشیر" کے باب دہم میں مسلم عہد کے عسکری نظم و نسق سے متعلق حصے میں ملے گی۔

سلطان قطب الدین [۷۷۵ھ تا ۷۹۱ھ / ۱۳۷۳ء تا ۱۳۸۹ء]

سلطان شہاب الدین کی وفات پر اس کا بھائی ہندال ۷۷۵ھ (۱۳۷۳ء) میں سلطان قطب الدین کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ شہاب الدین کا بڑا بیٹا حسن خان اپنے چھوٹے بھائی علی خان سمیت، جیسا کہ ہم جان چکے ہیں، پہلے ہی باپ کے ہاتھوں جلاوطن ہو چکا تھا۔ لیکن نئے حکمران نے اپنی فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے شہزادہ حسن خان کو ولی عہد بننے کی دعوت دی۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ قطب الدین امورِ مملکت کی طرف اپنی مستعد توجہ میں ممتاز تھا اور انہیں بذاتِ خود عدل اور اعتدال کے ساتھ انجام دیتا تھا۔

سلطان کے عہد کا سکون اس وقت درہم برہم ہوا جب لوہارہ نے بغاوت کی۔ لوہارہ وہ پہاڑی خطہ ہے جو توشہ میدان کے قریب پیر پنچال کی جنوبی ڈھلوانوں پر مشتمل ہے۔ سلطان محمود غزنوی کی کشمیر پر یورش لوہارہ کے قلعے لوہ کوٹ کے محاصرے پر آکر رک گئی تھی۔

قطب الدین نے اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے اپنے سپہ سالار ڈامر لولک کو فوج دے کر روانہ کیا۔ شاہی فوج کو شکستِ فاش ہوئی۔ سپہ سالار مارا گیا اور، جون راجہ کے الفاظ میں، اسے "یوَنوں کی آخری رسم" کے مطابق دفن کیا گیا، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سپہ سالار مسلمان تھا اگرچہ اس کا نام کسی غیر مسلم کا سا معلوم ہوتا ہے۔ اس عہد کا ایک نہایت اہم واقعہ ۷۷۹ھ (۱۳۷۷ء) میں کشمیر کے سرپرست ولی شیخ نورالدین کی ولادت ہے۔ ان کے حالاتِ زندگی پر ایک نوٹ باب سوم میں آچکا ہے۔

سلطان شہاب الدین کے آخری دور کا وزیرِ اعظم اُدے شری — یا تو اپنے پرانے سلطان سے وفاداری کے جذبے سے، یا اقتدار اپنے ہاتھوں میں لینے اور برقرار رکھنے کی غرض سے — قطب الدین کو تخت سے اتارنے اور اس کی جگہ شہزادہ حسن خان کو بٹھانے کی سازش کے

درپے ہوا۔ مگر یہ سازش ناکام ہو گئی۔ اُدے شری قید کیا گیا اور پھر اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ شہزادہ ملک چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

میر سید علی ہمدانی — جن کی تفصیلات باب سوم میں درج ہیں — ۷۸۱ھ (۱۳۷۹ء) میں دوسری مرتبہ سری نگر تشریف لائے اور ان کا نہایت والہانہ استقبال ہوا۔

اس عظیم سید کے زیرِ اثر سلطان نے اپنا زیادہ وقت مراقبے اور عبادت کے لیے وقف کر دیا اور "قطب" تخلص کے ساتھ ایک بڑا صوفی شاعر بن گیا۔ سید نے سلطان کو اپنی کلاہ عطا کی، جسے قطب الدین اپنے شاہی تاج میں پہنتا تھا۔ سلطان کے زمانے میں ایک سے زائد بار قحط پڑا، مگر اس نے اپنی فیاضی سے صورتِ حال پر کامیابی سے قابو پایا اور لوگوں کو فاقہ کشی سے نجات دلائی۔

اس نے قطب الدین پور بسایا، جس پر اب سری نگر کے دو محلے، یعنی لنگر ہٹہ اور پیر حاجی محمد، آباد ہیں۔

قطب الدین اب بوڑھا ہو چکا تھا اور بیٹے سے محروم تھا۔ آخرکار ملکہ کے بطن سے ایک بیٹا پیدا ہوا "جو خاندان کی زینت اور اپنے باپ کی آنکھوں کی ٹھنڈک تھا اور جس کی آمد روزے کے بعد عید کے مانند تھی۔" جون راجہ اس بچے کو شری نگر یعنی زیور یا آرائش کہتا ہے (صفحہ 53)۔ طبقات نے اسے سیکر لکھا ہے، جو غالباً سکندر کی تحریف ہے، اور جون راجہ نے آگے چل کر اسے شکندھر لکھا ہے (صفحہ 54)۔ یہی وہ بچہ ہے جو تاریخ میں سکندر کے نام سے معروف ہوا۔ اس موقع پر منعقد ہونے والے جشنوں میں سلطان نے دلی مسرت سے قیدیوں کی رہائی کا حکم دیا۔ بعد میں ملکہ کے ہاں ایک اور بیٹا پیدا ہوا جس کا نام ہیبت رکھا گیا۔

قطب الدین پندرہ برس حکومت کرنے کے بعد ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں وفات پا گیا۔ اس کے پس ماندگان میں دونوں بیٹے ابھی کمسن تھے۔ سلطان سکندر اس کا جانشین ہوا۔ یہ وہی سال ہے جس میں ملک سرور نے جونپور میں شرقی خاندان کی بنیاد رکھی اور تیمور نے بغداد پر قبضہ کیا۔

سلطان قطب الدین کا مقبرہ قطب الدین پور یعنی لنگر ہٹہ میں، پیر حاجی محمد صاحب کی زیارت کے قریب، سری نگر میں واقع ہے اور ایک محفوظ قومی یادگار ہے۔

سلطان سکندر [۷۹۱ھ تا ۸۱۶ھ / ۱۳۸۹ء تا ۱۴۱۳ء]

سکندر ۷۹۱ھ (۱۳۸۹ء) میں تخت نشین ہوا، جب انگلستان کا بادشاہ بلیک پرنس کا بیٹا رچرڈ دوم تھا۔ سکندر کی حکومت ہنری چہارم اور ہنری پنجم کے عہد سے بھی ہم زمانہ رہی۔

سکندر کی کمسنی کے باعث اس کے ابتدائی عہدِ حکومت میں اس کی والدہ حورا اس کے لیے قوت کا بڑا سرچشمہ ثابت ہوئی۔ چونکہ جون راجہ نے ''شیر خوار'' کا لفظ استعمال کیا ہے، اس لیے ممکن ہے کہ تخت نشینی کے وقت سکندر کی عمر زیادہ سے زیادہ آٹھ برس سے کم رہی ہو۔ غیر معمولی شخصیت اور استواریِ کردار کی حامل اس خاتون نے ہر مخالفت کا قلع قمع کیا اور شریروں کے دلوں میں دہشت بٹھا دی۔ اس نے یہاں تک انتہا کی کہ اپنی بیٹی اور داماد شاہ محمد کی جان لے لی اور یوں اُس بغاوت کو، جسے داماد خفیہ طور پر ہوا دے رہا تھا اور جو خطرناک صورت اختیار کر سکتی تھی، ابتدا ہی میں کچل دیا۔

بتایا جاتا ہے کہ سکندر سنِ بلوغ کو پہنچ کر عسکریت کی جانب خاص طور پر مائل ہوا، جس کے نتیجے میں اس کی فوج کی مکمل کایا پلٹ گئی۔ یہ بھی مذکور ہے کہ اس کی عسکری مہمات شاذو

نادر ہی ناکام ہوتی تھیں۔ ۱۳۹۵ء میں شمال مغربی ہندوستان پر اس کی یورش اس کی عسکری تنظیم کے لیے باعثِ اعتبار تھی۔ چنانچہ اس نے اوہند کو مطیع کیا اور وہاں کے سردار کی بیٹی میرا سے نکاح کیا۔ سبھٹا یا شوبھا مہادیوی، جو کھنجیہ راج کی بہن تھی، سلطان کی بیوی تھی مگر بظاہر اس وقت تک بے اولاد تھی۔ بعد میں وہ شہزادہ فیروز کی ماں بنی، جسے سکندر نے فتنے کے سدِباب کے لیے جلاوطن کر دیا۔ ایک اور مقام پر جون راجہ شوبھا مہادیوی کے دونوں بیٹوں کو "متبنیٰ اولاد" لکھتا ہے۔ میرا تین بیٹوں کی ماں تھی، جن میں سے دوسرے، شاہی خان، کے مقدر میں "بڈ شاہ" یعنی "شاہِ اعظم" بننا لکھا تھا، جو تاریخ میں سلطان زین العابدین کے نام سے معروف ہے۔

اپنے عہد کے عمومی رجحان میں شریک ہوتے ہوئے سکندر، بظاہر، تمام امورِ مملکت میں مذہبی قانون کے نفاذ کا والہانہ جذبہ رکھتا تھا۔ اس کا عدل اور مذہبی یک رنگی کی شدید آرزو ایک شاعر کے حسبِ ذیل اشعار سے ظاہر ہے، جن میں سے آخری مصرعے سے اس کی تخت نشینی کا سال بھی برآمد ہوتا ہے—

کہ زری یافت سرفرازی تاج گرچہ بودہ زکفر چوں شب داج عادل سکندر

سکندر اپنی ولولہ انگیز طبیعت کے ساتھ ساتھ فہم و فراست اور تدبر میں بھی کسی سے کم نہ تھا۔ اس کے بھائی ہیبت کی زہر سے موت کے بارے میں یہ خیال عام تھا کہ اس کا سبب وزیر رائے ماگرے تھا۔ بادشاہ نے اس وزیر کے اثر و رسوخ کو بھانپتے ہوئے انتقام میں تاخیر سے کام لیا۔ رائے ماگرے کو جب یہ احساس ہوا کہ وہ معتوب ٹھہر چکا ہے تو اس نے اپنے تاجدار آقا کو اس بات پر آمادہ کیا کہ اسے تبتِ خرد کے باغیوں کی سرکوبی کی اجازت دی جائے۔ وزیر کا اصل مقصد یہ تھا کہ وہ اپنے لیے ایک ایسی ریاست حاصل کر لے جو اسے

بادشاہ کے انتقام کی دسترس سے باہر کر دے، جب کہ بادشاہ کو دوسری طرف یہ امید تھی کہ وزیر کو فوجی مہم پر روانہ کر کے اس سے نجات پا لے گا۔ رائے ماگرے کی فوجوں کو کامیابی نصیب ہوئی جس سے اس کی شہرت اور قوت میں اضافہ ہو گیا۔

جب اس نے خود کو محفوظ سمجھا تو اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا۔ بادشاہ نے اس موقع کو غنیمت جانا، لشکر لے کر بڑھا اور اسے عبرت ناک شکست دی۔ وزیر گرفتار ہوا اور جلد ہی قید خانے میں مر گیا۔ اس کے بعد بادشاہ کی توجہ تبتِ خرد کی بازیافتہ ریاست میں امن و انتظام کی بحالی پر مرکوز رہی۔

(ماخذ: کنگز آف کشمیرا، صفحہ 59 نیز صفحہ 64؛ تاریخِ کشمیر از ملک حیدر چاڈورہ، صفحہ 138)

تیمور کی ہندوستان پر یورش اور سکندر سے تبادلۂ مراسم

جب تیمور ہندوستان پر اترا تو سکندر نے دانش مندی سے کام لیتے ہوئے اپنا نمائندہ اس کی خدمت میں روانہ کیا، کیونکہ وہ ان شہزادوں کے ہولناک انجام سے باخبر تھا جنہوں نے مزاحمت کر کے تیمور کی پیش قدمی کے سیلاب کو روکنے کی کوشش کی تھی۔

ظفر نامہ کی روایت کے مطابق تیمور نے اپنے پوتے رستم اور اپنے ایلچی معتمد زین الدین کے ذریعے دہلی سے سکندر کے لیے بطور اعزاز زربفت کی خلعتِ فاخرہ روانہ کی۔ یوں دونوں فرماں رواؤں کے مابین باہمی مراسم کا دروازہ کھل گیا۔ سکندر نے شاہ ہمدان کے ایک ممتاز مرید مولانا نورالدین بدخشی کو گراں قدر تحائف کے ساتھ تیمور کی خدمت میں بھیجا۔ جواباً تیمور نے پیغام بھیجا کہ وہ سکندر سے ملاقات کا خواہش مند ہے۔ تاہم تیمور کے حاشیہ نشین بعض امرا نے کہلا بھیجا کہ سکندر اس عظیم فاتح کی نذر کے لیے تیس ہزار گھوڑے اور ایک لاکھ

اشرفیاں بھی تیار رکھے۔ سکندر اس نذرانے کی فراہمی کے انتظام میں لگ گیا جس کی تیاری کا مطالبہ تیمور کے امرا نے کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس گراں بار مطالبے کے انکشاف پر تیمور کا غضب انہی امرا کے سر پر ٹوٹا۔ بہرحال سکندر ۱۳ رجب ۸۰۱ھ (۱۳۹۸ء) کو دریائے سندھ کے کنارے تیمور سے ملاقات کے لیے روانہ ہوا۔ اسی اثنا میں تیمور دریائے سندھ عبور کر کے سمرقند کی جانب بڑھ چکا تھا، چنانچہ سکندر بارہ مولا تک ہی جا کر کشمیر واپس لوٹ آیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے بعد اس نے اپنے فرزند شہزادہ شاہی خان کو، جو بعد میں سلطان زین العابدین کہلایا، تیمور اور اپنے مابین قائم دوستانہ تعلقات کو مستحکم کرنے کے لیے روانہ کیا۔ لیکن کسی معاصر تاریخ میں اس سفارت کا کوئی ذکر نہیں ملتا، کیونکہ ظاہر ہے کہ شہزادہ اس وقت پیدا ہی نہ ہوا ہو گا؛ بڈشاہ کی ولادت ۱۴۰۱ء بمطابق ۸۰۴ھ میں ہوئی تھی۔ البتہ طبقاتِ اکبری کی رو سے یہ امر مسلم ہے کہ سکندر نے اپنے سفیر کثیر نذرانے کے ساتھ تیمور کی خدمت میں بھیجے۔ سلطان کی رعایا کو اس کے دو محاصل یعنی باج اور تمغہ کی معافی سے بڑا فائدہ پہنچا۔

سکندر کی علم پروری

اگرچہ سکندر خود اعلیٰ تعلیم کی نعمت سے بہرہ ور نہ ہو سکا تھا، تاہم اس کی ادب پروری نے ایشیا کے گوشے گوشے سے، بالخصوص خراسان، ماوراء النہر اور عراق سے، اہلِ علم کو اپنی جانب کھینچ لیا۔

(تمغہ ایک ایسا محصول تھا جو قومیت اور مذہب کے امتیاز کے بغیر سب پر عائد ہوتا تھا۔ اس محصول کی اصل نوعیت کی وضاحت کہیں نہیں ملتی۔ بلوخمان (Blochmann) اور برگز (Briggs) نے تمغہ کا ترجمہ ”اندرونِ ملک راہداری محاصل“ کیا ہے۔ ایک مقامی زندہ

مؤرخ کی رائے ہے کہ باج کو وہ نذرانہ سمجھنا چاہیے جو ہر شخص کو سلطان کی زیارت کے موقع پر پیش کرنا پڑتا تھا اور جو آج تک ہندوستانی ریاستوں میں مروج ہے؛ نظامِ حیدرآباد نے اسے چند سال قبل موقوف کر دیا۔ تاہم میں بلوخمان اور برگز سے متفق ہوں اور ان محاصل کو راہداری کے واجبات، چنگی یا محصول ہی سمجھنا چاہیے۔)

ان اہلِ علم میں سب سے نمایاں شخصیت مولانا افضل کی تھی جو بخارا کے باشندے تھے اور آمد پر انہیں اس عظیم الشان مدرسے کا صدر مقرر کیا گیا جو سکندر کی تعمیر کردہ جامع مسجد کے سامنے واقع تھا۔ مولانا افضل نے اپنی ساری عمر طلبہ کے درس و تدریس میں بسر کی۔ بادشاہ نے ان کی گزر اوقات کے لیے موضع ناگام ان کے نام وقف کر رکھا تھا۔ مولانا شہاب الدین پور میں سید تاج الدین کے مزار کے احاطے میں دفن ہوئے۔ سید محمد مدنی ایک غیر ملکی سفیر اور جلیل القدر عالم تھے جنہوں نے سلطان کی علم پروری کے باعث کشمیر ہی میں سکونت اختیار کر لی اور بڈشاہ کے عہد میں وفات پائی۔ ان کا مقبرہ بڈشاہ نے تعمیر کرایا۔

سکندر کی دینی حمیت

سکندر خود ایک راسخ العقیدہ مسلمان تھا جو اپنے دین کے جملہ تقاضوں کی پابندی کا اہتمام کرتا تھا، چنانچہ اس نے ان تمام رسوم کا خاتمہ کر دیا جو شریعت یعنی اسلامی قانون کے منافی تھیں۔ اس کے مطابق شراب کی خرید و فروخت اور کشید، ستی کی رسم، قمار بازی، قحبہ گری اور ناچ رنگ کی محفلیں ممنوع قرار پائیں۔ تمغہ نامی محصول، جس کا ذکر اوپر آ چکا

ہے، موقوف کر دیا گیا۔ اسلامی عدالتیں قائم کی گئیں اور دیانت دار اور صاحبِ علم قاضی مقرر کیے گئے۔

عہدِ سکندری کی تعمیرات

دینی حمیت اور مستحکم نظمِ حکومت کے علاوہ سکندر کو تعمیرات کا بھی ویسا ہی شوق تھا جیسا ہندوستان کے تغلق سلاطین میں فیروز شاہ کو تھا۔ اس کے عہد میں بہت سی مسجدیں، مدرسے اور خانقاہیں تعمیر ہوئیں۔ اس کی پہلی عمارت خانقاہِ معلیٰ تھی جو اس نے ۷۹۸ھ (۱۳۹۵ء) میں سری نگر میں میر سید علی ہمدانی کے چلہ خانہ یعنی گوشۂ عبادت و ریاضت کی جگہ پر تعمیر کرائی۔ ونتی پور کے قریب ترال کی خانقاہِ اعلیٰ، پرگنہ شاوہ رہ کے موضع واچی کی خانقاہِ والا اور متن کی خانقاہِ کبرویہ اس کی دیگر مثالیں ہیں۔

سکندر نے جامع مسجد یعنی مسجدِ اعظم بھی تعمیر کرائی جس میں پچی کاری کا کام دو نامور کاریگروں — لرستان کے سید محمد اور خراسان کے سید صدرالدین — نے، جو دونوں حضرت شاہ ہمدان کے قدیم رفقا میں سے تھے، بلا معاوضہ انجام دیا۔ اس مسجد میں 372 ستون تھے، ہر ستون چالیس گز بلند اور چھ گز محیط رکھتا تھا۔ ان عمارتوں کے علاوہ سکندر نے اور بھی بہت سی عمارتیں بنوائیں جن کے محلِ وقوع اور کھنڈرات کا آج سراغ نہیں ملتا۔

(تاریخِ کبیر، صفحہ 290۔ لرستان مغربی ایران کا ایک صوبہ ہے جس کا صدر مقام خرم آباد ہے۔ خراسان کے لیے صفحہ 110 کا حاشیہ ملاحظہ ہو۔)

سید محمد ہمدانی کے ساتھ سکندر کی عقیدت

شاہ ہمدان کے فرزند سید محمد ہمدانی تقریباً تین سو، اور بعض مؤرخین کے بیان کے مطابق سات سو، مریدوں کے ہمراہ کشمیر تشریف لائے اور سلطان بھی ان کے حلقۂ ارادت میں شامل ہو گیا۔

اب سلطان کے دل میں یہ ولولہ موجزن ہوا کہ اپنے طرزِ حکمرانی کو اسلامی نظمِ حکومت میں ڈھال دے، اور اس سمت میں خاصی پیش رفت بھی ہوئی۔ چونکہ اس غرض سے اس کے احکام کی تعمیل یا تو نو مسلموں کے ہاتھوں ہوتی تھی یا دوسرے عمال کے ذریعے، اس لیے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ نو مسلم اور عمال محض دینی جذبے ہی سے سرشار نہ تھے؛ لازماً بہت سی ایسی زیادتیاں سرزد ہوئی ہوں گی جنہوں نے ہندوؤں کے جذبات کو مجروح کیا ہو گا۔ بزرگ سید محمد کو جب اس صورتِ حال کی خبر ہوئی تو انہوں نے بادشاہ سے کہا کہ جو کچھ اس کے حکم سے یا اس کی چشم پوشی سے ہو رہا ہے، اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا، کیونکہ اسلام اپنی اشاعت کے لیے جبر و تشدد کے بجائے ذاتی نمونے اور محبت پر انحصار کرتا ہے۔ ان الفاظ نے سلطان پر ایسا اثر کیا کہ اس نے فوراً ان کارروائیوں کا سلسلہ بند کر دیا۔

سکندر کی وفات

سکندر کا عہدِ حکومت قریباً چوبیس برس پر محیط رہا، اگرچہ اس کا بڑا حصہ — کم از کم بارہ برس — بیوہ ملکہ ہورا اور ملک سیف الدین کی نیابت میں گزرا۔ جب سکندر شدید بخار میں مبتلا ہوا تو اس نے اپنے تینوں بیٹوں — (۱) میر خان، (۲) شاہ رخ، جیسا کہ فتوحاتِ کبرویہ میں مذکور ہے، یا جونا راجا کے بیان کے مطابق شاہی خان، اور (۳) محمد خان — کو طلب کیا اور انہیں

نصیحت کی کہ اس کے بعد باہمی نزاع سے بچیں اور متحد رہیں۔ اس نے میر خان کو اپنا جانشین نامزد کر کے اسے علی شاہ کے لقب سے سرفراز کیا اور ۲۲ محرم ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) کو انتقال کر گیا۔

سکندر لوئی شور مندر کے سابقہ احاطے کے شمالی حصے میں دفن ہوا۔ یہ قبرستان مزار السلاطین کے نام سے موسوم ہے جو سری نگر میں زینہ کدل کے محلہ مہاراج گنج میں واقع ہے۔ مغرب میں یہ واقعہ جنگِ ایجن کورٹ سے چار برس پہلے کا ہے۔ ہندوستان میں سادات خاندان کے بانی خضر خان کی تخت نشینیِ دہلی اس کے ایک سال بعد ہوئی، اور شاعر ملا عبدالرحمٰن جامی کی ولادت بھی اس کے ایک سال بعد ہوئی۔

ہندوؤں کے ایذا رسانی میں سکندر کا حصہ

لیفٹیننٹ نیوال (Lieutenant Newall) کا بیان ہے کہ کچھ تیمور کے اثر سے اور کچھ بلاشبہ ان متعصب مسلمانوں کے اکسانے سے جو حال ہی میں اس کے ملک میں وارد ہوئے تھے، سکندر اسی زمانے میں مذہبی ایذا رسانی پر آمادہ کیا گیا۔ اس نے اپنی رعایا کو بت پرستی ترک کرنے پر مجبور کرنا شروع کیا اور اسی بنا پر "بت شکن" کا لقب پایا (نہ کہ "بت شکست"، جیسا کہ سٹائن (Stein) نے راج ترنگنی کے اپنے انگریزی ترجمے، جلد اول، صفحہ 131 میں لکھا ہے)۔ سر وولزلی ہیگ (Sir Wolseley Haig) اسے "سفاک متعصب" قرار دیتا ہے۔

(اسکیچ آف دی محمڈن ہسٹری آف کشمیر، از لیفٹیننٹ ڈی جے نیوال، بنگال آرٹلری، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، نمبر 5، ۱۸۵۴ء، صفحہ 413؛ کیمبرج ہسٹری آف

انڈیا، جلد سوم، صفحہ 280)

ان آرا سے بلاشبہ یہ تاثر پیدا ہو گا کہ اس ساری ایذا رسانی اور مندروں کی مسماری کا ذمہ دار خود سلطان تھا۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ مسلمان علما، مبلغین اور دیگر تارکینِ وطن کی اس کے ملک میں آمد نے اس کے اندر اپنے دین کی اشاعت کی ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ تاہم اس معاملے میں اس کا وزیرِ اعظم سوہ بھٹ اس سے کہیں آگے نکل گیا، جس نے بعد میں اسلام قبول کیا اور ملک سیف الدین کے نام سے موسوم ہوا۔ ناظم نے سید محمد ہمدانی کے دستِ حق پرست پر اس کے قبولِ اسلام کا ذکر نظم کیا ہے۔ رعایا کی ایذا رسانی اور مندروں کا انہدام اسی پرجوش نو مسلم اور دوسرے نو مسلموں کے ہاتھوں انجام پایا۔

یہ لوگ اپنے سابق دین کے پیروکاروں کے خلاف بے رحم واقع ہوئے تھے۔ چارلس جے راجرز (Chas. J. Rodgers) کے الفاظ میں، اپنے سابق ہم مذہبوں کی ایذا رسانی میں وزیر کے جوش و خروش کی نظیر نو مذہبوں کی مذہبی تاریخ میں شاذ ہی ملتی ہے۔

اسی کے ایما پر سلطان کے نام سے بعض اہم مندروں کے انہدام، ماتھے پر ٹیکہ (سیندور کا نشان) لگانے کی ممانعت اور اس رسم کی موقوفی کے نفاذ کے احکام صادر ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ خود سکندر، اس کے معاصر جونا راجا کی شہادت کے مطابق، تخت نشینی کے وقت شیر خوار بچہ تھا اور سوہ بھٹ بحیثیت نائب السلطنت کلی اختیارات کا مالک تھا۔ اور حسن کے بیان کے مطابق سوہ بھٹ چالیس برس تک کشمیر کی وزارت کے منصب پر فائز رہا، جب کہ سکندر کا عہدِ حکومت چوبیس برس رہا۔ اگر ہم یہ فرض بھی کر لیں کہ اپنے والد سلطان قطب الدین کی جانشینی کے وقت سکندر کی عمر آٹھ برس تھی، تو بھی وہ قریباً اٹھارہ بیس برس کی عمر

ہی سے نظمِ حکومت کا ذاتی طور پر ذمہ دار ہوا ہو گا، یعنی کل بتیس برس کی زندگی میں تقریباً بارہ برس۔ اخلاقی اور انسانی بنیادوں پر ہم سکندر کو ستی کی رسم موقوف کرنے پر موردِ الزام نہیں ٹھہرا سکتے؛ حقیقت یہ ہے کہ اس باب میں وہ اکبر اور بینٹنک (Bentinck) پر سبقت لے گیا۔ کشمیر میں شراب کی ممانعت کی کوشش پر بھی سکندر کو ملامت نہیں کی جا سکتی۔ لیکن اسے اس بھاری ذمہ داری سے کلیتاً بری الذمہ بھی قرار نہیں دیا جا سکتا کہ اس نے اپنے ان وزرا اور عمال کی مذہبی ایذا رسانی سے چشم پوشی کی جو بہرحال اس کے اپنے منتخب کردہ لوگ تھے یا اس کے مختصر عہدِ حکومت کے آخری دور میں مکمل طور پر اس کے زیرِ فرمان تھے۔ تاہم یہ ذکر کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ سکندر کا زمانہ خود مذہبی ایذا رسانی کا زمانہ تھا۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ اس کی حکومت انگلستان میں لولارڈ فرقے کی ایذا رسانی کے عہد سے ہم زمانہ تھی۔ ایچ جی ویلز (H. G. Wells) کے الفاظ میں ۱۴۱۴ء تا ۱۴۱۸ء کی مجلسِ کانسٹنس نے "ایسے طریقے اختیار کیے جو ہمارے جدید ضمیر پر گراں گزرتے ہیں"۔ وکلف (Wycliffe) کی ہڈیوں کو جلانے کا حکم دیا گیا۔ ہس (Huss) کو فریب سے بلا کر ۱۴۱۵ء میں زندہ جلا دیا گیا۔ اگلے برس جیروم آف پراگ (Jerome of Prague) کو نذرِ آتش کیا گیا۔ پوپ مارٹن پنجم نے ایک فرمان جاری کیا جس میں وکلف اور ہس کے پیروکاروں اور دیگر ملحدوں کی بیخ کنی کے لیے صلیبی جنگ کا اعلان کیا گیا تھا۔ انگلستان کی تاریخ کی پہلی خود مختار ملکہ میری نے، جس نے ۱۵۵۳ء سے ۱۵۵۸ء تک حکومت کی، لوگوں کو سولی کے کھمبے سے باندھ کر جلوانے کی اپنی ناخوش گوار روش کے باعث "خونی میری" کا لقب پایا۔

(دی اسکوائر سلور کوائنز آف دی سلطانز آف کشمیر، از چارلس جے راجرز، پرنسپل نارمل کالج امرتسر، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، جلد LIV، حصہ اول، نمبر 2، ۱۸۸۵ء،

صفحہ 101)

خود ہمارے اپنے زمانے میں ۱۹۳۳ء تا ۱۹۳۹ء مہذب جرمنوں نے — جو سائنس دانوں اور فلسفیوں کی قوم ہیں — ان یہودیوں کو ایذائیں پہنچائیں جو ڈیڑھ ہزار برس سے زیادہ عرصے سے جرمن سرزمین پر آباد چلے آتے تھے، اور ان کے بچوں پر تعلیمی اداروں کے دروازے بند کر دیے۔ یہودیوں کے مذہبی پیشوائے اعظم ڈاکٹر جے ایچ ہرٹز (Dr. J. H. Hertz) نے اپریل ۱۹۳۳ء میں لندن ٹائمز کو لکھا: "جرمن یہودی کو اس کے وطن کی عوامی، پیشہ ورانہ اور معاشرتی زندگی سے بے رحمی کے ساتھ خارج کرنے کا سلسلہ بلا روک ٹوک جاری ہے۔ فوری برطرفی کے مقابلے میں نہ کوئی کارنامہ کام آتا ہے، نہ کوئی منصب، نہ عمر بھر کی خدمت۔ پیشہ ور اصحاب کی فوج در فوج تعداد — اطبا، جج، وکلا، سرکاری ملازم، اساتذہ، صحافی، موسیقار، اداکار — اس طرح اپنی روزی سے محروم کی جا رہی ہے اور دل ہلا دینے والی کثرت کے ساتھ افلاس میں دھنس جانے پر مجبور ہے۔ شہری حقوق کی اس محرومی کے پہلو بہ پہلو اس ملک کے ہر یہودی مرد اور عورت کی انسانی توقیر کو ناقابلِ یقین طور پر پامال کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ نازی اخبارات میں اور سرکاری پروپیگنڈے کی ہر صورت کے ذریعے یہودیوں کو مسلسل اپنے وطن کا "غدار" ٹھہرایا جا رہا ہے — حالانکہ جنگِ عظیم میں کم و بیش بارہ ہزار جرمن یہودیوں نے اپنے ملک پر جانیں نثار کیں۔ یہودی مہاجرین کو اپنی جائیداد کا صرف دسواں حصہ جرمنی سے باہر لے جانے کی اجازت ہے۔ یہودی کتب فروش صرف یہودی گاہکوں کو یہودی کتابیں بیچ سکتے ہیں۔ یہودیوں کو عوامی باغوں میں الگ بینچوں پر بیٹھنا ہو گا۔

"نیورمبرگ کے فرامین جرمن یہودی کو تمام سیاسی حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ کوئی "غیر آریائی" نہ رائخ کا شہری بن سکتا ہے، نہ ووٹ دے سکتا ہے، نہ کوئی سرکاری منصب سنبھال

سکتا ہے۔ یہودیوں اور ”آریاؤں“ کے مابین نکاح ممنوع ہے اور ازدواج سے باہر کے تعلقات قابلِ تعزیر جرم ہیں۔

یہودی جرمن پرچم بھی نہیں لہرا سکتے۔“

یہ حکم بھی صادر کیا جا چکا ہے کہ جنگ میں کام آنے والے یہودیوں کے نام جرمن جنگی یادگاروں پر کندہ نہ کیے جائیں۔ اگرچہ بارہ ہزار یہودی اُس جنگ میں جرمنی کے لیے جانیں دے چکے تھے، مگر اب وہ فوج میں خدمت نہیں کر سکتے۔ گویا یہودیوں کی وہ سماجی تذلیل اور ان کے خلاف وہ معاشی امتیاز، جس کا آغاز نازی حکومت کے ساتھ ہوا تھا، اب ایک قانونی اور مستقل بنیاد پا چکا ہے۔ بعض چھوٹے قصبوں اور دیہات میں جرمن دکانداروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ یہودیوں کے ہاتھ خوراک نہ بیچیں۔ جو ”آریائی“ کسی یہودی سے لین دین کرتا ہے وہ مقامی نازی جتھے کے غیظ و غضب کا نشانہ بنتا ہے۔ یہودی زمین کے مالک نہیں ہو سکتے، لیکن اگر وہ اپنی زمین بیچنا چاہیں تو ”آریائیوں“ کو ان سے خریدنے کی اجازت نہیں۔

۱۹۳۸ء میں ”آسٹریا کے یہودیوں کی حالتِ زار کے رقّت انگیز قصے موصول ہو رہے تھے، جن کی تعداد دو لاکھ تھی اور جنہیں ان کے سامی نژاد ہونے کے سوا کسی جرم کے بغیر گداگری کی حالت تک پہنچایا جا رہا تھا۔ ان کی نوّے فیصد دکانیں ضبط کر لی گئیں۔ ذریعۂ معاش سے محروم، مگر ملک چھوڑنے سے قاصر، ان لوگوں کے ساتھ حکمران طبقات مویشیوں کا سا سلوک کر رہے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ چار دنوں کے عرصے میں ویانا کے یہودی قبرستانوں میں تدفین کی اوسط ۱۴۰ یومیہ رہی، حالانکہ معمول کی اوسط صرف چار تھی۔ ایک عشرہ قبل ایسا ظلم اور بے رحمانہ جبر، جیسا اب آسٹریا میں روا رکھا جا رہا ہے، ساری دنیا میں خوف اور برہمی کی ایک لہر دوڑا دیتا؛ لیکن گزشتہ پانچ برسوں میں حبش، چین، ہسپانیہ اور دیگر

مقامات پر اس قدر سفاکانہ واقعات رونما ہو چکے ہیں کہ دوسروں کے مصائب کے ساتھ دور دراز کی ہمدردی کی انسانی صلاحیت کند ہو کر رہ گئی ہے۔ جذبات اب قریب تر واقعات اور اشخاص ہی کے لیے مخصوص ہوتے جا رہے ہیں۔" [یہ بات غلط نہ سمجھی جائے کہ ڈاکٹر ہرٹز (Dr. Hertz) کے مذکورہ بالا مکتوب کو نقل کرنے کا مقصد کسی طور سیف الدین یا سکندر کی صفائی پیش کرنا ہے۔ انگلستان اور فرانس، یا انگلستان اور جرمنی، یا دیگر مغربی ممالک کے مابین خونریز جنگوں کے باوجود یہ عظیم قومیں کم و بیش ایک ربع صدی میں ایک دوسرے کی زیادتیاں فراموش کر دیتی ہیں۔

لیکن کشمیر میں پرانے واقعات کی ناخوشگوار یادوں کو مٹانے کے لیے پانچ صدیاں بھی کافی نہیں۔

عظیم انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (Encyclopaedia Britannica)، جو کشمیر کی پوری تاریخ میں صرف ایک ہی مسلمان حکمران کا ذکر کرتا ہے، مندروں کی تخریب کے الزام میں تنہا بے چارے سکندر ہی کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے؛ ملاحظہ ہو اس کا چودھواں ایڈیشن، ۱۹۲۹ء، جلد 13، صفحہ 290، پیراگراف 4۔]

ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ سکندر کا پہلا وزیر ایک ہندو — رائے مگرے — تھا (جسے ڈے (De) کے طبقاتِ اکبری کے انگریزی ترجمے، صفحہ 644 کے حاشیے میں رائے مداری لکھا گیا ہے)، جس نے اس کے بھائی ہیبت خان کو زہر دیا۔ صرف یہی نہیں؛ جون راجہ کی روایت کے مطابق سکندر نے ایک ہندو خاتون سبھٹا یا شری شوبھا مہادیوی سے نکاح کیا، اور اس کا سپہ سالار ایک ہندو برہمن تھا جو میر محمد ہمدانی کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوا۔ سلطان کسی طرح اس بات کا پابند نہ تھا کہ ہندو بیوی، ہندو وزیر یا ہندو سپہ سالار رکھے۔ اگر

چاہتا تو اپنے ان دونوں اہم ترین مناصب کے لیے ممتاز مسلمانوں کو مدعو کر سکتا تھا۔ یہیں سے اس امر کا قطعی ثبوت ملتا ہے کہ وہ ویسا کٹر متعصب نہ تھا جیسا بعض ہندو اور دیگر مؤرخین یا مصنفین نے اسے پیش کرنے کی کوشش کی ہے — اور وہ بھی جے پیٹر، چکرورمن، ابھی منیو یا ہرش (باب سوم) یا راجہ دیو ایسے حکمرانوں کے اس انتہائی بے حرمتی آمیز سلوک کو یکسر فراموش کر کے جو انہوں نے بتوں، مندروں اور بھٹوں اور برہمنوں کے ساتھ روا رکھا اور جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔

لارنس (Lawrence) کے بقول سکندر "بہادر اور صاحبِ علم و ذوق" تھا۔ راجرز (Rodgers) کے الفاظ میں "سکندر نہایت فیاض انسان تھا۔ اس کا شہرہ سن کر عراق، خراسان اور ماوراء النہر کے اہلِ علم اس کثرت سے اس کے دربار میں جمع ہو گئے کہ وہ خود ان ولایتوں کے درباروں کے لیے نمونہ بن گیا۔" سکندر کے عہد میں کشمیر کی خوشحالی اس امر سے ثابت ہے کہ وہاں ایک لاکھ دیہات موجود تھے۔ سٹائن (Stein) کے الفاظ میں یہ شہادت "صحیح اور مبنی بر واقعہ" ہے، کیونکہ اس کی بنیاد تیمور کے مؤرخ شرف الدین علی یزدی کے ۱۴۰۰ء کے بیان پر ہے، جس کا ہم عصر سکندر تھا۔

کہ مایوس را گشت حرماں حرام چنان ضتش زد صلاہ کم

مد از بس کہ اسلام رونق گرفت

[یعنی اس کی عالی ظرفی نے ایسی فیاضی کا اعلان کیا کہ مایوس پر بھی حرماں حرام ٹھہرا؛ اور جب اسلام کو ایسی رونق نصیب ہوئی تو اس کا در خاص و عام کے لیے حرمِ مقدس بن گیا۔ —بی ڈے (B. De)] ایسا شخص اس بے محابا مذمت کا ہرگز مستحق نہیں جو اس کے سر تھوپی جاتی ہے! وہ ہرش اور ان دوسروں کی نسبت ہزار درجے زیادہ انسان دوست تھا

جنہیں کوئی لبھی علانیہ، اتنی بلند آہنگی سے، اتنی تکرار اور اتنی تلخی کے ساتھ برا نہیں کہتا۔ سکندر کا نام اور اس کی چند لغزشیں کسی ایسی شدید بدگمانی کا جواز نہیں بننی چاہئیں جیسی کہ آئے دن بنائی جاتی ہیں۔

چنانچہ آنجہانی مسٹر برجیندر ناتھ ڈے (Brajendranath De) (۱۸۵۲ء–۱۹۳۲ء)، ایم اے، بیرسٹر ایٹ لا، آئی سی ایس، ۱۸۷۵ء میں جامعۂ آکسفورڈ کے بوڈن سنسکرت اسکالر اور بنگال کے ضلع برداون ڈویژن کے سابق کمشنر نے، جو طبقاتِ اکبری کے محنت کش مترجم تھے، لکھا: ”جون راجہ کے ہاں بت شکنی کے متعلق بہت کچھ ملتا ہے، لیکن مجھے مندروں کے انہدام کا کوئی ذکر نہیں مل سکا۔“

یہاں ذرا ٹھہر کر اس امر پر ایک لفظ کہنا مناسب ہو گا کہ بتوں یا مورتیوں کے توڑے جانے پر آخر اس قدر تلخی کیوں ہو۔ بت شکنی میں مسلمان تنہا نہیں۔ عیسائیوں کی دلیل یہ تھی کہ ”یہ سراسر لغو بات ہے کہ انسان خود بت بنائے اور پھر اسی کی پرستش کرے یا اپنے ہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی چیز سے خوف کھائے۔“ خود ہندوؤں میں بھی ”بت پرستی کی ہمہ گیری... نسبتاً جدید ہے۔“ قدیم ویدک مذہب میں مورتیوں کی گنجائش نہ تھی۔ گاؤ پرستش کی طرح یہ بھی ہندو مذہبی عمل میں بعد کا اضافہ ہے اور اس عظیم و قدیم مذہب کا کوئی لازمی یا جوہری جز نہیں۔ آخر کبیر پنتھی، سکھ، برہمو سماجی، آریہ سماجی اور رادھا سوامی ست سنگی سبھی بت پرستی کو رد کرتے ہیں، اور پھر بھی ہندو ہی رہتے ہیں! میرے لڑکپن میں امرتسر کے عظیم سنہری مندر (دربار صاحب) کے منتظم سردار اروڑ سنگھ نے سکھ عبادت کے اس مرکز سے تمام مورتیاں نکال باہر کیں، مگر اسے کبھی بت شکن تو درکنار، بت بردار تک نہ کہا گیا! حقیقت یہ ہے کہ ویدانت کا مطالعہ ہندو مت کے پرانک نظام کے رد کی طرف لے جا رہا

ہے۔ زیرِ بحث عہد میں چونکہ کشمیری خود اسلام قبول کرتے جا رہے تھے، اس لیے انہیں خود ہی اپنی مورتیوں کو جوں کا توں محفوظ رکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ یہ محض ایک سیدھا سادہ معاشی مسئلہ تھا کہ قبولِ اسلام کے بعد وہ اپنے مقدس مقامات کو عبادت کے نئے طریقے کے مطابق ڈھال لیں۔ خدا ان کے نزدیک وہیں موجود تھا؛ جگہ بھی وہی تھی؛ تبدیلی صرف اس مقام پر اس خدا کی عبادت کے انداز میں آئی تھی۔ یہ کام مورتیاں ہٹا کر اور کعبے کی سمت محراب بنا کر انجام دیا گیا۔ بلاشبہ اس وقت اس سے ان لوگوں کی دل آزاری ہوئی جو کسی تبدیلی کے روادار نہ تھے؛ ان کے جذبات مجروح ہوئے۔ لیکن پانچ صدیاں پرانے واقعات آج بھی تلخی کا باعث کیوں بنیں؟

بھائی اور بھائی کے درمیان آج تک کدورتیں کیوں پالی جائیں، جب کہ سب کشمیری ایک ہی مٹی کے فرزند ہیں؟ علامہ اقبال کی زبان میں اسلام نے جو کچھ کیا وہ یہ ہے:

آدی آزاد زیر تو ھم سے ہڑا

[یعنی انسان توہم کی زنجیروں سے آزاد ہو گیا۔]

ملک حیدر چاڈورہ نے اپنی تاریخ (ملک حیدر کی تاریخِ کشمیر، صفحہ 152) کے اوراق میں سلطان سکندر کی وفات پر کہا گیا ایک مرثیہ محفوظ رکھا ہے۔

سلطان علی شاہ (۸۱۶ھ تا ۸۲۳ھ / ۱۴۱۳ء تا ۱۴۲۰ء)

میر خان، ملقب بہ علی شاہ، جسے چارلس جے راجرز (Chas. J. Rodgers) غلطی سے علی شیر لکھتا ہے، ۸۱۶ھ (۱۴۱۳ء) میں اپنے والد کی مملکت کا وارث ہوا۔ اس کے عہدِ

حکومت کے بارے میں بہت کم معلومات ملتی ہیں۔ فرشتہ لکھتا ہے کہ اس بادشاہ کا وزیر بھی سہ بھٹ ہی رہا، جو طبقاتِ اکبری کے مطابق چار برس تک اس منصب پر فائز رہا اور اپنی تبدیلیٔ مذہب کی مہم جاری رکھے رہا، یہاں تک کہ اندرونی نزفِ خون سے، یا طبقات کی روایت کے مطابق تپِ دق سے، اس کا انتقال ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ سری نگر میں نالۂ مار پر واقع اس محلے میں مدفون ہے جو اب محلہ سیف الدین پورہ کہلاتا ہے۔ حسن کے بیان کے مطابق سہ بھٹ — سیف الدین — مجموعی طور پر چالیس برس وزیر رہا۔ اس کے بعد بادشاہ نے اس کی جگہ اپنے بھائی شاہی خان کو مقرر کیا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد بادشاہ نے مکہ کی زیارت کے لیے حج کا قصد کیا۔ آئینِ اکبری کہتی ہے کہ علی شاہ حج کو گیا؛ فرشتہ کہتا ہے کہ وہ سیرِ عالم کو نکلا، اور طبقات کا بیان بھی یہی ہے۔ لیکن خیرات کا لٹایا جانا آئینِ اکبری ہی کے مؤقف کی تائید کرتا ہے، اور جون راجہ کے بقول اس نے ”خزانے سے قیمتی جواہر اور خوبصورت گھوڑے نکال کر عطا کیے۔“ علی شاہ اپنی سلطنت اپنے بھائی شاہی خان کی نگرانی میں سونپ کر والیٔ جموں سے الوداع کہنے روانہ ہوا۔

والیٔ جموں، جسے تیمور نے مشرف بہ اسلام کیا تھا، علی شاہ کا خسر تھا۔ علی شاہ کے وہاں پہنچنے پر اس نے تخت چھوڑ دینے پر اس سے سخت احتجاج کیا۔ سلطان نے ارادہ بدل دیا۔ اب اس نے اپنے خسر اور راجوری کے راجہ کی اعانت سے اپنا تخت واپس لینے کی کوشش کی۔ تینوں پکھلی کے راستے آگے بڑھے، جس پر اس کا بھائی شاہی خان اُر کے مقام پر شکست کھا کر کشمیر چھوڑ گیا اور سیالکوٹ میں گکھڑوں (یا کھکھڑ) کے سردار جسرت خان کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔

جسرت خان تیمور کی وفات کے بعد ۱۴۰۵ء میں سمرقند کی اسیری سے واپس آ چکا تھا؛ یہ اسیری اسے اس بنا پر پیش آئی تھی کہ اس نے ہندوستان پر تیمور کی یورش میں مدد دینے کا اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تھا اور اس کے سامان پر دست درازی کی تھی۔ جسرت خان ان دنوں پنجاب میں اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہا تھا۔

اس برادر کُشانہ کشمکش کے بارے میں مؤرخین میں اختلاف ہے۔ فرشتہ کا دعویٰ ہے کہ سلطان علی شاہ ابتدا میں سیالکوٹ تک کامیاب رہا۔ پھر شاہی خان اور جسرت خان گکھڑ اسے شکست دے کر گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بعد ازاں علی شاہ کا انتقال چاڈورہ میں ہوا۔

سری نگر–چرار روڈ پر تسدوریا چاڈور میں سلطان علی شاہ کی قبر۔

حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ ۸۲۳ھ یعنی ۱۴۲۰ء میں سلطنت شاہی خان کے ہاتھوں میں منتقل ہو گئی — نہ کہ "شادی خان" کے، جیسا کہ برگز (Briggs) نے غلط لکھا ہے۔ علی شاہ نے چھ برس نو ماہ حکومت کی۔ اس کے عہد کا واحد اہم واقعہ تبتِ خرد (لٹل تبت) کا ہاتھ سے نکل جانا ہے، جو بلاشبہ علی شاہ کی نااہلی کا نتیجہ تھا۔ ہندوستان میں کبیر کی وفات اسی سال درج ہے جس سال سلطان علی شاہ تخت سے محروم ہوا۔

سلطان زین العابدین (۸۲۳ھ تا ۸۷۴ھ / ۱۴۲۰ء تا ۱۴۷۰ء)

جون ۱۴۲۰ء میں سلطان زین العابدین — جس کے لفظی معنی "عبادت گزاروں کی زینت" یا "اہلِ تقویٰ کا فخر" ہیں — کے انیس برس کی عمر میں مسندِ اقتدار سنبھالنے کے ساتھ کشمیر کے لیے امن، خوشحالی اور توسیع کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ پچاس شمسی یا اکاون

سے زائد قمری برسوں پر محیط یہ عہدِ حکومت وہ نقطۂ عروج تھا جہاں تک کشمیر کا کوئی دوسرا خودمختار بادشاہ کبھی نہ پہنچ سکا۔

شاہ رخ یا شاہی خان کی حیثیت سے بڈشاہ نے مولانا کبیر کی شاگردی میں تعلیم پائی۔ زین العابدین ابتدائے عمر ہی سے اپنی صلاحیتوں کے باعث مشہور تھا؛ وہ اپنے بھائی، یعنی مرحوم بادشاہ، کا وزیر رہ چکا تھا اور اہلِ کشمیر پر اپنے اعلیٰ اوصاف ظاہر کر چکا تھا۔ چنانچہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں نے اس کی تخت نشینی کا نہایت مسرت سے خیر مقدم کیا۔ زمامِ اقتدار سنبھالنے کے کچھ ہی عرصہ بعد زین العابدین نے اپنے بھائی محمد خان کو وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر نامزد کیا اور اس کے ساتھ اپنی افواج کے سالاروں ہلمت رینہ اور احمد رینہ کو وابستہ کر دیا۔ ملک مسعود وزیرِ داخلہ مقرر ہوا اور مرزا حسن خزانہ دارِ اعلیٰ۔ محمد خان کی وفات پر اس کا بیٹا حیدر خان اپنے والد کی جگہ وزیرِ اعظم بنا۔

بادشاہ نے قاضی القضاۃ کا منصب اس وقت تک اپنے ہی پاس رکھا جب تک اسے قاضی جمال الدین کی صورت میں، جو ہندوستان سے آیا تھا، ایک موزوں شخص میسر نہ آگیا۔

خواجہ نظام الدین احمد اور محمد قاسم فرشتہ نے بالترتیب بڈشاہ کے فیصل کردہ ایک مقدمے کی روایت بیان کی ہے۔ دونوں روایتوں میں فرق صرف اتنا ہے کہ طبقاتِ اکبری کے مطابق متعلقہ دونوں عورتیں مالکن اور خادمہ تھیں، جب کہ گلزارِ ابراہیمی یا تاریخِ فرشتہ کے مطابق دو سوکنیں تھیں۔ مختصر یہ کہ ایک عورت نے دو بچوں میں سے ایک کو قتل کر کے اس جرم کا الزام دوسری عورت پر لگا دیا۔ مقدمہ عدالت میں پہنچا، جس نے حقیقتِ حال معلوم کرنے سے اپنے عجز کا اعتراف کیا۔ معاملہ سلطان کے حضور پیش ہونے پر مبینہ ملزمہ کو طلب کر کے طرح طرح کی سخت دھمکیاں دی گئیں۔ چونکہ وہ بے گناہ تھی، اس نے کوئی

اعتراف نہ کیا۔ آخر سلطان نے کہا: ”اگر تم برہنہ ہو کر مردوں کی موجودگی میں اپنے گھر چلی جاؤ تو شاید یہ تمہاری بے گناہی کا ثبوت ہو۔“ عورت نے شرم سے سر جھکا لیا اور بولی: ”میرے لیے مر جانا اس فعل سے بہتر ہے۔ میں اپنی سزا پر راضی ہوں، مگر ایسا کرنے پر راضی نہیں ہو سکتی۔“ تب سلطان نے مدعیہ کو ایک دوسرے کمرے میں بلوایا اور کہا: ”اگر تم اپنی اس فریاد میں سچی ہو تو مردوں کی موجودگی میں برہنہ ہو جاؤ۔“ عورت مان گئی اور اپنا لباس اتارنے پر آمادہ ہو گئی۔ سلطان نے اسے روک دیا اور کہا: ”اس فعل کا گناہ تمہارا ہی ہے۔“ اور ”چند ضربیں لگنے پر اس نے اپنے جرم کا اعتراف کر لیا۔“

زین العابدین کا شوقِ تعمیر

فنِ تعمیر کے باب میں زین العابدین کو کشمیر کا شاہ جہاں کہا جا سکتا ہے۔ متعدد اہم عمارتیں اور بستیاں — جن میں سے بیشتر کے آثار آج بھی تلاش کیے جا سکتے ہیں — مثلاً زینہ لنک، زینہ کوٹ، زینہ پٹن، زینہ کنڈل، زینہ مٹھ، زینہ پور، زینہ تلک، زینہ گیر اور زینہ گام، تعمیرات اور شہری آبادکاری کے ساتھ اس کے والہانہ شغف کی شہادت دیتی ہیں۔ اس نے ہر پرگنے میں، اور بیشتر اہم دیہات میں، مسافروں کے لیے آرام گاہیں تعمیر کرائیں۔ جب وہ دوروں پر نکلتا — اور وہ اپنی مملکت میں کثرت سے سفر کیا کرتا تھا — تو اس بنا پر رعایا کو کسی زحمت کا سامنا نہ کرنا پڑتا تھا۔ اس نے مسافروں کی سہولت کے لیے سڑکوں کے کنارے کاروان سرائیں اور منزل گاہیں بھی بنوائیں اور یوں اس معاملے میں ایران کے صفوی بادشاہوں اور ہندوستان کے سوری سلاطین پر سبقت لے گیا۔

وولر میں واقع سلطان کے جزیرے کی اصل اور تاریخ کے بارے میں تمام مؤرخین نے حسبِ ذیل روایت قلم بند کی ہے۔ واضح رہے کہ زینہ گیر اب کم راج کے اُس پرگنے کا نام ہے جو سوپور کے شمال مغرب میں، اس سے تقریباً چار گھنٹے کی مسافت پر واقع ہے، جب کہ زینہ کنڈل اور زینہ پٹن جھیل وولر پر واقع تھے۔

زینہ کوٹ سری نگر سے تقریباً چار میل مغرب میں ایک گاؤں ہے۔

زینہ گام بروہ پرگنے کا ایک گاؤں ہے۔ زینہ مٹھ ڈل جھیل پر ایک مٹھ تھا۔ زینہ تلک دریائے جہلم کے کنارے جیاپیڈ پور (اندر کوٹ) کے قریب بسایا گیا ایک شہر تھا۔ زینہ پور اُس پرگنے کا نام ہے جو شوپیاں کے شمال مشرق میں واقع سطحِ مرتفع کے خطوں پر مشتمل ہے۔ پرگنہ ملک کے اُس قطعے کو کہتے ہیں جو متعدد دیہات کی اراضی پر مشتمل ہوتا ہے۔

جھیل وولر

وولر کشمیر کی سب سے بڑی جھیل ہے اور میٹھے پانی کے اعتبار سے ہندوستان کی بھی سب سے بڑی جھیل ہے۔ یہ وادی کے شمالی سرے کی جانب، سری نگر سے تقریباً ۲۱ میل شمال مغرب کے فاصلے پر واقع ہے۔ وولر سطحِ سمندر سے ۵٬۱۸۰ فٹ کی بلندی پر واقع ہے اور اس کا رقبہ ساڑھے بارہ مربع میل ہے جو سیلاب کے برسوں میں ۱۰۳ مربع میل تک پھیل جاتا ہے۔ تیز ہوا کے موسم میں جھیل کی سطح متلاطم موجوں کا سمندر بن جاتی ہے۔ اوسط گہرائی ۱۲ فٹ اور محیط تقریباً ۳۰ میل ہے۔

جھیل کے خط و خال نہایت باقاعدہ ہیں اور اس کا عمومی منظر دل کش ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ نام سنسکرت لفظ ”اُولا“ کی بگڑی ہوئی صورت ہے جس کے معنی ”متلاطم“ یا

"بلند موجوں والی (جھیل)" کے ہیں۔ اس کا قدیم نام مہاپدم سر ہے جو اس کے محافظ دیوتا ناگ مہاپدم کے نام سے ماخوذ ہے۔ اینڈریو ولسن (Andrew Wilson) کے بہ قول وولر کے مزاج میں کوئی ایسی بات ہے جو جھیل لیمان کی یاد دلاتی ہے، اور یہ غالباً اس کے پھیلے ہوئے پانی اور گرد و پیش کے مناظر کی بہ یک وقت لطافت اور شکوہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے شمالی اور مشرقی کناروں سے بلند و بالا پہاڑ تقریباً متصل اٹھتے ہیں، لیکن جھیل کے گرداگرد اُن بے شمار دیہات کے لیے جگہ موجود ہے جو اس کے ساحل کو رونق بخشتے ہیں۔

جھیل عام طور پر پُرسکون رہتی ہے، مگر اکثر اس کی سطح پر شدید طوفان بھی برپا ہوتے ہیں، اور ایسے ہی ایک طوفان میں رنجیت سنگھ کی وہ ۳۰۰ کشتیاں غرق ہو گئیں جو اس کے قافلے اور سامان کو لے جا رہی تھیں (دی اَبوڈ آف سنو، صفحہ 428)۔ موسمِ بہار کے آغاز میں وولر اور کشمیر کی دیگر جھیلوں کے بعض آبی پرندے یارقند اور کاشغر کی دور دراز وادیوں کی طرف اڑان بھر جاتے ہیں۔ دریائے جہلم مشرقی جانب سے وولر میں داخل ہوتا ہے اور جنوب مغربی گوشے سے نکل جاتا ہے۔ کیپٹن بیٹس (Captain Bates) کا کہنا ہے کہ یہ "محض اس لیے جھیل ہے کہ اس کی تہہ دریائے جہلم کی گزرگاہ سے نیچی ہے؛ جوں جوں بارہ مولا کے درے کی گزرگاہ دریا کے کٹاؤ سے گھستی جائے گی، یہ بتدریج معدوم ہو جائے گی؛ اس کے کناروں پر مٹی اور ریزوں کے جمتے جانے سے اس کا پھیلاؤ نمایاں طور پر سکڑتا جا رہا ہے۔"
جھیل کے شمال مغربی گوشے میں زینہ لنک واقع ہے جس سے وہ ملاح پناہ لیتے ہیں جو طوفان میں جھیل کی موجوں سے خائف ہوتے ہیں، اگرچہ خشک موسم میں یہ جزیرہ نہیں رہتا۔
مغربی ساحل پر وٹلب کی چٹان ہے جس پر بابا شکورالدین کا مزار ہے، جنھیں لوگ غلطی سے شکرالدین کہتے ہیں۔ مچھلی، آبی پرندے اور سنگھاڑا وولر کی اہم پیداوار ہیں۔

یہ جزیرہ سندر سین نامی ایک عیاش اور جابر راجہ کے زمانے میں ایک آباد مقام تھا، اور اس کی رعایا بھی اپنے راجہ کی تقلید میں پیچھے نہ تھی (منشی محمد الدین فوق کی "مکمل تاریخِ کشمیر"، جلد دوم)۔

انھی دنوں کلال نامی ایک بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے راجہ اور رعایا دونوں کو بدکرداری ترک کرنے کی تلقین کی، مگر کسی نے ان بزرگ کی نصیحتوں پر کان نہ دھرا۔ آخر ایک دن وہ دل برداشتہ ہو کر یہ مقام چھوڑ گئے اور جاتے ہوئے باشندوں کو ایسے عذاب سے خبردار کر گئے جو ان کے مسکن کو جھیل میں بدل دے گا۔ ان کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ ایک ارضی تغیر نے اس سرزمین کو جھیل بنا دیا!

[یہاں ایک حیرت انگیز دور دراز کی نظیر ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتی ہے۔ جاپان کے جنوب میں فارموسا کے قریب ماؤری گا سیما نامی جزیرے کے بارے میں بھی یہی خیال کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے باشندوں کے گناہوں کی پاداش میں سمندر میں غرق ہو گیا۔ ماہی گیر اور غوطہ خور وہاں سے جو ظروف نکال لاتے تھے وہ چین اور جاپان میں گراں ترین قیمتوں پر فروخت ہوتے تھے۔ تھامس مور (Thomas Moore) نے اپنی لالہ رخ میں اس کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے: "اور چینی مٹی کے وہ آبخورے اُس جزیرے سے، جو ہند کے سیلابِ آب تلے غرق ہوا، جہاں سے خوش نصیب غوطہ خور اکثر ایسے ظروف نکال لاتا ہے جو بادشاہوں کے ایوانوں کی زینت بنتے ہیں۔" نوٹ: کیا اس سے مراد بحرِ ہند کا وہ سیلاب ہے جو بحر الکاہل تک جا پہنچا؟]

وولر کا یہ زیرِ بحث خطہ زین العابدین کے عہد تک زیرِ آب رہا، جس کے ذہن میں جھیل کے اندر ایک محل تعمیر کرنے کا خیال آیا۔ غوطہ خوروں کی مدد سے وہ اس کی بنیادیں ایک ایسے

مندر کے کھنڈروں پر رکھنے میں کامیاب ہوا جو لبھی اس غرق شدہ زمین پر کھڑا تھا اور جسے اب عمارت کی بنیاد کے لیے پتھروں سے بھر دیا گیا۔ محل کے علاوہ، جو اب مکمل طور پر کھنڈر ہو چکا ہے، ایک مسجد بھی تعمیر کی گئی۔ اس مسجد کے قدیم گنبد کا چوتھائی حصہ اور ایک بوسیدہ دروازہ باقی رہ گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی چالیس برس پہلے تک یہ گنبد اچھی حالت میں دیکھا گیا تھا۔ اگر بروقت توجہ دی جاتی تو اسے محفوظ رکھا جا سکتا تھا۔ ملا احمد کشمیری نے حسبِ ذیل شعر میں اس عمارت کو شہرت بخشی (ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخِ کشمیر، صفحہ 145):

زین عبادتا درو جشن کندپیوستہ چو تاریخ خودش خرم

"یہ عمارت افلاک کی بنیادوں کی مانند مستحکم رہے! یہ کائنات کی نامور ترین زینت ہو۔ جب تک شہریار زینِ عباد اس میں جشن منائے، یہ اس کے اپنے عہد کی تاریخ کی مانند خرم رہے۔"

لفظ "خرم" کے حروف کی عددی قیمت ۸۴۷ھ (۱۴۴۳ء) بنتی ہے، جو اس عمارت کی بنیاد رکھے جانے کی تاریخ ہے۔ "کتبے والا پتھر بظاہر سیاہ سلیٹ کی ایک تختی ہے جو خوب صیقل شدہ اور آراستہ ہے؛ اس کی پیمائش ساڑھے اکیس انچ ضرب بارہ انچ اور موٹائی ڈھائی انچ ہے۔" یہ پتھر اب مفقود ہے۔

بادشاہ نے جزیرے کا نام زینہ لنک رکھا۔ کشمیری زبان میں "لنک" کے معنی جزیرہ ہیں۔ اس تعمیر کے اخراجات اس خوش قسمت دریافت سے پورے ہوئے کہ شاہی ملازمت میں شامل غوطہ خوروں کو جھیل سے ٹھوس سونے کے دو بت ہاتھ آ گئے۔

سلطان نے سری نگر کے قریب نو شہر میں — جو جدید اصطلاح میں گویا اس کی نئی دہلی تھی — ایک عظیم الشان بارہ منزلہ محل تعمیر کرایا جس کی ہر منزل پچاس کمروں پر مشتمل تھی، اور سری نگر کی زیبائش کو بہتر بنایا اور اس میں اضافہ کیا۔ کرم راجیہ میں "اس نے سورت ران پور بسایا جو ایسے مکانات سے آراستہ تھا جنھوں نے ہمالیہ کی چوٹیوں کا غرور خاک میں ملا دیا۔"

زین العابدین کی صنعت و حرفت کی سرپرستی

زین العابدین نے ایران، توران، ترکستان اور ہندوستان سے کاری گروں، دست کاروں اور اہلِ حرفہ کو دعوت دی اور انھیں کشمیر میں آباد ہونے کے لیے اچھے امکانات اور مراعات کی پیش کش کی۔ مختلف فنون اور حرفتوں کی زین العابدین کی سرپرستی نے ملک کی مادی اور معاشی ترقی میں بہت بڑا حصہ ڈالا اور اس کی شہرت میں خاصا اضافہ کیا۔

کشمیری صنعتوں کی مصنوعات بیرونِ ملک بہت قدر کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھیں اور گراں قیمتوں پر فروخت ہوتی تھیں۔

آتش بازی کے ایک ماہر نے اپنا فن بہت سے دوسروں کو سکھایا۔

حبیب نے — جس کا نام راجرز (Rodgers) نے غلطی سے جاب لکھا ہے — بارود تیار کیا۔

"مختلف دھاتوں سے بنے نئے اور سخت ہتھیار" وضع کیے گئے۔

ایک توپ بھی کارگر حالت میں موجود تھی۔

یہ توپ "مضبوط، خوب منضبط، گہری گونج والی اور نہایت گراں قدر" تھی۔ فوج کے لیے اسلحے جیسے سنجیدہ موضوع کے ساتھ ساتھ عوام کی تفریحات کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا۔ شعبدہ بازوں کو مدعو کیا گیا اور وہ بڑی تعداد میں آئے۔ موسیقی کو ایسا فروغ ملا جس کی نظیر پہلے کبھی نہ دیکھی گئی تھی۔ چنانچہ یہ بڑی حد تک اسی کی کاوشوں کا ثمر ہے کہ کشمیر آج بھی متعدد فنون و حرف، مثلاً لکڑی پر نقاشی، کاغذ سازی، شال بافی اور نجاری میں بلند مقام رکھتا ہے۔ اس نے اپنی رعایا میں سے افراد کو بعض صنعتیں سیکھنے کے لیے دوسرے ملکوں میں بھی روانہ کیا۔ اُس عہد کے بعض فنون ہندوستان سے درآمد ہوئے۔ اس نے تاجروں کو اپنا مال اپنے گھروں میں چھپا رکھنے سے منع کیا اور انھیں مجبور کیا کہ اسے مناسب منافع پر فروخت کے لیے پیش کریں۔ اس نے علمِ طب کی طرف بھی توجہ دی اور امراض کے علاج کے لیے سرکاری شفاخانے قائم کر کے اپنی رعایا کو سہولتیں فراہم کیں۔ یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ اطبا کے وہ بڑے خاندان جو دہلی اور لکھنؤ میں مشہور ہوئے، اصلاً کشمیر ہی سے آئے تھے۔ خواجہ اعظم بڈ شاہ کو یہ سہرا دیتے ہیں کہ اس نے سمرقند سے دائیاں اور تیماردار عورتیں منگوائیں۔ غالباً اسی سے کشمیر میں زچگی کے وارڈوں یا ضرورت مند عورتوں کے لیے سہولتوں کا آغاز ہوا — ایک ایسا اقدام جو بڈ شاہ کے کئی معاصر حکمرانوں سے کہیں آگے تھا۔

زین العابدین کی علم و ادب کی سرپرستی

زین العابدین کی علم و ادب سے محبت فنون و حرف سے اس کی دل چسپی سے کسی طرح کم نہ تھی۔ اپنی رعایا کی ذہنی نشوونما اور معاشی ترقی سے اس کی دل چسپی گہری اور انتھک تھی۔ اس نے اہلِ علم کی سرپرستی اسی فیاضی سے کی جس فیاضی سے دست کاروں اور

اہلِ حرفہ کی، اور یہی وجہ ہے کہ دوسرے ملکوں سے علما اور اہلِ قلم کی ایک بڑی تعداد کشمیر میں آکر جمع ہو گئی۔ تنگیِ داماں کے باعث اُن تمام اہلِ علم کا احوال بیان کرنا ممکن نہیں جو اس کے دربار سے وابستہ تھے یا اس کے عہد میں نمایاں ہوئے؛ لہٰذا ذیل میں ان میں سے صرف چند ممتاز شخصیات کا نہایت مختصر تذکرہ دیا جاتا ہے:

۱۔ مولانا کبیر—یہ پیدائشی کشمیری تھے جو عالمِ شباب میں ہرات ہجرت کر گئے تھے اور وہاں انھوں نے علمِ دین اور اس کے تمام متعلقہ علوم کی تحصیل کی۔ بادشاہ نے کئی کوششوں کے بعد انھیں کشمیر واپس آنے پر آمادہ کیا تاکہ وہ شیخ الاسلام یعنی محکمۂ شرعی امور کے سربراہ کا منصب سنبھالیں۔ انھیں جامعہ کا سربراہ بھی مقرر کیا گیا، جس کے قیام اور اخراجات کے لیے ناگام پرگنے کے متعدد دیہات کی آمدنی وقف کر دی گئی (تاریخِ کبیر، صفحہ 290)۔

۲۔ ملا احمد کشمیری—یہ صدر المدرسین مولانا محمد افضل بخاری کے شاگرد تھے جو سلطان سکندر کے عہد میں کشمیر آئے تھے۔ ملا احمد گہرے عالم، ممتاز شاعر اور بہترین مؤرخ تھے۔ تاریخِ وقائعِ کشمیر اور مہابھارت کا فارسی ترجمہ ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ یوں مہابھارت کے اولین فارسی ترجمے کا اعزاز بڈ شاہ کے حصے میں آتا ہے۔

ملا احمد نے سلطان کے حکم سے کلہن کی راج ترنگنی کا فارسی ترجمہ بھی کیا، جس کا نام سلطان نے بحر الاسمار یعنی "قصوں کا سمندر" رکھا—شاید کلہن کے "بادشاہوں کے دریا" کے تقابل میں۔ کلہن کی تصنیف کا یہ ترجمہ، یا شاید تلخیص، ضرور نامکمل رہا ہوگا، کیونکہ ۱۵۹۴ء میں اکبر نے ملا عبدالقادر بدایونی کو اس کی تکمیل کا حکم دیا۔ لیکن چونکہ ملا احمد کا ترجمہ اکبر کے زمانے تک خاصی قدیم فارسی کا حامل ہو چکا ہوگا، اس لیے شہنشاہ نے پورے متن کے ایک تازہ اور مکمل ترجمے کی فرمائش کی۔

[بدایونی (صفحہ 384) لکھتے ہیں: ”شہنشاہ نے مجھے حکم دیا تھا کہ شاہ آباد کے ملا شاہ محمد — جو علومِ استدلالی اور تاریخ کے ماہر ایک صاحبِ علم تھے — کے تاریخِ کشمیر کے فارسی ترجمے کو از سرِ نو لکھوں۔ مجھے اسے سلیس اسلوب میں لکھنا تھا۔ چنانچہ میں نے یہ کام کیا اور دو ماہ کے عرصے میں اپنی کتاب پیش کر دی، جو پڑھے جانے کی اپنی باری کے انتظار میں اعلیٰ حضرت کے کتب خانے میں رکھ دی گئی۔“ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم اکبر کے قیامِ کشمیر کے دوران، ۲ جمادی الثانی تا ۲ ذی قعدہ ۹۹۷ھ (۱۵۸۸ء)، دیا گیا، جب وہ ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) کے آغاز میں بہ راہِ کابل واپس ہوا۔ ”شاہ محمد کی تاریخِ کشمیر ہو یا بدایونی کی نظرِ ثانی — دونوں میں سے کسی کا کوئی نسخہ اب تک دستیاب نہیں ہو سکا۔“ بدایونی صفحہ 402 پر مزید لکھتے ہیں: ”مجھے بحر الاسمار کی تکمیل کا حکم دیا گیا — یہ قصوں پر مشتمل وہ کتاب ہے جس کا زین العابدین کے حکم سے جزوی طور پر فارسی میں ترجمہ ہو چکا تھا۔ میں نے اگلے پانچ مہینوں میں نئے حصوں کا ترجمہ کر دیا جو کل ملا کر تقریباً ساٹھ جز تھے۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد شہنشاہ نے مجھے ایک بار اپنی خواب گاہ میں طلب کیا اور ساری رات صبح تک مجھ سے ان قصوں کے بارے میں پوچھتا رہا۔ اس نے مجھے بحر الاسمار کی پہلی جلد بھی از سرِ نو لکھنے کا حکم دیا، کیونکہ وہ اُس قدیم فارسی میں لکھی گئی تھی جو اب بولی نہیں جاتی، اور کہا کہ جو حصہ میں نے تیار کیا ہے اس کا مسودہ اپنے پاس محفوظ رکھوں۔ میں نے زمین بوسی ادا کی اور دل و جان سے نئے کام کا آغاز کر دیا۔ اعلیٰ حضرت نے مجھے دس ہزار مرادی ٹنکے (جو شہزادہ مراد کی ولادت پر ڈھالے گئے تھے) اور ایک گھوڑا بھی بہ طورِ انعام عطا کیا۔“ اسی سال (۱۰۰۳ھ = ۱۵۹۴ء) کے اواخر میں عبدالقادر بدایونی کو کشمیر کے شیخ یعقوب صرفی کی وفات کا غم بھی سہنا پڑا۔ تاہم ڈاکٹر چارلس ریو (Dr. Charles Rieu) کی برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کی فہرست (جلد اول، ۱۸۷۹ء، صفحہ 296) ہمیں بتاتی ہے کہ راجترنگنی (Add.

24,032) غالباً وہی تصنیف ہے جسے عبدالقادر بدایونی نے ۹۹۹ھ = ۹۱-۱۵۹۰ء میں از سرِ نو لکھا تھا۔ آئینِ اکبری میں ابوالفضل کے اصل الفاظ یہ ہیں: ”تاریخِ کشمیر، جو گزشتہ چار ہزار برس پر محیط ہے، کشمیری زبان سے فارسی میں مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے ترجمہ کی ہے“ (انگریزی ترجمہ از ایچ بلوخمین (H. Blochmann)، جلد اول، ۱۸۷۳ء، صفحہ 106)۔ ریو نے نوٹ کیا ہے کہ یہ ترجمہ ملا شاہ محمد نے اکبر کے لیے ۹۹۸ھ (۱۵۸۹ء) میں سنسکرت سے فارسی میں کیا تھا۔ ایلیٹ اور ڈاؤسن (Elliot and Dowson) کی تاریخِ ہند کے مطابق راج ترنگنی کا ترجمہ عام طور پر مولانا عماد الدین سے منسوب کیا جاتا ہے (جلد پنجم، ۱۸۷۳ء، صفحہ 478)۔ عماد الدین غالباً روضۃ الطاہرین کے مصنف ہیں، جو ابتدائی زمانے سے ۱۰۱۴ھ = ۱۶۰۵ء تک کی ایک عمومی تاریخ ہے اور جس کے پانچویں حصے میں ”سلاطینِ کشمیر“ پر ایک باب شامل ہے (ریو کی فہرست، جلد اول، صفحات 117-119)۔ برنیئر (Bernier) کا بیان ہے کہ جہانگیر کے حکم سے راج ترنگنی کا ایک اختصاری فارسی ترجمہ کیا گیا تھا اور وہ خود اسے فرانسیسی میں منتقل کرنے میں مصروف تھا۔ لیکن ہوریس ہیمن ولسن (Horace Hayman Wilson) کہتے ہیں کہ ہم نے ”مسٹر برنیئر کے اس ترجمے کے بارے میں پھر کبھی کچھ نہیں سنا۔“]

حافظ بغدادی اور ملا پارسی دو اور صاحبانِ علم تھے جنھوں نے بحیثیت مدرس اپنی عمریں شاہی جامعہ میں بسر کیں۔ دونوں مہاجر تھے؛ اوّل الذکر، جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، بغداد سے آئے تھے اور ثانی الذکر بخارا سے۔ حافظ مولانا کبیر کے مزار میں مدفون ہیں، جب کہ ملا کی آخری آرام گاہ نوشہر میں ہے۔

۵۔ قاضی جمال الدین — جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، جمال الدین اصلاً ہندوستان سے آئے تھے۔ وہ خانقاہِ شاہ ہمدان میں زہد اور گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتے تھے اور طالبانِ علم کو فیض پہنچاتے تھے۔ دربارِ شاہی سے ان کا تعارف عجیب انداز سے ہوا۔

وہ ایسے لوگوں کے لیے عرضیاں لکھا کرتے تھے جنھیں کوئی مقدمہ درپیش ہوتا یا کسی شکایت کی دادرسی مطلوب ہوتی۔ بادشاہ اپنے حضور پیش ہونے والی ان عرضیوں کے مطالعے سے ان کی علمیت سے نہایت متاثر ہوا۔ اس سے بادشاہ کے تخیل کو تحریک ملی اور جمال الدین کو دیکھنے کا اشتیاق اور بھی بڑھ گیا۔ ایک مرتبہ جمال کے قلم سے نکلی ہوئی ایک منظوم عرضی بادشاہ کے سامنے آئی جس میں انھوں نے سلطان سکندر کی رحلت پر اظہارِ ماتم کیا تھا؛ عرضی کا آخری مصرع یہ تھا:

شہے کہ بوردِ مرادش ما ئے ے مسکینان سکیتان دل طلبیدے

اس عرضی کے مطالعے پر بادشاہ جمال کو دیکھنے کی آرزو پر مزید ضبط نہ کر سکا اور ایک امیر کو روانہ کیا کہ انھیں دربار میں لے آئے۔ بادشاہ نے ان کا نہایت عزت و اعزاز کے ساتھ استقبال کیا اور انھوں نے اپنی تصانیف میں سے ایک کتاب بادشاہ کی خدمت میں پیش کی۔ بعد ازاں بادشاہ نے انھیں اپنی پوری سلطنت کا قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔

٦۔ اس عہد کے ایک اور ممتاز عالم، جو منصبِ قضا پر بھی فائز رہے، قاضی میر علی بخاری تھے جو بخارا سے آئے تھے؛ بادشاہ کی نظر میں ان کی بڑی قدر و منزلت تھی اور ان کی کفالت کے لیے انھیں ایک جاگیر عطا ہوئی۔

۷۔ سید حسین قمی رضوی، ایک فاضل متکلم، جنھوں نے تبلیغِ اسلام کی خاطر وطن چھوڑ دیا تھا، کشمیر آئے اور سلطان نے انھیں باغِ زین گیر، تحصیل ہندواڑہ میں قیام کی دعوت دی؛ یہ مقام اب اسی فاضل سید کے نام پر سید پور یا سیدہ پور کہلاتا ہے۔

۸۔ حکیم منصور نے فارسی زبان میں طب پر "کفایۂ منصوری" تصنیف کی۔ اس کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے جو نول کشور پریس سے شائع ہوا ہے۔ ۹۔ ملا نادری، ملک حیدر چاڈورہ کی روایت کے مطابق، ملا احمد کے بعد بڈشاہ کے ملک الشعرا مقرر ہوئے۔ نادری مؤرخ بھی تھے، مگر نہ ان کا دیوان دستیاب ہے اور نہ ان کی تاریخِ کشمیر۔

۱۰۔ شیخ بہاء الدین گنج بخش، جو اپنے زمانے کے مشہور بزرگ تھے، خواجہ اسحاق ختلانی کے مرید تھے جو شاہ ہمدان کے ممتاز خلیفہ تھے۔ شیخ نے بہت وسیع سیاحت کی۔ کشمیر میں ان کا تعلق شیخ نورالدین اور سید محمد مدنی سے رہا۔ ان کے استغراقِ مراقبہ، ان کے کمالِ انکسار اور ان کی خود فراموشی و نفس کشی کی حکایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ ان کے جنازے میں اس عہد کے معززین کی بڑی تعداد شریک ہوئی۔ جب ۸۴۹ھ (۱۴۴۵ء) میں شیخ کا انتقال ہوا تو بڈشاہ کی ملکہ بیہقی بیگم نے اپنا ایک زیور فروخت کر کے شیخ کا مقبرہ تعمیر کرایا۔

۱۱۔ قاضی حمید ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو منصبِ قضا یعنی نظمِ عدل پر فائز چلا آتا تھا۔ وہ کشمیر کی ایک عمدہ تاریخ کے مصنف مانے جاتے ہیں جو بدقسمتی سے آج نایاب ہے۔

ان کے فرزند قاضی ابراہیم نے والد کی چھوڑی ہوئی تاریخ کی تکمیل کا بیڑا اٹھایا، مگر یہ تاریخ بھی موجود نہیں۔

۱۲۔ سید ناصر الدین خانیاری بڈشاہ کے عہد کے ایک معزز بزرگ ہیں۔ سید اصلاً بیہق سے آئے تھے جو ایران میں نیشاپور کے شمال مغرب میں واقع ایک ضلع ہے۔ بڈشاہ نے انھیں سفارتی خدمات سونپیں۔ ناصر الدین محلہ خانیار، سری نگر میں ایک گنبد کے نیچے مدفون ہیں جس میں یوز آسف کی قبر بھی ہے۔ یہ علاقہ روضہ بل کے نام سے معروف ہے۔

۱۳ تا ۲۱۔ یوز آسف، جن کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ مصر سے آئے ہوئے ایک سفیر تھے، بابا عثمان اُچھپ گنائی ایک فاضل عالمِ دین، حاجی آدم ایک صاحبِ ولایت بزرگ، شمس الدین اندرابی ایک نامور عالم، سلطان محمد ایک شاعر، سید محمد علی بلخی جنھوں نے درویشانہ زندگی کی خاطر فرماں روائی ترک کر دی، سید جانباز ولی، میر سید حسن منطقی اور بابا زین الدین رشی — یہ سب بھی وہ حضرات ہیں جو سلطان کے عہد کی زینت تھے۔

زین العابدین، جس کے نام کی سنسکرت صورت "جَین" ہے اور جسے جون راجہ "شری جین اُلّابھ دین" لکھتا ہے، خود سنسکرت کا طالب علم تھا اور "سنسکرت علوم کا سرپرست اور گاہے گاہے وادی کے قدیم تیرتھوں کا زائر بھی" تھا۔ اس کے پُرامن عہد میں ہندو روایات نے پھر سر اٹھایا اور ملک کو اس کی پرانی خوش حالی لوٹ آئی۔ زین العابدین کے بارے میں یہ بھی مروی ہے کہ اس نے ہندو فلسفے (یوگ وَ شِشٹھ) کا مطالعہ کیا تھا۔ سری وَرا کا بیان ہے کہ بادشاہ نے "پُران، منطق کی کتابیں، میمانسا اور دیگر کتب دور دراز ملکوں سے منگوائیں اور اہلِ علم میں تقسیم کیں۔ بادشاہ نے مجھ سے والمیکی کی تصنیف وَ شِشٹھ برہم درشن کی قرأت سنی۔۔۔۔ ملیچھ لوگ بِرہت کتھا سار، ہاٹکیشور سنہتا، پُران اور دیگر کتابیں اپنی زبان میں پڑھتے تھے۔"

ہندو اہلِ علم میں سب سے ممتاز حسبِ ذیل حضرات تھے:

۱۔ اُتّھ سوم ایک کشمیری عالم تھا جو فارسی، سنسکرت اور اپنی مادری زبان پر پوری دسترس رکھتا تھا اور اسی زبان میں شعر کہتا تھا۔ وہ دار الترجمہ میں ایک اعلیٰ منصب پر فائز تھا اور اس نے کشمیری زبان میں زین العابدین کی سوانح "جَین چَرِت" لکھی۔

۲۔ یودھ بھٹ نہایت ذہین اور حیرت انگیز حافظے کا مالک شخص تھا۔ وہ اتھرو وید کی تحصیل کے لیے مہاراشٹر گیا اور شری بھٹ کے اصرار پر کشمیر واپس آیا تاکہ اس وید کے علم کو پھیلائے۔ پانچ سو برس بعد، جب مرحوم شنکر پانڈورنگ پنڈت نے اتھرو وید کا اپنا مشہور ایڈیشن مرتب کیا تو دکن میں مخطوطہ دستیاب نہ ہونے کے باعث اس نے اسی کشمیری نسخے پر اعتماد کیا۔

۳۔ جون راجہ سنسکرت کا عالم تھا اور "خاصی استعداد کا حامل، اگرچہ بظاہر بہت زیادہ جدتِ طبع سے بہرہ ور نہ تھا۔" وہ ایک مؤرخ تھا جس نے، خود اس کے اپنے الفاظ میں، بادشاہوں کی تاریخ کا خاکہ مرتب کیا اور کلہن کی تصنیف کو اپنے زمانے تک پہنچایا۔ بادشاہ نے اپنی معہود فیاضی سے اسے انعام دیا۔ جون راجہ کو عدالت ہائے انصاف کے ناظم، عالی ظرف شری بھٹ کی جانب سے حکم ملا کہ "شاہی سلسلے کی داستان مکمل کرے۔" جون راجہ کا انتقال ۱۴۵۹ء میں ہوا۔ ۴۔ سری ورا بھی نامور مؤرخین میں سے تھا، اگرچہ "وہ کلہن کا مقلد تھا۔" اس نے جون راجہ کی وفات پر بادشاہوں کی کتاب کے باقی ماندہ حصے کی تکمیل کا کام اپنے ذمے لیا۔ سری ورا نے بڈشاہ کی وفات کے بعد ۱۵۰۵ء میں جامی کی "یوسف زلیخا" کو سنسکرت کے قالب میں ڈھالا؛ اس کا نام "کتھا کوتُک" ہے۔

دیگر نامور اہلِ علم یہ تھے: (۵) تِلک آچاریہ، بودھ عالم؛ (٦) کرپور بھٹ، طبیب؛ (۷) روپیہ بھٹ، ماہرِ فلکیات؛ (۸) سنہا، نجومی؛ (۹) رامانند، کیمیا دان، جس نے مہابھاشیہ کی ایک

شرح لکھی۔ بھٹ اوتار نے "جَین وِلاس" تصنیف کی۔ (۱۰) شیو بھٹ بادشاہ کا خاص معالج تھا اور اس کے کھانوں کی نگرانی کرتا تھا۔ یہ تمام علمی سرگرمیاں اپنے جملہ ضمنی مصارف سمیت اس لیے اتنی وسعت اختیار کر سکیں کہ بادشاہ خود ایک ایسا عالم تھا جو "اپنے عہد کے ادب پر پوری نظر رکھتا تھا" اور متعدد زبانوں سے واقف تھا۔ زین العابدین نے میر آتش حبیب کو سوال و جواب کی صورت میں آتش گیر مواد کی ترکیب و تیاری کے متعلق ہدایات املا کرائیں۔ اس نے پیرانہ سالی میں "شکایت" کے نام سے ایک تصنیف لکھی جو "تمام اشیا کی بے ثباتی کے بیان" میں ہے۔ یہ دونوں تصانیف فارسی میں تھیں۔ بڈشاہ نے ماندو کے خلجی فرماں روا محمود اول کو "اپنی زبان میں خود کہی ہوئی ایک خوب صورت نظم" بھیجی — غالباً فارسی میں، کیونکہ محمود کشمیری نظم سے شاید ہی لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ کشمیری ادب کو بھی زبردست فروغ حاصل ہوا۔ علم و ادب کے میدان میں سلطان کی سرگرمیاں کتابوں کے تراجم تک محدود نہ تھیں — جن میں مہابھارت کا ترجمہ نمایاں مقام رکھتا ہے — بلکہ اس نے خطیر رقوم صرف کیں، اپنے آدمی مختلف مقامات پر بھیجے، اور اس طرح ایک ایسا کتب خانہ جمع کیا جو سامانیوں کے جمع کردہ کتب خانے کے ہم پلہ تھا۔ یہ کتب خانہ فتح شاہ کے زمانے تک، یعنی قریباً ایک سو برس، محفوظ رہا۔

زین العابدین کی شعر دوستی

زین العابدین کو شاعری سے محبت تھی اور وہ شعرا کی صحبت سے بہت لطف اٹھاتا تھا جن کی تعداد اس کے دربار میں کچھ کم نہ تھی۔

ان میں سب سے درخشاں ملک الشعرا ملا احمد کشمیری تھے جن کا تخلص "قطب" تھا۔ ملک حیدر چاڈورہ نے اس شاعر کے حسبِ ذیل دو شعر نقل کیے ہیں:

اے بر د رویت پر و انہ سے وزلب و شوریست در ھر

سح نای می خورم خو ن گر من بہ آشچندین یگانڈ حال ان است؛ وای بر را

منشی محمد الدین فوق نے اپنی "مکمل تاریخِ کشمیر" جلد دوم (صفحہ 20) میں یہ اشعار سلطان قطب الدین سے منسوب کیے ہیں اور اس غزل کا مقطع بھی درج کیا ہے جو یوں ہے:

سکن گر یکند عیش مکن گس ی کند دیو ان نود عیب

دوسری جانب ملک حیدر چاڈورہ ان اشعار کو ملا احمد کا کلام قرار دیتا ہے۔ یہ امر پیشِ نظر رہے کہ ملک حیدر کی تاریخ مولانا نادری اور ملا احمد کی تصانیف کا خلاصہ ہے، اس لیے فوق کی یہ نسبت باطل ٹھہرتی ہے۔ ویسے خود فوق نے بھی اپنی "تاریخِ بڈشاہی" (۱۹۴۴ء) میں یہ نسبت واپس لے لی ہے۔ اور جیسا کہ بعض حضرات نے قیاس کیا ہے، دہلی کے خواجہ قطب الدین بختیار کاکی بھی یقیناً ان اشعار کے خالق نہیں، کیونکہ نول کشور پریس کے شائع کردہ خواجہ بختیار کاکی کے دیوان میں یہ اشعار موجود نہیں، اور خواجہ کاکی اپنے تخلص کے طور پر "قطب" نہیں بلکہ عموماً "قطب الدین" استعمال کرتے ہیں۔

ملا احمد اور سلطان زین العابدین کے مابین گاہے گاہے بدیہہ گوئی کے مقابلے بھی ہوا کرتے تھے۔

ایک بار ملا سلطان کے حضور اس حال میں حاضر ہوئے کہ ان کی دستار کا شملہ پیشانی پر لٹک رہا تھا، جس پر سلطان نے فی البدیہہ یہ شعر کہا:

گرندیدستی تو در آفاق گاو شاخسار شاخ پیشاق ملا احد کشر ہیں

ملا نے جواب میں یہ شعر عرض کیا:

نام درمیان مادہ گاواں در مار گے * واری دادم شاخ

سلطان ملا کی حاضر جوابی سے اس قدر محظوظ ہوا کہ اسے فراخ دلی سے انعام و اکرام سے نوازا۔ مگر دشمنوں کی ایک سازش کے نتیجے میں، جس کی نوعیت معلوم نہیں ہو سکی، ملا معتوب ہوئے اور نتیجتاً جلا وطن کر دیے گئے۔

پکھلی پہنچ کر انھوں نے سلطان کو یہ اشعار بھیجے:

ے ب منطق ز جحصس رک اثرستہ بندا خبرے رت بہ تحوم ز

احد ار غر چرا رانند برمن ان کسر و جر

سلطان ان اشعار کے مطالعے سے بہت متاثر ہوا اور اس نے فوراً ملا کو واپسی کا حکم بھیج دیا۔ (ایک اور روایت میں "کرگی" کا لفظ آیا ہے جس کے معنی گینڈے یا تبتی یاک کے ہیں، مگر غصے کے وقت اپنی دم کا گچھا سر پر کھینچ لینا بھیڑیے ہی کا وصف ہے۔)

بادشاہ کی فوج اور اس کی فتوحات

جب سلطان تخت نشین ہوا تو فوج کی تعداد ایک لاکھ پیادہ اور تیس ہزار سوار تھی۔ اس نے فوج کی تنظیم اس انداز سے کی کہ کسی بغاوت یا سرکشی کا امکان باقی نہ رہا۔ مزید برآں، افسروں کے ساتھ اس کے ذاتی حسنِ سلوک نے انھیں ایسا گرویدہ بنا لیا کہ وہ اس کے

اشارے پر اپنے سپاہیوں سمیت ہر خطرے کا بہادری سے سامنا کرتے ہوئے پیش قدمی کے لیے تیار رہتے تھے۔ اس نے پورا پنجاب فتح کر لیا، اگرچہ جسرت خان گکھڑ کی قیادت میں اس کی فوج دہلی فتح کرنے میں ناکام رہی۔ پنجاب اس وقت دہلی کے سید فرماں روا کی کمزور گرفت سے نکل چکا تھا۔ (واضح رہے کہ ہندوستانی یا صوبائی مؤرخین زین العابدین کی اس فتحِ پنجاب کا کوئی ذکر نہیں کرتے؛ قرینِ قیاس یہی ہے کہ یہ محض ایک تاخت تھی جو کسی مستقل قبضے پر منتج نہ ہوئی۔) بڈشاہ نے بھوٹ دیس یعنی مغربی تبت کو، غالباً ۱۴۶۰ء اور ۱۴۷۰ء کے درمیان، اپنی قلمرو میں شامل کیا۔ یہاں اس نے دریائے سندھ پر لیہ سے اوپر واقع سایہ دیش یا شیل (تلفظ "شے") میں مہاتما بدھ کی ایک سنہری مورتی کو تباہی سے بچایا۔ یہ گاؤں اپنی بڑی بڑی بدھ مورتیوں کے لیے ہمیشہ سے مشہور رہا ہے۔ سلطان نے کُلوٹہ یا کُلو کا قصبہ بھی لے لیا جو بظاہر اس زمانے میں تبتیوں کے قبضے میں تھا۔ کلوٹہ یا کلو کا راجہ لیہ کے راجہ کا باج گزار تھا۔ کلو فتح کرنے کے بعد بڈشاہ کانگڑہ کے علاقے لاہول کے راستے واپس آیا۔ ایک غیر مصدقہ روایت ہے کہ فتحِ پنجاب کے دوران اس نے امرتسر میں پڑاؤ کیا؛ پرانے کشمیری اس پڑاؤ کی یہ روایت ابھی حال تک دہراتے رہے ہیں اور کہتے تھے کہ اس نے اس محلے میں، جو اس کے نام پر "بڈکھوہ" کہلایا، ایک کنواں کھدوایا تھا؛ بعد میں شہر کے اس حصے میں کشمیری پنڈتوں کی کثرتِ آمد کے باعث یہ نام "بٹ کھوہ" ہو گیا۔ طبقاتِ اکبری کے بیان کے مطابق بڈشاہ نے تمام مفتوحہ ملکوں کے خزانوں کی تاراج کی اجازت دے دی تھی اور ان پر مال گزاری اسی شرح سے مقرر کی تھی جو دار الحکومت کے گرد و نواح کے علاقے کی تھی۔

اس کی تدبیرِ ملک داری اور خارجہ تعلقات

سازشوں کے قلع قمع اور سلطنت کے امن و سکون میں خلل ڈالنے والے عناصر کے استیصال کے علاوہ سلطان نے آگے بڑھ کر اپنے قریبی ہمسایوں نیز دور دراز ملکوں کے فرماں رواؤں اور والیانِ ملک سے دوستانہ تعلقات قائم کیے۔ اس نے خراسان، ترکستان، گیلان اور سیستان کے بادشاہوں، سلطانِ ترکی، مصر کے برجی مملوک فرماں روا اور شریفِ مکہ کے پاس مناسب تحائف اور خطوط کے ساتھ سفیر روانہ کیے۔ سلطان بہلول لودھی، گجرات کے سلطان محمود بیگڑھا اور سندھ کے جام نظام الدین (ننڈا) نے اس کے سفارتی وفود کا استقبال کیا۔ تبت کے حکمران نے اسے نہایت خوب صورت ہنسوں کا ایک جوڑا بھیجا جس کی طرف ایک عجیب کرشمہ منسوب کیا جاتا تھا، یعنی یہ کہ وہ دودھ اور پانی کو الگ الگ کر کے دودھ پی لیتے اور پانی برتن ہی میں چھوڑ دیتے تھے۔ سلطان اور گوالیار کے تنور راجہ کے درمیان موسیقی کی محبت ایک رشتے کا کام دیتی تھی۔

ہندوستان میں بڈشاہ کے نامور ہم عصر حکمران یہ تھے: دہلی میں خضر خان کا بیٹا معز الدین مبارک اور اس کے بعد بہلول لودھی؛ سندھ میں جام نظام الدین (ننڈا) ۱۴۳۷ء–۱۴۹۴ء؛ ملتان میں قطب الدین شاہ ۱۴۴۰ء–۱۴۵۶ء؛ جونپور میں محمود شاہ ۱۴۳۶ء–۱۴۶۸ء؛ دکن میں احمد شاہ ولی ۱۴۲۹ء–۱۴۳۶ء؛ گجرات میں محمود بیگڑھا ۱۴۵۸ء–۱۵۱۱ء؛ مالوہ میں محمود اول (خلجی) ۱۴۳۶ء–۱۴۶۹ء؛ خاندیش میں مبارک خان ۱۴۴۱ء–۱۴۵۷ء؛ اور بنگال میں ناصر الدین محمود شاہ ۱۴۴۲ء–۱۴۶۰ء۔

(اڑیسہ میں) کپلیشور دیو (کپلیندر دیو) ۱۴۳۴ء–۱۴۷۰ء، وجے نگر میں دیوا رایا دوم ۱۴۱۹ء–۱۴۴۶ء، گونڈوانا میں سورجا بلال سنگھ (شیر ساب بلال شاہ) ۱۴۳۷ء–۱۴۶۲ء، برما میں ملکہ

شن ساؤبھو ۱۴۵۳ء–۱۴۷۲ء اور سیلون میں پراکرما باہو ششم ۱۴۰۹ء–۱۴۶۶ء برسرِ اقتدار تھے۔

آذربائیجان اب شمال مغربی ایران کا ایک صوبہ ہے جس کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل ہے۔ اس کی آبادی کا تخمینہ بیس لاکھ ہے۔

صدر مقام تبریز ہے جس کی آبادی دو لاکھ ہے۔

آذربائیجان خلفاء کی سلطنت کا بھی ایک صوبہ تھا۔ یہ خطہ عموماً بلند و بالا پہاڑی سلسلوں پر مشتمل ہے۔ اس کا سب سے بڑا دریا ارس ہے جو بحیرۂ خزر میں جا گرتا ہے۔

بحیرۂ خزر کے ساحل پر واقع سابق روسی صوبے باکو اور ایلیزاویت پول بھی اب آذربائیجان ہی کہلاتے ہیں اور ۳۰ ستمبر ۱۹۲۰ء سے انہیں سوشلسٹ سوویت جمہوریہ قرار دیا جا چکا ہے، جس کا دارالحکومت باکو ہے۔ یہ دوسرا آذربائیجان قدیم آذربائیجان ہی کا ایک حصہ تھا۔
۲۔ گیلان ایران کا ایک صوبہ ہے جو بحیرۂ خزر کے جنوب اور سلسلۂ البرز کے شمال میں واقع ہے؛ اب یہ ایک ولایت ہے جس کا صدر مقام رشت ہے۔ اس کی آبادی ڈھائی لاکھ ہے۔ گیلان ایک مدتِ دراز تک آزاد رہا؛ ہلاکو نے اسے فتح کیا اور بالآخر صفوی حکمرانوں نے اسے ایران میں شامل کر لیا۔ عرب اسے جیل یا جیلان کہتے ہیں۔

زین العابدین کے ہم عصر یورپی فرماں روا یہ تھے: انگلستان میں ہنری ششم (۱۴۲۲ء–۱۴۶۱ء)، اسکاٹ لینڈ میں جیمز دوم (۱۴۳۷ء–۱۴۶۰ء)، فرانس میں چارلس ہفتم (۱۴۲۲ء–۱۴۶۱ء)، اسپین میں ہنری چہارم (۱۴۵۴ء–۱۴۷۴ء)، (مقدس رومی)

سلطنت میں شہنشاہ فریڈرک چہارم (۱۴۳۹ء–۱۴۹۳ء) اور مسندِ پاپائیت پر یوجینیس چہارم (۱۴۳۱ء–۱۴۴۷ء)۔

بعض مسلمان ہم عصر حکمران یہ تھے:

غرناطہ (اسپین) کے بنو نصر حکمرانوں میں–

(۱) محمد ہشتم المتمسک ابن یوسف ۱۴۱۷ء–۱۴۲۷ء (۲) محمد نہم الصغیر ابن نصر (۳) محمد ہشتم (دوبارہ) (۴) ابو الحجاج یوسف چہارم ابن محمد ششم (۵) محمد دہم الاحنف ابن عثمان (٦) سعد المستعین ابن علی (۷) محمد دہم (دوبارہ) (۸) سعد (دوبارہ) (۹) ابو الحسن علی ابن سعد ۱۴٦۱ء–۱۴۸۲ء۔

مراکش اور الجزائر میں – ابو محمد عبد الحق ابن ابی سعید عثمان دوم اور ابو زکریا یحییٰ ابن زیان الوطاسی۔

مصر و شام میں برجی مملوک حکمرانوں میں – (۱) الاشرف سیف الدین برسبائی (۲) العزیز جمال الدین یوسف ابن برسبائی (۳) الظاہر سیف الدین جقمق (۴) المنصور فخر الدین عثمان ابن جقمق (۵) الاشرف سیف الدین اینال (٦) المؤید شہاب الدین احمد (۷) الظاہر سیف الدین خوشقدم (۸) الظاہر سیف الدین بلبائی (۹) الظاہر تیمر بغا (۱۰) الاشرف سیف الدین قایتبائی۔

آذربائیجان میں قرا قویونلو حکمرانوں میں – یہ وہ ترکمان قبیلہ ہے جو اپنے علَموں پر بنے نشان کی بنا پر "کالی بھیڑ" کے نام سے معروف تھا – (۱) سکندر ابن یوسف (۲) مظفر الدین جہاں شاہ

ابن یوسف (۳) حسن علی۔ اور آق قویونلو یعنی "سفید بھیڑ" والے ترکمان قبیلے میں—(۱) نور الدین حمزہ ابن قرایولوق (۲) معز الدین جہانگیر (۳) اوزون حسن ابن علی۔

اس زمانے میں شرفائے مکہ یہ تھے—(۱) علی ابن عنان (۱۴۲۳ء) (۲) علی ابن عجلان (۳) الحسن (۴) ابو القاسم ابن الحسن اور (۵) محمد ابن برکات۔

بڈشاہ کا ہندو رعایا کے ساتھ رویہ

سلطان کے اختیار کردہ اقدامات میں ہندوؤں سے متعلق بعض ایسے قوانین بھی شامل تھے جن کی رو سے انہیں جداگانہ انتظام اور اپنے مقدمات کی اپنے ہی قوانین کے مطابق سماعت کا حق دیا گیا۔ طبقاتِ اکبری کا بیان ہے کہ سلطان نے برہمنوں سے یہ عہد لیا کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں میں لکھی باتوں کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ اس کے بعد سکندر کے وزیرِ اعظم ملک سیف الدین کے جاری کردہ ناروا ظالمانہ اقدامات منسوخ کر دیے گئے اور تمام مذاہب کے لیے عام رواداری کا اعلان کیا گیا۔ گزشتہ عہدِ حکومت میں ہجرت کر جانے والے برہمنوں اور دیگر ہندوؤں کو واپس بلایا گیا۔ مکمل مذہبی آزادی عطا کی گئی۔ پچھلے دورِ حکومت میں منہدم کیے گئے بعض مندر دوبارہ تعمیر کیے گئے اور نئے مندروں کی تعمیر کی اجازت دی گئی۔ سری وراکا بیان ہے کہ سدھاپوری نامی محل کے اندر بڈشاہ نے شکستہ مندروں کی ستونوں کے سہارے مرمت کرائی یا انہیں از سرِ نو تعمیر کرایا۔ ہندو لڑکوں کے لیے پاٹھ شالائیں کھولی گئیں تاکہ وہ اپنے مذہبی صحائف کی تعلیم حاصل کر سکیں۔ سنسکرت کے مطالعے کے لیے طلبہ کو وظائف عطا کیے گئے اور انہیں دکن اور کاشی (بنارس) روانہ کیا گیا۔ سلطان نے جزیہ معاف کر دیا، ہندوؤں کو جاگیریں عطا کیں اور گاؤ کشی کی حوصلہ شکنی کی۔

مزید برآں اس نے اپنی ہندو رعایا میں سے ان لوگوں کو اپنی ملازمت میں لے کر ان کی حوصلہ افزائی کی جو اس کی سرپرستی اور پذیرائی کے مستحق تھے۔ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ برہمنوں کے کارکن (سرکاری ملازمت پیشہ) اور بچھ بٹ (پروہتی پیشہ) طبقے اسی عہد میں وجود میں آئے اور انہیں اسی دور میں شناخت ملی۔ یہ دونوں فرقے آج تک دو الگ الگ گروہ چلے آتے ہیں اور آج بھی باہم شادی بیاہ نہیں کرتے۔ ایک تیسرا طبقہ جوتشیوں یعنی نجومیوں کا ہے جو کارکن طبقے سے رشتے کرتا ہے۔ منشی محمد دین فوق (تاریخِ اقوامِ کشمیر، جلد اول، صفحہ 48) کے مطابق کشمیر میں فارسی اور اسلامی علوم کا مطالعہ سب سے پہلے سپرو برہمنوں نے اختیار کیا، جو اس برادری کے مورثِ اعلیٰ تھے جس نے ہمارے زمانے میں (۱) مرحوم سر محمد اقبال کو جنم دیا، جن کے خاندان نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں اسلام قبول کیا اور سیالکوٹ جا بسا، اور (۲) رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو کو، جن کا خاندان خود سر تیج کے بیان کے مطابق ”تقریباً ایک سو تیس برس یا اس سے کچھ زیادہ عرصہ قبل“ کشمیر سے نکل کر دہلی میں آباد ہوا اور پھر الٰہ آباد منتقل ہو گیا۔

بڈشاہ کی ہندو اور مسلمان رعایا مذہبی منافرتوں سے بے نیاز ہو کر باہم امن و آشتی سے رہتی تھی۔ اگر کبھی اتفاقاً کوئی رنجش پیدا ہو بھی جاتی تو وہ پنچایتوں کے ذریعے خوش اسلوبی سے طے کر دی جاتی، جن کی صدارت خود بادشاہ کیا کرتا تھا۔

اصلاحات کے نفاذ میں بڈشاہ کی نرم خوئی

سلطان نے اپنی رعایا کو ایک ضابطۂ قوانین عطا کیا اور ان سب کو تانبے کی تختیوں پر کندہ کرا کے عام بازاروں اور ایوان ہائے عدل میں نصب کرایا۔ اس اعتبار سے وہ غالباً کشمیر کا پہلا

باضابطہ واضعِ قانون تھا۔ اسے ہر قسم کی خوں ریزی سے نفرت تھی اور اس نے کبھی کسی کو معمولی جرم پر سزائے موت نہیں دی۔ اس کے بارے میں مروی ہے کہ اس نے ایک ایسے شخص کی روح کے ایصالِ ثواب کے لیے کئی اونٹوں کے بار کے برابر نقدی اور کپڑا خیرات کیا جسے اس نے اس بنا پر سزائے موت دی تھی کہ وہ اپنی بیوی کے بے جا قتل کا مرتکب ہوا تھا۔ غالباً جوناراجا اسی واقعے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جوناراجا لکھتا ہے: ”اگرچہ بادشاہ نرم دل تھا، تاہم اپنی رعایا کی خاطر وہ اپنے بیٹوں، کسی وزیر یا کسی دوست تک کو، اگر وہ مجرم ہوتے، معاف نہ کرتا تھا۔ مرے شایا نامی یَوَن (یعنی مسلمان) ایک بار نشے میں تھا اور اس نے بلا قصور اپنی بیوی کو قتل کر ڈالا؛ اگرچہ وہ بادشاہ کا منظورِ نظر تھا، تاہم بادشاہ نے اسے سزائے موت دلوائی۔“ اسی طرح فرشتہ کے بیان کے مطابق بڈشاہ نے اپنے رضاعی بھائی شیر کو اس بنا پر سزائے موت دی کہ اس نے اپنے ہی بھائی مسعود کو قتل کر ڈالا تھا۔ فرشتہ کا بیان ہے کہ صوبائی حکام کے عائد کردہ من مانے جرمانے منسوخ کر دیے گئے۔ سلطان نے سابق بادشاہوں کے تمام قیدی رہا کر دیے۔ جب چکوں نے اس کے عظیم الشان بارہ منزلہ محل زینہ ڈب کو آگ لگا دی تو اس نے انہیں پسپا کر دیا اور ان کے سردار پانڈو چک کو کوڑے لگوا کر ہلاک کرایا، لیکن اس کے چھوٹے بیٹے حسین چک کو، جو ہمت چک کا چھوٹا بھائی تھا، اپنے التفات سے نوازا۔

اسی حسین چک سے ہم اپنی تاریخ میں آگے چل کر پھر ملیں گے، جب وہ میر شمس الدین عراقی کے زیرِ اثر شیعہ مذہب اختیار کر لیتا ہے۔ مزاج کی یہ نرمی اور لوگوں کے ساتھ روا رکھی گئی رعایت ملک میں کسی جرم کی حوصلہ افزائی کا باعث نہ بنی، اگرچہ شاید بعد کے زمانے میں سلطان کے بیٹوں کے مابین کشمکش کو اسی بے جا نرم مزاجی کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

قید خانوں میں کوزہ گری اور دیگر صنعتوں کا ایک نظام قائم کیا گیا۔

قیدیوں کو داغنے کا سلسلہ بند کر دیا گیا اور ان سے سڑکوں کی تعمیر کا کام لیا جانے لگا۔ سلطان نے کاشتکار طبقے پر خصوصی توجہ دی اور ایسے بہت سے اقدامات کیے جن سے اس کی حالت میں غیر معمولی بہتری آئی۔ اس نے خود اپنی ذات کو بھی مشقت سے مستثنیٰ نہ رکھا۔ اس نے بہ نفسِ نفیس متعدد پلوں، نہروں اور آبی گزرگاہوں کی تعمیر کی نگرانی کی، جس کے نتیجے میں کشمیر کا ایک بڑا حصہ قابلِ کاشت اور سیراب ہو گیا۔ اس کی زینہ گیر نہر حال ہی میں از سرِ نو تعمیر کی گئی ہے۔ اس نے جریب یعنی زنجیر اور گز کی لمبائی میں اضافہ کیا، مگر اس کی تفصیل دستیاب نہیں۔ طبقات میں جو کچھ درج ہے وہ یہ ہے: ”رعیت پر شفقت کے پیشِ نظر اس نے گز کے پیمانے اور زنجیر کی لمبائی دستور سے بڑھا دی۔“ سادہ الفاظ میں ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ اس نے جریب اور گز کے پیمانوں کو معیاری بنا دیا۔ اراضی کی تشخیصِ لگان پر نظرِ ثانی کی گئی اور بعض مقامات پر اسے گھٹا کر ساتواں حصہ کر دیا گیا۔ دیہاتیوں اور کسانوں کو مالیہ کے عملداروں کی زیادتیوں سے مزید تحفظ دینے کے لیے ایک ایسا قانون نافذ کیا گیا جس کی رو سے ان عملداروں کے لیے کسی قسم کا تحفہ قبول کرنا ممنوع ٹھہرا۔ اشیاء کی قیمتیں ماہانہ اعلانات کے ذریعے مقرر کی جاتی تھیں۔بیع ناموں پر شاہی مہر ثبت کی جاتی تھی۔ شاہراہوں پر سرائیں تعمیر کی گئیں اور جنگلوں کے اندر پناہ گاہیں بنائی گئیں۔ سلطان نے معاشرے کے پست حال طبقوں کا درجہ بلند کرنے کی جانب مزید پیش قدمی کی۔

بڈشاہ کے ذرائع آمدنی

ایک عظیم دربار کے لیے، جید علماء کی ایک کہکشاں کے لیے، متعدد عمارات کے لیے—جن میں سے بعض فی الواقع شاندار تھیں—اور اپنی فوج کے لیے سلطان کو زر درکار تھا۔ یہ زر اس نے تانبے کی کانوں سے، لداخ کے دریاؤں سے سونے کے ذرّوں کی فراہمی سے، اور نہروں کے اس وسیع نظام کی تعمیر سے حاصل کیا جس نے بنجر زمین کے بڑے بڑے قطعات کو سیراب کر دیا تھا۔ "ہر کسی کو ایسی قوتِ عزم نصیب نہیں ہوتی کہ وہ اپنے عہد کے شجر کو سرسبز رکھ سکے۔"

زین العابدین اور اکبر کا موازنہ

مؤرخین نے بعض اوقات زین العابدین اور اکبر کے مابین موازنہ کیا ہے۔ اولاً یہ امر فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ وہ دونوں ہم عصر نہ تھے۔ علاوہ ازیں زین العابدین کشمیر نیز تبت اور پنجاب کے بعض حصوں کا سلطان تھا، جب کہ اکبر کے زیرِ نگیں ایک ایسی مملکت تھی جو زین العابدین کی مملکت سے کئی گنا بڑھ کر تھی۔ لہٰذا وسعتِ سلطنت کے اعتبار سے دونوں کے مابین کوئی موازنہ نہیں۔

زین العابدین اکبر جیسی ہمت اور جسمانی قوت سے محروم نہ تھا، مگر بڈشاہ کے لیے ان کے اظہار کا میدان نسبتاً محدود تھا۔ دونوں کے مابین مشابہت کا ایک بہت بڑا پہلو وہ مقبولیت تھی جو دونوں کو، خصوصاً ہندوؤں میں، حاصل تھی۔ تاہم ذرا گہری نظر سے دیکھا جائے تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مقبولیت حاصل کرنے میں بھی دونوں کے طریقے ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ اکبر نے اپنے وضع کردہ ایک التقاطی مذہب کو، جسے اس نے "دینِ الٰہی" کا نام دیا، فروغ دیا اور راجپوت راجاؤں کے ساتھ ازدواجی رشتے استوار کیے۔ زین

العابدین کی عظمت اس امر میں مضمر ہے کہ اس نے اپنے دین پر کوئی سمجھوتہ کیے بغیر اور اس نوع کی کسی پالیسی کا سہارا لیے بغیر اپنی ہندو رعایا سے اتنی ہی محبت اور عزت حاصل کی جتنی اکبر نے کی، بلکہ شاید اس سے بھی زیادہ۔ اپنے اغراض و مقاصد میں یہ فرماں روا اسی نصب العین کا علمبردار تھا جس کی جستجو اکبر کو ہمیشہ رہی اور جو اس کے پیشِ نظر رہا۔ جیسا کہ سر وولزلی ہیگ (Sir Wolseley Haig) نے خوب کہا ہے، زین العابدین "علم و کمالات کے ایسے ذخیرے کا مالک تھا جس سے اکبر کی نوجوانی کی کاہلی نے اسے بڑی حد تک محروم رکھا تھا؛ اس کے خیالات شہنشاہ کے خیالات سے زیادہ روشن تھے اور وہ اس رواداری پر عمل پیرا تھا جس کی اکبر محض تلقین کیا کرتا تھا۔"

ایچ بیوریج (H. Beveridge)، جس نے اکبر نامہ کے تاریخی حصے کے ترجمے پر بیس برس سے زائد عرصہ صرف کیا، یہ کہنے پر مجبور ہے کہ اکبر کی ضرورت سے زیادہ تعریف کی گئی ہے۔ اکبر میں اپنے عہد اور اپنی نسل کے، نیز اپنی ذاتی افتادِ طبع کے نقائص موجود تھے۔ وہ سنگ دل بھی تھا اور عیش پسند بھی۔ اس نے ایک چراغ جلانے والے کو محض اس جرم پر فصیل سے نیچے پھینک دینے کا حکم دیا کہ وہ شاہی بستر پر سو گیا تھا۔ ایک موقع پر اس نے ایک شخص کو، جو دریائے سندھ پر گھاٹ کا سراغ نہ لگا سکا تھا، دریا میں پھینکوا دیا۔ ایک اور موقع پر اکبر نے ایک شخص پر، جو نشے کی حالت میں اس کے حضور آگیا تھا، غصے میں ٹھنڈا پانی ڈلوایا، جس کے نتیجے میں وہ بے چارہ بالآخر صدمے سے چل بسا۔ وی اے سمتھ (V. A. Smith) کو اکبر کے خصوصی مطالعے نے اس دعوے پر مجبور کیا کہ اکبر بارہا ان لوگوں کو، جنہیں وہ خطرناک سمجھتا، خفیہ قتل یا پوشیدہ سزائے موت کے ذریعے راستے سے ہٹا دیا کرتا تھا۔ یہ درست ہے کہ اکبر نے، جب وہ آدھا ہندو یا آدھا پارسی ہو چکا تھا، جہانگیر کے مظالم پر اظہارِ نفرت کیا، لیکن بیوریج نشاندہی کرتا ہے کہ یہ اکبر ہی تھا جس نے بے گناہ اور

باصلاحیت منصور شیرازی کو پھانسی دی، اور یہ وہی تھا جس نے اپنے بوڑھے اور لبھی واجب التعظیم استاد کو قتل کیا یا اس کے قتل سے چشم پوشی کی۔ زین العابدین کی زندگی اس نوع کے ظلم سے پاک تھی۔

وہ کوئی تاتاری نہ تھا؛ اس کی رگوں میں خوں ریز چنگیز کا خون شامل نہ تھا۔

اکبر کا اپنا بیٹا جہانگیر زین العابدین کی پارسائی کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس نے اپنے زینہ لنک میں کئی چلے کاٹے، اور مزید لکھتا ہے کہ کہا جاتا ہے کہ سلطان سے بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں (ایلیٹ اور ڈاؤسن — Elliot and Dowson — جلد ششم، صفحہ 306)۔ اکبر کو جہانگیر سے آزار پہنچا؛ اسی طرح زین العابدین کو بھی اپنے بیٹوں سے آزار پہنچا۔

بڈشاہ اور اکبر کی خانگی زندگی

اکبر کی تین سو سے زائد بیویاں تھیں؛ بڈشاہ کی صرف دو۔ زین العابدین اس خوبی سے متصف تھا جو مشرق و مغرب دونوں کے قرونِ وسطیٰ کے حکمرانوں میں یکساں نایاب تھی، یعنی جیسا کہ ابھی ذکر ہوا، صرف دو بیویوں پر قناعت — اور دوسری بیوی بھی اس لیے کہ پہلی سے کوئی نرینہ اولاد نہ تھی۔ خود اکبر کا مؤرخ بخشی نظام الدین احمد لکھتا ہے کہ بڈشاہ نے "کبھی کسی اجنبی عورت کا چہرہ نہ دیکھا۔" حسبِ ذیل واقعہ بڈشاہ کے کردار کے اس پہلو پر مزید روشنی ڈالتا ہے: "باج گزار ہندو راجاؤں کا دستور تھا کہ وہ اپنی ایک بیٹی فرماں روائے اعظم کے حرم میں بھیجا کرتے تھے، اور روایت ہے کہ راجاپوری (راجوری کا قدیم نام) کے راجہ سندر سین نے، جس کی تخت نشینی کا زمانہ تقریباً ۱۴۵۰ء متعین کیا جاتا ہے، اپنی سب سے بڑی بیٹی راجیہ دیوی سلطان زین العابدین کے پاس بھیجی۔ اس کی کشمیر آمد

کے وقت بادشاہ ولر جھیل پر سیر و تفریح میں مصروف تھا۔ خواتین کے قافلے کو آتا دیکھ کر اس نے اپنے ایک خادم سے پوچھا: 'یہ کس ماں کی ڈولی ہے؟' جب اسے معلوم ہوا کہ یہ راجاپوری کی شہزادی ہے جو اس کے پاس بھیجی گئی ہے تو اس نے کہا: 'جب میں اسے پہلے ہی ماں کہہ چکا ہوں تو اب اسے بیوی کیسے بنا سکتا ہوں؟' چنانچہ اسے حرم کی خواتین کے ساتھ رہنے کے لیے بھیج دیا گیا، جہاں وہ بعد ازاں مسلمان ہو گئی۔ سری نگر میں نہرِ مار پر واقع پل، راجہ وریا راجوری کدل، اسی نے تعمیر کرایا تھا۔"

پنڈت سری ورا لکھتا ہے: "بادشاہ کی محبوب ملکہ ودھا خاتون کا انتقال ہو گیا۔ وہ سادات (سیدوں) کے خاندان کے لیے وہی حیثیت رکھتی تھی جو سمندر کے لیے چاندنی کی ہے۔ اسی کی رفاقت میں بادشاہ نے اپنی زندگی کو مسرت آ گیں جانا تھا، اور اب اس کی جدائی سے اس کا وجود غم میں جلنے لگا اور ہر شے اسے ہیچ دکھائی دینے لگی۔"

سلطان زین العابدین المعروف بڈشاہ کی ملکہ مخدومہ خاتون کی قبر مزارِ کلاں یعنی حضرت بہاء الدین گنج بخش کے مقبرے میں بیہقی سادات کی قبروں کے درمیان واقع ہے۔

وہ ۸۷۰ھ (۱۴۶۵ء) میں فوت ہوئی۔ یہ ووڈھا (یا بوڈ، بمعنی بڑی) کھاتون در حقیقت تاج خاتون بیہقی بیگم تھی، جو سید محمد بیہقی کاندھامی کی دختر تھی۔ وہ سری نگر میں ہری پربت کے ناگر نگر سے باہر قطب العالم شیخ بہاء الدین گنج بخش کی زیارت میں مدفون ہے۔ اس کا مقبرہ اب ایک محفوظ یادگار کی حیثیت رکھتا ہے۔

بیہقی بیگم کی دو بیٹیاں تھیں؛ ایک اپنے ہی بھتیجے سید حسن بیہقی سے بیاہی گئی اور دوسری سلطانِ پکھلی کے عقد میں آئی۔ بیہقی بیگم کے ہاں کوئی بیٹا نہ ہوا۔

چنانچہ زین العابدین نے دوسرا نکاح کیا۔ یہ بیوی والئ جموں کی دختر تھی، اور اسی کے بطن سے بڈشاہ کے چار بیٹے پیدا ہوئے: (۱) آدم خان، (۲) حاجی خان، (۳) جسرت خان، (۴) بہرام خان۔ جسرت غالباً کم سنی ہی میں چل بسا، کیونکہ اس کے بعد اس کا کوئی ذکر سننے میں نہیں آتا۔ شری ورا کے بیان کے مطابق جموں کی اس ڈوگرہ ملکہ، یعنی زین العابدین کی دوسری بیوی، کا مزار اس کے سب سے بڑے بیٹے آدم خان کی قبر کے پہلو میں واقع ہے۔ اگر آدم خان کی قبر کے قریب واقع اس قبر کا کتبہ فی الواقع اسی سے متعلق ہے تو وہ ۸۵۶ھ (۱۴۵۲ء) میں فوت ہوئی۔

بڈشاہ اور اکبر کی عمومی عادات

اکبر کے برعکس، جو سرکاری خزانے سے فراخ دلی سے خرچ کرتا تھا، سلطان زین العابدین اپنے ذاتی مصارف کے لیے صرف اپنی تانبے کی کانوں کی آمدنی صرف کرتا تھا۔ اکبر شکار کا دلدادہ تھا؛ زین العابدین نے شکار ممنوع قرار دے رکھا تھا۔ بلکہ رمضان کے مہینے میں وہ کبھی گوشت نہ کھاتا تھا، اور چوری کے جرم میں کسی کو کبھی سزائے موت نہ دیتا تھا: اس اعتبار سے، راجرز (Rodgers) کے الفاظ میں، ”وہ انگلستان سے تین سو برس آگے تھا۔“ جونا راجا کی زبان میں ”حسن اس کے پیکر میں بستا تھا اور علم کی دیوی اس کے لبوں پر؛ اقبال مندی اس کے سینے میں مقیم تھی اور صبر اس کے ذہن میں۔“ الغرض یہ تھا وہ بادشاہ — شاہانہ شکل و شمائل کا مالک، فنون و حرفت کا سرپرست، کاشتکاروں کا دوست، علم و فضل کا مربی اور ہندوؤں کا محسن۔ اور فی الحقیقت وہ اپنے نام کے مصداق ”عابدوں کی آبرو“ یا ”زینتِ عابداں“ تھا۔

کرنل میلیسن (Col. Malleson) کے وہ الفاظ مستعار لیجیے جو اس نے اکبر کے لیے استعمال کیے تھے: جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ زین العابدین نے کیا کچھ کیا اور کس زمانے میں کیا، تو ہم اس اعتراف پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ سلطان ان نامور ہستیوں میں سے تھا جنہیں قدرت کسی ملک کی احتیاج کی گھڑی میں گاہے گاہے اس لیے بھیجتی ہے کہ اسے امن اور رواداری کی ان راہوں پر واپس لے آئیں جو تنہا اس کے باشندوں کی خوش حالی کی ضامن ہو سکتی ہیں۔

زین العابدین کی زندگی اپنے آخری ایام میں بیٹوں کی باہمی رقابت کے باعث کسی قدر تلخ ہو گئی۔ بد قسمتی سے وہ اپنے لائق باپ کے لائق بیٹے ثابت نہ ہوئے۔ دانا بادشاہ نے رنج کے ساتھ محسوس کیا کہ انہیں ایک دوسرے سے جدا کر دینا ہی بہتر ہوگا۔ چنانچہ غالباً ۱۴۵۱ء میں اس نے اپنے سب سے بڑے بیٹے آدم خان کو، جس کے طور طریقے بادشاہ کو ہمیشہ ناگوار گزرتے تھے، ایک بڑی فوج کا سالار بنا کر لداخ یعنی مغربی تبت پر حملے کے لیے مامور کیا۔ ان دنوں تبت کشمیر کے لیے وہی حیثیت رکھتا تھا جو انیسویں صدی کے نصفِ آخر میں الجزائر یا تیونس کی فرانس کے لیے تھی۔ دوسرے بیٹے حاجی خان کو پونچھ میں لوہ کوٹ کے خلاف پیش قدمی کا حکم ملا؛ سب سے چھوٹا بیٹا بہرام خان بادشاہ کے پاس رہا۔

دونوں بیٹے فتح یاب ہوئے اور نامِ فتح و ظفر سے آراستہ ہو کر واپس آئے۔ حاجی خان نے، جو بادشاہ کا چہیتا بیٹا بھی تھا، اپنے ہی باپ کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔ ۱۴۵۲ء (۸۵۶ھ) میں تحصیل بڈگام میں پلہ گلی کے میدان میں دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں۔ بڑا بیٹا آدم خان باپ کے ساتھ کھڑا رہا، جس نے پہلے پہل باغی بیٹے کو فہمائش کے ذریعے راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ حاجی کی فوج نے سلطان کی فوج پر حملہ کر دیا اور لڑائی طلوعِ آفتاب

سے غروبِ آفتاب تک جاری رہی۔ حاجی شاہی افواج کے مقابلے کی تاب نہ لا کر ہیرہ پور کی جانب بھاگا، جو شوپیاں سے تقریباً سات میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ وہاں سے وہ پیچھے ہٹ کر نروان کے قصبے میں جا ٹھہرا، جو بڈل درے کے راستے کشمیر میں داخل ہونے والی شاہراہ پر واقع ہے۔ آدم خان نے اس کا تعاقب کیا، مگر سلطان کے احکام نے اسے مزید تعاقب سے روک دیا۔

تاہم سلطان نے آدم خان کو حکم دیا کہ کامراج کے قلعے سوپور پر چڑھائی کرے، چنانچہ وہ مقام زیر کر لیا گیا۔ اس کے جن باشندوں نے حاجی خان کو بغاوت پر اکسایا تھا، انہیں بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس آخری اقدام کے نتیجے میں حاجی کی فوج میں شامل سوپور کے کامراجی سپاہیوں کی ایک خاصی تعداد اس کا ساتھ چھوڑ گئی۔ اس نازک موقع پر جواں مردی دکھانے کے صلے میں آدم خان بادشاہ کا جانشین قرار پایا، مگر وہ ناکام ثابت ہوا۔ کامراج میں اس کی بدانتظامی کی شکایتیں بار بار سلطان تک پہنچتی رہیں، اور باپ کی تنبیہات کا جواب اس ناخلف بیٹے نے قطب الدین پور میں علمِ بغاوت بلند کر کے دیا۔ اس نے حاجی خان کو تعاون کی دعوت دی، جس نے بڑے بھائی پر حملہ کر کے صورتِ حال کو اپنے حق میں موڑنے کی کوشش کی، مگر سوپور کے مقام پر سخت ہزیمت اٹھائی۔ اب سلطان نے اپنی فوج آدم خان کے خلاف روانہ کی۔ اب کے آدم خان کو خاصے جانی نقصان کے ساتھ شکست سے دوچار ہونا پڑا، جس کے بعد وہ سوپور کی طرف بھاگا اور سلطان نے تیزی سے اس کا تعاقب کیا۔ حاجی جنگ کے نشیب و فراز پر ہوشیاری سے نظر رکھے ہوئے تھا اور اسی اثنا میں بارہ مولہ آپہنچا۔ سلطان نے اپنے سب سے چھوٹے بیٹے بہرام خان کو اس کی آمد پر خیر مقدم کے لیے بھیجا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس اقدام کا اصل ہدف آدم خان

تھا، کیونکہ دونوں بھائیوں کے تعلقات کبھی خوش گوار نہ رہے تھے۔ آدم خان نے نیل آب —دریائے سندھ کا کشمیری نام— کے کناروں کی جانب فرار میں عافیت ڈھونڈی۔

حاجی، جو اب تائب اور فرماں بردار ہو چکا تھا، بڑے بھائی کی جگہ ولی عہد قرار پایا، اور اس نے اپنی سابقہ بدسلوکیوں کی تلافی کی کوشش بھی کی۔ لیکن سلطان کو یہ دیکھ کر سخت قلق ہوا کہ اس کا چہیتا بیٹا اس کی نصیحتوں پر کان نہیں دھرتا اور بدستور اپنی عیاشیوں اور بادہ نوشی میں مبتلا ہے۔ مزید برآں اس نے خوں ریزی کی روش اختیار کر کے مدبرانہ سیاست سے مکمل بے اعتنائی کا ثبوت دیا۔ اس کے مخالفوں نے، موقع غنیمت جان کر، خفیہ طور پر آدم خان کو بلاوا بھیجا، مگر جب وہ دارالحکومت پہنچا تو سلطان نے اسے معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ تاہم بڑا بیٹا اس سے دل برداشتہ نہ ہوا اور اپنی ریشہ دوانیاں اور اپنا پروپیگنڈا جاری رکھا۔ اب امرا نے، صورتِ حال کی سنگینی اور سلطان کی گرتی ہوئی صحت کے پیشِ نظر، اس پر زور دیا کہ وہ اپنا جانشین نامزد کر دے۔ حاجی خان چونکہ دارالحکومت میں غالب تھا اور سلطان کی نظرِ عنایت بدستور اسے حاصل تھی، اس لیے اسی کو تختِ سلطنت کا جانشین قرار دے دیا گیا۔

اس کے کچھ ہی عرصے بعد سلطان اپنی عمر کے انہترویں شمسی سال میں، "باون برس کی حکمرانی" کے بعد، ۱۴۷۰ء بمطابق ۸۷۴ھ میں، جیٹھ کے مہینے (جون-جولائی کے مطابق) کی قمری تاریخوں کے بارہویں دن، بروز جمعہ دوپہر کے وقت اس عالم میں رحلت فرما گیا کہ پنڈت شری ورا کے بیان کے مطابق اس کے لرزتے ہونٹوں پر دعائیں جاری تھیں۔ پنڈت نے بادشاہ کی نعش دیکھی اور "اس کے چہرے پر لہراتی سیاہ داڑھی کے حسن" کا ذکر کیا۔ پنڈت شری ورا لکھتا ہے: "موت کے وقت یوں معلوم ہوتا تھا کہ اقبال اس کے تمام اعضا

کو چھوڑ کر اس کے چہرے پر نمودار ہو رہا ہے، اور میں نے اسے اسی عالم میں دیکھا۔ مجھے اس کا چہرہ دیوئ اقبال کا مسکن دکھائی دیا، اور اس سے پسینہ یوں رواں تھا جیسے سعادت کی کوئی ندی بہہ رہی ہو۔ اس کا سانس اس کی جان لے کر یوں رخصت ہوا گویا اس گوہر کی چوری پر خوف زدہ ہو۔ جان نکل جانے کے بعد بھی اس کی آنکھوں سے آنسو جاری رہے، گویا اس کی آنکھیں، جو آفتاب و ماہتاب کی مانند تھیں، پگھل گئی ہوں اور رعایا کے لیے اس کی محبت قطرہ قطرہ ٹپک رہی ہو۔"

سلطان اپنے والد سلطان سکندر کے پہلو میں دفن ہوا۔ شری ورا کہتا ہے کہ "قبر پر بلور کا ایک طویل پتھر رکھا گیا، جو وہاں موجود تمام پتھروں میں سب سے بلند تھا، لیٹے ہوئے بادشاہ کے پیکر سے مشابہ تھا اور اشعار سے منور تھا۔" یہ مزار چوتھے پل کے نیچے واقع ہے جو زینہ کدل کہلاتا ہے۔ یہ محلہ اسی عظیم فرماں روا کے نام پر بڈشاہ کہلاتا ہے۔

مگر مزار کی خستہ حالی نے کشمیر کے سابق چیف جسٹس مرحوم پیرزادہ محمد حسین عارف کی زبان سے یہ مصرع کہلوایا:

شکستہ حال زین العابدین کا مقبرہ دیکھا

زین العابدین کا ماتم اس کی ساری رعایا نے کیا۔ شعرا اور مؤرخین نے اس کے امن و شوکت سے معمور بے مثال عہد کی یاد میں خامہ فرسائی کی۔ ایک قطعۂ تاریخ بادشاہ کی برمحل مدح کے ساتھ ساتھ اس کا سالِ وفات ۸۷۴ھ (۱۴۷۰ء) بھی دیتا ہے۔

جہانگیر اور ملک حیدر چاڈورہ نے زین العابدین سے متعلق ایک دلچسپ کرامت نقل کی ہے۔ سلطان سیر و تفریح کے لیے جھیل ولر کے جزیرے کی طرف گیا تھا۔ اس موقع پر

اس کا بڑا بیٹا بھی ہمراہ تھا۔ اس نے سلطان کو کشتی کی سیر کا مشورہ دیا، اس حساب سے کہ موقع پا کر اسے پانی میں گرا کر اس کا کام تمام کر دے گا۔ سلطان نے کسی شبہے کا اظہار نہ کیا۔ ایک میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد اس نے آدم خان سے کہا کہ اس کی تسبیح لے آئے جو حجرۂ عبادت میں رہ گئی تھی۔ حجرۂ عبادت میں واپس پہنچ کر شہزادے نے حیرت و اضطراب کے عالم میں دیکھا کہ سلطان خود اسی حجرے میں بیٹھا مراقبے میں محو ہے۔ وہ سلطان کے پاس لوٹا اور اپنے مذموم ارادے کا اعتراف کر لیا، جس پر سلطان نے اسے معاف کر دیا، مگر ساتھ ہی یہ شعر پڑھا — اور یہ کیسا سچا ثابت ہوا، کیونکہ آدم، بڑا بیٹا ہونے کے باوجود، اپنے باپ کی جانشینی کے لیے مقدر نہ تھا:

پدر کش پادشاہی را نشاید وگر شاید شش مہ نپاید

"پدر کشی کرنے والا تاج پہننے کے لائق نہیں؛ اور اگر پہن بھی لے تو چھ ماہ سے زیادہ عصائے شاہی تھامے نہیں رہ سکتا۔"

اس سے اورنگ زیب عالمگیر کا اپنے اس بیٹے کے نام خط یاد آتا ہے جس نے اسی طرح اپنے شاہی باپ کی موت کی دعا مانگی تھی اور تاج تک نہ پہنچ سکا۔ سر محمد اقبال نے اس مضمون کو نظم کے قالب میں ڈھالا ہے۔

آدم خان نے ایک بار پھر حصولِ تخت کی تگ و دو کی، مگر حاجی خان کی معاملہ فہمی اور اس کے بیٹے حسن خان کی منظر عام پر بروقت آمد نے آدم خان کے منصوبے پھر خاک میں ملا دیے اور وہ ہندوستان کی طرف فرار پر مجبور ہوا۔

حیدر شاہ [۸۷۴ھ تا ۸۷۷ھ بمطابق ۱۴۷۰ء تا ۱۴۷۲ء]

حاجی حیدر شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ فرشتہ کے مطابق سلطان نے خاندانی روایت کی پیروی میں اپنے چھوٹے بھائی بہرام خان کو اپنا وزیر مقرر کیا اور ناگام اس کی جاگیر ٹھہری۔ اس کا اپنا بیٹا حسن خان اس کا جانشین نامزد ہوا اور امیر الامرا یعنی سردارِ امرا بھی، اور ضلع کامراج بطور ذاتی جاگیر ہمیشہ کے لیے اسے عطا ہوا۔ نیا بادشاہ آغاز ہی سے عیش و عشرت اور بدکاری کی زندگی میں غرق ہو گیا۔ وہ ہر اعتبار سے اپنے باپ کا الٹ ثابت ہوا اور اس نے ملک کا نظم و نسق کلیتاً بہرام خان کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔

حیدر شاہ کی نیک نامی کو اس بے جا عنایت نے داغ دار کیا جو اس نے لولی نامی ایک نائی پر کی۔ اسی نائی کے کہنے پر خزانے کے اس افسر حسن کچھے کا سر قلم کروا دیا گیا جس نے سلطان کی تخت نشینی کے لیے اس کی حمایت میں کام کیا تھا۔ پنڈت شری ورا اس نائی کو ایک جگہ رِکتیتارا اور دوسری جگہ پُورنا لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس "عیار شخص نے اپنی زبان کی شیرینی سے اپنے دل کی وہ سختی چھپا رکھی تھی جو اسے لوگوں پر ظلم ڈھانے پر آمادہ کرتی تھی۔"

سلطان کے سب سے بڑے بھائی آدم خان نے اس واقعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی، مگر مغلوں کے ایک دستے کے ہاتھوں مارا گیا۔ تاہم حیدر شاہ کے ہاتھوں اس کی نعش کی باعزت تدفین عمل میں آئی۔ شہزادہ آدم خان کا مقبرہ سری نگر کے محلہ سہیار میں، نوکدل کے مقابل واقع ہے۔

اس زمانے میں امرا نے بہرام خان کو پیش کش کی کہ اگر وہ تخت پر قبضہ کرنا چاہے تو وہ اس کی مدد کریں گے۔ وہ ابھی کسی فیصلے پر نہ پہنچا تھا کہ اسی اثنا میں سلطان کا بیٹا حسن خان — جس نے طبقاتِ اکبری کے مطابق ہندوستان میں کئی قلعے فتح کیے تھے، مگر کیمبرج ہسٹری

آف انڈیا (Cambridge History of India) کے مطابق پنجاب پر تاخت و تاراج کرتا رہا تھا اور کثیر مالِ غنیمت سمیٹ چکا تھا—دربار میں نمودار ہوا، بظاہر اس ارادے سے کہ اپنی مہمات میں جمع کیا ہوا مالِ غنیمت باپ کے قدموں میں نچھاور کرے۔ مگر اس کا اصل مقصد اپنی قسمت آزمانا تھا۔ اس کی اچانک آمد نے امرا کے دلوں کو شبہات سے بھر دیا، اور فرشتہ اور بخشی نظام الدین کے بقول انہوں نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ اسے شرفِ باریابی نہ بخشے۔ سلطان کے اس طرزِ عمل کی کوئی واضح توجیہ ممکن نہیں سوائے اس کے کہ وہ بہرام سے خائف تھا۔

اس دوران کشمیر میں ابتری اور انتشار کا دور دورہ رہا؛ سازشیں اور ریشہ دوانیاں عام تھیں۔ سلاطینِ کشمیر کے اقتدار کے زوال کا آغاز ۱۴۷۲ء میں اسی سلطان کی موت سے ہوا، جو چودہ ماہ کی مختصر حکمرانی کے بعد نشے کی حالت میں ایک چھت سے گر پڑا۔ لیکن سلطان کے ہم عصر پنڈت شری ورا کا بیان ہے کہ لوگوں کو شبہ تھا کہ ایک جوگی نے حیدر شاہ کو ایسی دوا دی تھی جس میں زہر شامل تھا۔ شری ورا موسیقی اور شاعری سے بادشاہ کے شغف پر اس کی تعریف کرتا ہے۔

سلطان حسن شاہ [۸۷۷ھ تا ۸۸۹ھ بمطابق ۱۴۷۲ء تا ۱۴۸۴ء]

سپہ سالار احمد آبی یا احمد اسود کی بھرپور تائید و حمایت سے سلطان حیدر شاہ کا بیٹا حسن خان سلطان حسن شاہ کے لقب کے ساتھ تخت نشین ہوا۔ سری ورا (Śrīvara) نے (صفحہ 208) حسن شاہ کی رسمِ تاج پوشی کا نہایت شان دار الفاظ میں ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ”اس کے باپ، اس کے دادا (سلطان زین العابدین) اور اس کے چچا (بہرام خان) کی

ساری دولت اس خوش بخت بادشاہ کی طرف یوں بہہ آئی جس طرح دریا سمندر کی طرف بہتے ہیں۔" حسن شاہ نے اس موقع پر ان قیدیوں کو رہا کر دیا جنھیں اس کے باپ اور دادا بھوٹہ ملک سے پکڑ لائے تھے۔ سری ورا کے بیان کے مطابق حیات خاتون سلطان کی محبوب ملکہ تھی۔ وہ سادات کے ایک نامور خاندان کی چشم و چراغ اور بڈشاہ کے عہد کے سید ناصر الدین بیہقی کے فرزند سید حسن بیہقی کی بیٹی تھی۔ جب اس کے بطن سے شہزادہ محمد شاہ پیدا ہوا تو "غریبوں میں ریشمی کپڑے تقسیم کیے گئے۔" سید حسن کو وزارت کے منصب پر فائز کیا گیا۔

سلطان کے حق میں خدمات کے صلے میں احمد اسود کو "ملک" کا خطاب اور وزارتِ عظمیٰ کا منصب عطا ہوا، جب کہ اس کا بیٹا نوروز امیرِ دریعنی داروغۂ دربارِ شاہی مقرر ہوا۔ بادشاہ کے چچا بہرام خان نے اپنی سلامتی اسی میں دیکھی کہ خود اختیار کردہ جلاوطنی اختیار کر کے ہندوستان چلا جائے۔

حسن شاہ نے اپنے دادا زین العابدین کے ان احکام اور معمولات کو ازسرِنو جاری کیا جو حیدر شاہ کے مختصر عہدِ حکومت میں عارضی طور پر معطل ہو گئے تھے۔ سری ورا کا بیان ہے کہ حسن شاہ نے فلسفے کے چھ مکاتبِ فکر کی تعلیم حاصل کی۔

۱۔ فرشتہ اور بخشی نے "احمد اسود" لکھا ہے۔ اسود کے معنی "سیاہ" کے علاوہ "زورآور" اور "نامور" بھی ہیں۔ ۲۔ امیرِ در کا منصب سلطنتِ دہلی کے وکیلِ در سے ملتا جلتا تھا، جو تمام شاہی خانگی امور کا نگران ہوتا اور بادشاہ کے ذاتی عملے کے وظائف اور تنخواہوں کی ادائیگی کی نگرانی کرتا تھا۔

ملکائیں، شہزادے، شاہی باورچی خانہ حتیٰ کہ اصطبل بھی اسی کی تحویل میں ہوتے تھے۔ وہی تمام ایسے معاملات بادشاہ کے حضور پیش کرتا جن کے لیے شاہی منظوری درکار ہوتی۔ فی الحقیقت وکیلِ در بڑا اثر و رسوخ رکھتا تھا اور بہت سے پہلوؤں سے بادشاہ کا نائب سمجھا جاتا تھا۔

اور "ان چھ مکاتب کی الگ الگ تصانیف اس کی ذات میں یکجا ہو گئیں" (صفحہ 208)۔ اس سے یوں معلوم ہوتا ہے گویا حسن شاہ، اکبر کے بعد آنے والے بے تاج دارا شکوہ کا پیش رَو تھا۔

راجانک چتی کنٹھ نے کئی کتابیں تصنیف کیں اور متعدد کتابوں کے عربی سے سنسکرت میں ترجمے کیے، اور حسن شاہ کی دانش مندانہ اور فراخ دلانہ حکمرانی کو سراہا ہے۔ کسوما نجلی (نذرانۂ گلہائے دعا) اسی زمانے میں لکھی گئی۔ بابا اسماعیل کبروی، جو ایک عالم اور صاحبِ ولایت بزرگ تھے، شیخ الاسلام کے منصب پر فائز تھے۔ جامع مسجد اور شاہ ہمدان کی خانقاہ، جو آتش زدگی سے تباہ ہو گئی تھیں، ازسرِنو تعمیر کی گئیں۔ خانقاہ سے ملحق مسجد کی تعمیر کا سال ۸۸۵ھ مطابق ۱۴۸۰ء ان الفاظ میں مضمر ہے:

سجد آسن عل النقوی

[یعنی: یہ مسجد تقویٰ کی بنیاد پر اٹھائی گئی]

بعد ازاں انہی الفاظ کو یوں منظوم کیا گیا:

سجد اس ... اللئثوی متا نقاء امسر شمدان است

ظاہر ہے کہ بعض ناراض عناصر نئے نظام کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتے تھے اور پرانے مفید معمولات کے احیا کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے بادشاہ کے چچا بہرام خان کو تخت پر قبضے کے لیے بلایا۔ چنانچہ وہ کشمیر میں صوبہ کامراج تک گھس آیا۔ لیکن ملک تازی بٹ نے، جو ولی عہد شہزادہ محمد خان کی اتالیقی و نگہبانی کے منصب پر مامور تھا، بہرام کی پیش قدمی کا سیلاب روک دیا اور اسے عبرت ناک شکست دی۔ بہرام خان کو کشمیر کے اعیان و امرا سے عملی مدد اور تعاون کی توقع تھی، مگر عین وقت پر انھوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ زینہ پور بھاگ گیا، لیکن جلد ہی وہ اور اس کے بیٹے گرفتار کر کے دارالحکومت لائے گئے، جہاں بہرام کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ اس ظلم کے بعد وہ تین دن سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ مؤرخین وزیر سید حسن بیہقی اور سپہ سالار ملک احمد کے مابین بڑھتی ہوئی رقابت کا ذکر کرتے ہیں۔ تاہم احمد کا انجام المناک ہے؛ وہ قید ہی میں فوت ہوا۔

دل ... جہاں ز ارگ با جباندارانِ جبان بگذاشتم دست از ... اعتی بستم ...پنداشتم

۱۔ ہمدرد، سری نگر، مورخہ ۲۵ جنوری ۱۹۴۲ء۔

۲۔ برگس (Briggs)، جلد چہارم، صفحہ 478۔

ملک احمد کی قبر کا یہ کتبہ اس کے المناک انجام کی گواہی دیتا ہے۔ سادات کا دھڑا نہایت طاقت ور تھا۔ اس پر بھی اس عہد کے عظیم شاعر اور صاحبِ ولایت بزرگ سید امین اویس بھی ۱۴۸۴ء میں ایک جھڑپ میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ وفات سے قبل انھوں نے کہا—

... ھمچو من ... یکساں حوشتر است

تقریباً ۱۴۸۳ء مطابق ۸۸۸ھ میں سید (حسن بیہقی) نے دو سید سرداروں جہانگیر اور ناصر کی قیادت میں بلتستان اور لداخ کی تسخیر کے لیے ایک مہم روانہ کی۔ دونوں نے بروقت مل کر قدم نہ اٹھایا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یلغار ناکام ہوئی اور کشمیری افواج کو بھوٹوں کے ہاتھوں شکست اٹھانی پڑی۔ اس ذلت آمیز شکست کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاہ میری خاندان کے عہدِ حکومت میں پھر کبھی کشمیر کے سپاہی لداخ پر تاخت و تاراج کی مہموں پر روانہ نہیں کیے گئے۔

ملک حیدر چاڈورہ ہمیں بتاتا ہے کہ حسن شاہ کے دربار میں بارہ سو ہندوستانی گویے تھے اور اتنی ہی بڑی تعداد کنیزوں کی تھی۔ بادشاہ نے رعایا کے حق میں اپنے فرائض سے غفلت برتی۔ اس نے نظمِ عدل کو نظرانداز کیا اور فوج کے معائنے کا کام اپنے بعض امرا کے سپرد کر چھوڑا۔

قیصر... شاقان لقب عدم و افسوس آں سلطان حسن... دل شد از اندوہ... از زم زمن رقص و... از طرب ناژو ادا از تاریخ حسن بہ ٹرمیم

آخری مصرعے سے، بشرطیکہ (ترمیم کے مطابق) الفاظ کے دوسرے حروف اور واؤ حذف کر دیے جائیں، سنِ وفات یعنی ۸۸۹ھ برآمد ہوتا ہے۔
محمد شاہ اور اس کے والد کے چچا زاد فتح شاہ کے مابین تختِ کشمیر کے لیے کشمکش—

سلطان محمد شاہ (اول) [۸۸۹ھ تا ۸۹۲ھ مطابق ۱۴۸۴ء تا ۱۴۸۶ء]

سلطان حسن شاہ نے بسترِ مرگ پر اپنے خسر، بڈشاہ کے داماد اور مملکت کے وزیرِ اعظم سید حسن بیہقی کو ہدایت کی کہ تخت پر یا تو آدم خان کے بیٹے فتح خان کو بٹھایا جائے یا بہرام خان

کے بیٹے یوسف خان کو۔ مگر وزیر نے، جو ظاہر ہے کہ جاہ طلبی سے مغلوب تھا، ۸۸۹ھ مطابق ۱۴۸۴ء میں سلطان حسن شاہ اور اپنی ہی بیٹی حیات خاتون کے فرزند شہزادہ محمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ شہزادہ اس وقت سات برس کا بچہ تھا، کیونکہ اس کی ولادت ۱۴۷۷ء مطابق ۸۸۲ھ میں ہوئی تھی۔ بادشاہ کی خردسالی کے باعث سید حسن کی نیابتِ سلطنت نے شدید رقابت کو جنم دیا، جس کے نتیجے میں ناراض عناصر معاندانہ سرگرمیوں پر اتر آئے۔ انہی دھڑوں کی شہ پا کر اور تازی بٹ کی درپردہ سازباز سے فتح خان نے ایک فوج جمع کی اور کشمیر پر حملہ کر دیا۔ جہانگیر ماگرے نے سادات کی بھرپور تائید سے فتح خان کو شکست دے دی۔ دوسری کوشش بھی اسی طرح بے سود ثابت ہوئی۔ ان ناکامیوں کے بعد فتح خان نے جموں پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے کہیں زیادہ زوردار حملہ کیا۔

یہ کوشش بھی بے نتیجہ رہی۔

۱۔ دی انڈین اینٹی کویری (The Indian Antiquary)، جولائی ۱۹۰۸ء، صفحات 190-191۔ ۲۔ تاریخِ کشمیر از ملک حیدر چاڈورہ، صفحہ 189۔

تاہم فتح خان مایوس نہ ہوا۔ وہ ایک بار پھر لشکر لے کر بڑھا۔ اس جنگ میں، جو ۸۹۵ھ (۱۴۸۹ء) میں پیش آئی، جہانگیر ماگرے زخمی ہو گیا۔ اسے میدان سے ہٹنا پڑا اور فتح خان کو مکمل فتح حاصل ہوئی، جس کے نتیجے میں محمد شاہ دو برس سات ماہ کی برائے نام فرماں روائی کے بعد تخت سے دست بردار ہو گیا۔ اس نے اور اس کے رفقا نے فرار میں پناہ ڈھونڈی، مگر بعض زمینداروں یعنی کاشت کاروں نے انھیں پکڑ کر فتح خان کے حوالے کر دیا، جس نے محمد شاہ کو سخت نظربندی میں رکھا۔ راجرز (Rodgers) لکھتا ہے: ”ٹھیک اسی زمانے میں انگلستان میں ایڈورڈ پنجم اور اس کا کم سن بھائی ٹاور (لندن) میں قتل کر دیے گئے۔ فتح شاہ

رچرڈ سوم جیسا برا نہ تھا۔ اس نے حکم دیا کہ شہزادے کا کھانا پینا اس کے اپنے حکم کے مطابق تیار کیا جائے اور اسے محل میں جگہ دی۔"

غالباً ابتدائی زمانے کی اسی پرورش و نگہداشت کے احسان کے صلے میں سلطان محمد شاہ نے فتح شاہ کی میت کو پیر پنجال کے راستے پر بھمبر کے قریب نوشہرہ سے لا کر شایانِ شان تدفین کے ذریعے اس کی آخری آرام گاہ کی تکریم کی۔ یہ بادشاہ اپنے باہمی اختلافات اور معزولیوں کے باوجود ایک دوسرے کے حق میں انسانیت سے دست کش نہیں ہوئے۔

۱۔ لیفٹیننٹ نیوال (Lt. Newall) نے بھی اپنے مضمون اے سکیچ آف دی محمڈن ہسٹری آف کشمیر (A Sketch of the Muhammadan History of Kashmir) میں محمد شاہ کی پہلی معزولی اس کی جلوس نشینی کے دو برس سات ماہ بعد قرار دی ہے۔— جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، نمبر 5، ۱۸۵۴ء، صفحہ 417۔

فرشتہ اس کے برخلاف اسے ۹۰۲ھ (۱۴۹۶ء) میں، یعنی جلوس نشینی کے گیارھویں سال میں، واقع ہوا قرار دیتا ہے۔— برگس، جلد چہارم، صفحہ 486۔ ۲۔ دی اسکوائر سلور کوائنز آف دی سلطانز آف کشمیر (The Square Silver Coins of the Sultans of Kashmir)— جرنل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال، ۱۸۸۶ء، صفحہ 110۔

بلکہ ان کی معزولیاں، اگرچہ بلاشبہ خوں ریزی سے خالی نہ تھیں، فرانس میں وزارتوں کے سقوط یا انگلستان میں کابینہ کی تبدیلیوں سے زیادہ مشابہ نظر آتی ہیں۔

سلطان فتح شاہ (اول) [۸۹۲ھ تا ۸۹۸ھ مطابق ۱۴۸۶ء تا ۱۴۹۳ء]

فتح خان ۱۴۸۶ء میں سلطان فتح شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ توقع کی جا سکتی تھی کہ اب جب تخت پر ایک ایسا نیا بادشاہ آبیٹھا ہے جو تاج کے لیے لڑنے کی ہمت اور قوت رکھتا تھا، تمام باہمی نزاعیں ختم ہو جائیں گی اور سلطنت کے تمام انتشار پسند عناصر قابو میں آ جائیں گے۔

مگر فی الواقع زین العابدین کے جانشین نظم و نسق اور قیادت کی ضروری صلاحیتوں سے محروم تھے۔ فتح شاہ امن و امان کی بحالی کے کام کا اہل نہ تھا۔ اس کی کمزوری نے چکوں کو منظرِ عام پر لا کھڑا کیا۔ اسی سے خود اس کے اقتدار کی بربادی ہوئی اور بالآخر کشمیر میں غالب اور حکمران قوت کی حیثیت سے اس کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

ملک سیف الدین ڈار عرف سیف ڈار بادشاہ کا وزیرِ اعلیٰ تھا۔ اس نے مملکت کے معاملات دانش مندی اور مدبرانہ انداز سے چلائے۔

اسی کی ملازمت میں وہ سخت جان چک، شمس الدین، بھی تھا، جو پہلے پہل سید حسن بیہقی کے بیٹے سید محمد بیہقی کی خدمت میں داخل ہوا تھا، پھر اس نے ملک احمد کے بیٹے ملک نوروز کو اپنا آقا بنایا اور آخرکار سیف ڈار کی ملازمت اختیار کر لی۔ شمس الدین چک نے اپنے چچا حسین چک کی بیٹی سے شادی کی اور اس رشتے سے قوت حاصل کی۔ اس کے بعد وہ سازشوں کی سوداگری کرنے لگا۔

اس نے شنکریا شرنگاریا سرہنگ رینہ اور موسیٰ رینہ کو، جو دونوں بھائی اور کوٹا رانی کے باپ رام چندر کی نسل سے تھے، اپنے ساتھ ملا لیا۔ شمس الدین چک نے انھیں کھلم کھلا سیف ڈار کے حریفوں کی حیثیت سے کھڑا کر دیا۔ فتح شاہ نے بھی اپنی نظرِ عنایت اٹھا لی۔

جلد ہی یہ دھڑے بندی کی کشمکش سیف ڈار اور اس کے ایک حریف سرہنگ رینہ کی موت پر منتج ہوئی۔ شمس الدین چک اپنے آقا سیف ڈار کے حصے کے اقتدار اور انتظام کا وارث بن بیٹھا۔ وہ ایک آقا کے ازالے پر مطمئن نہ تھا۔ اسے سید محمد بیہقی کا کھٹکا لگا رہتا تھا، چنانچہ اس نے اسے کاجی چک اور دوسروں سے ٹکرا دیا۔ سید نے جلد ہی اس نودولت ابھرنے والے کے عزائم بھانپ لیے۔ نتیجتاً اس نے معزول بادشاہ سے سازباز کی اور ابراہیم ماگرے، حاجی پڈر اور موسیٰ رینہ کے بیٹے ملک عیدی رینہ کو بھی اپنی طرف ملا لیا۔ بلبل شاہ کے مزار کے قرب و جوار میں لڑی جانے والی ایک جھڑپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کاجی چک اور شمس الدین چک کامراج کی طرف بھاگ گئے۔ سید محمد نے کچھ دور تک ان کا گرم تعاقب کیا اور واپسی پر ان کے گھر جلا ڈالے۔ فتح شاہ بھی پنجاب کو روانہ ہو گیا۔ شمس الدین چک، جو اب شمس چک کے نام سے زیادہ معروف ہے، انتقام لینے کے لیے واپس آیا۔ لیکن محمد شاہ اور دیگر مخالفوں کو موجود پا کر اس نے کھلی جنگ سے گریز کیا۔ اس نے شب خون مارا اور شکست کھا کر پنجاب میں اپنے سابق آقا، معزول سلطان فتح شاہ سے جا ملا، جو دو برس گیارہ ماہ کی فرماں روائی کے بعد پھر فراری و بے وطن تھا۔

۱۴۸۴ء سے ۱۵۱۶ء تک ۳۲ برس کے عرصے پر محیط محمد شاہ اور فتح شاہ کی یہ کشمکشیں ظاہر کرتی ہیں کہ کشمیر میں تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی تھی۔ یہ دونوں ہمیں ۹۰۶ء سے ۹۳۷ء تک ۳۱ برس پر پھیلی ہوئی پارتھ اور چکرورمن کی ننگ آور کشمکشوں کی یاد دلاتے ہیں۔

یہ گویا کشمیر میں جنگ ہائے گلہائے سرخ و سفید (Wars of the Roses) کا نیا جنم تھا، جو ۱۴۵۵ء سے ۱۴۸۷ء تک ۳۲ برس جاری رہیں، جب انگلستان کے بادشاہ ہنری ششم، ایڈورڈ چہارم اور رچرڈ سوم دھڑوں کے ہاتھوں تخت پر بٹھائے اور اتارے جاتے رہے۔

سلطان محمد شاہ (دوم) [۸۹۸ھ تا ۹۱۱ھ مطابق ۱۴۹۳ء تا ۱۵۰۵ء]

محمد شاہ نے، جو اب سولہ برس کا ہو چکا تھا، اپنے ماموں سید محمد بیہقی کی کوششوں سے اپنا تخت دوبارہ حاصل کر لیا۔ سید محمد بیہقی کی تیز نگاہ سے چکوں کی ابھرتی ہوئی طاقت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے اسی قبیلے کی جانب سے خطرے کا ایک اور امکان ان کے شیعی رجحانات میں دریافت کیا، جن کی میر شمس الدین عراقی نے ان میں کامیابی سے اشاعت کی تھی۔ اس دینی پیشوا کو، جس پر حاکمِ خراسان نے جلاوطنی مسلط کی تھی، کشمیر میں پناہ ملی تھی۔ اس کی تبلیغ ایسی کامیاب رہی کہ خصوصاً چکوں کے تمام بڑے سردار، بلکہ عوام میں سے بھی متعدد لوگ برضا و رغبت اس کے عقائد کے حلقہ بگوش ہو گئے۔

چنانچہ سید محمد بیہقی نے اس کی تبلیغ میں ایک خطرہ محسوس کیا؛ اس کے خیال میں یہ تبلیغ چک مخالفت کی اس آگ میں، جس کی چنگاریاں ابھی سلگ رہی تھیں، مذہبی جوش و خروش بھی شامل کر دیتی۔ اس لیے اس نے میر شمس الدین عراقی کو جلاوطن کر دیا۔ مگر چونکہ یہ قدم بہت تاخیر سے اٹھایا گیا تھا، چکوں نے اپنے دینی پیشوا پر مسلط کی جانے والی اس جبری بے وطنی کو شدت سے محسوس کیا۔ جواباً انھوں نے فتح شاہ اور شمس چک سے سازباز شروع کر دی۔ فتح شاہ اور محمد شاہ ایک بار پھر تحصیل پلوامہ کے مقام کھمپور کے میدانِ جنگ میں آمنے سامنے ہوئے۔ سید محمد بیہقی کی شجاعت پہلے پہل محمد شاہ کے حق میں فتح کا فیصلہ کرتی معلوم ہوئی، مگر بیہقی کے اتفاقاً ایک گھاٹی میں جا گرنے سے پانسا پلٹ گیا۔ حریفوں نے جی کڑا کر کے ہلہ بول دیا اور شاہی افواج کو تتر بتر کر دیا۔ فطری نتیجہ یہ نکلا کہ فتح شاہ نے پھر تخت پر قبضہ کر لیا اور سید محمد بیہقی کے خاندان سے انتقام لیا۔

ملک حیدر چاڈورہ چکوں کی اس روگردانی کا ذمہ دار محمد شاہ کو ٹھہراتا ہے، جس نے اپنی تنگ دلی اور بخل کے سبب موسیٰ رینہ کو اس کی ان جری خدمات کا واجب صلہ نہ دیا جنھوں نے فتح شاہ کی شکست میں بڑی حد تک حصہ لیا تھا۔

۱۵۰۵ء ہی میں پنڈت سری ورا نے سلطان محمد شاہ کے درباری شاعر کی حیثیت سے سلطان کی تہذیبِ ذوق کے لیے ملا عبدالرحمٰن جامی کی یوسف زلیخا کا سنسکرت میں ترجمہ کیا۔ سر اے۔بیری ڈیل کیتھ (Sir A. Berriedale Keith) کی یہ غلط بیانی کہ یہ ترجمہ زین العابدین کے عہد میں لکھا گیا، صفحہ 167 کے حاشیے میں پہلے ہی واضح کی جا چکی ہے۔

سلطان فتح شاہ (دوم) [۹۱۱ھ تا ۹۲۰ھ مطابق ۱۵۰۵ء تا ۱۵۱۴ء]

دوبارہ تخت نشین ہونے پر فتح شاہ نے شمس چک کو اپنا وزیر مقرر کر کے اس کی خدمات کا صلہ دیا اور موسیٰ رینہ کو بھی خاصے اختیارات تفویض کیے۔ شمس چک دربار میں کسی حریف کا وجود گوارا نہ کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے موسیٰ رینہ کی تباہی کے جتن کیے، مگر نتیجہ صرف یہ نکلا کہ وہ خود اسی جال کے پھندوں میں الجھ گیا جو اس نے اپنے حریف کے لیے بچھایا تھا۔ وہ معتوب ہوا، بھرے دربار میں گرفتار کر لیا گیا اور قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ موسیٰ نے ایسے زبردست اور سازشی حریف کا قصہ پاک کرنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ مسلح آدمی شمس چک کو قتل کرنے کے لیے قید خانے میں بھیجے گئے، مگر اس نے حملہ آوروں کی بے رحم ضربوں کے آگے ڈھیر ہونے سے پہلے ان میں سے اچھی خاصی تعداد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔

شمس چک کا یہ کارنامہ حسبِ ذیل شعر میں مشہور ہو گیا ہے—

بچوب و بسنگ و بخشت و عشت حس چک شصت کس را بکشت

[یعنی لاٹھی سے، پتھر سے، اینٹ سے اور ضرب سے ملک شمس چک نے ساٹھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔]

تاہم موسیٰ رینہ اس قدر زیرک آدمی تھا کہ اس قتل کا الزام اپنے سر نہ لیا۔

اس نے بڑی چابک دستی سے یہ الزام ماگرے سرداروں کے سر تھوپ دیا، چنانچہ وہ جلاوطن کر دیے گئے۔

موسیٰ رینہ اس منصب پر فائز ہوا جو شمس چک کے پاس رہا تھا۔ اس کا برسرِ اقتدار آنا میر شمس الدین عراقی کے لیے سکردو سے واپسی کا اشارہ تھا۔ عراقی نے جلد ہی ہندوؤں میں اشاعتِ اسلام کے لیے ایک مذہبی مہم کا آغاز کر دیا اور اس باب میں سلطان سکندر کے وزیر ملک سیف الدین کی تقلید کی کوشش کی۔ شیعوں کے ہاتھوں جاری یہ مذہبی سختیاں موسیٰ رینہ کی جانب سے بلا روک ٹوک ہوتی رہیں اور انہوں نے بجا طور پر ابراہیم ماگرے کے غیظ و غضب کو بھڑکا دیا، جو اب سنیوں کے قائد کی حیثیت رکھتا تھا۔ بادشاہ چونکہ خود کچھ کرنے سے قاصر تھا، اس نے خفیہ طور پر ابراہیم کو اشارہ دیا کہ موسیٰ رینہ سے معاملہ نمٹا لے، چنانچہ موسیٰ رینہ پنجاب کی جانب فرار پر مجبور ہوا۔ گھوڑے پر عجلت اور گھبراہٹ کے عالم میں بھاگتے ہوئے موسیٰ رینہ کی گردن انگور کی ایک بیل میں ایسی بری طرح الجھی اور گھوڑا ایسا بدکا کہ وہ ۱۵۱۸ء میں موقع ہی پر ہلاک ہو گیا۔

اب اقتدار کے مزے لوٹنے کی باری ابراہیم ماگرے کی تھی۔ اس نے ملک عثمان، دانی ملک اور اپنے قبیلے کے ان دیگر افراد کو واپس بلا لیا جن پر پہلے شمس چک کو موت کے گھاٹ

اتارنے کا الزام لگا کر انہیں جلاوطن کیا گیا تھا۔ لیکن چالیس دن گزرنے پر اس نے اپنا منصب ملک عثمان کے لیے خالی کر دیا۔ ملک عثمان بھی تین ماہ بعد دست برداری پر مجبور ہوا۔ وزیروں کی یہ پے در پے تبدیلیاں بادشاہوں کی تبدیلیوں ہی کی طرح تباہ کن تھیں۔ فتح شاہ ایک برائے نام حکمران سے زیادہ کچھ نہ رہ گیا تھا اور کسی وزیر کو دیر تک قائم رکھنے کی قدرت نہ رکھتا تھا۔ وہ اس قدر عاجز آگیا کہ چند مشیروں کے ہمراہ ہندوستان روانہ ہو گیا۔ ابراہیم ماگرے نے اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھایا اور خود کو وزیر مقرر کر لیا؛ پھر اس نے فتح شاہ کو واپس بلا لیا۔ بادشاہ کے حامی کاجی چک اور جہانگیر پادر پنجاب کو سدھار گئے۔ اسی اثنا میں پکھلی کے مقام غازی کوٹ پر محمد شاہ کی فوج فتح شاہ کی فوج سے ٹکرا گئی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ فتح شاہ کی فوج کو پسپا ہونا پڑا۔

ایک سال تک صورتِ حال جوں کی توں رہی، البتہ ابراہیم ماگرے بحیثیت وزیر صاحبِ اختیار رہا۔ پھر ملک عثمان نے، جسے ابراہیم ماگرے نے رہا کر دیا تھا، اس کی جگہ لے لی۔ منصب چھوڑنے پر ابراہیم ماگرے، کاجی چک اور جہانگیر پادر کے ہمراہ، محمد شاہ سے جا ملا۔ بالآخر ایک رینہ سردار کے ہاتھوں نہایت ہوشیاری سے برپا کی گئی بغاوت نے میدان محمد شاہ کے حق میں فیصل کر دیا۔ فتح شاہ کو بارہ برس آٹھ ماہ کی حکومت کے بعد ایک بار پھر راہِ فرار اختیار کرنا پڑی؛ اس عرصے میں بغاوتوں اور وزیروں کی مسلسل تبدیلیوں نے اقتدار اور نظمِ حکومت کی بنیادیں تک کھوکھلی کر دی تھیں۔

سلطان محمد شاہ (سوم) [۹۲۰ھ تا ۹۲۱ھ یعنی ۱۵۱۴ء تا ۱۵۱۵ء]

اگرچہ محمد شاہ کو ابراہیم ماگرے نے تخت پر بٹھایا تھا، مگر وہ پانچ ماہ سے زیادہ تخت پر قائم نہ رہ سکا۔ جب فتح شاہ ایک بڑی فوج کے ساتھ نمودار ہوا تو محمد شاہ آنجہانی وزیر سید محمد بیہقی کے بیٹے سید ابراہیم بیہقی کے ہمراہ بہ حفاظت نوشہرہ چلا گیا۔

سلطان فتح شاہ (سوم) [۹۲۱ھ تا ۹۲۲ھ یعنی ۱۵۱۵ء تا ۱۵۱۶ء]

سلطان فتح شاہ کی حکمرانی کا تیسرا دور ایک سال ایک ماہ کی مدت پر محیط رہا۔ اپنی پرانی مصیبتیں یاد کر کے اس نے تمام شاہانہ اختیارات سے دست کش ہو جانے کا عزم کیا اور ملک کو چار حصوں میں تقسیم کر دیا۔ ان میں سے تین حصے اس نے جہانگیر پادر، کاجی چک اور سنکر رینہ کے حوالے کیے اور صرف ایک حصہ اپنے پاس رکھا، اس امید پر کہ یوں اس کے باقی دن امن و سکون سے بسر ہو جائیں گے۔ لیکن اس کے شریکِ اقتدار جلد ہی اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور انہوں نے محمد شاہ کو، ابراہیم ماگرے سمیت، تخت کے لیے لڑنے کی دعوت دی۔ جو معرکہ پیش آیا اس کا نتیجہ محمد شاہ کے حق میں کسی طور موافق نہ نکلا، کیونکہ ابراہیم ماگرے، جو اس کی قوت کا اصل سہارا تھا، اپنے بیٹوں سمیت مارا گیا۔

محمد شاہ نے اس ہزیمت پر ہمت نہ ہاری۔ اس نے دہلی کے سکندر لودھی سے مدد طلب کی۔ اسی دوران جہانگیر پادر اور سنکر رینہ نے بھی محمد شاہ کا خیر مقدم کیا اور اسے اس قابل بنا دیا کہ فتح شاہ کو نکال باہر کرے۔ فتح شاہ تین برس بعد ۹۲۵ھ یعنی ۱۵۱۹ء میں پیر پنجال کے راستے پر واقع قصبے نوشہرہ میں جلاوطنی کے عالم میں فوت ہوا۔ ”فتح شاہ فنا“ اس کی ہجویہ تاریخِ وفات ہے۔ محمد شاہ نے اس کی میت اس کے باپ آدم خان بن بڈشاہ کے پہلو میں دفن کرائی۔ وہ کلاہ جو میر سید علی ہمدانی (شاہ ہمدان) کا عطیہ تھی، فتح شاہ کی خواہش کے

مطابق اس کے ساتھ ہی دفن کی گئی۔ سلطان فتح شاہ کی قبر گورستانِ بڈشاہ میں واقع ہے۔ فتح شاہ نے مجموعی طور پر سترہ برس حکومت کی۔ پنڈت شُکا فتح شاہ کا ذکر ان سطور پر ختم کرتا ہے: ”عظیم بادشاہ فتح شاہ، جو فرماں رواؤں میں ماہتاب کی حیثیت رکھتا تھا، کشمیر سے باہر ایک ملک میں فوت ہوا۔ محمد شاہ نے جس روز یہ خبر سنی، اس روز نہ کھانا کھایا، نہ سویا، نہ غسل کیا، بلکہ سارا وقت اسی بادشاہ کے خیال میں بسر کیا۔ اس جیسا بادشاہ کہاں ملے گا — جہاں دیدہ، راست گو، صابر، بڑا مدبر، اہلِ کمال کا قدردان اور اپنے خادموں سے محبت رکھنے والا؟ بادشاہ کشمیر سے باہر ایک ملک میں پیدا ہوا اور وہیں فوت ہوا۔ قضا و قدر کی کارفرمائی عجیب ہے! پھر میت ایک ڈولی میں رکھی گئی اور چند ہی دنوں میں اس کے خادم اور سردار اسے یہاں لے آئے تاکہ اس کی آخری تجہیز و تکفین کی جا سکے۔“

نیومزیٹک کرانیکل (Numismatic Chronicle)، جلد ششم، صفحہ 37 میں ”قدیم سکہ ہائے کشمیر“ (The Ancient Coinage of Kashmir) کے عنوان سے مضمون کے مصنف لکھتے ہیں: ”اسی رات سید علی ہمدانی ایک فقیر کے سامنے ظاہر ہوئے اور اسے بتایا کہ یہ کلاہ انہوں نے سلطان قطب الدین کو حصولِ سعادت کے لیے عطا کی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سلطنت بھی باپ سے بیٹے کو منتقل ہوتی ہوئی موجودہ نسل تک پہنچی تھی؛ لیکن چونکہ فتح شاہ اب یہ کلاہ اپنے ساتھ قبر میں لے گیا ہے، اس لیے سلطنت بھی قبر ہی میں جا پہنچی اور اس کے خاندان سے رخصت ہو گئی۔“

محمد شاہ، جس کی عمر اب تقریباً ۳۹ برس، یا قمری مہینوں کے حساب سے ۴۰ برس تھی، کاجی چک کی صلاحیت اور تگ و دو کی بدولت چوتھی بار تخت نشین ہوا۔ اس کی خدمات کے صلے میں بادشاہ نے اسے مدار المہام یعنی وزیرِ اعظم مقرر کیا۔

سلطان محمد شاہ (چہارم) [۹۲۲ھ تا ۹۳۴ھ یعنی ۱۵۱۶ء تا ۱۵۲۸ء]

معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر اب حسد، نفاق، رقابت اور خوں آشامی کی زرخیز زمین بن چکا تھا۔ دھڑے ابھرتے، عارضی طور پر قوت پکڑتے اور امرا میں مسلسل جھگڑوں کا باعث بنتے رہتے۔ کاجی چک امرا کے اس دھڑے کا ہدف بنا جس میں نصرت رینہ، لوہر ماگرے اور جہانگیر پادر شامل تھے۔ تاہم کاجی چک اپنے حریفوں کو شکست دینے اور نصرت رینہ کو قتل کرنے میں کامیاب رہا۔ اس اتحاد کے ٹوٹ جانے پر عبدال ماگرے ملک کو تاراج کرنے لگا، مگر کاجی کے بیٹے مسعود چک کے ہاتھوں راہِ فرار پر مجبور ہوا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد امرا کا ایک اور گروہ — جس میں فتح شاہ کا سب سے بڑا بیٹا سکندر شاہ، جہانگیر پادر، لوہر ماگرے اور عیدی رینہ شامل تھے — اس اعلانیہ مقصد کے ساتھ منظرِ عام پر آیا کہ تخت سکندر شاہ کو دلایا جائے۔

مسعود چک ایک بار پھر اس بغاوت کو فرو کرنے کے لیے روانہ کیا گیا۔ باغیوں کو مسعود چک کی موت کے سوا کوئی قابلِ ذکر کامیابی حاصل نہ ہوئی اور بادشاہ کچھ عرصے کے لیے پھر امن سے رہنے لگا۔ سلطان محمد شاہ ہی کے عہدِ حکومت میں ہندوستان میں مغل سلطنت کے بانی بابر نے اندرونی انتشار سے فائدہ اٹھا کر کشمیر پر حملے کے لیے اپنی فوج بھیجی۔ کاجی چک، جو امورِ سلطنت سے پہلے ہی کنارہ کش ہو چکا تھا، جذبۂ حب الوطنی سے سرشار ہو کر فوج لے کر حملہ آوروں کے مقابلے پر نکلا اور انہیں کاجی چک کی یلغاروں کے آگے پسپا ہونا پڑا۔ اس کامیابی نے کاجی چک کو دوبارہ بادشاہ کا منظورِ نظر بنا دیا۔ لیکن اب کاجی چک نے بادشاہ ہی کو معزول کر کے سلطان محمد شاہ کے بیٹے اور اپنے بھانجے ابراہیم شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔

جلیل القدر عالم شیخ یعقوب صرفی سلطان محمد شاہ کے اسی دورِ حکومت میں ۱۵۲۱ء میں پیدا ہوئے۔ صرفی کی عظمت کا ذکر آگے آئے گا۔

سلطان ابراہیم شاہ اول [۹۳۴ھ تا ۹۳۵ھ یعنی ۱۵۲۸ء تا ۱۵۲۹ء]

فرشتہ کے بیان کے مطابق ابراہیم کے عہد میں عبدال ماگرے، جو اپنے فرار کے بعد بابر کے دربار میں مقیم تھا، پھر منظرِ عام پر آیا۔ وہ ایک بڑی فوج لے کر آیا جس کی قیادت دو مغل امرا، علی بیگ اور محمد خان، کر رہے تھے۔ سکندر خان کے چھوٹے بھائی اور سلطان فتح شاہ کے بیٹے نادر خان کو مہرے کے طور پر استعمال کیا گیا تاکہ کشمیریوں کو یہ گمان نہ گزرے کہ کوئی اجنبی بطور بادشاہ ان پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ سلطان ابراہیم شاہ کی فوج مغل فوج کے مقابلے کے لیے نکلی، لیکن تحصیل بارہ مولہ میں پٹن سے نیچے تاپر کے مقام پر اسے سخت شکست ہوئی اور ابراہیم ملک چھوڑ کر فرار ہو گیا۔

سلطان نازک شاہ (اول) [۹۳۵ھ تا ۹۳۶ھ یعنی ۱۵۲۹ء تا ۱۵۳۰ء]

اس کے بعد نادر خان سلطان نازک شاہ کے لقب سے تخت نشین ہوا اور اس نے عبدال ماگرے کو اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔ مغل فوج کے افسروں کو بھی فیاضی سے نوازا گیا اور وہ بعد ازاں ہندوستان لوٹ گئے۔

عبدال ماگرے کاجی چک کے تعاقب میں لگا رہا، یہاں تک کہ وہ کشمیر سے فرار ہو گیا۔ پھر عجیب بات یہ ہوئی کہ عبدال ماگرے نے محمد شاہ کو، جو لوہ کوٹ میں قید تھا، وہاں سے بلوا کر

دوبارہ تخت پر بٹھا دیا۔ ظاہر ہے کہ نازک شاہ اس بساط کا محض ایک مہرہ تھا؛ اس کا کام پورا ہو چکا تھا اور اب اس کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔

سلطان محمد شاہ (پنجم) [۹۳۶ھ تا ۹۴۳ھ یعنی ۱۵۳۰ء تا ۱۵۳۷ء]

محمد شاہ کی حکمرانی کے پانچویں یعنی آخری دور کو بجا طور پر ماگرے بالادستی کا دور کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ ماگرے سردار ملک عبدال نے منصبِ وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہونے کے بعد کشمیر کو اپنے حامیوں اور با اثر طرف داروں میں بانٹ دیا۔ اس طرح عبدال نے محمد شاہ کو ایک وظیفہ خوار کی ماتحت حیثیت تک گرا دیا۔

اگر کشمیر کے شانِ دار ماضی کا موازنہ اس ابتر حالت سے کیا جائے جس کو وہ اب پہنچ چکا تھا تو حیرت کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ نااہل حکمرانوں کے تسلسل اور جاہ طلب امرا نے — جو باہمی خانہ جنگی اور اس کے جملہ لوازم میں ہمہ وقت مصروف رہتے تھے — ملک کو بیرونی حملہ آوروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔ بابر نے دو بار خاصی کامیابی کے ساتھ اپنے لشکر اس سرزمین پر بھیجے۔ پھر ہمایوں کی رضامندی سے کامران نے ۱۵۳۱ء میں نوشہرہ سے تیس ہزار سواروں پر مشتمل ایک مہم کی قیادت کی۔ اس کے سپہ سالار مہرم بیگ — جسے غلطی سے مجرم بیگ لکھا گیا ہے — اور علی بیگ پیش قدمی کرتے ہوئے سری نگر کے قریب تک جا پہنچے، جہاں سے مہرم بیگ نے کامران کو ایک تہنیتی نظم بھیجی، جس کے حسبِ ذیل اشعار ملک حیدر چاڈورہ نے نقل کیے ہیں:

فہم فے دوس شم آسان شود حم عش یادشا ے خونی دھد نعام دوس فی فتح کہ کہ از گفتا خرد شہر کشمبریح بتار او نم فتح کردم سو ہے کردم سی چو

(نوشہرہ کشمیر جانے والے پیر پنجال کے راستے پر ایک قصبہ ہے، جو بھمبر سے 27 میل شمال اور سری نگر سے 122 میل جنوب مشرق میں واقع ہے۔ قصبے کے وسط میں ایک عمدہ قدیم مغل سرائے ہے جس کا ایک حصہ اب سرکاری رہائش گاہ ہے۔ نوشہرہ میں 511 سپاہیوں کی ایک چھاؤنی بھی ہے۔)

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اگرچہ اس زمانے میں کشمیری امرا ایک دوسرے کے گلے کاٹنے پر آمادہ رہتے تھے، مگر ان میں اپنے وطن کے لیے حب الوطنی کی کوئی کمی نہ تھی۔ اور ذاتی عداوتوں اور شکایتوں کے باوجود وہ ملک کے دفاع کے لیے ایک راندۂ درگاہ سردار کے گرد بھی جمع ہو جانے کی صلاحیت رکھتے تھے۔

اس موقع پر کاجی چک مدد کو پہنچا۔

اس نے تمام ناراض اور مخالف امرا کو یکجا کیا اور اپنی فوجوں کی قیادت ایسی مہارت سے کی کہ مہرم بیگ کو صلح کر کے پسپا ہونا پڑا۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد پھر انتشار پھیل گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کاشغر کے بادشاہ ابو سعید مرزا نے اپنے دوسرے بیٹے سلطان زادہ سکندر خان کو مرزا حیدر دوغلت (Mirza Haidar Dughlat) کے ہمراہ بارہ ہزار سواروں کے لشکر کے ساتھ تبت سے لار کے راستے کشمیر کی تسخیر کے لیے روانہ کیا۔ مرزا حیدر اس سلطان زادے کو اسکندر سلطان لکھتا ہے۔

اس مہم میں اسکندر سلطان کی قسمت نے یاوری کی۔

اس نے دارالحکومت میں فاتحانہ داخل ہو کر اپنے جوہر دکھا دیے۔ فاتح فوج نے لوٹ مار اور غارت گری سے جی بھر کر اپنی ہوس پوری کی۔ طبقاتِ اکبری کے بیان کے مطابق کاشغری

فوج نے "وہ عظیم الشان عمارتیں جو قدیم سلاطین نے تعمیر کی تھیں خاک میں ملا دیں اور شہر اور دیہات کو آگ لگا دی۔" خزانہ لوٹ لیا گیا۔ دفینے ڈھونڈ ڈھونڈ کر قبضے میں لیے گئے۔ تمام سپاہیوں نے مال و زر سے اپنے آپ کو لاد لیا۔ کشمیریوں کا تعاقب کیا گیا اور انہیں قتل یا قید کیا گیا۔ طبقات کے مطابق یہ غول تین ماہ تک قابض رہے۔ اگلی بہار میں کشمیر کے سُن پڑ جانے والے امرا میں ایک نئی روح پھونک دی گئی اور وہ غیر ملکیوں کو اپنی سرزمین سے نکال باہر کرنے کے لیے متحد ہو گئے۔

لیکن اس کوشش میں انہیں نمایاں شکست اٹھانی پڑی جس میں خاصا جانی نقصان ہوا۔ اس شکست سے دل برداشتہ ہوئے بغیر وہ کاجی چک اور عبدال ماگرے کی قیادت میں پھر متحد ہوئے اور حملہ آوروں کو ایسا زچ کیا کہ وہ صلح کی شرائط کی درخواست پر مجبور ہو گئے۔ فرشتہ فتح کسی بھی فریق کے نام نہیں لکھتا۔ مرزا حیدر اس مہم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے (انگریزی ترجمہ، صفحات 437 تا 442) لکھتا ہے: "الغرض خان (ابو سعید خان مرزا) کے نامِ نامی کا خطبہ پڑھا گیا اور اسی نام کا سکہ ڈھالا گیا۔ کشمیر کا محصول، جو مغلوں کا حق تھا، ہم نے وصول کیا۔ محمد شاہ کی ایک بیٹی اسکندر سلطان کے عقد میں دی گئی۔ اور ہر شخص نے اپنے مرتبے کے مطابق سلطان یا ملکانِ کشمیر سے شناسائی پیدا کی۔ مثلاً میں نے محمد شاہ سے ربط قائم کیا۔ مغل دستور کے مطابق ہم ایک دوسرے کو 'دوست' کہا کرتے تھے۔ اسی طرح میر دائم علی (مرزا حیدر کے نائب) اور عبدال ماگرے کے درمیان ربط قائم ہوا ... بابا سارِک مرزا اور کاجی چک کے درمیان ... کثرت سے تحائف اور نذرانوں کا تبادلہ ہوا۔" (صفحہ 441)

مرزا حیدر دوغلت نے کاشغر کے سلطان ابو سعید کو تہنیت کا پیغام بھیجا، جسے کاشغر کے ایک درباری شاعر نے نظم کر دیا:

دوران سلطان سکندر شاہ عادل آں دم از لاف بزدان تادر ور کر عداء در روز ھجا کان ماہ شمان چبارم از روز تاریخ فتحش الق ھس است

اپنے حق میں ایسی سود مند صلح طے کر لینے کے بعد حملہ آور کشمیر سے رخصت ہو گئے۔ کشمیر سے واپسی پر، خود مرزا حیدر کے الفاظ میں، کاشغر کے بادشاہ ابو سعید مرزا نے فطری طور پر نہایت محبت سے اس کا خیر مقدم کیا۔ لیکن مغل اپنے پیچھے ویرانی اور بھوک کے ایسے آثار چھوڑ گئے جنہوں نے اس خطۂ دل کش میں زولچو یا ڈلچہ کی یورش کی یادیں تازہ کر دیں۔ افق پر دو دم دار ستارے نمودار ہوئے۔ قحط بھی پڑ گیا۔

ہزاروں افراد بھوک سے ہلاک ہوئے اور لاکھوں بے گھر ہو گئے۔ تاہم اگلی فصل نے کچھ سہارا دیا اور باقی ماندہ آبادی کو فاقہ کشی سے بچا لیا۔ سلطان محمد شاہ نے بھی بھوک کے خلاف نبرد آزما اپنی مرتی ہوئی رعایا کی دستگیری کی، مگر افسوس کہ وہ ان اصلاحی کوششوں کو جاری رکھنے کے لیے زیادہ عرصہ زندہ نہ رہا۔ محرقہ (ٹائیفائیڈ) کے عارضے میں مبتلا ہو کر وہ ۹۴۳ھ مطابق ۱۵۳۷ء میں ماہ جیٹھ کے روشن پندھرواڑے کی پہلی تاریخ کو، بروز جمعرات، ساٹھ برس کی عمر میں انتقال کر گیا، ”اپنا سارا سونا غریبوں اور محتاجوں میں بانٹ کر“۔ چونتیس برس سے زائد—یا صحیح تر الفاظ میں چونتیس برس، آٹھ ماہ اور دس دن—کے اپنے پُر نشیب و فراز عہدِ حکومت میں اس نے قسمت کے اتنے الٹ پھیر دیکھے جتنے شاید دنیا کی پوری تاریخِ شاہی میں کسی اور بادشاہ کے حصے میں کم ہی آئے ہوں گے۔

سلطان شمس الدین ثانی (۹۴۳ھ تا ۹۴۴ھ مطابق ۱۵۳۷ء تا ۱۵۳۸ء)

شمس الدین ثانی محمد شاہ کا دوسرا بیٹا تھا۔ اپنے باپ کی طرح وہ بھی ایک وظیفہ خوار بادشاہ ہی رہا اور اپنے حد سے زیادہ طاقت ور وزیر کاجی چک کے اشاروں پر چلتا رہا۔ اسے شمس الدین ثانی اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس خاندان کا بانی شاہ میر سلطان شمس الدین اول کہلاتا ہے۔ شمس الدین ثانی کے عہد میں چکوں اور ماگروں کے مابین حسبِ معمول کشمکش جاری رہی، مگر کاجی چک نے اس پر کامیابی سے قابو پا لیا۔

یہ کاجی چک کی دانائی اور دور اندیشی ہی تھی کہ اس نے حکمران خاندان کے ساتھ ازدواجی رشتے استوار کیے۔ اس سفارتی چال کے نتیجے میں بالآخر اقتدار اسی کے خاندان کے حصے میں آیا۔

سلطان اسماعیل شاہ اول (۹۴۴ھ تا ۹۴۵ھ مطابق ۱۵۳۸ء تا ۱۵۳۹ء)

سلطان شمس الدین ثانی کے بعد اس کا بھائی اسماعیل تخت نشین ہوا جو کاجی چک کا داماد تھا۔ کہنہ مشق چک بدستور وزیرِ اعظم کے منصب اور اثر و رسوخ پر قائم رہا، مگر دیگر امرا کے ساتھ اس کے متکبرانہ رویّے نے بالآخر اس کا اثر ختم کر دیا۔ جان بچانے کے لیے وہ گکھڑوں کے پہاڑی علاقے کی طرف بھاگ نکلا، جہاں سے سید ابراہیم بیہقی کی مدد سے واپس آکر اس نے اپنا اقتدار دوبارہ حاصل کر لیا۔ واپسی پر اس نے کشمیر کو تین مساوی حصوں میں تقسیم کیا، جن میں سے دو حصے اس نے سلطان اور سید ابراہیم بیہقی کو سونپے اور تیسرا اپنے پاس رکھا۔ چنانچہ سلطان کی حیثیت میں کوئی تبدیلی نہ آئی اور وہ اپنے بلافصل پیش رووں ہی کی طرح محض ایک وظیفہ خوار رہا۔

جب کاجی چک نے خود کو خاطر خواہ آزاد محسوس کیا تو اس نے پورے کشمیر پر وہ شیعی عقائد نافذ کر دیے جن کی اشاعت میر شمس الدین عراقی نے کی تھی۔ اس معاملے میں اس نے موسیٰ رینہ کا کردار اپنے سر لیا اور میر شمس الدین کا ایک رسالہ تمام رعایا کے لیے بطور ضابطۂ قانون پیش کیا۔

اٹھارہ ماہ کے مختصر عہدِ حکومت کے بعد اسماعیل شاہ اول کا انتقال ہو گیا۔

سلطان ابراہیم شاہ ثانی (۹۴۵ھ تا ۹۴۶ھ مطابق ۱۵۳۹ء تا ۱۵۴۰ء)

اسماعیل اول کے بعد اس کا بیٹا ابراہیم ثانی جانشین ہوا — ابراہیم اول محمد شاہ کا بیٹا تھا۔ ابراہیم شاہ ثانی کا چار ماہ کا مختصر عہدِ حکومت دو قابلِ ذکر واقعات سے عبارت ہے۔ ان میں پہلا واقعہ کاجی چک کا فرار تھا جو دوسروں کے ساتھ اس کے اپنے جابرانہ طرزِ عمل کا نتیجہ تھا۔ دوسرا واقعہ کہیں زیادہ اہمیت کا حامل تھا: یہ بابر کی اولاد کی جانب سے کشمیر کی تسخیر کی تیسری کوشش تھی۔

ماگروں نے کاجی چک سے نجات پانے کے لیے ہمایوں سے مدد طلب کی۔ وہ بادشاہ اس وقت خود شیر شاہ سوری کے ہاتھوں سخت پریشان تھا، تاہم ہمایوں نے مرزا حیدر دوغلت کو ماگروں کی طرف سے کشمیر پر فوج کشی کی اجازت دے دی۔ مرزا حیدر بابر اور کاشغر کے سلطان سعید خان — دونوں کا عم زاد تھا۔ سپاہی ہونے کے علاوہ مرزا ایک عالم بھی تھا اور تاریخِ رشیدی کے مصنف کی حیثیت سے معروف تھا۔ کشمیری اس وقت باہم دست و گریباں تھے، اس لیے کاجی چک کی سرتوڑ مزاحمت کے باوجود مرزا حیدر کو، جو کچھ کہا جا سکتا ہے، آسان فتح حاصل ہوئی۔ کاجی چک شکست کے بعد اتنا زیرک ضرور تھا کہ اپنے حریفوں

کے خلاف مدد کے لیے شیر شاہ سوری کے دربار میں جا پہنچا۔ اسی اثنا میں ابراہیم ثانی کا مختصر عہدِ حکومت اس کی بے وقت موت پر تمام ہوا۔

مرزا حیدر نے ملک کی اس تقسیم میں، جو کاجی چک پہلے ہی نافذ کر چکا تھا، کوئی تبدیلی نہ کی۔ مرزا نے صرف ایک تہائی حصہ اپنے لیے رکھا؛ باقی دو تہائی عبدال ماگرے اور ملک رینہ کے حصے میں آئے، غالباً ان کی خدمات کے صلے میں۔

مرزا حیدر دوغلت

چونکہ اس کتاب میں مرزا حیدر دوغلت کا ذکر متعدد بار آ چکا ہے، اس لیے یہاں، جب کہ ہم اسی دور کی گفتگو کر رہے ہیں جس میں اس نے تاریخِ کشمیر میں اہم کردار ادا کیا، اس کی سوانح پر ایک مختصر نوٹ بے محل نہ ہوگا۔

حیدر محمد دوغلت (یا اوغلت) گورگان چغتائی مغل — یہ اس کا پورا نام تھا — سنہ ۹۰۵ھ مطابق ۱۴۹۹ء (غالباً ۱۵۰۰ء، کیونکہ سنہ ۹۰۵ھ کا آغاز ۸؍ اگست ۱۴۹۹ء کو ہوا تھا) میں تاشقند میں پیدا ہوا، جو اس زمانے میں شاش (یا چاچ) کے نام سے معروف صوبے کا دارالحکومت تھا۔ اس کا باپ محمد حسین گورگان دوغلت اس سے کوئی چھ برس قبل مغلستان اور کاشغر کے برائے نام خان محمود کی طرف سے شاش کا حاکم مقرر ہوا تھا۔ اپنی ماں خوب نگار خانم کی طرف سے مرزا حیدر شہنشاہ بابر کا رشتہ دار تھا؛ خوب نگار یونس خان مغل کی بیٹی اور بابر کی ماں قتلغ نگار خانم کی چھوٹی بہن تھی۔

مرزا حیدر اور اس کی تاریخ کے متعلق یہاں درج معلومات اس مقدمے سے ماخوذ ہیں جو مسٹر نے الیاس (Ney Elias) نے سر ڈینیسن راس (Sir Denison Ross) کے تاریخِ رشیدی

کے انگریزی ترجمے پر لکھا ہے، نیز بابر کی تزک سے۔ راس کا ترجمہ مجموعی اعتبار سے عمدہ ہے، سوائے اس کے کہ بعض عبارتوں کا ترجمہ غلط ہو گیا ہے۔

مرزا حیدر کی زندگی کا آغاز "کشمکش اور مہم جوئی کے ہنگاموں میں" ہوا۔ اس کا باپ — جو ایک غدار اور سازشی آدمی تھا — کابل میں بابر کے خلاف ایک شر انگیز سازش کا مجرم ٹھہرایا گیا تھا، مگر خونی رشتے کی بنا پر معاف کر دیا گیا۔ کچھ عرصے بعد محمد حسین گورگان دوغلت ازبک سردار شاہی بیگ خان، المعروف شیبانی خان، کے اشارے پر قتل کر دیا گیا۔ ۱۵۰۸ء میں، جب مرزا حیدر کی عمر تقریباً نو برس تھی، اس کے باپ کے ایک وفادار دوست نے اسے اپنی سرپرستی میں لے لیا اور بابر کے عم زاد اور زیرِ دست خان مرزا کے پاس پہنچا دیا۔ یہاں حیدر ایک برس مقیم رہا، پھر بابر نے اسے کابل بلا لیا۔

کابل پہنچنے پر مرزا حیدر کو شاہی خاندان کا فرد بنا لیا گیا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ بڑی عنایت کا برتاؤ روا رکھا گیا۔

۹۲۰ھ مطابق ۱۵۱۴ء کے اوائل کا واقعہ ہے کہ مرزا حیدر جوانی کی بلند پروازی سے مغلوب ہو کر بابر کو چھوڑ کر اندجان چلا گیا، جو اس وقت فرغانہ کا دارالحکومت تھا۔ یہاں وہ اپنے عزیز سلطان سعید خان کی ملازمت میں داخل ہوا۔ اسی زمانے کے متعلق بابر لکھتا ہے: "حیدر مرزا خوش نویسی، مصوری، تیر سازی، پیکان اور زہ گیر بنانے میں کمال رکھتا ہے۔ وہ ہر قسم کی دست کاری میں نہایت سلیقہ مند ہے۔ اسے شاعری کا بھی ذوق ہے، اور مجھے اس کا ایک خط موصول ہوا ہے جس کا اندازِ نگارش ہرگز برا نہیں۔" ابوالفضل مرزا کے کمالات میں موسیقی کا اضافہ کرتا ہے۔ اگرچہ اس وقت اس کی عمر صرف پندرہ برس تھی، مرزا حیدر کو بلند منصب پر فائز کیا گیا اور یوں اس کی زندگی کے سب سے سرگرم دور کا آغاز ہوا۔ سلطان

سعید خان کے عہدِ حکومت کے اگلے انیس برسوں میں مرزا نے مختلف حیثیتوں سے، مگر بیشتر ایک سپاہی کی حیثیت سے، اس کی خدمت انجام دی۔

سلطان سعید کی ملازمت کے زمانے میں مرزا حیدر نے پہلے لداخ پر، پھر کشمیر پر، پھر بلتستان پر اور اس کے بعد اصل تبت پر فوج کشی کی۔

لداخ کو زیر کرنے کے بعد تقریباً ۱۵۳۱ء میں برق رفتاری سے پیش قدمی کر کے کشمیر میں داخل ہوا، مگر مرزا کو کشمیر چھوڑنا پڑا۔

بعد ازاں مرزا حیدر نے لہاسہ کی جانب کوچ کیا اور نیپالیوں سے جنگ کی۔ یہ اس کے نمایاں ترین کارناموں میں سے ایک تھا، مگر گھوڑوں کی ہلاکت، رسد کی قلت اور سردی سے پیدا ہونے والی عمومی ابتلا کے باعث اسے واپس پلٹنا پڑا۔ ۱۵۳۴ء کے ابتدائی مہینوں میں وہ لداخ میں ایک محفوظ مقام تک پہنچا۔ معلوم ہوتا ہے کہ لداخ سے وہ سلطان سعید خان کی وفات کے سبب — جو ۱۵۳۳ء میں واقع ہوئی — بدخشاں کے راستے کابل چلا گیا۔

فرغانہ ترکستان کا ایک صوبہ ہے جو بنیادی طور پر بلند سلسلہ ہائے کوہ میں گھری ہوئی ایک وادی پر مشتمل ہے، جس میں سیر دریا اور اس کے معاون دریا بہتے ہیں۔ فرغانہ کا رقبہ ۵۵٬۴۸۳ مربع میل اور آبادی تقریباً ۲۱٬۶۹٬۶۰۰ ہے۔

اس کے بعد مرزا حیدر نے کاشغر کو خیرباد کہا، اپنی خدمات ہندوستان کے مغلوں کے سپرد کر دیں اور لاہور روانہ ہو گیا۔

یہاں مرزا حیدر کا استقبال بابر کے بیٹے مرزا کامران نے کیا، جس نے اسے عزت و وقار کے منصب، یعنی صوبہ پنجاب کی حکومت، پر فائز کیا۔ مرزا حیدر ایک برس لاہور میں مقیم رہا؛ پھر

جب مرزا کامران اور ہمایوں کے مابین اختلافات پیدا ہوئے تو مرزا حیدر ہمایوں کا حامی بن گیا۔ جب شیر شاہ سوری نے ہمایوں کا تعاقب دریائے بیاس تک کیا اور مرزا حیدر لاہور کا حاکم تھا، تو اس نے ہمایوں کو کشمیر فتح کرنے کا مشورہ دیا۔ اسی زمانے میں، مرزا حیدر کے اپنے بیان کے مطابق، کشمیر کے کاجی چک، عبدال ماگرے اور ریگی چک (راس کے ترجمے میں زنگی چک) نے اس سے رابطہ کیا؛ یہ لوگ برسرِ اقتدار سلطان سے برسرِپیکار ہو کر پنجاب میں پناہ گزین تھے۔ انہوں نے کوشش کی کہ مرزا حیدر کے اثر و رسوخ کے ذریعے مغل فوج کا ایک دستہ حاصل کریں تاکہ اپنے ہی ملک پر چڑھائی کر کے ناپسندیدہ حکمران کو نکال باہر کریں۔ یہ منصوبہ مرزا کی رائے میں معقول ٹھہرا۔ کچھ تاخیر کے بعد وہ تقریباً نومبر ۱۵۴۰ء مطابق ۹۴۷ھ میں وادی میں اترنے میں کامیاب ہو گیا۔ مرزا حیدر کا بیان ہے کہ اس نے اس تاریخ کا مادّہ "جلوسِ دار الملکِ کشمیر" سے برآمد کیا۔ اس نے بغیر کوئی وار کیے کشمیر پر قبضہ کر لیا اور یوں فی الفور، عملاً اور حقیقتاً، وادی کا بادشاہ بن گیا۔ تاہم چونکہ ہمایوں کی قسمت کا فیصلہ ابھی معلق تھا، اس لیے مرزا حیدر نے ہمایوں سے اپنی وفاداری کے سبب نہ تو خود کو کشمیر کا بادشاہ قرار دیا اور نہ ہی ہمایوں کو کشمیر کا فرماں روائے اعلیٰ ظاہر کرنا مصلحت کے مطابق سمجھا۔

۲؍ اگست ۱۵۴۱ء کی لڑائی سے شمار کر کے جن دس برسوں پر مرزا حیدر کی نیابتِ سلطنت محیط رہی، ان کے بارے میں اکبر نامہ میں بیان ہوا ہے کہ جب وہ اپنے دشمنوں سے نبرد آزما نہ ہوتا تو خود کو وادی کی بحالی اور اس کے وسائل کی ترقی کے لیے وقف رکھتا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے وادی کو ویرانی اور بربادی کی حالت میں پایا اور اسے کھیتوں کی فراوانی اور شاداب قصبوں والی سرزمین بنا دیا۔ اس نے سرحدوں کو بھی وسعت دی اور اعتدال و انصاف کے ساتھ حکومت کی۔ ابوالفضل لکھتا ہے: "اس (مرزا حیدر) نے ہر طرف سے اہلِ ہنر اور

دست کاروں کو بلوایا اور کشمیر کی ناموری اور خوش حالی کے لیے محنت کی۔ خاص طور پر موسیقی کی خوب مانگ رہی اور طرح طرح کے ساز متعارف ہوئے۔ الغرض ملک کی ظاہری حالت، یعنی اس کی دنیوی کیفیت، نے استحکام حاصل کر لیا۔" تاہم کشمیر کی حکومت سلطان نازک شاہ ہی کے نام پر چلائی جاتی رہی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب ہمایوں ایران میں پناہ گزین تھا۔

تاریخِ رشیدی

کشمیر میں قیام کے انہی برسوں میں مرزا حیدر دوغلت نے اپنی تاریخِ رشیدی تصنیف کی، جو وسطی ایشیا کے مغلوں—یعنی چغتائیوں کی مشرقی شاخ یا اصل مغلوں—کی تاریخ ہے۔ تاریخِ رشیدی کے پہلے حصے کو اس کے فاضل مصنف نے "تاریخِ اصل" یعنی اصل تاریخ کا نام دیا ہے۔ یہ حصہ کشمیر میں ۱۵۴۴ء اور ۱۵۴۵ء میں لکھا گیا اور فروری ۱۵۴۶ء کے لگ بھگ، یعنی کشمیر میں اس کی نیابت کے آغاز کے پانچ برس بعد، مکمل ہوا۔ دوسرا حصہ، جسے مرزا "مختصر" کا نام دیتا ہے، ۱۵۴۱ء–۱۵۴۲ء میں لکھا گیا اور ضخامت میں پہلے حصے سے دوگنا ہے۔ پہلا حصہ دوسرے حصے کی تکمیل کے بعد لکھا گیا، اور اس تاریخ کا نام کاشغر کے حکمران عبدالرشید خان کے نام پر رکھا گیا، جو سلطان سعید خان کا سب سے بڑا بیٹا اور جانشین تھا۔ یہ سلطان سعید خان ہی تھا جس نے مرزا حیدر کو اپنے دوسرے بیٹے اسکندر سلطان کے ہمراہ کشمیر روانہ کیا تھا۔ تاریخِ رشیدی سنہ ۹۴۸ھ (۱۵۴۱ء) پر ختم ہوتی ہے۔

تاریخِ رشیدی "نمود و نمائش یا ادبی ذوق کی تسکین کے لیے" نہیں لکھی گئی؛ یہ ایک سنجیدہ کاوش ہے۔ مصنف کا مقصد بلاشبہ یہ تھا کہ یہ کتاب سب سے بڑھ کر اس زمانے کی واضح

اور مکمل تشریح ہو جس کی تاریخ نویسی کا اس نے بیڑا اٹھایا تھا۔

بابر کو بیک وقت سپاہی، مؤرخ اور خود نوشت نگار کہا گیا ہے۔ اس کے عزیز مرزا حیدر کو بھی بجا طور پر انہی الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ البتہ بابر مرزا حیدر سے بہتر خود نوشت نگار تھا اور بلاشبہ اس سے کہیں بڑا سپاہی بھی؛ دوسری طرف مرزا حیدر کو صاف طور پر بہتر مؤرخ تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ سر ڈینیسن راس کے ترجمۂ تاریخِ رشیدی کے مقدمے میں مسٹر الیاس کہتے ہیں کہ بابر کے ہاں تاریخ اس کی تزک کے ضمن میں آئی ہے، جب کہ مرزا حیدر کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ مسٹر الیاس مزید لکھتے ہیں کہ مرزا نے اپنی نسل اور خاندان کی تاریخ ایک متعین مقصد کے تحت لکھی، اور جب وہ اپنے زمانے تک پہنچا تو اس نے اپنے ذاتی واقعات کو، جن واقعات کو وہ قلم بند کر رہا تھا ان میں ایک کردار اور شریکِ کار کی حیثیت سے، اس طرح پرو دیا کہ ایک دوسرے کی وضاحت کرتے چلے جائیں؛ چنانچہ یہ بات پورے صدق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اس کی زندگی خود تاریخ کا حصہ ہے۔ مرزا نے فارسی میں لکھا، جب کہ بابر نے چغتائی ترکی میں۔

مرزا حیدر بابر سے سولہ برس چھوٹا تھا اور باون برس کی عمر میں پرانی مغل شاہراہ پر سری نگر سے بارہ میل کے فاصلے پر واقع خانپور کے قریب مارا گیا۔ وہ ۱۵۵۱ء میں سری نگر میں دفن ہوا۔ بابر اڑتالیس برس کی عمر میں ۱۵۳۰ء میں، مرزا حیدر سے اکیس برس پہلے، آگرہ میں فوت ہوا اور کابل میں مدفون ہے۔

سلطان نازک شاہ (۹۴۶ھ تا ۹۵۸ھ مطابق ۱۵۴۰ء تا ۱۵۵۱ء)

مرزا حیدر خود کو بادشاہت اختیار کرنے کے لیے خاطر خواہ محفوظ محسوس نہیں کرتا تھا۔ اس نے یہی مناسب سمجھا کہ تخت پر ایک برائے نام بادشاہ بٹھا دیا جائے اور تمام حقیقی اقتدار خود اس کے ہاتھ میں رہے۔ چنانچہ اس نے فتح شاہ کے بیٹے نازک کو تخت پر بٹھایا اور ایک مدت تک عوام کے تقریباً تمام طبقوں کے کامل اطمینان کے ساتھ ملک پر حکومت کی۔

اپنی بھتیجی کی شیر شاہ سوری سے شادی کے بمشکل ایک برس بعد کاجی چک نے اس سے دو ہاتھی اور پانچ ہزار سوار حاصل کیے، جن کی کمان حسین خان شروانی اور عادل خان (یا اکبرنامہ کے مطابق علاول خان) کے ہاتھ میں تھی، اور کشمیر پر چڑھائی کر دی۔ مگر اب کاجی چک نے کشمیر کو پہلے سے زیادہ مضبوط اور بیرونی حملے کے مقابل اپنے دفاع کے زیادہ قابل پایا، چنانچہ وہ میدان ہار گیا۔ مرزا حیدر کے الفاظ میں: ”پیر کے دن ۸ ربیع الثانی ۹۴۸ھ کو نمازِ ظہر کے وقت (۲ اگست ۱۵۴۱ء، نہ کہ ۲۰ ربیع الثانی مطابق ۱۶ اگست، جیسا کہ بیورج (Beveridge) کے ترجمۂ اکبرنامہ، جلد اول، صفحہ 403 میں درج ہے) ہم نے صرف تین سو آدمیوں کے ساتھ پانچ ہزار سواروں اور کئی ہزار پیادوں کے لشکر کو شکست دے کر بھگا دیا۔“ کشمیر کے خطیب مولانا جمال الدین محمد یوسف کے تصنیف کردہ قطعۂ تاریخ ”فتحِ مکرر“ (۹۴۸ھ مطابق ۱۵۴۱ء) سے مرزا حیدر کی فتح کی تاریخ برآمد ہوتی ہے۔

”مکرر فتح“ سے مراد مرزا حیدر کی وہ سابقہ کامیاب چڑھائی ہے جو اس نے کاشغر کے حکمران سلطان سعید خان کے کارندے کی حیثیت سے کشمیر پر کی تھی (نیز دیکھیے تاریخِ رشیدی کا انگریزی ترجمہ از راس (Ross)، صفحہ 485)۔

دو سال بعد ریگی چک نے بغاوت کی اور شکست کھا کر ملک سے فرار ہو کر کاجی چک سے جا ملا۔ پھر دونوں نے اپنی افواج یکجا کیں اور از سرِ نو کشمیر پر چڑھائی کی۔ مرزا حیدر نے ایک بار

پھر انھیں ایسی عبرت ناک شکست دی جس نے کاجی چک کی موت کو قریب تر کر دیا؛ اس کی تاریخِ وفات "فوتِ سردار" کے الفاظ میں مضمر ہے، یعنی ۹۵۱ھ مطابق ۱۵۴۴ء۔

حریفوں کے اندیشوں سے یکسر آزاد ہو کر مرزا حیدر نے سلطان زین العابدین کے عہد کی صنعتی عظمت کے احیا کی کوشش کی۔ اپنی فتوحات کے ذریعے اس نے تبتِ خرد، پکھلی، راجوری اور کشتواڑ کو دوبارہ سلطنتِ کشمیر میں شامل کر دیا۔ مزید برآں اس نے ان صنعتوں کے احیا اور از سرِ نو قیام کے لیے، جن کی بدولت کشمیر نے اپنا نام پیدا کیا تھا، طرح طرح کی تدابیر اختیار کیں۔

مملکت داری میں بھی اس نے اسی نامور فرماں روا کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کی اور رعایا کے تمام طبقوں سے مساوی سلوک روا رکھ کر اپنے مقصد میں بڑی حد تک کامیاب رہا۔ اس نے رائے عامہ کو کامیابی سے ہم آہنگ کیا اور ان لوگوں کے تحفظات کو دور کیا جو اسے ایک اجنبی خیال کرتے تھے۔ لیکن بد قسمتی سے یہ امن زیادہ دیر قائم نہ رہ سکا۔

صحیح ہو یا غلط، مرزا حیدر کے ذہن میں یہ خیال جاگزیں ہو گیا کہ ملک میں رائج مذہبی تفرقہ ہی ان تمام سازشوں اور نزاعوں کا واحد سبب ہے جنھوں نے کشمیر کی ترقی کو گہنا رکھا تھا۔ کاجی چک اور اس کے رفیقوں کی یورشوں سے پیدا شدہ فتنہ اس کے سامنے تھا۔ مرزا نے یہ بھی محسوس کیا کہ نئے شیعی مسلک کے پیرو تمام رجعت پسندانہ اقدامات میں نمایاں رہے ہیں۔ ابوالفضل کے الفاظ میں "مرزا نے عدل کے قوانین سے، جو 'نگہبانِ سلطنت' ہیں، تجاوز کیا اور تدبر و بردباری کو، جو سعادت کے دو بازو ہیں، اپنے ہاتھ سے جانے دیا۔" چنانچہ اس نے اس نئے مسلک کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا عزم کر لیا؛ یہی اس کے بدلے ہوئے رویے اور بدلے ہوئے طرزِ عمل کا سبب تھا۔ اس کا ملک ریگی چک سے جھگڑا ہوا، جس

کے زوال کو ملک عیدی رینہ اور حسین مگرے کے دھڑوں نے تیز تر کر دیا۔ انھوں نے پہلے پہل مرزا حیدر کی مدد کی، لیکن بعد ازاں سارے کشمیر کو مرزا حیدر کے ظلم و جبر اور زیادتیوں کی داستانوں سے بھر دیا۔ کیا تعجب کہ اس واقعے نے مرزا کو برافروختہ کر دیا اور شیعہ مسلک کے تمام پیروؤں کے خلاف اس کے معاندانہ رویے کو اور بھی پختہ کر دیا۔ میر شمس الدین عراقی کے فرزند میر دانیال کو، حسن کی روایت کے مطابق، ایک سال کی اسیری کے بعد قاضی ابراہیم اور قاضی عبدالغفور کے فتوے پر قتل کر دیا گیا (اکبر نامہ، فارسی متن، کلکتہ، ۱۸۷۷ء، جلد اول، صفحہ 199)۔ اس طرح اس نوجوان کی افادیت سے معمور اُبھرتی ہوئی زندگی کا بے دردی سے خاتمہ کر دیا گیا۔ دانیال کی تاریخِ وفات دردناک طور پر ''دشتِ کربلا'' (۹۵۷ھ مطابق ۱۵۴۹ء) ہے۔ زڈی بل میں میر شمس الدین عراقی کی قبر کی بے حرمتی کی گئی، اور اسی بنا پر میر شمس کا جسدِ خاکی چاڈورہ منتقل کیا گیا۔ ملک عیدی رینہ، حسین مگرے، ملک محمد ناجی اور خواجہ حاجی بندے نے ایک دھڑا تشکیل دیا—جسے غالباً اسلام شاہ سوری کی پشت پناہی بھی حاصل تھی—جسے کچل دینا مرزا نے اپنا فرض جانا۔

مرزا کے عم زاد قرا بہادر خان کو مغلوں اور کشمیریوں کی مشترکہ فوج کے ساتھ ان کے مضبوط ٹھکانے محمد کوٹ کو زیر کرنے کے لیے روانہ کیا گیا؛ یہ مقام غالباً راجوری کے آس پاس، خان پور یا آوان پور سے اوپر کے پہاڑی خطے میں واقع تھا۔ وہاں پہنچ کر قرا بہادر خان نے دیکھا کہ کشمیری متزلزل اور امرا بدظن ہیں۔ چنانچہ اس نے مرزا حیدر کو ان اقدامات کی حماقت سے خبردار کیا جن کا اس نے آغاز کر رکھا تھا۔ لیکن مرزا حیدر نے محسوس کیا کہ جو قدم وہ اٹھا چکا ہے اس سے اب رجوع ممکن نہیں، چنانچہ اس نے حملے کا حکم دیا جس کا انجام نہایت تباہ کن ہوا۔ قرا بہادر خان اور اس کے ہمراہی کشمیریوں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے۔ اس ناکامی سے مشتعل ہو کر مرزا نے قرا بہادر خان کی رہائی کے لیے شب خون مارنے

کا عزم کیا، کہ اسی اثنا میں خود اس کے اپنے سلاح بردار شاہ نذیر کا ایک تیر اسے جا لگا جو مہلک ثابت ہوا۔ تاہم ملک حیدر چاڈورہ کا بیان ہے کہ جس وقت مرزا قلعے کے دروازے میں داخل ہو رہا تھا، ایک قصائی نے — یا ایک اور روایت کے مطابق کمال ڈلی نے (جس کا نام ابوالفضل اور نظام الدین کے نسخوں میں غلطی سے کمال ڈبی لکھا گیا ہے)، جو اتفاقاً دروازے پر موجود تھا — اسے للکارا۔ کشمیری زبان سے مرزا کی ناواقفیت اس کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔ ڈلی نے اس کے اجنبی لہجے سے بھانپ لیا کہ وہ مغل ہے اور اپنا بھاری کلہاڑا اس پر دے مارا۔ لیکن چونکہ مرزا حیدر کی نعش پر صرف تیر ہی کا زخم نمایاں بتایا جاتا ہے، اس لیے قوی قیاس یہی ہے کہ ایک تاریک ابر آلود رات میں شاہ نذیر ہی نے غلطی سے اپنے آقا کو مار ڈالا۔ (بعض مصنفین قرا بہادر خان کو مرزا حیدر کا بھائی اور بعض اس کا بھتیجا قرار دیتے ہیں۔ پنڈت توکا اسے ایک جگہ ہمایوں کا بیٹا اور دوسری جگہ مرزا حیدر کا خادم لکھتا ہے۔ خود ابوالفضل اکبر نامہ (فارسی متن، جلد اول، صفحہ 138) میں اسے حیدر کا برادر کہتا ہے؛ نیز دیکھیے بیوریج (Beveridge) کا انگریزی ترجمہ، جلد دوم؛ برگز (Briggs)، جلد چہارم، صفحہ 508؛ ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخِ کشمیر، صفحہ 188؛ نیز لیفٹیننٹ نیوال (Lieut. Newall) کا مضمون ”کشمیر کی محمڈن تاریخ کا خاکہ“، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، جلد 23، نمبر 5، ۱۸۵۴ء، صفحہ 424۔) نے الیاس (Ney Elias) کا کہنا ہے کہ جس مقام پر مرزا کام آیا وہ ”ضرور دریائے جہلم پر بارہ مولا کے قریب کہیں رہا ہو گا۔“ یہ درست نہیں۔ مرزا حیدر پرانی شاہراہِ مغلیہ پر خان پور کے قریب کام آیا۔ خان پور کو کشمیری ”کھام پور“ تلفظ کرتے ہیں اور یہ تحصیل پلوامہ میں واقع ہے۔ خان پور اب ایک سو نفوس کی چھوٹی سی بستی ہے اور سری نگر سے تقریباً بارہ میل کے فاصلے پر ہے۔

فتنے کی جو آگ اس طرح بھڑکائی گئی تھی وہ اپنا پورا خراج وصول کیے بغیر نہ بجھ سکی۔ ملا قاسم، ملا باقی، ملا عبداللہ سمرقندی، محمد ناگر اور مرزا حیدر کا رضاعی بھائی یوسف مرزا — جو مرزا کے سرکردہ اور شجاع ترین امرا میں سے تھے اور جنھوں نے بالترتیب تبتِ خرد، پکھلی، منگلی (مانسہرہ اور ایبٹ آباد کے درمیان) اور کشتواڑ فتح کیے تھے — وہ بھی اس پالیسی کی بھینٹ چڑھ گئے جس کا مقصد کشمیر میں شیعوں کا مکمل استیصال تھا۔ اس پالیسی کا بانی خود بھی کام آیا۔ حیدر کی تاریخِ وفات، یعنی ۹۵۸ھ (اکتوبر ۱۵۵۱ء)، حسبِ ذیل قطعۂ تاریخ میں بیان ہوئی ہے:

شہ گرگان مرزا حیدر شہادت زدہ کوس شاہی

کہا جاتا ہے کہ باغیوں نے مرزا حیدر کی نعش کی بے حرمتی کا ارادہ کر لیا تھا۔ مرزا حیدر کا جسدِ خاکی نہ تو خان پور میں، جہاں وہ کام آیا، دفن ہو سکا اور نہ آوان پور میں (جس کی آبادی 221 نفوس ہے اور جو اب تحصیل بڈگام میں ہے)، جہاں بظاہر ایک معرکہ بھی پیش آیا تھا۔ یہ دونوں مقامات چاڈورہ (آبادی 1,064، تحصیل بڈگام) سے، جو معروف شیعوں کا مسکن ہے، صرف دو میل کے فاصلے پر ہیں۔ لیکن جب باغیوں نے دیکھا کہ ان کے سنی مسلک کے حلیف مزاحمت پر تلے ہوئے ہیں تو انھیں پسپا ہونا پڑا۔ تاہم انھوں نے اپنے انتقام کا نشانہ مرزا کی اولاد کو بنایا۔ فرشتہ اس نکتے پر خاموش ہے، لیکن ملک حیدر چاڈورہ (صفحہ 188) کا دعویٰ ہے کہ مرزا قرا بہادر خان کی معیت میں مرزا حیدر کے اہلِ خانہ، اس کے بیٹوں اور دیگر افراد کو باعزت طور پر ان کے وطن کاشغر جانے کی اجازت دی گئی اور ان کے مال و اسباب کو ہاتھ تک نہ لگایا گیا۔ چاڈورہ کا یہ بیان کلی طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا، کیونکہ وہ خود بھی شیعہ مسلک کا پیرو تھا۔ یہ بات بعید از قیاس نہیں کہ فتح کے نشے میں اور تعصب سے مغلوب

ہو کر چکوں نے وہ فیاضانہ سلوک نہ کیا جو مطلوب تھا۔ حسن سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد بیہقی کو ایک ماہ تک مرزا کی قبر کی نگہبانی کرنا پڑی تاکہ چک اس کی بے حرمتی نہ کر سکیں۔ طبقاتِ اکبری کے مطابق مرزا حیدر کے مغل پیروؤں کا بقیہ حصہ بھاگ کر اندر کوٹ پہنچا جہاں مرزا کی بیوی خانم اور اس کی بہن خانجی مقیم تھیں۔ مغلوں نے مورچہ بندی کر لی، لیکن مرزا کی بیوی اور بہن نے مغلوں سے کہا: ”جب مرزا حیدر ہم سے رخصت ہو چکا ہے تو بہتر یہی ہے کہ کشمیریوں سے صلح کر لی جائے۔“ اندر کوٹ کا تمام مال و اسباب فاتحین اٹھا لے گئے۔ مرزا حیدر کا جسدِ خاکی سری نگر میں بڈشاہ اور دیگر کی قبروں کے احاطے سے باہر مدفون ہے۔ ۱۸۲۳ء میں سیاح ولیم مورکرافٹ (William Moorcroft) کے ایما پر اس قبر کی مرمت کی گئی اور مورکرافٹ کے وابستہ کار عزت اللہ خان نے اس پر ایک کتبے والی سنگی لوح نصب کرائی۔ مرزا حیدر دوغلت شمشیر و سناں کے ساتھ کشمیر میں داخل ہوا تھا، لیکن اس نے اپنی فرماں روائی کا خاتمہ مذہبی فتنے کی آگ سے کیا اور خود بھی اسی میں جل کر بھسم ہو گیا۔

(انگریز سیاح ولیم مورکرافٹ لنکاشائر میں تقریباً ۱۷۷۰ء میں پیدا ہوا۔ اس نے لیورپول میں طب کی تعلیم پائی اور پھر علمِ بیطاری کی طرف متوجہ ہوا، جس کی بعد ازاں اس نے لندن میں مشق کی۔ بیطاری کے سلسلے میں وہ کچھ عرصے کے لیے فرانس گیا اور پھر لندن لوٹ آیا۔ ذاتی حالات سے مجبور ہو کر وہ ۱۸۰۸ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے بنگال اصطبل کا انسپکٹر مقرر ہوا۔ اسی حیثیت میں اس نے ترکمان گھوڑوں کی کھیپ حاصل کرنے کے لیے وسطِ ایشیا کا سفر اختیار کیا، کیونکہ وہ بلخ اور بخارا کے ترکمان گھوڑوں کو عربی نسل سے برتر سمجھتا تھا۔ کیپٹن ولیم ہرسی (William Hearsey)—جو بعد میں جنرل سر جان کہلایا—کے ہمراہ وہ ۲۶ مئی ۱۸۱۲ء کو پہاڑوں کے اندر واقع جوشی مٹھ سے روانہ ہوا۔ سرحدی درۂ نیتی عبور

کر کے وہ دونوں دریائے سندھ کی بالائی مرکزی شاخ پر اس کے منبع کے قریب پہنچے اور ۵ اگست کو مقدس جھیل مانسروور پر وارد ہوئے۔ بھوٹان کے راستے واپسی پر گورکھوں نے اسے کچھ عرصہ روکے رکھا اور وہ نومبر میں کلکتہ پہنچا۔ مورکرافٹ اکتوبر ۱۸۱۹ء میں دوسرے سفر پر روانہ ہوا۔ ۱۴ اگست کو دریائے بیاس (ہائی فیسس) کا منبع دریافت ہوا اور بعد ازاں دریائے چناب کا۔ ۲۴ ستمبر کو وہ لداخ کے دار الحکومت لیہہ پہنچا اور حکومتِ لداخ سے ایک تجارتی معاہدہ طے پایا جس کی بدولت پورا وسطِ ایشیا عملاً برطانوی تجارت کے لیے کھل گیا۔ وہ ۳ نومبر ۱۸۲۲ء کو کشمیر، ۲۴ جون ۱۸۲۴ء کو جلال آباد، ۳۰ جون کو کابل اور ۲۵ فروری ۱۸۲۵ء کو بخارا پہنچا۔ افغان ترکستان کے مقام اندخوئی پر مورکرافٹ کو بخار نے آلیا، جس سے وہ ۲۷ اگست ۱۸۲۵ء کو چل بسا اور بلخ کی فصیل سے باہر دفن ہوا۔ اس کا رفیقِ سفر جارج ٹریبک (George Trebeck) — کلکتہ میں مقیم ایک لندنی وکیل کا بیٹا، جو جغرافیائی یادداشتوں کی تیاری سے دلچسپی رکھتا تھا — اس کے بعد صرف چند دن زندہ رہا۔ لیکن ابے ہک (Abbé Huc) کے مطابق مورکرافٹ ۱۸۲۶ء میں لہاسا پہنچا اور وہاں بارہ برس مقیم رہا، اور ۱۸۳۸ء میں ہندوستان واپسی کے سفر میں قتل کر دیا گیا۔ ۱۸۴۱ء میں مورکرافٹ کے کاغذات ایشیاٹک سوسائٹی نے حاصل کیے اور ایچ ایچ ولسن (H. H. Wilson) کی ادارت میں ”ہندوستان اور پنجاب کے ہمالیائی صوبوں، لداخ و کشمیر، پشاور، کابل، قندوز اور بخارا کے اسفار، ۱۸۱۹ء تا ۱۸۲۵ء“ کے عنوان سے شائع ہوئے۔ [ماخوذ از انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، چودھواں ایڈیشن، لندن، ۱۹۲۹ء، جلد 15، صفحہ 782] مسٹر ایچ ایل او گیرٹ (H. L. O. Garrett) ایشیاٹک ریویو بابت اکتوبر ۱۹۴۱ء (صفحہ 785) میں لکھتا ہے: ”غالب گمان یہ ہے کہ وہ ایک خفیہ اطلاعاتی افسر تھا جسے سرزمین (وسطِ ایشیا) کی ٹوہ لینے کے لیے بخارا بھیجا گیا تھا۔“)

اکبر نامہ (فارسی متن، جلد اول، صفحات 329-30) سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمایوں نے کشمیر پر حملے کا عزم کر لیا تھا — ایک ایسا ارادہ جو برسوں سے اس کے دل میں پرورش پا رہا تھا۔ تاہم اس کے امرا نے اسے غیر دانش مندانہ خیال کیا۔ ہمایوں نے قرآن سے فال لی۔ اتفاق سے حضرت یوسف علیہ السلام کا قصہ سامنے آیا۔ درباری خواجہ حسین مروی نے عرض کیا کہ کشمیر کو کنویں یا قید خانے سے تشبیہ دی گئی ہے، جیسا کہ حضرت یوسف (علیہ السلام) کا مقدر ہوا تھا۔ چنانچہ ہمایوں وادی پر حملے کا ارادہ ترک کرنے پر مجبور ہو گیا۔ اگر درباریوں کو کشمیر پر حملہ مطلوب ہوتا تو وہ یقیناً اس فال کی تعبیر حضرت یوسف کی بعد کی فرماں روائیِ مصر سے بھی کر سکتے تھے!

مرزا حیدر کی وفات کے بعد اقتدار عیدی رینہ (یا رینا) کے کندھوں پر آ پڑا، جو مدت سے اس کا آرزو مند تھا۔ اس کے عہد میں ہیبت خان نیازی نے کشمیر پر حملہ کیا؛ اسے شیر شاہ سوری کے بیٹے اور جانشین سلیم شاہ سوری نے، نیازی کے سلیم شاہ سوری سے اپنے جھگڑے کی رفع دفع کے بعد، مامور کیا تھا۔ سپہ سالار دولت چک نے دشمن کو پسپا کر دیا اور اپنے کارناموں سے نام پیدا کیا۔ پھر عیدی رینہ اور دولت چک کی قیادت میں دیگر چکوں کے درمیان اقتدار کی سخت کشمکش شروع ہوئی۔ عیدی رینہ کے بیشتر حامیوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ سید محمد ابراہیم بیہقی اور حسین مگرے، جو وفادار رہے، دولت چک کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ عیدی رینہ کی جماعت کے اس انتشار کا ناگزیر نتیجہ وہ شکست تھی جس کا انجام بالآخر ۱۵۵۱ء میں سری نگر میں عیدی رینہ کی موت اور چکوں کے غلبے کی صورت میں ہوا۔

یہ غلبہ قطعی طور پر ان کے حصولِ اقتدار کے آغاز کی نشان دہی کرتا ہے۔ دولت چک نے تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے کر سید محمد ابراہیم بیہقی اور حسین مگرے کو رہا کر دیا اور انھیں اپنا مشیر بنا لیا۔ (لیفٹیننٹ نیوال کا بیان ہے کہ اس جماعت کے قائدین کاجی چک کے بیٹے غازی خان، حسین خان اور علی خان تھے — جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، نمبر 5، ۱۸۵۴ء، صفحہ 424۔ سلیم شاہ سوری کی ایک کشمیری بیوی تھی جس سے اس کی ایک بیٹی تھی۔ بیوی اور بیٹی بیرم کے قافلے کے ساتھ حج کو روانہ ہوئیں۔ بیرم راستے میں ایک افغان کے ہاتھوں مارا گیا — اکبر نامہ، انگریزی ترجمہ از بیوریج، جلد دوم، صفحہ 201۔) اس کا اقتدار اس درجہ مستحکم ہو چکا تھا کہ اس نے ۱۵۵۱ء میں سلطان نازک شاہ کو باقاعدہ تخت سے اتار دیا۔

سلطان اسماعیل شاہ ثانی [۹۵۸ھ تا ۹۶۱ھ مطابق ۱۵۵۱ء تا ۱۵۵۴ء]

اگلی جانشینی کے بارے میں فرشتہ کا بیان ملک حیدر چاڈورہ سے مختلف ہے۔ فرشتہ کا دعویٰ ہے کہ نازک شاہ کے بعد اس کے بیٹے ابراہیم کو تخت پر بٹھایا گیا، لیکن صرف پانچ ماہ کی حکمرانی کے بعد اسے معزول کر دیا گیا، اور اسماعیل شاہ ثانی کو، جو ابراہیم شاہ اول کا بیٹا اور سلطان محمد شاہ کا پوتا تھا، بادشاہی پر فائز کیا گیا۔ فرشتہ نازک شاہ کے بیٹے ابراہیم کو ابراہیم [ثانی] کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

دولت چک نے نہایت جابرانہ انداز میں اپنی مرضی اور شیعی عقائد ملک پر مسلط کیے اور مسجدوں کے ائمہ کو موت کی دھمکی دے کر مجبور کیا کہ وہ جمعے کے خطبوں میں شیعوں کے بارہ اماموں کے نام پڑھیں۔ لیکن اس کا غلبہ زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ غیر مرکزی بادشاہت کے ان

ایام میں سازش کشمیری امرا کے مزاج کا جزوِ لاینفک بن چکی تھی اور اس میں ذات اور مسلک کی کوئی تمیز روا نہ رکھی جاتی تھی۔ غازی چک اور دولت چک، اگرچہ دونوں شیعہ تھے، ایک دوسرے سے سخت برسرِپیکار تھے، کیونکہ مؤخر الذکر نے کاجی چک کی بیوہ، یعنی غازی چک کی ماں، سے نکاح کرنے کی جسارت کی تھی۔

دولت چک کو فرار ہونا پڑا، لیکن ایک گڈریے نے اسے پکڑ کر غازی چک کے سپاہیوں کے حوالے کر دیا اور وہ قتل کر دیا گیا۔ دولت کی شجاعت اور قوت کے کارناموں کی بہت سی حکایتیں بیان کی جاتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ایک بار اس نے چوبیس گز لمبا اور دو گز موٹا ایک گرتا ہوا شہتیر ایک ہاتھ سے تھام لیا تھا۔

دہلی میں قیام کے دوران اس نے شیر شاہ سوری کی موجودگی میں ایک ہاتھی کو دُم سے پکڑ لیا اور وہ جانور اپنی جگہ سے ہل نہ سکا۔ دولت چک کے بارے میں یہ کارنامہ بھی منسوب ہے کہ اس نے غیر معمولی فاصلے تک تیر چلایا۔

جوں ہی دولت چک کا ستارہ گردشِ زوال میں آیا، اسماعیل کے عہدِ حکومت کا بھی خاتمہ ہو گیا۔

برگز (Briggs)، جلد چہارم، صفحات 505-06۔

لیفٹیننٹ نیوال (Lieut. Newall)، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، نمبر 5، ۱۸۵۴ء، صفحہ 424۔

شاہ میری خاندان کے آخری فرمانروا [۹۶۱ھ تا ۹۶۲ھ یعنی ۱۵۵۴ء تا ۱۵۵۵ء]

غازی چک نے اسماعیل شاہ کے بیٹے کو معزول کر کے تخت پر حبیب شاہ کو بٹھایا، جو اسماعیل شاہ ثانی کا بیٹا اور سلطان محمد شاہ کا پوتا تھا۔ حبیب شاہ بھی، ۹۴۵ھ کی عارضی تخت نشینی کی مانند، اپنے اقتدار کے لیے کاجی چک کا مرہونِ منت تھا، جس کے اس اقدام کے پس پردہ خود اس کے اپنے مفادات کارفرما تھے۔ تاریخ میں حبیب شاہ اپنے خاندان کا آخری فرمانروا قرار پایا، اگرچہ عجیب بات یہ ہے کہ اسے توقع تھی کہ اس کے خاندان کے مزید افراد اس کے بعد تخت نشین ہوں گے، جیسا کہ یہ کتبہ ظاہر کرتا ہے:

در زیارت روضۂ اجداد شود سلطان حبیب ... عنقریب

... روضہ ... نصیب ... نوشنیدم از سروش گاہ تعمیر ...

سال ... سلطان حبیب

محمد شاہ اور فتح شاہ کے زمانے ہی سے شاہ میرِ اعظم کی اولاد محض برائے نام حکمران رہ گئی تھی، جنہیں برسرِ اقتدار امیر اپنی خواہش کے مطابق تخت پر بٹھاتے یا اتار دیتے تھے۔ تاہم چکوں نے ابتدا میں بادشاہت پر قبضے کے کوئی عزائم نہ پالے تھے، یہاں تک کہ حبیب شاہ کی تخت نشینی کا مرحلہ آیا۔ اب بظاہر یہی ان کا مقصود ٹھہرا اور اس کے حصول کے لیے انہوں نے اپنی جان و مال کی بازی لگا دی۔

غازی چک اب اپنی حکمتِ عملی کو عملی جامہ پہنانے میں لگ گیا۔

اس نے آغاز اس طرح کیا کہ سلطان پر طرح طرح کی بدکرداریوں اور غالباً بے وفائی کے افعال کے الزامات عائد کیے۔ سلطان کچھ کہنے یا کرنے سے یکسر قاصر تھا۔ آخرکار ایک روز بھرے دربار میں غازی چک کے بھائی علی چک نے بادشاہ کے سر سے تاج اتار کر اپنے بھائی

کے سر پر رکھ دیا۔ درباریوں نے غازی چک کو اپنا فرمانروا تسلیم کر کے اس کی تہنیت کی۔ حبیب شاہ کو تخت سے ہٹا کر قید میں ڈال دیا گیا۔

یہ سب کچھ ۹۶۳ھ (۱۵۵۵ء) میں پیش آیا۔

تاریخِ کشمیر کا یہ واقعہ تاریخِ انگلستان کے اس واقعے سے کچھ مختلف نہیں، جب اس سے ستر برس قبل بوسورتھ کے میدان (۲۲ اگست ۱۴۸۵ء) میں رچرڈ سوم کے سر سے گرایا جانے والا تاج ہنری ارلِ رچمنڈ کو پیش کیا گیا جو ہنری ہفتم کے لقب سے تخت نشین ہوا۔ کشمیر میں شاہ میری خاندان کی معزولی پر ماتم کا کوئی جواز نظر نہیں آتا۔ اس کے حکمران بالکل بے حس اور ناکارہ ہو چکے تھے۔ ان میں اقدام کی صلاحیت اور حکمرانی کی اہلیت جیسی بنیادی صفات کا افسوسناک حد تک فقدان تھا۔ ان میں کردار کی کمزوری بھی نمایاں تھی، چنانچہ وہ اپنا مقام برقرار رکھنے کے قابل نہ رہے تھے۔ یہ محض رحمتِ ایزدی تھی، یا یوں کہیے کہ چکوں کی جھجک، کہ انہیں چک غلبے کے تحت برائے نام بادشاہوں کا کردار نبھانے کی اجازت ملتی رہی۔ درحقیقت انہیں مدتوں پہلے ہٹا دیا جانا چاہیے تھا تاکہ توانا اور باہمت فرمانرواؤں کے لیے جگہ پیدا ہوتی۔

باب چہارم کا ضمیمہ

لاہول کے بارے میں، جس کا ذکر صفحہ 170 پر آیا ہے، ایک مختصر نوٹ یہاں دیا جاتا ہے۔ لاہول، جو بھیڑوں کی شاداب چراگاہوں اور مشہور پشمینہ بکریوں کی سرزمین ہے، مغربی تبت اور شمالی پنجاب کے درمیان ایک کوہستانی علاقہ ہے جس کی بلندی کبھی 10,000 فٹ سے کم نہیں ہوتی۔ یہ مشرقی پنجاب کے ضلع کانگڑہ کی ذیلی تقسیم کولو کی ایک وزیری یعنی انتظامی

اکائی ہے۔ شمال میں لاہول کی حدود کشمیر کے صوبہ لداخ سے اور مغرب میں ریاست چمبہ سے ملتی ہیں۔ ۱۹۰۱ء میں اس کی آبادی 7,205 تھی۔ ہیون سانگ (Hiuen Tsiang) نے اس کا ذکر کولو کے شمال مشرق میں واقع ایک علاقے کے طور پر کیا ہے اور اسے "لو ہو لو" کا نام دیا ہے۔ لداخ اور وسطِ ایشیا کے مابین، نیز کولو اور مشرقی پنجاب کی تجارت لاہولیوں کے ہاتھ میں ہے۔ آب و ہوا اور خطے کی سختیوں نے ایک جفاکش قوم پیدا کی ہے۔ تہواروں کے مواقع پر لاہولی عورت کے زیورات کا انتخاب کہربا، فیروزہ، مرجان اور چاندی کے زیورات کا ایک حیرت انگیز مجموعہ ہوتا ہے جنہیں وہ بڑی جسارت کے ساتھ ایک ہی وقت میں پہن لیتی ہے۔

شاہ میری خاندان

[سلاطینِ کشمیر کی تاریخ وار فہرست اور نسب نامہ از ٹی ڈبلیو ہیگ (T. W. Haig)، جرنل آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، ۱۹۱۸ء، صفحہ 468۔ یہی فہرست کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم "ترک و افغان"، مرتبہ لیفٹیننٹ کرنل سر وولزلی ہیگ (Sir Wolseley Haig)، کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۲۸ء، صفحات 698، 699 اور 700 میں نقل ہوئی ہے۔]

اس فہرست کے مطابق شاہ میری فرمانروا بالترتیب یہ ہیں: شاہ مرزا، شمس الدین؛ جمشید؛ علی شیر، علاء الدین؛ شیر اشامک، شہاب الدین؛ ہندال، قطب الدین؛ سکندر بت شکن؛ میر خان، علی شاہ؛ شاہی خان، زین العابدین؛ حاجی خان، حیدر شاہ؛ حسن شاہ؛ محمد شاہ؛ فتح شاہ؛ محمد شاہ (بحالی)؛ فتح شاہ (بحالی)؛ محمد شاہ (دوبارہ بحالی)؛ ابراہیم شاہ اول؛ نازک شاہ؛

محمد شاہ (دوبارہ بحالی)؛ شمس الدین شاہ ثانی؛ نازک شاہ (بحالی)؛ مرزا حیدر دغلت (غاصب)؛ نازک شاہ (دوبارہ بحالی)؛ ابراہیم شاہ ثانی؛ اسماعیل شاہ؛ اور حبیب شاہ۔

چک خاندان

غازی شاہ؛ ناصر الدین حسین شاہ؛ ظہیر الدین علی شاہ؛ یوسف شاہ؛ یعقوب شاہ؛ (اس کے بعد مغل شہنشاہ)۔ ان کے ادوارِ حکومت ۱۵۶۱ء، ۱۵۶۳ء-۶۴ء، ۱۵۶۹ء-۷۰ء، ۱۵۷۸ء-۷۹ء اور ۱۵۸۵ء تا ۱۵۸۹ء بتائے گئے ہیں۔

نوٹ: زمباؤر (E. de Zambaur) نے اپنی کتاب "مانوئل دے ژینیالوژی ای کرونولوژی پور لستوار دے لسلام" (ہنور، ۱۹۲۷ء)، حصہ دوم، صفحہ 293 میں مختلف تاریخیں دی ہیں؛ مثلاً شمس الدین شاہ مرزا سواتی کی تخت نشینی کے لیے ۷۳۵ھ اور زین العابدین کی تخت نشینی کے لیے ۸۲۰ھ، وعلیٰ ہذا القیاس۔

ابوالفضل کی "آئینِ اکبری" کے مطابق

بتیس فرمانرواؤں نے 282 برس، 5 ماہ اور 1 دن حکومت کی۔

رنچن تبتی، جو اسی ملک کا باشندہ تھا: دس برس اور چند ماہ۔

شاہ میری سلاطین: سلطان شمس الدین، سنہا دیو کا وزیر (۷۱۵ھ / ۱۳۱۵ء)؛ سلطان جمشید، اس کا بیٹا (۷۵۰ھ / ۱۳۴۹ء)؛ سلطان علاء الدین بن شمس الدین (۷۵۲ھ / ۱۳۵۱ء)؛ سلطان شہاب الدین (۷۶۵ھ / ۱۳۶۳ء)؛ سلطان قطب الدین بن شہاب الدین (۷۸۵ھ / ۱۳۸۶ء)؛ سلطان سکندر، اس کا بیٹا، جس کا اصل نام سنکر تھا (۷۹۹ھ /

۱۳۹۶ء)؛ سلطان علی شاہ، اس کا بیٹا (۸۱۹ھ / ۱۴۱۶ء)؛ سلطان زین العابدین، علی شاہ کا چھوٹا بھائی (۸۲۶ھ / ۱۴۲۲ء)؛ سلطان حاجی حیدر شاہ، اس کا بیٹا (۸۷۷ھ / ۱۴۷۲ء)؛ سلطان حسن خان، اس کا بیٹا؛ سلطان محمد شاہ، اس کا بیٹا؛ سلطان فتح شاہ بن آدم خان بن سلطان زین العابدین؛ سلطان محمد شاہ، دوسری بار؛ سلطان فتح شاہ، دوسری بار؛ سلطان محمد شاہ، تیسری بار؛ سلطان ابراہیم، اس کا بیٹا؛ سلطان نازک شاہ بن فتح شاہ؛ سلطان محمد شاہ، چوتھی بار؛ سلطان شمسی بن محمد شاہ؛ سلطان اسماعیل شاہ، اس کا بھائی؛ سلطان نازک شاہ، دوسری بار؛ سلطان اسماعیل شاہ، دوسری بار؛ مرزا حیدر گورگان؛ سلطان نازک شاہ، تیسری بار۔

چک سلاطین: غازی خان بن کاجی چک (۹۷۱ھ / ۱۵۶۳ء)؛ حسین چک، اس کا بھائی؛ علی چک، حسین چک کا بھائی؛ یوسف شاہ، اس کا بیٹا (۹۸۶ھ / ۱۵۷۸ء)؛ سید مبارک شاہ، اس کے امرا میں سے ایک؛ لوہر چک بن سکندر بن کاجی چک؛ یوسف شاہ، دوسری بار؛ یعقوب خان، اس کا بیٹا۔

- اس کے انگریزی ترجمے کے لیے دیکھیے کرنل جیرٹ (Colonel H. S. Jarrett)، جلد دوم، صفحات 379-۔

نوٹ: پرنسپ (Princep) کے جداول میں سلاطینِ کشمیر کی ترتیب وہی ہے جو ابوالفضل کی آئینِ اکبری کی مذکورہ بالا ترتیب ہے، سوائے اس کے کہ ۹۴۸ھ=۱۵۴۱ء اور ۹۷۱ھ=۱۵۶۳ء کے درمیان وہاں یہ نام ملتے ہیں: ابراہیم (۹۶۰ھ=۱۵۵۲ء)، اسماعیل (۹۶۳ھ=۱۵۵۵ء) اور حبیب (۹۶۴ھ=۱۵۵۶ء)۔ نیز یہ کہ ۸۹۱ھ=۱۴۸۶ء تا

۹۱۱ھ=۱۵۰۵ء کے درمیانی عرصے کے حکمرانوں کے ناموں کی چند وہ تفصیلات وہاں حذف ہیں جو ابوالفضل نے درج کی ہیں۔

جون راجہ، سری وَر، پراجیہ بھٹ اور شُکا کے مطابق شاہ میریوں اور چکوں کی تاریخیں

[دیکھیے جوگیش چندر دت (Jogesh Chander Dutt) کی کتاب "کنگز آف کشمیرا"، ایلم پریس، کلکتہ، ۱۸۹۸ء، جلد سوم کے آخر میں فہرستِ سلاطین، صفحات XXI تا XXIV۔]

رنچن (سلطان صدر الدین): ۱۳۲۰ء۔

شاہ میری سلاطین: شاہ میر عرف شمس الدین اول (۱۳۳۹ء)؛ جمشید (۱۳۴۲ء)؛ علاء الدین (۱۳۴۳ء)؛ شہاب الدین (۱۳۵۴ء)؛ قطب الدین (۱۳۷۳ء)؛ سکندر (۱۳۸۹ء)؛ علی شاہ (۱۴۱۳ء)؛ زین العابدین (۱۴۲۰ء؛ حساب کے مطابق پچاس برس)؛ حیدر شاہ (۱۴۷۰ء)؛ حسن شاہ (۱۴۷۲ء)؛ محمد شاہ (۱۴۸۴ء)؛ فتح شاہ (۱۴۸۶ء)؛ محمد شاہ، دوسری بار؛ فتح شاہ، دوسری بار؛ محمد شاہ، تیسری بار؛ ابراہیم شاہ؛ نازک شاہ؛ محمد شاہ، چوتھی بار؛ شمس شاہ (شمس الدین ثانی)؛ حبیب شاہ۔

سلاطینِ کشمیر کے تانبے کے سکوں پر سی جے راجرز (C. J. Rodgers) کا مقالہ، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، جلد XLVIII، حصہ اول، نمبر 4، ۱۸۷۹ء، صفحات 283-4۔

چک سلاطین: غازی شاہ (۱۵۶۰ء)؛ حسین شاہ؛ علی شاہ؛ یوسف شاہ؛ سید مبارک (سید مبارک بیہقی)؛ لوہر چک (لوہر شاہ)؛ یوسف شاہ، دوسری بار (۱۵۷۸ء)؛ یعقوب شاہ (۱۵۸۷ء)۔

باب پنجم — چکوں کے عہد میں کشمیر

کشمیر کی تاریخ کے مطالعے سے یہ سرزمین مہمان نوازی کی سرزمین معلوم ہوتی ہے۔ شاہ میری خاندان کے بانی شاہ میر اور چک خاندان کے جدِّ امجد لنکر یا لنگر چک، دونوں کا یہاں خیر مقدم کیا گیا۔ اگرچہ خود لنکر یا لنگر کو تاجِ شاہی پہننے کا شرف حاصل نہ ہو سکا، تاہم اس کی اولاد نے رفتہ رفتہ اپنی قوت اس درجہ مستحکم کر لی کہ وہ کشمیر کی سیاست پر نہایت گہرا اثر ڈالنے کے قابل ہو گئی: بادشاہوں کو تخت پر بٹھانا اور اتارنا، اور بالآخر خود عصائے شاہی سنبھال لینا اس کے بس میں آ گیا۔

چکوں کی تاریخ — جن کا نسب دردی الاصل بتایا جاتا ہے — مرہٹوں کی تاریخ سے عجیب مشابہت رکھتی ہے۔ [لفظ ”درد“ کی تاریخ کے لیے باب ہشتم کا حصہ ”کشمیری زبان“ ملاحظہ ہو۔] چک — جنہیں کشمیری تواریخ میں ”چکریگا“ یا ”چکر“ لکھا گیا ہے — رفتہ رفتہ گمنامی سے ابھرے اور انہوں نے سلطان زین العابدین جیسے دانا حکمران کو بھی اپنے وجود کا احساس دلا دیا، جس کی دوررس نگاہ نے اس اقتدار کی پیش گوئی کر دی تھی جو بالآخر انہیں حاصل ہوا۔ انہوں نے امرا کی ملازمت اختیار کی اور یوں اپنی حیثیت مضبوط و مستحکم کرتے چلے گئے، یہاں تک کہ کاجی یا قاضی چک کی پُرہیبت قیادت میں — جسے تواریخ میں ”کاچن چکر یچا“ یا ”کاچا چکر“ لکھا گیا ہے — اپنا لوہا منوا لیا اور کشمیر کی سیاست کا ایک اہم عنصر بن گئے۔

1۔ لفظ چک کو سر وولزلی ہیگ (Sir Wolseley Haig) نے ”چکؔ“ لکھا ہے، مگر زیادہ صحیح کشمیری تلفظ ”تساک“ یا ”تشاک“ سے ملتا جلتا ہے۔ 2۔ لیفٹیننٹ نیوال

(Lieutenant Newall) کا "سلیچ آف دی محمڈن ہسٹری آف کشمیر" – جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، نمبر 5، ۱۸۵۴ء، صفحہ 146۔

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ چکوں کا عروج اس مذہبِ شیعہ کے قبول کرنے سے ہم زمانہ ہے جس کی تبلیغ میر شمس الدین عراقی نے کی – ملک حیدر چاڈورہ اسے شیخ شمس الدین محمد عراقی لکھتا ہے – یعنی سلطان فتح شاہ کے پہلے دورِ حکومت میں، جب حسین چک شیعہ ہوا۔ اور حسین کی اولاد بھی شیعہ ہی رہی۔ سلسلۂ نسب واضح کرنے کے لیے یہ بتا دینا مناسب ہے کہ لنکر یا لنگر چک کی چوتھی پشت میں پانڈو چک نامی شخص سلطان زین العابدین کے عہد میں ایک جاگیردار کی حیثیت سے نمایاں ہو چکا تھا۔

پانڈو کے دو بیٹے تھے: ہمت اور حسین۔ حسین، جیسا کہ ہم کہہ چکے، شیعہ ہو گیا جب کہ ہمت سنی رہا۔ تاہم ہمت کی اولاد میں حکمرانی کسی کو نصیب نہ ہوئی، اگرچہ وہ ملکی اور فوجی ملازمتوں میں اعلیٰ مناصب پر فائز رہے۔ شمس، ریگی، مسعود اور بہرام ہمت کے اسی سلسلے کی نمایاں مثالیں ہیں۔ یہ کہنا درست نہ ہو گا کہ حسین کی شاخ کے شیعہ ہو جانے نے چکوں میں تختِ شاہی کے حصول کی امنگ بھڑکا دی تھی؛ تاریخ نے ابھی تک یہ ثابت نہیں کیا۔ البتہ اس حقیقت کو نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ وہ پہلے ہی اتنے طاقت ور ہو چکے تھے کہ حالات کے دھارے میں مداخلت کر کے اپنا اثر دکھا سکیں، جب محمد شاہ اور فتح شاہ کی باہمی خانہ جنگی نے انہیں موقع فراہم کر دیا۔ اپنے پورے دور میں – خواہ کسی خاص بادشاہ کے طرف دار کی حیثیت سے، خواہ خود صاحبِ اقتدار کی حیثیت سے – انہوں نے مدبرانہ سیاست کا کوئی خاص ثبوت نہ دیا۔ ان میں تنگ نظری بھی پائی جاتی تھی۔ کسی شاہ میری حکمران نے شیعوں کے خلاف ویسا مذہبی تعصب نہیں دکھایا جیسا غازی چک اور حسین چک

نے کشمیر کے سنیوں کے خلاف روا رکھا۔ اس تلخی کے نتیجے میں شیعوں اور سنیوں کے درمیان متعدد سنگین تصادم ہوئے — جن کی تعداد اٹھارہ بتائی جاتی ہے — اور اسی بنا پر کشمیر کے شیعہ کو، بلخ کے سنی کی طرح، "بے پیر" کی شہرتِ بد حاصل ہوئی۔ چک ریشہ دوانیوں میں بھی طاق تھے، مگر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ میدانِ جنگ میں وہ اچھے سپاہی تھے۔

ان کے کارنامے آسانی سے فراموش نہیں کیے جا سکتے۔ ان کی حب الوطنی اور جنگ جویانہ روح کشمیر کے لیے بڑی سود مند ثابت ہوئی۔ چنانچہ پورے وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ نہ ہوتے تو کشمیر حیدر دوغلت یا بابر اور اس کے بلافصل جانشین کی ہوسِ ملک گیری کا آسان شکار بن جاتا — انہی کے مقابلے میں چک حکمرانوں نے شاہ میریوں کے اختیار کردہ لقب "سلطان" کی جگہ "بادشاہ" کا لقب اختیار کیا۔

[۹۶۲ھ تا ۹۷۰ھ بمطابق ۱۵۵۵ء تا ۱۵۶۳ء]

ان حالات کا اعادہ ضروری نہیں جن کے نتیجے میں غازی چک اپنے خاندان کا پہلا حکمران بن کر تخت نشین ہوا۔ اس نے اپنے دورِ حکمرانی کا آغاز تدبر و ہوش مندی سے کیا اور اپنی توجہ ان خرابیوں کے ازالے پر مرکوز کی جنہوں نے ایک مدت سے ملک کے نظم و نسق کو مفلوج کر رکھا تھا۔

غازی چک نے ان علاقوں کو دوبارہ فتح کیا یا سلطنت میں شامل کر لیا جو مملکت سے الگ ہو چکے تھے۔ اس کوشش میں اسے نمایاں کامیابی حاصل ہوئی: اس نے سکردو، گلگت، کشتواڑ، پکھلی اور منگلی (متصل پکھلی) واپس لے لیے، اور گکھڑوں کے سردار کو بھی مطیع بنا لیا۔ ان علاقوں کے مؤثر نظم و نسق کو یقینی بنانے کے لیے اس نے ان پر تجربہ کار اور ذہین حاکم مقرر کیے۔

[لداخ یا لداگ یعنی تبتِ کلاں روئے زمین کے بلند ترین خطوں میں سے ہے۔ کاشت کاری بہت کم ہے اور نو ہزار سے چودہ ہزار فٹ تک بلند سطحوں پر کی جاتی ہے۔ آب و ہوا نہایت خشک اور صحت بخش ہے اور ہوا فرحت افزا۔ گرج چمک کا فقدان قابلِ ذکر ہے۔ لیہ ہی واحد اہم مقام ہے۔ باشندے خود کو "بھوٹ" کہتے ہیں۔ چھچھ کوٹ کے ایک شیعہ مسلمان گاؤں اور ارغونوں یعنی مخلوط النسل لوگوں کے استثنا کے ساتھ، شہرِ لیہ کو چھوڑ کر، تقریباً تمام آبادی بدھ مت کی پیرو ہے، جن میں حالیہ برسوں تک کثیر شوہری کا رواج رہا؛ اب قانون سازی کے ذریعے اس کا سدباب کر دیا گیا ہے۔ ارغون لداخی عورتوں اور کشمیریوں یا یارقندیوں کے باہمی ازدواج کا نتیجہ ہیں۔ کچھ ترکی ساربان اور ڈوگرے بھی موجود ہیں۔ میجر گومپرٹز (Major Gompertz) اپنی کتاب "میجک لداخ" (Magic Ladakh)، ۱۹۲۸ء، صفحہ 45 پر لکھتا ہے کہ ریت کے بے آب صحراؤں میں قدیم شہروں اور قدیم تہذیبوں کے آثار اور ایسے رسم الخط کی تصویریں اور تحریریں ملتی ہیں جن کے نام تک معلوم نہیں۔

بلتستان یا تبتِ خرد لداخ کے وزیرِ وزارت کے زیرِ انتظام ایک خطہ ہے۔ سالانہ بارش تقریباً چھ انچ ہوتی ہے۔ ہوا خشک اور قوت بخش ہے۔ برف باری اکثر خاصی ہوتی ہے اور ان دیہات کے لیے نہایت اہم ہے جن کی آب پاشی کا انحصار برف ہی پر ہے۔ بلتستان کے قدیم حکمران "گیالپو" یا راجا کہلاتے تھے۔ علی شیر خان نے وہ قلعہ تعمیر کرایا جو اسی نام کی تحصیل میں واقع ہے، اور یہ تحصیل بلتستان کا ایک اہم خطہ ہے۔

سترھویں صدی کے اوائل میں سکردو کے سردار علی میر نے بلتستان پر کامیاب حملہ کیا۔ بلتی اور لداخی ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ اگرچہ لداخ اور بلتستان جغرافیائی اعتبار

سے یکساں ہیں اور ان کے باشندے نسلی اعتبار سے ایک ہی ہیں، تاہم بلتی عموماً مسلمان ہیں جب کہ لداخی بدھ مت کے پیرو۔ اصل تبت، یعنی لاماؤں کی سرزمین، صرف "تبت" کہلاتی ہے۔]

غازی ایک منصف مگر قدرے سخت گیر حکمران تھا۔ انصاف کرنے میں وہ اپنے عزیز و اقارب تک پر رحم نہ کھاتا تھا۔ ایک بار اس کے بیٹے حیدر خان کے ایک ملازم نے سلطان کی ہمرکابی کے دوران عناب (بیر کے درخت کا پھل) توڑ لیا۔ سلطان نے یہ دست درازی دیکھ لی اور خطاکار کے ہاتھ کٹوا دیے — ایسی سزا جس نے حیدر خان کو رنجیدہ بھی کیا اور مشتعل بھی۔ بعد ازاں جب غازی چک نے نوجوان کے چچا محمد ملک کو اس ترش روئی پر تنبیہ کے لیے بھیجا جو اس نے ظاہر کی تھی، تو نوجوان نے طیش میں آکر اپنے چچا کو خنجر گھونپ دیا۔ اس پر غازی چک نے اسے پھانسی دلوا دی اور اس کی لاش آٹھ دن تک سولی پر نمائش کے لیے لٹکی رہی۔

غازی کی سخت گیری نے خود اس کے قبیلے کے لوگوں کو اس کے خلاف اٹھ کھڑا کیا۔ ریگی چک کے بیٹوں نصرت چک اور یوسف چک نے اس کے خلاف بغاوت کی مگر کامیابی سے کچل دیے گئے۔ بعد ازاں ریگی چک کے بیٹوں شنکر چک، بہرام چک اور فتح چک نے — واضح رہے کہ ریگی چک کے سات یا اس سے زیادہ بیٹے تھے — سوپور میں علمِ بغاوت بلند کیا، مگر شکست کھا کر منتشر ہو گئے۔ پھر عیدی رینہ کے بیٹے اور موسیٰ رینہ کے پوتے شمس رینہ نے — جس سے ہم فتح شاہ کے دوسرے دورِ حکومت میں صفحات 191-2 پر مل چکے ہیں — ہمایوں سے مدد مانگنے کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ مگر اس کی بدقسمتی کہ اس کی آمد ہی کے دن ہمایوں گرنے کے نتیجے میں وفات پا گیا۔ واپسی پر اس کی ملاقات ہمایوں کے منظورِ نظر

ابو المعالی سے ہوئی، جسے بیرم خان نے نکال باہر کیا تھا اور جس نے گکھڑ کے پہاڑوں میں پناہ لے رکھی تھی۔ شمس رینہ نے اسے کشمیر پر حملے پر آمادہ کر لیا۔ میرزا حیدر دوغلت کی سابقہ کامیابی سے حوصلہ پا کر ابو المعالی بلاتامل کشمیر پر حملہ آور ہوا۔ تاہم غازی چک نے سید ابراہیم بیہقی اور اس کے پیروؤں کو اپنی طرف ملا لیا اور حملہ آوروں کو کامیابی سے شکست دے دی۔ اگلے سال شمس رینہ کے بھائی محمد رینہ نے رینواؤں اور بعض ناراض چکوں کی مشترکہ بغاوت کی قیادت کی، مگر اسے شکست ہوئی۔

۱۵۵۹ء میں غازی کے قبضۂ تخت کو میرزا حیدر دوغلت کے چچا زاد قرا بہادر نے پھر متزلزل کیا، جسے ریگی چک کے بیٹے یوسف چک اور دیگر لوگوں نے لڑائی پر اکسایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ قرا بہادر اپنے ساتھ دس ہزار سوار لایا۔* جنگ راجوری کے پہاڑوں میں ہوئی۔ غازی چک بنفسِ نفیس دشمن کے مقابلے کے لیے آگے بڑھا اور اس نے اپنے سپاہیوں سے وعدہ کیا کہ ہر کٹے ہوئے سر کے عوض ایک اشرفی دی جائے گی۔ بادشاہ کو مکمل فتح حاصل ہوئی اور معرکے کے بعد سات ہزار سر اس کے حضور پیش کیے گئے۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنے وعدے سے بڑھ کر فی سر دو اشرفیاں تقسیم کیں۔ *جرنل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، نمبر 5، ۱۸۵۴ء، صفحہ 426۔

غازی چک ایک قابل اور سرگرم حکمران تھا۔ وہ شاعر بھی تھا۔ آٹھ برس سے زائد حکومت کرنے کے بعد اس نے جذام کی ایک نہایت شدید صورت کے باعث اپنے بھائی حسین چک کے حق میں تخت سے دست برداری اختیار کر لی؛ اس مرض نے اسے تقریباً دو برس صاحبِ فراش رکھا، جس کے بعد وہ فوت ہوا۔ اپنے شیعہ عقیدے پر اس کے فخر کا اظہار ملا میر علی ساز نے حسبِ ذیل رباعی میں کیا ہے:

گہ نظمغان بہ رفض مرا نام ردہ اند

گی دوسدان موالی حیدر

شکر کہ دوست دشومن بہ اتفاق

دست برداری کے کچھ عرصہ بعد اس نے اپنا مال و اسباب برابر تقسیم کیا: آدھا اپنے بیٹے اور دیگر اولاد کو دے دیا، جب کہ باقی آدھا فروخت کے لیے تاجروں کے پاس بھیج دیا۔ اس نے تاجروں سے ان اشیا کی اس قدر گراں قیمت طلب کی کہ انہوں نے حسین شاہ سے شکایت کی۔ حسین شاہ نے جب یہ معاملہ غازی چک کے سامنے اٹھایا تو وہ ایسا برہم ہوا کہ دوبارہ اپنا اقتدار قائم کرنے کی فکر میں لگ گیا، مگر حسین شاہ نے ہوشیاری سے اس کی چال ناکام بنا دی۔ کچھ عرصہ بعد حسین شاہ نے، اپنی ذاتی حفاظت اور راستے سے ایک حریف کو ہٹانے کی غرض سے، غازی چک کے بیٹے احمد خان کی آنکھیں نکلوانے کا ارادہ کیا۔ غازی نے فطری طور پر اپنے بیٹے کی سفارش کی مگر ناکام رہا اور دل شکستہ ہو کر چل بسا۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا، وہ پہلے ہی شدید جذام کے ہاتھوں سخت تکلیف اٹھا چکا تھا۔

حسین شاہ چک [۹۷۱ھ تا ۹۷۸ھ بمطابق ۱۵۶۳ء تا ۱۵۷۰ء]

حسین شاہ ۹۷۰ھ (۱۵۶۳ء) میں تخت نشین ہوا۔ ”خسروِ عدل“ اس کی تخت نشینی کی تاریخ کا مادہ ہے۔ وہ نسبتاً نرم خو حکمران تھا، اپنے بھائی سے کم متعصب، اور اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خواہاں۔ اس نے ریاستی مالیات کی مؤثر تنظیم کا اہتمام کیا۔

۹۷۲ھ (۱۵۶۴ء) میں حسین شاہ نے اپنے بھائی شنکر چک کو راجوری کا حاکم بنا کر بھیجا۔ بھائی نے فوج جمع کی اور خود تخت پر قبضے کے لیے بغاوت کر دی۔ اسے وزیر ملک محمد ناجی نے — جو ہمارے مؤرخ حیدر ملک چاڈورہ کا دادا تھا* — اور بادشاہ کے چھوٹے بھائی علی خان چک نے شکست دی۔ اس فتح نے ملک محمد ناجی کو بادشاہ کی خاصی عنایات کا مستحق بنا دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فتنہ یہیں ختم نہ ہوا۔ اگلے سال ۹۷۳ھ (۱۵۶۵ء) میں بادشاہ تحصیل اسلام آباد (اننت ناگ) کے مقام ویتھ نار میں شکار کھیل رہا تھا۔ اس کی غیر حاضری میں ریاست کے ایک وزیر فتح چک نے — جو خواجہ فتح بقال بھی کہلاتا تھا اور خان الزماں کے خطاب سے ملقب تھا — اپنے بیٹے بہادر خان کے ساتھ مل کر بغاوت کر دی۔ فتح چک نے خزانے پر قبضہ کرنے اور خود کو بادشاہ قرار دینے کی غرض سے شاہی محل پر حملہ کیا۔

*ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخِ کشمیر، صفحہ 201۔

تاہم ملک محمد ناجی، جسے محل کی حفاظت پر مامور چھوڑا گیا تھا، ایک ہوشیار تدبیر سے خان الزماں کو پسپا کرنے اور اس کے بیٹے کو مار ڈالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس معرکے کے دوران بادشاہ کے محافظ دستے کے ایک افسر مسعود نائک نے اپنی جرات مندانہ اور بے خوف کارکردگی سے خود کو نمایاں کیا۔ خان الزماں گرفتار کر لیا گیا اور بادشاہ کی واپسی پر زنجیروں میں جکڑ کر اس کے حضور لایا گیا۔ بادشاہ نے مسعود نائک کو "مبارز خان" کے خطاب سے سرفراز کیا اور ڈل کے کنارے پرگنہ پھاک بطور جاگیر عطا کیا۔ خان الزماں کو، ظاہر ہے، اس کی غداری کی پاداش میں سزائے موت دے دی گئی۔ تاہم مبارز خان کو رفتہ رفتہ اپنی طاقت پر غرور ہو چلا۔ چنانچہ بادشاہ کے پاس اس سے نہ صرف حسد بلکہ خوف کھانے کا بھی حقیقی سبب موجود تھا۔ کسی بہانے سے بادشاہ نے اسے قید کر دیا اور اس کی

جگہ ملک لولی لون* کو مقرر کیا۔ لولی بھی زیادہ عرصے اپنے نئے منصب سے بہرہ ور نہ ہو سکا؛ وہ چالیس ہزار خروار شالی (دھان) کے غبن کی کوشش میں پکڑا گیا اور معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد علی کوکہ وزیرِ اعظم مقرر ہوا۔

*بخشی نظام الدین نے اپنی طبقاتِ اکبری (مطبع سنگی، صفحات 626-27، اور ڈی (De) کا فارسی متن، جلد 3، صفحہ 493) میں غلطی سے "لونڈ" لکھا ہے۔

۹۷۶ھ (۱۵۶۸ء) میں یوسف مانڈو نامی ایک متعصب شیعہ نے جامع مسجد کے سنی خطیب، قاضی القضاۃ سید حبیب اللہ خوارزمی پر حملہ کر کے اسے خاصا شدید زخمی کر دیا؛ اسے قتل ہونے سے اس کے داماد مولانا میر کمال الدین نے بچایا۔ میر کمال الدین سے ہم آگے چل کر باب ہشتم میں "اہلِ علم" کے تحت ملا کمال کی حیثیت سے ملیں گے، جو علامہ عبدالحکیم سیالکوٹی، مجدد الف ثانی اور علامی سعد اللہ خان کے استاد تھے۔ بادشاہ نے یوسف کی گرفتاری کے احکام جاری کیے۔ بادشاہ کی مقرر کردہ علما کی مجلسِ منصفاں نے — جو ملا شمس الدین الماس (جو ملا یوسف کے نام سے بھی معروف تھا) اور ملا فیروز گنائی پر مشتمل تھی — یوسف مانڈو کو سنگسار کرا دیا۔

اس کے کچھ ہی عرصہ بعد اکبر کے دربار سے ایک سفارت کشمیر پہنچی جس کی قیادت میرزا محمد مقیم اور میر یعقوب کر رہے تھے؛ دونوں شیعہ مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ بادشاہ نے بنفسِ نفیس ان کا خیر مقدم کیا اور ہیرپور میں ان کے استقبال کے لیے اپنا ذاتی خیمہ نصب کرایا۔ پھر وہ کشتی کے ذریعے سری نگر پہنچے اور ایک امیر حسین ماگرے کے مکان میں ٹھہرائے گئے۔ مقیم نے مذکورہ بالا متعصب شیعہ یوسف کے سنگسار کیے جانے کے معاملے میں مداخلت کر کے سخت بے تدبیری کا مظاہرہ کیا۔ یہ خالصتاً ایک اندرونی معاملہ تھا جسے خود

حسین شاہ ہی کو طے کرنا چاہیے تھا۔ مگر بد قسمتی سے حسین شاہ اس موقع پر متحارب شیعہ اور سنی فریقوں کے شور و غوغا سے بچنے کے لیے شہر سے باہر چلا گیا، کیونکہ اب دونوں کے جذبات ایک دوسرے کے خلاف مشتعل ہو چکے تھے۔ میرزا مقیم کے اکسانے پر ان علما کو، جنہوں نے یوسف کے مقدمے میں منصفوں کے فرائض انجام دیے تھے، فتح خان نامی ایک شیعہ عہدے دار کے حوالے کر دیا گیا۔ فتح خان نے انہیں قتل کرا دیا اور ان کی لاشیں گلیوں میں گھسیٹیں۔

شہر واپس آنے کے بعد حسین شاہ نے، اکبر کے دربار میں میرزا مقیم کی غلط بیانی سے بچنے کی فکر میں، اور اس اندیشے کے پیشِ نظر کہ کہیں شہنشاہ خود اس کے اس تامل پر ناراض نہ ہو جو اس نے علما کو سزا دینے میں دکھایا تھا، انہیں مناسب تحائف دیے۔

حسین شاہ نے یہ بھی مان لیا کہ وہ اپنی بیٹی شہنشاہ کے بیٹے سلیم سے بیاہ دے گا۔ حاجی گنائی کی سرکردگی میں کشمیریوں کا ایک وفد اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا تاکہ علما کی لاشوں کے ساتھ روا رکھے گئے شرمناک سلوک کی روداد پیش کرے اور اس سے دادرسی چاہے۔ وفد اکبر کو میرزا مقیم اور حسین شاہ چک کے خلاف برانگیختہ کرنے میں کامیاب رہا۔ میرزا مقیم کی واپسی پر اکبر نے اسے مذہبی تعصب کی پاداش میں سزائے موت دلوا دی اور حسین شاہ کے تحائف واپس بھیج دیے۔ شہنشاہ نے حسین شاہ کی بیٹی کو بھی واپس بھیج دیا۔

حسین شاہ کو اکبر کی اس توہین سے ایسا صدمہ پہنچا کہ اس صدمے اور اپنے بیٹے کی وفات کے غم کے باعث وہ چند مہینوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکا۔ تاہم شُکا کا بیان ہے کہ حسین شاہ کا انتقال مرگی کے مرض سے ہوا۔

حسین شاہ بالعموم نہایت وسیع المشرب معلوم ہوتا ہے۔

اس نے ہفتے میں تین دن مسلمان اور ہندو علمائے دین اور سیاح درویشوں کے مواعظ سننے کے لیے مخصوص کر رکھے تھے، جب کہ باقی تین دن وہ فوج کے معائنے، شکار، موسیقی اور عدل گستری کے لیے وقف کرتا تھا۔ حسین شاہ شاعری کا ذوق بھی رکھتا تھا۔ روایت ہے کہ ایک شاعر، جو ہر عید پر اس سے انعامات اور خلعتِ فاخرہ پایا کرتا تھا، ایک عید سے قبل اسے اپنا ایک مصرع لکھ بھیجا، جس کے جواب میں بادشاہ نے یہ مصرع لکھ کر بھیجا—

فہم را نے آں این رسد نے این رسد

[پیر پنجال کی وادی کا گاؤں ہیرہ پور شوپیاں سے تقریباً سات میل جنوب مغرب میں واقع ہے۔ ہیرہ پور کا قدیم نام شورا پورہ تھا۔ ہیرہ پور راجوری کی جانب سے کشمیر میں داخلے اور اخراج کا دروازہ ہے۔]

خواجہ اعظم اور پیر حسن شاہ حسین شاہ کے بعض دیگر اشعار بھی نقل کرتے ہیں، جن میں سے ایک مصرع یہ ہے—

دلا برخیز و کارے کن کہ جان در کار می آید

حسین شاہ کا مستقل معمول یہ تھا کہ نمازِ جمعہ کے بعد اپنے خزانچی کو حکم دیتا کہ ایک رقم علیحدہ کر دی جائے، جسے وہ خیرات میں تقسیم کر دیتا تھا۔ شُکا کہتا ہے: ”دولت کی دیوی، اگرچہ بے دریغ اخراجات سے اس کی تحقیر ہوتی رہی، پھر بھی اس کے ساتھ ساتھ رہی۔“ طبقاتِ اکبری کا بیان ہے کہ حسین شاہ نے ایک مدرسہ قائم کیا، اس کے احاطے میں صلحا اور اہلِ علم کی صحبت میں رہا کرتا تھا، اور اس نے پرگنہ زینہ پور ان کی گزر اوقات کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔

اس کی وفات سے قبل ہی درباری امرا اگلی جانشینی کے بارے میں سازباز کرنے لگے۔ بعض حسین شاہ کے بھائی علی خان اور سید مبارک بیہقی میں سے کسی ایک کے انتخاب کے حق میں تھے، جب کہ بعض نوعمر شہزادے یوسف خان کو اپنا اگلا بادشاہ بنانا چاہتے تھے۔ علی خان دارالحکومت سے نکل گیا اور ایک فوج لے کر لوٹا۔ تب دولت چک نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ خوں ریزی سے بچنے کے لیے شاہی نشاناتِ اقتدار علی خان کو بھیج دے۔ بادشاہ نے اس مشورے پر عمل کیا، مرگی کے عارضے کے باعث ۱۵۷۰ء میں تختِ سلطنت سے دست بردار ہو گیا اور اس کے بعد زینہ پور میں گوشہ نشین رہا، جہاں ۱۵۷۲ء میں اس کا انتقال ہوا۔

[ماخذ: تاریخِ کشمیر از ملک حیدر چاڈورہ، صفحہ 202 و 203]

علی شاہ چک [۹۷۸ھ تا ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۰ء تا ۱۵۷۹ء]

علی خان علی شاہ چک کے لقب سے تخت نشین ہوا۔

اپنے بھائی حسین شاہ کی طرح علی شاہ بھی ایک عادل اور دانا حکمران تھا۔ وہ اولیا اور درویشوں کی بڑی تعظیم کیا کرتا تھا۔ چنانچہ بابا داؤد خاکی کہتے ہیں—

توران علی شاہ دوستدار صالحان * پور او شہزادہ یوسف با جاہ و جلال

اگرچہ چک شیعہ تھے، اور کشمیر کے شیعہ اسی طرح مطعون ہیں جس طرح اس طنزیہ فارسی شعر میں بلخ کے سنی—

دو ... اند در جہان بے‌پیر

تاہم ایک جلیل القدر سنی پیشوا، یعنی سلطان العارفین شیخ حمزہ مخدوم کے خلیفہ بابا داؤد خاکی کی شہادت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکمران سنیوں کے ساتھ حسنِ سلوک سے پیش آتا تھا۔ ایران سے ایک شعبدہ باز درویش کے بھیس میں شاہ عارف کے نام سے کشمیر آیا۔ اس نے صفوی شاہِ وقت سے رشتہ داری کا دعویٰ کیا، مگر اس کا فریب کھل گیا۔

تخت نشینی کے کچھ ہی عرصے بعد علی شاہ نے اپنے امرا کے تمام باہمی جھگڑوں کا خاتمہ کر دیا۔ اس نے سید محمد مبارک بیہقی کو، جو سنی تھا، اپنا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔ سید محمد مبارک بیہقی اسی سید محمد بیہقی کا پوتا تھا جس کا ذکر محمد شاہ اور فتح شاہ کی باہمی کشمکش کے سلسلے میں گزر چکا ہے۔ سید محمد مبارک، سید ابراہیم بیہقی کا بیٹا تھا۔ یہ بیہقی سادات بڈشاہ کے خسر سید محمد بیہقی کی نسل سے تھے اور سلطان سکندر کے عہد میں بیہق سے — جو ایران میں نیشاپور کے شمال مغرب میں واقع ایک ضلع ہے — ہجرت کر کے کشمیر میں آباد ہوئے تھے۔ متاخر شاہ میری سلاطین کے زمانے میں انہوں نے کشمیر کی سیاست میں نہایت نمایاں کردار ادا کیا۔

علی شاہ کا وزیرِ اعظم سید مبارک بیہقی، جو فی الواقع ایک بہادر آدمی تھا، طبعاً غیر معمولی طور پر صلح جو اور معاملات کو تدبر سے نمٹانے والا شخص معلوم ہوتا ہے۔ اس نے متعدد مواقع پر بڑی دانش مندی کا مظاہرہ کیا: خاص طور پر نوروز چک کے بیٹے علی چک کے لیے، جو بغاوت کے جرم میں قید تھا، بادشاہ سے معافی دلوانے میں۔ اسی نے بادشاہ اور اس کے بیٹے یوسف خان کے مابین بھی صلح و آشتی بحال کرائی، جس نے ایک تکرار کے دوران غازی چک کے بیٹے ابراہیم خان کو قتل کر دیا تھا۔

کشتواڑ کا راجا بہادر سنگھ، جو ۱۵۷۰ء میں گدی نشین ہوا تھا، پے در پے دو مرتبہ شکست کھا گیا۔ ۱۵۷۲ء میں اپنی پہلی شکست کے بعد راجا نے بادشاہ کے پوتے یعقوب خان کو اپنی بہن شنکر دیوی نذر کی۔ اسی خاتون نے آگے چل کر فتح خاتون کا لقب پایا اور بعد ازاں، جب اس کا شوہر اکبر کے ہاتھوں شکست کھا گیا، تو وہ اسے کشتواڑ لے گئی۔ راجا نے سالانہ خراج جاری رکھنے کا وعدہ بھی کیا۔

جب ۱۵۷۴ء میں اسے دوسری مرتبہ شکست ہوئی تو راجا نے اپنا بیٹا نارائن سنگھ بطور یرغمال دے دیا اور خراج کی ادائیگی کے عہد کی تجدید کی۔ اسی سال علی شاہ نے اکبر کے سفیروں قاضی صدر الدین اور مولانا عشقی کا استقبال کیا، جو ازدواجی رشتے کا پیغام لائے تھے۔ اس پر اس نے اپنی بھتیجی کو، یعنی حسین شاہ کی وہ بیٹی جسے اکبر پہلے واپس بھیج چکا تھا، تحائف کے ہمراہ روانہ کیا۔ اس نے خطبۂ جمعہ میں اکبر کا نام بھی شامل کر دیا اور شہنشاہ کے نام کا سکہ ڈھالا، جو اس امر کی علامت تھی کہ وہ اکبر کو اپنا فرماں روائے اعلیٰ تسلیم کرتا ہے۔ نازک شاہ کے بیٹوں حیدر خان اور سلیم خان نے ہندوستان کے بعض امرا سے اتحاد کر کے ۱۵۷۵ء میں کشمیر پر چڑھائی کا قصد کیا۔ علی شاہ نے اپنے بھتیجوں لوہر چک اور محمد چک کو دشمن کے مقابلے پر روانہ کیا۔

محمد چک نے چالاکی سے، محض دکھاوے کے طور پر اور حریف کو فریب دینے کے لیے، لوہر چک کو قید کر لیا اور بے باکی سے دشمن کے ساتھ جا ملا۔ پہلا ہی موقع پاتے ہی اس نے سلیم خان پر پانسہ پلٹ دیا اور اسے تہِ تیغ کر دیا، جس پر حیدر خان فرار ہو گیا۔ یوں شاہ میر کی اولاد کی تختِ کشمیر دوبارہ حاصل کرنے کی یہ آخری کوشش اپنے انجام کو پہنچی۔

۹۸۴ھ (۱۵۷۶ء) میں کشمیر ایک ایسے قحط میں مبتلا ہوا جو تین برس تک جاری رہا۔ غلہ اس قدر نایاب ہو گیا کہ بعض اوقات لوگ فی الواقع آدم خوری تک پر اتر آئے۔ زیتی چک، جو عرفِ عام میں زیت شاہ کہلاتا تھا، ایک پرجوش درویش اور شیخ حمزہ مخدوم کا مرید تھا۔ جب علی شاہ نے زیتی سے پوچھا کہ یہ قحط کب تک رہے گا تو زیتی نے صاف صاف کہہ دیا کہ قحط کا خاتمہ بادشاہ کی موت کے ساتھ ہی ہو گا۔

بادشاہ کو عیدگاہ کے میدان میں چوگان کھیلتے ہوئے موت نے آ لیا، کیونکہ اس کی زین کا قربوس اس کے پیٹ میں گھس گیا۔ تاہم مرنے سے پہلے اس نے اپنے بیٹے یوسف کی تاج پوشی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی تاکہ اس کا اپنا بھائی عبدال خان چک کوئی فتنہ کھڑا نہ کر سکے۔ عبدال خان چک بالآخر وزیرِ اعظم سید مبارک بیہقی کے ہاتھوں مارا گیا۔

یوسف شاہ چک (اول) [۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء]

یوسف شاہ نے سید مبارک بیہقی ہی کو اپنا وزیرِ اعظم برقرار رکھا۔ لیکن بادشاہ عیش و عشرت کی زندگی میں ایسا غرق ہوا کہ اس کا وزیر برگشتہ خاطر ہو کر اپنے منصب سے مستعفی ہو گیا۔ اس کی جگہ محمد بٹ مقرر ہوا، اور بادشاہ بدستور امورِ سلطنت سے غافل رہا۔

امرا نے باہم اتحاد کر کے سید مبارک بیہقی سے مدد چاہی، جس نے انہیں بغاوت سے گریز کا مشورہ دیا۔ ساتھ ہی اس نے ایک شیعہ عالم بابا خلیل کے ذریعے بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ باغیوں کے ساتھ نرمی برتی جائے تاکہ بغاوت زور نہ پکڑے۔ بادشاہ نے سیاسی تدبر سے محرومی کا ثبوت دیتے ہوئے سید مبارک بیہقی سے، سزائے موت کی دھمکی کے ساتھ، مطالبہ کیا کہ

باغیوں کو زنجیروں میں جکڑ کر اس کے حوالے کیا جائے۔ یہ بیک وقت کھلی توہین بھی تھی اور چیلنج بھی، جسے سید نے بلا تامل قبول کر لیا۔

ملک محمد ناجی نے بادشاہ کو مشورہ دیا کہ فراخ دلی سے کام لے تاکہ اپنے مخالفوں کو بھی اپنی طرف مائل کر سکے۔ مگر یوسف نے اس پر کان نہ دھرا۔ اس کے برعکس اس نے دو سرداروں، حبیب خان چک اور محمد خان چک، کی سرکردگی میں سید مبارک بیہقی سے لڑنے کے لیے فوج روانہ کر دی۔ اس معرکے میں ملک محمد ناجی کا بیٹا کام آیا۔ بادشاہ بھی اپنا تخت کھو بیٹھا۔ ملک ناجی غم سے گھل کر چند ہی ہفتوں میں چل بسا۔ یوسف نے شاہی نشاناتِ اقتدار سے دست برداری اختیار کی اور تحصیل کولگام اور کوہستانِ پیر پنچال کے درمیان برنیال لامر کے پہاڑوں کی راہ لی۔ [سید مبارک بیہقی تاریخِ کشمیر میں سید مبارک خان بیہقی کے نام سے معروف ہے۔ کشمیر میں خان کا خطاب ان امرا کو دیا جاتا تھا جو فوج کے انتظام و انصرام سے متعلق ہوتے تھے، نیز شاہی خون کے شہزادوں کو۔ خان کو کم و بیش انگریزی کے ڈیوک کے مماثل سمجھا جا سکتا ہے، فرق صرف یہ ہے کہ ڈیوک کا منصب موروثی ہوتا ہے جب کہ کشمیر میں خانی اس مفہوم میں موروثی نہ تھی۔]

[سی جے راجرز (C. J. Rodgers)، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، ۱۸۸۵ء، صفحہ 135؛ تاریخِ کشمیر از ملک حیدر چاڈورہ، صفحہ 217]

سید مبارک بیہقی [۹۸۶ھ مطابق ۱۵۷۸ء]

سید مبارک نے، جو اب مسندِ حکمرانی پر متمکن ہو چکا تھا، اپنا مختصر دورِ اقتدار خاصے بے تکلفانہ، بلکہ اشتراکیوں کے سے رنگ میں لینن (Lenin) کے انداز پر شروع کیا۔ اس نے

شاہی تاج توڑ کر اس کے جواہر غریبوں میں بانٹ دیے۔ تاہم امرا کے ساتھ اس کی کھلی بے اعتنائی نے انہیں سخت ناراض کر دیا۔ وہ یوسف شاہ کی واپسی کے لیے سازشیں کرنے لگے۔ ادھر سید مبارک نے خود ایک درباری داؤد میر کو دعوت نامہ دے کر جلاوطن بادشاہ کے پاس بھیجا، جس نے اپنے بیٹوں یعقوب خان اور ابراہیم خان کو اس ارادے سے روانہ کیا کہ خود ان کے پیچھے پیچھے آئے گا۔ مگر سپہ سالار عبدال بٹ نے اسے خفیہ طور پر خبردار کر دیا کہ یہ دعوت دراصل سید مبارک کی ایک چال ہے۔ تاہم بالآخر اس نے جنگ کی اور بری طرح شکست کھائی، جس کے بعد وہ تحصیل کو لگام میں برنیال کی پہاڑی کے پیچھے روپوش ہو گیا۔

سپہ سالار عبدال بٹ نے ایسی کامیاب چالیں چلیں کہ یوسف شاہ اور سید مبارک دونوں کو سخت ابتری میں مبتلا کر دیا اور انہیں آپس میں لڑا بھی دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عبدال کی عیارانہ تدبیروں نے تخت لوہرچک کے حوالے کرا دیا، کیونکہ سید مبارک نے بخوشی دست برداری کی پیش کش کر دی — حسن کے بقول چھ ماہ دو دن، خواجہ اعظم کے بقول آٹھ ماہ پندرہ دن، جب کہ حیدر ملک چاڈورہ اور خلیل مرجان پوری کے نزدیک صرف دو ماہ پندرہ دن حکومت کرنے کے بعد۔

سید مبارک نے دست برداری کے وقت یہ مصرع پڑھا:

کہ دنیا را وفائے نیست خواہ از ما و خواہ ازگو

یوسف اس تاجِ شاہی سے محروم ہی رہا جس کے حصول کے لیے اسے بلایا گیا تھا۔ بیہقی کی وفات ۱۵۹۱ء میں، کشمیر میں مغلیہ اقتدار کے قیام کے پانچ برس بعد، واقع ہوئی۔

لوہر شاہ چک [۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء تا ۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ء]

بدیع الدین یا گوہر شاہ، جو لوہر چک کے نام سے زیادہ معروف ہے، یوسف شاہ کا چچازاد بھائی تھا اور شنکر چک کا بیٹا تھا۔ عبدال بٹ کو اس پادشاہ کے تحت وزارتِ عظمیٰ کا وہ منصب مل گیا جس کی اسے آرزو تھی۔

یوسف شاہ چک وہ تاج کھو بیٹھنے کے بعد، جو گویا اس کی دسترس میں آ چکا تھا، ۲ جنوری ۱۵۸۰ء کو فتح پور سیکری میں اکبر کے دربار میں حاضر ہوا تاکہ اپنی سلطنت کی بازیابی کے لیے مدد کا طالب ہو۔ کہنے کی ضرورت نہیں کہ شہنشاہ ایسے ہی کسی موقع کی تاک میں تھا کہ اسے اپنے فائدے میں استعمال کرے۔ چنانچہ اکبر نے بخوشی راجا مان سنگھ اور مرزا یوسف کو ایک فوج کے ساتھ جلاوطن بادشاہ کے ہمراہ روانہ کیا، اور لاہور میں یوسف شاہ کا وزیر محمد بٹ ایک ہزار سپاہیوں کے لشکر سمیت ان سے آملا۔

محمد بٹ کے مشورے پر یوسف شاہ کو یہ شبہ لاحق ہوا کہ اکبر سلطنت پر خود قبضہ کر لے گا، اور اب اسے بلاوجہ بیرونی مدد طلب کرنے پر ندامت ہونے لگی۔ اس نے راجا مان سنگھ اور مرزا یوسف کو اس بہانے پیچھے چھوڑ دیا کہ بہتر یہ ہو گا کہ وہ اپنے ہم وطنوں کا مزاج جانچنے کی غرض سے تنہا پیش قدمی کرے۔ مان سنگھ کا ذکر آگے آئے گا۔

محمد بٹ کی کوششوں سے یوسف کشمیر پہنچنے سے قبل ہی چار ہزار آدمی اپنے گرد جمع کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ عبدال بٹ کے مقرر کردہ یوسف ڈار کے تین ہزار سپاہیوں سے بچنے کے لیے اس نے بارہ مولا سے سات میل کے فاصلے پر واقع گاؤں دلنہ کے قریب دریائے جہلم

عبور کیا۔ یوسف شاہ فاتحانہ شان سے سری نگر میں داخل ہوا۔ عبدال بٹ مارا گیا۔ لوہر چک نے دست برداری اور فرار میں عافیت ڈھونڈی اور بعد ازاں ہلاک ہوا۔

لوہر نے تقریباً تیرہ ماہ حکومت کی، جس کے بارے میں ملک حیدر، جو عملاً عینی شاہد تھا، لکھتا ہے کہ ملک میں ارزانی اور فراوانی کا دور دورہ تھا، ایک کھروار شالی یعنی بغیر چھڑے ہوئے چاول ایک پیسے میں دستیاب تھے، اور لوگ خوش حالی سے بہرہ ور تھے۔

یوسف شاہ چک (دوم) [۹۸۸ھ مطابق ۱۵۸۰ء تا ۹۹۴ھ مطابق ۱۵۸۶ء]

ڈیڑھ برس کی جلاوطنی کے بعد یوسف شاہ دوبارہ تخت پر متمکن ہو گیا۔

ابتدا میں اس نے امورِ سلطنت کی طرف پوری توجہ دی، ملک کو تفرقے سے پاک کیا اور سید مبارک خان بیہقی سے از سرِ نو دوستانہ تعلقات استوار کیے، جس کے بیٹے سے اس نے اپنی ایک بیٹی بیاہ دی۔ مؤرخ ملک حیدر چاڈورہ یوسف شاہ کی ملازمت میں داخل ہوا اور کشمیر میں، نیز بہار میں یوسف کی جلاوطنی کے زمانے میں، چوبیس برس تک اسی خدمت پر مامور رہا۔

یہی یوسف شاہ گرم موسم میں گلمرگ جایا کرتا تھا اور اسی نے اس کا نام گوری مرگ (یعنی شِوکی بیوی گوری کا مرگ یا راستہ یا درہ)، جو عرفِ عام میں گُرمرگ یعنی ”گھوڑے کا مرغزار“ (گُر بمعنی گھوڑا) کہلاتا تھا، بدل کر گلمرگ یعنی ”پھولوں کا مرغزار“ رکھا۔ وہ سونہ مرگ، اہرہ بل اور اچھہ بل بھی جایا کرتا تھا۔ یوسف کو اپنی زلیخا حبہ خاتون کی صورت میں ملی، جس سے وہ شہزادگی ہی کے زمانے سے وابستہ تھا۔ ان دونوں کی داستانِ محبت کشمیر کے رومانی ادب کے شاعرانہ ترین ابواب میں سے ایک ہے۔ ایک مختصر جدائی پر یوسف شاہ پکار اٹھا—

شد ثار سر و مار سر از گریہ دو چشمم

[تارسر اور مارسر پرگنہ پھاک کی دو جھیلیں ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ تارسر کے معنی تارا دیوی کی جھیل کے ہیں، اور مارسر کامدیو کی جھیل ہے۔] حبہ یا حب کا ذکر آگے چل کر "کشمیر کی نامور خواتین" کے باب میں آئے گا۔

[گلمرگ سری نگر سے تقریباً ۲۸ میل کے فاصلے پر اور بارہ مولا سے ٹھیک ۱۳ میل جنوب میں واقع ہے۔ یہ مرگ، جس کی شکل کسی قدر ہندسہ 8 سے ملتی جلتی ہے، تقریباً تین میل طویل ہے، اور اس کی چوڑائی چند سو گز سے لے کر ایک میل سے زائد تک ہے۔ یہ ہر طرف سے ان پہاڑیوں میں گھری ہوئی ہے جو دیودار کے گھنے جنگلوں سے ڈھکی ہیں۔ اس کی پوری سطح رنگ برنگے پھولوں سے مزین رہتی ہے۔ مرگ کی بلندی وادیٔ کشمیر کی سطح سے تقریباً ۳۰۰۰ فٹ اور سطحِ سمندر سے ۸۷۰۰ فٹ سے زیادہ ہے۔ یہاں کی آب و ہوا سرد، فرحت بخش اور صحت افزا ہے۔ بارش سری نگر کی نسبت تین گنا ہوتی ہے، پھر بھی وہ مری کی بارش کے دو تہائی سے زیادہ نہیں۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر اور نورجہاں گلمرگ میں بل کھاتی ہوئی ندی کے کنارے سیر و تفریح کے لیے اپنے خیمے نصب کیا کرتے تھے، جس طرح ان سے پہلے یوسف شاہ اور حبہ خاتون اپنے زمانے میں یہاں لطفِ حیات اٹھایا کرتے تھے۔ یوں گلمرگ کشمیر کے شاہی عاشقوں کی سرزمین ہے۔]

امن و امان زیادہ دیر قائم نہ رہا۔ یوسف شاہ کی امورِ سلطنت سے بے اعتنائی کے باعث اس کے امرا میں جلد ہی بے چینی کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ شمس چک، عالم شیر ماگرے اور سید یوسف جیسے سرکردہ سازشیوں کی بازپرس کی گئی۔ بعد ازاں وزیر محمد بٹ اور اس کے بھائی حسین بٹ کے ساتھ ساتھ حسین چک کے بیٹے یوسف چک کی بادشاہ کے خلاف ریشہ

دوانیاں اچانک بے نقاب ہوئیں اور وہ قید کر دیے گئے۔ لیکن حسین چک کا بیٹا یوسف چک قید سے فرار ہو گیا اور لاہور میں لوہر چک کی فوج کے ایک سالار حیدر چک سے جا ملا، جہاں سے دونوں نے خاموشی سے لداخ یعنی مغربی تبت جانے کا فیصلہ کیا۔

اسی سرزمین سے انہوں نے کشمیر پر حملہ کیا، مگر شکست کھائی، گرفتار ہوئے اور سزا کے طور پر ان کی آنکھیں نکال دی گئیں۔ بادشاہ کے بیٹے یعقوب خان نے بھی بغاوت کر کے حیدر چک کا ساتھ دیا۔ دونوں کو شکست ہوئی، لیکن حیدر چک بھاگ کر لاہور میں راجہ مان سنگھ کے پاس پہنچ گیا۔ راجہ کے دل میں پہلے ہی یوسف شاہ کے خلاف کدورت تھی، کیونکہ اس نے راجہ کی پیش کردہ مدد کو حقارت سے ٹھکرا دیا تھا۔ حیدر چک کی سازشوں کا توڑ کرنے کے لیے یوسف شاہ نے خواجہ قاسم کو تحائف کے ساتھ راجہ مان سنگھ کے پاس بھیجا۔ خواجہ نے واپسی پر یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے سیاسی مشن میں کامیاب رہا ہے، حالانکہ راجہ مان سنگھ نوشہرہ اور بھمبر کے اضلاع حیدر چک کو بطور جاگیر پہلے ہی عطا کر چکا تھا۔ اس مہم کے بارے میں ابوالفضل کی ایک جزئی تفصیل یہاں نقل کی جاتی ہے: ”جب ایلچی میر طاہر اور صالح عاقل کشمیر سے واپس آئے تو اکبر نے شاہ رخ بہادر، راجہ بھگوان داس، شاہ قلی محرم، مادھو سنگھ، مبارک خان اور دیگر امرا کو مرزا علی اکبر شاہی، شیخ یعقوب کشمیری، حیدر چک اور دیگر کی معیت میں روانہ کیا۔ ... جب فوج تسخیرِ کشمیر کے لیے روانہ ہوئی تو سرداروں کا خیال یہ تھا کہ بھمبر کے راستے جائیں، کیونکہ اس راہ سے بڑی فوجیں آسانی اور تیزی سے پیش قدمی کر سکتی تھیں اور وہاں کے بعض زمیندار بھی خیر خواہ تھے۔“ منصوبہ یہ تھا کہ جب راستے برف سے صاف ہو جائیں اور موسمِ سرما ختم ہو جائے تو درّوں کے راستے پیش قدمی کی جائے۔ اور جب دشمن غافل ہو تو مغل فوج پکھلی کے راستے سے بڑھے، جہاں برف باری نسبتاً کم ہوتی ہے۔ (صفحہ 723)

”اس خبر پر یوسف شاہ چک نے جنگ کا فیصلہ کیا اور بہت سے تجربہ کار افراد کو روانہ کیا تاکہ وہ جہلم کے معاون دریائے کنہار کی ایک تنگ گھاٹی کے قریب قلعہ تعمیر کریں۔ انہیں ہر درّے میں مورچہ قائم کر کے جنگ کی تیاری کرنی تھی۔“ روانہ کی گئی فوج بارہ مولہ سے چھ کوس آگے نکل چکی تھی۔ لیکن مغل فوج کی خوش قسمتی سے یوسف شاہ نے درّوں کے عبور کی دشواری، برف اور بارش کی آمد اور حملہ آور فوج کے گرم ملک کے باشندے ہونے کا خیال کر کے اچانک اپنے آدمی واپس بلا لیے۔ چنانچہ یوسف شاہ نے اپنا منصوبہ بدل دیا۔

مگر یوسف شاہ کو خاصی تاخیر سے معلوم ہوا کہ اکبر کا لشکر پکھلی یا ہزارہ کے قریب پہنچ چکا ہے اور مغل افواج نشیب و فراز طے کرتی ہوئی دریائے جہلم کے دائیں کنارے پر بلیاسہ (قدیم بولیاسکہ، جو غالباً اب بونیار کہلاتا ہے) کے نزدیک آپہنچی ہیں، جو بارہ مولہ سے تقریباً 50 میل اور ایبٹ آباد سے چھ منزلوں کے فاصلے پر ہے۔ محمد شاہ رخ اور راجہ بھگوان داس کی مہم مغرب کی جانب سے بڑھی اور دریائے جہلم کے بہاؤ اور موجودہ سڑک کے خط پر چلتی رہی۔ لیکن یہ فوجیں کشمیر کی سرحدوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جہانگیر نے توزک (جلد دوم، صفحہ 132) میں اسی کا ذکر کیا ہے کہ یعقوب شاہ نے بھگوان داس کی فوج سے بلیاسہ کے مقام پر جنگ کی، جسے وہ ”بھیل بس“ کہتا ہے اور جسے وہ کشمیر کی سرحد قرار دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یوسف نے انتہائی بزدلی کا مظاہرہ کیا اور اپنی فوج اور ملک کو چھوڑ دیا۔ البتہ یعقوب نے بڑی پامردی سے جنگ کی؛ اور مغل فوج سردی، رسد کی گرانی، دشوار گزار راستوں اور بارش و برف باری سے سخت پریشان ہوئی اور کسی بھی شرط پر پسپائی کو غنیمت جاننے لگی۔ (یہ بیان اکبر نامہ کے انگریزی ترجمے از بیورج (Beveridge)، جلد سوم، باب ۸۵، صفحات 715 تا 725 پر مبنی ہے۔)

اسی اثنا میں اکبر نے تیمور بیگ کو یوسف شاہ کے پاس بھیجا۔ جواباً یوسف شاہ نے اپنے بیٹے یعقوب خان کو، جو اب اپنے والد سے اختلافات ختم کر چکا تھا، تحائف کے ساتھ فتح پور سیکری میں اکبر کے دربار میں روانہ کیا۔ کابل میں حکمرانی کرنے والے اپنے سوتیلے بھائی مرزا حکیم کی وفات کی خبر ملنے پر شہنشاہ نے وہاں جانے کا ارادہ کیا اور خواہش ظاہر کی کہ راستے میں یوسف شاہ سے ملاقات ہو۔ جب یوسف شاہ حاضر نہ ہوا تو اکبر نے میر طاہر اور صالح عاقل دیوانہ کو حکم دیا کہ یوسف کو دربار میں پیش کریں۔ یعقوب خان تیز رفتار منزلیں طے کر کے کشمیر پہنچا تاکہ اپنے والد کو آگاہ کرے، جو خواجہ قاسم کی اکساہٹ پر اکبر کی اس اہانت پر سخت برہم تھا۔ یوسف شاہ کے امرا نے اسے اکبر کے دربار میں جانے سے باز رکھا۔ کشمیر کا تخت حاصل کرنے میں اکبر نے یوسف کی عملاً کوئی مادی مدد نہیں کی تھی۔ لیکن یہ بھی درست ہے کہ اگر یہ بات مشہور نہ ہوتی کہ اکبر اس کی مدد پر آمادہ ہے تو یوسف کو اتنی آسانی سے کامیابی نہ ملتی۔ اکبر کے مؤرخین اس کے بعد سے یوسف کو باج گزار قرار دیتے ہیں اور اسے یوسف خان لکھتے ہیں۔ یوسف کا اپنا نقطۂ نظر — جیسا کہ سر والٹر ہیگ (Sir W. Haig) نے (کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد سوم، صفحہ 292 پر) لکھا ہے — یہ تھا کہ چونکہ اس نے غیر ملکی فوجوں کی مدد کے بغیر اپنا تخت دوبارہ حاصل کیا تھا، اس لیے وہ بدستور ایک خود مختار فرماں روا تھا۔

اکبر نے ۲۰ دسمبر ۱۵۸۵ء کو راجہ بھگوان داس، شاہ رخ مرزا اور شاہ قلی خان کو کشمیر پر پیش قدمی کا حکم دیا۔

لارنس بنین (Laurence Binyon) نے نشان دہی کی ہے کہ اکبر اپنی مہمات کی قیادت خود نہیں کرتا تھا، اور بحیثیت حکمران اس کی یہ کمزوری تھی کہ وہ اپنے نائبین کے انتخاب میں

ہمیشہ دانش مندی سے کام نہیں لیتا تھا۔ کشمیر کی مہم پر بھیجے گئے تینوں سالاروں میں باہم جھگڑا ہو گیا۔ ان میں سے ایک "بیربل تھا — جو سپاہی یا سالار سے زیادہ ایک موسیقار، شاعر اور ظریف تھا۔" اکبر آٹھ ہزار سپاہیوں کے نقصان کی خبر تو نسبتاً سکون سے سن سکتا تھا، مگر بیربل کے مارے جانے کا صدمہ اس کے لیے ناقابلِ برداشت تھا، جو اس معرکے میں کام آیا۔ بیربل — اس کا پیارا بیربل، اس کا شگفتہ مزاج رفیق، جس کی آواز، جو شاموں کو اس کی اپنی تصنیف کردہ نظمیں گاتی یا سناتی تھی، اب بھی اس کے کانوں میں گونجتی تھی؛ بیربل، جس کے لیے اس نے فتح پور سیکری میں ایسا خوب صورت مکان بنوایا تھا؛ بیربل، وہ واحد ہندو جس نے شہنشاہ کے نئے مذہب دینِ الٰہی کو قبول کیا تھا۔ (لارنس بنین کی کتاب "اکبر"، پیٹر ڈیوس لمیٹڈ، ۱۹۳۲ء، صفحات 134-35) لیکن سیر المتاخرین (جلد اول، صفحہ 192) کے مطابق اکبر نے ابوالفضل اور بیربل کے درمیان قرعہ اندازی کی تھی؛ قرعہ بیربل کے نام نکلا اور اسی بنا پر اسے جانا پڑا۔ چونکہ عسکری اعتبار سے کامیابی کا دعویٰ ممکن نہ تھا، اس لیے بھگوان داس نے صلح کی شرائط پیش کر کے سفارتی طور پر صورتِ حال سنبھالنے کی کوشش کی، جس پر یوسف شاہ اس کے کیمپ میں آیا۔ یوسف کی غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر کشمیری امرا نے یعقوب خان کو تخت پر بٹھا دیا، اور مزید برآں شاہی فوج پر حملہ کر کے اسے بھاری نقصان پہنچایا۔

راجہ بھگوان داس یعقوب سے صلح کرنے پر مجبور ہوا، جس کی سب سے اہم شرط کشمیر کی طرف سے اکبر کو سالانہ خراج کی ادائیگی تھی۔ اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ کشمیریوں نے یہ ماننے کی پیش کش کی کہ "منبروں اور سکوں پر شہنشاہ کا نام ہو، اور ٹکسال، زعفران، ریشم اور شکار شاہی ملکیت قرار پائیں۔ ہر محکمے پر ایک نگران یا داروغہ مقرر کیا جائے اور اس کے بعد فوج واپس چلی جائے۔ ... حضورِ والا نے ... اس معاہدے کو قبول فرمایا۔" راجہ یوسف شاہ کو اکبر

کے دربار میں لے گیا۔ لیکن اکبر نے وہ معاہدہ منظور کرنے سے انکار کر دیا جو راجہ بھگوان داس نے کیا تھا، اور یوسف کو قیدی بنا کر عہد شکنی کی۔

بھگوان داس نے، جو معاملۂ ناموس میں نہایت حساس تھا، خودکشی کر لی۔

یہاں یوسف شاہ چک کا بحیثیت حکمران خاتمہ ہو جاتا ہے۔

وہ فیاض تھا۔ صاحبِ علم و ذوق تھا۔ ایک روشن خیال شیعہ تھا۔ لیکن کمزور اور متلوّن مزاج تھا۔ قوتِ فیصلہ کے فقدان اور امورِ سلطنت سے بے اعتنائی نے اس سے اس کا تاج چھین لیا۔ اسے چاہیے تھا کہ تدبر اور استقلال سے دھڑے بندیوں اور اپنے امرا کو قابو میں رکھتا۔ ان اوصاف سے وہ محروم تھا اور اپنے وطن سے دور اس کی زندگی کا خاتمہ ہوا۔ یوسف نے شیر افگن خان کے حملے کا جواب دینے میں بہادری دکھائی اور اسے بنگال میں بردوان کے قریب قتل کیا۔

یعقوب شاہ چک (۹۹۴ھ / ۱۵۸۶ء)

جس طرح حبیب شاہ سلطان شمس الدین شاہ میر کی اولاد، شاہ میری خاندان، کا آخری فرماں روا تھا، اسی طرح یعقوب شاہ چکوں کا آخری حکمران تھا۔ تخت نشینی پر یعقوب نے ایک ممتاز عہدے دار علی ڈار کو اپنا وزیر بنایا اور خود عیش و عشرت کی زندگی اختیار کر لی۔ فطری نتیجہ بد نظمی اور بدانتظامی کی صورت میں نکلا۔

پہلے وزیر علی ڈار نے بغاوت کی، شہر سے فرار ہوا اور ڈوب کر ہلاک ہوا۔ دوسرے وزیر محمد بٹ نے اہلِ سنت پر بے دریغ ظلم و ستم روا رکھا۔ قاضی القضاۃ قاضی موسیٰ کو یعقوب شاہ

نے بے رحمی سے قتل کرا دیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب چاہتا تھا کہ قاضی نمازِ جمعہ کے خطبے میں پیغمبرِ اسلام کے دیگر تین خلفا کو چھوڑ کر صرف حضرت علیؓ کا نام برقرار رکھے۔ قاضی موسیٰ نے اس پر اعتراض کیا اور کہا کہ دنیاوی حکمرانوں کا روحانی معاملات سے کوئی سروکار نہیں۔ یعقوب ناراض ہوا؛ اس نے جلاد کو بلوایا اور قاضی موسیٰ کو قتل کرا دیا۔ قاضی موسیٰ کا گھر بھی لوٹ لیا گیا۔ (اس کی مفصل روایت رفیع الدین احمد غافل کی نوادر الاخبار میں ملے گی — برٹش میوزیم کے فارسی مخطوطات کے کیٹلاگ، Add. 24,029، صفحہ 299) اہلِ سنت فطری طور پر اس قدر خوف زدہ ہوئے کہ شیخ یعقوب صرفی اور بابا داؤد خاکی نے اکبر سے مدد کی درخواست کی اور اس کے ساتھ حسبِ ذیل عہد نامہ طے کیا:

یہ کہ حکمران فرماں روا مذہبی امور، اشیا کی خرید و فروخت اور غلّے کے نرخوں میں مداخلت نہیں کرے گا۔

یہ کہ کشمیر کے اعیان و عمّال کسی کشمیری کو، خواہ مرد ہو یا عورت، ہندو ہو یا مسلمان، غلام نہیں بنائیں گے۔ [غالباً اس شرط کا مقصد مفتوحہ علاقوں سے غلام بنانے کے مغل دستور کا سدِباب تھا۔]

یہ کہ ملک کے باشندوں کو کسی طرح ستایا جائے گا نہ ان پر ظلم ڈھایا جائے گا اور نہ ان سے ناجائز وصولیاں کی جائیں گی۔

یہ کہ کشمیر کے امرا، چونکہ فساد کا سرچشمہ رہے ہیں، فی الحال اپنے ملک کے نظمِ حکومت میں کوئی حصہ نہیں پائیں گے۔

قاسم خان کو حکم ملا کہ ۲۸ جون ۱۵۸۶ء کو چالیس ہزار سواروں اور بیس ہزار پیادوں کی فوج لے کر کشمیر پر چڑھائی کرے۔ وہ راجوری میں داخل ہوا اور سری نگر کی طرف بڑھا۔ یعقوب نے صورتِ حال سنبھالنے کی متعدد کوششیں کیں، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ یوسف اور یعقوب کے فرار پر اس شعر میں طنز کیا گیا ہے:

عزیزان یوسف از گم شد؛ چہ شد یعقوبرا بارے نہ از یوسف نشان دیدم؛ نی از یعقوب آثار

مرزا قاسم ۹۹۵ھ (۱۵۸۶ء) میں سری نگر میں داخل ہوا۔ اسی تاریخ سے کشمیر غیر ملکی تسلط میں آگیا اور اب اس نے ایک مغل صوبے کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا۔

اب جب کہ ہم کشمیر کی بحیثیت ایک آزاد ملک داستان ختم کر رہے ہیں، اس آزادی کے زیاں پر چند معروضات شاید بے محل نہ ہوں۔

شاہ میر کشمیر کے لیے ایک اجنبی تھا، لیکن جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں، اس نے کشمیر کو تغلقوں کی غلامی سے بچایا۔ چکوں نے مرزا حیدر دوغلت کی شکست اور موت کا سامان کیا اور بابر اور ہمایوں کو کشمیر کو اپنی ریاست بنانے سے روکے رکھا۔ بلاشبہ کشمیر بابر کے پوتے، اکبرِ اعظم، کے ہاتھوں فتح ہوا، لیکن یہ فتح اکبر کی عسکری قوت سے زیادہ خود کشمیر کے اندرونی اسباب کی مرہونِ منت تھی۔ اکبر کے اپنے وزیرِ اعظم ابوالفضل نے ایک موقع پر اعتراف کیا تھا کہ اگر کشمیر کا حکمران کشمیر کے درّوں کو مضبوط کر لے تو "ہزاروں رستموں" کی فوج کے لیے بھی اس ملک پر قبضہ کرنا دشوار بلکہ ناممکن ہو گا۔ (صفحہ 17 کا حاشیہ ملاحظہ ہو)

شاہ میر کی آخری اولاد نے خانہ جنگی اور نااہلی کے سبب کشمیر کھویا۔ لیکن وہ متعصب یا مذہبی جنونی نہ تھے۔ وہ روادار، بردبار اور مہذب لوگ تھے۔ انہوں نے فوجی بھرتی کے

معاملے میں کوئی امتیاز روا نہ رکھا۔ اس کے برعکس چکوں نے اپنے نئے مسلک کی آڑ میں مظالم کیے، اگرچہ یہ درست ہے کہ اہلِ تشیع مرزا حیدر دوغلت کے ہاتھوں ستم اٹھا چکے تھے۔ چکوں نے فوج کی بھرتی زیادہ تر شیعوں تک محدود رکھی، اور یوں انہوں نے فوج کو صرف اپنا وفادار تو بنا لیا، مگر وہ مجموعی طور پر پورے ملک کے دفاع کے قابل نہ رہی۔

للتادتیہ مکتاپیڈ (۷۲۵ء تا ۷۵۳ء) نے کشمیر کے حکمرانوں کو کسی ایک ضلعے سے—جس سے مراد کوئی ایک قبیلہ یا ذات بھی تھی—فوج بھرتی کرنے سے خبردار کیا تھا۔ یہ دانش مندانہ نصیحت تھی۔ چکوں نے اسے نظر انداز کیا۔ انہوں نے اپنی فوج اٹھائی اور اپنے فوجی افسر زیادہ تر شیعوں ہی میں سے بھرتی یا ترقی دے کر مقرر کیے۔ چک خود قدیم زمانے کے جاگیردار ڈامروں کا نیا روپ بن چکے تھے۔ اپنی شجاعت سے چکوں نے شاہ میریوں کا تختہ الٹا تھا۔

اور اپنی جاگیرداریت اور دھڑے بندیوں سے انہوں نے اپنے زوال کا سامان کیا۔ کیونکہ مذہبی تعصب، زیادہ تر اپنے ہی لوگوں میں سے فوج کی بھرتی، اور اس کے نتیجے میں اہلِ کشمیر میں پیدا ہونے والی گروہ بندیوں ہی کے باعث اکبر کو دعوت دی گئی کہ وہ کشمیر کو جنونیت اور ظلم سے نجات دلائے۔ یہاں بلغاریہ کی تاریخ کا ایک سبق ہے، جس کا ذکر ناگزیر ہے۔ ''ہسٹورینز ہسٹری آف دی ورلڈ'' کا ایک اقتباس اسے بخوبی واضح کر دے گا: ''صدیوں تک بلغاریوں نے (بلقان کے) پورے جزیرہ نما کو اپنے قبضۂ اثر میں رکھا، اپنا ادب اور تہذیب باقی راسخ الاعتقاد سلاوی دنیا کے ساتھ بانٹی، اور ایک مقامی فرقے کے عقائد کے ذریعے پورے جنوبی یورپ کو ہلا کر رکھ دیا—اور انجام کیا ہوا؟ وہ قوم جس کا کبھی اتنا احترام کیا جاتا تھا اور جس سے اتنا خوف کھایا جاتا تھا، سیاسی طور پر ترکوں کے اور علمی و ذہنی طور پر یونانیوں کے جوے تلے آ گئی، اور اس غلامی میں اس وقت تک رہی جب تک ہمارے

زمانے میں اس نے ثابت نہ کر دیا کہ اس کا کام ابھی ختم نہیں ہوا۔ وہ تین اسباب جو (بلغاریہ کی) سلطنتِ ترنووا کے زوال کا براہِ راست باعث بنے، بازنطینیت، بوگومل ازم اور قرونِ وسطیٰ کی جاگیرداریت تھے۔" (جلد ۲۴، صفحہ 175) چکوں کے زوال کے اسباب یہ تھے: (۱) قرونِ وسطیٰ کی وہ جاگیرداریت جس نے جاگیرداروں میں لڑائیوں اور دھڑے بندیوں کو فروغ دیا، اور (۲) بوگومل ازم، جو ان کے معاملے میں مذہبی جنونیت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ [بلغاریہ کی بوگومل ازم کی بنیاد دسویں صدی عیسوی کے نصفِ اول کے لگ بھگ بوگومل (لفظی معنی: خدا کی محبت) نامی ایک مصلح نے رکھی تھی۔ بوگومل ازم کی الٰہیات دو اصل عناصر — ایک خیر اور ایک شر — پر قائم تھی، جو مشرق سے درآمد شدہ ایک طرح کی مانویت تھی۔]

اب آئیے کشمیر میں مغل اقتدار کی ولادت کی طرف متوجہ ہونے سے پہلے یعقوب شاہ کو سپردِ خاک کریں۔

ہم جانتے ہیں کہ یعقوب کی شادی ۱۵۷۲ء میں کشتواڑ کے راجہ بہادر سنگھ کی بیٹی شنکر دیوی سے ہوئی تھی۔ شنکر دیوی، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، فتح خاتون بنی۔ ۱۵۸۶ء میں اپنی شکست کے بعد یعقوب کشتواڑ، اپنی جاں نثار ملکہ کے وطن، جا پہنچا۔

یہاں سے اس نے ۱۵۸۷ء میں کشمیر واپس لینے کی ایک اور کوشش کی، مگر ناکام رہا۔

۱۵۸۸ء میں یعقوب کا کشتواڑ میں انتقال ہوا اور وہیں مدفون ہوا۔ (نوادر الاخبار کے مصنف رفیع الدین احمد بن عبد الصبور بن خواجہ محمد بلخی کشمیری، تخلص غافل — جس کی یہ تصنیف قدیم ترین زمانے سے فتحِ اکبری تک کشمیر کی تاریخ ہے اور جسے مصنف نے شاہجہان آباد میں

صفر ۱۱۳۶ھ (۱۷۲۳ء) میں مکمل کیا — کا بیان ہے کہ یعقوب خان چک کی موت اکبر کے بھیجے ہوئے زہر سے واقع ہوئی۔ — ریو (Rieu) کا کیٹلاگ، جلد اول، ۱۸۷۹ء، صفحہ 300)

قصبہ کشتواڑ سے باہر چوگان پر واقع سرکوٹ کے تالاب کے جنوب میں ہے۔ فتح خاتون نے اپنے شوہر کی یاد میں ایک نہر تعمیر کرائی۔ یہ نہر کشتواڑ کے لیے یقیناً ایک بڑی نعمت ثابت ہوئی ہوگی، کیونکہ یہ علاقہ پانی کی قلت کا شکار ہے۔ اس نے ایک تالاب بھی بنوایا اور کالی ناگ سے موضع زیوار تک ایک اور نہر نکالی۔

کشمیر کے آخری خودمختار مسلمان حکمران کی آخری آرام گاہ آج ایک پنڈت کی ملکیت میں شامل کھیت کے ایک کونے میں چونے اور پتھر کے ایک پست ڈھیر کے سوا کچھ نہیں!

پتھر اور چونے کا یہ ڈھیر کشتواڑ کے ایک کھیت میں کشمیر کے آخری خودمختار مسلمان حکمران یعقوب شاہ چک کی آخری آرام گاہ کی نشان دہی کرتا ہے۔

پکھلی

صفحہ 87 کے حاشیہ 1 میں پکھلی کا بیان آیا ہے، جس کا ذکر اس باب میں بھی متعدد بار ہوا ہے؛ اس لیے یہاں اس کے بارے میں کچھ مزید معلومات درج کی جاتی ہیں: "پنجاب کے مغل صوبے کی ایک قدیم سرکار یا ضلع، جو اب شمال مغربی سرحدی صوبے کے ضلع ہزارہ میں شامل ہے۔ پکھلی کم و بیش اسی قدیم اُرسا کے مطابق ہے جسے بطلیموس (Ptolemy) دریائے بِداسپیس (جہلم) اور دریائے سندھ کے درمیان واقع بتاتا ہے۔ سکندر کے عہد میں اس کے بادشاہ کا نام ارساکیس تھا، جب کہ ہیون سانگ (Hiuen Tsiang) نے اسے کشمیر کا باج گزار پایا۔ کشمیر کی تاریخ راج ترنگنی میں یہ کبھی ایک جداگانہ مملکت کے طور پر

اور کبھی اس ریاست کے باج گزار کی حیثیت سے نظر آتا ہے۔ اسی خطے میں اگرور واقع تھا، جو قدیم اتیوگرہ پور ہے۔ بابر کے زمانے میں یہ علاقہ کھکھا اور بمبا قبائل کے قبضے میں تھا، جن کے سردار دریائے سندھ کے مشرقی علاقوں کے قدیم حکمران رہ چکے تھے، مگر باجوڑ اور سوات کے گبری سلاطین نے انہیں نکال باہر کیا تھا؛ اور اس خطے کا نام انہی فاتحین میں سے ایک، پکھلی، کے نام پر پڑا۔ آئینِ اکبری میں اس کی حدودیوں بیان ہوئی ہیں کہ اس کے مشرق میں کشمیر، جنوب میں گکھڑوں کا ملک، مغرب میں اٹک اور شمال میں کٹور (چترال) واقع ہے۔ درانی عہدِ حکومت میں سعادت خان کو پکھلی کا سردار مقرر کیا گیا، جو اس وقت کشمیر کا زیرِ نگیں علاقہ تھا۔ اسی نے گڑھی سعادت خان کا قلعہ تعمیر کیا، جو تیمور شاہ کے خلاف آزاد خان کی بغاوت کا صدر مقام بنا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں پکھلی تین اضلاع پر مشتمل تھا: جنوب اور جنوب مشرق میں مانسہرہ، شمال مشرق میں شنکیاری (جو کانڈی اور میدان میں منقسم تھا) اور وسط میں بھیر کنڈ۔ کاغان، بھوگڑمنگ اور اگرور کی وادیاں اس کے تابع تھیں۔“ — امپیریل گزیٹیئر آف انڈیا (The Imperial Gazetteer of India)، جلد XIX (نیا ایڈیشن)، آکسفورڈ پریس، ۱۹۰۸ء، ص 18-19۔

”تحصیل مانسہرہ کا میدانِ پکھلی، جو سطح سمندر سے 3,000 فٹ بلند ہے، شمالاً جنوباً 11 میل اور شرقاً غرباً 10 میل پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ ایک زرخیز اور نہایت شاداب و مزروعہ خطہ ہے، خصوصاً اس کا مغربی حصہ، جو دریائے سرن سے سیراب ہوتا ہے۔“ — گزیٹیئر آف دی ہزارہ ڈسٹرکٹ (Gazetteer of the Hazara District)، ۱۹۰۷ء، مرتبہ و مدونہ ایچ ڈی واٹسن (H. D. Watson)، سیٹلمنٹ آفیسر، چیٹو اینڈ ونڈس، لندن، ۱۹۰۸ء، ص 3۔

تاریخِ کشمیر سے متعلق مغل حکمران (۱۵۸۶ء تا ۱۷۵۲ء)

۱۔ جلال الدین اکبر، ۱۵۵۶ء تا ۱۶۰۵ء = ۹۶۳ھ تا ۱۰۱۴ھ؛ ۱۵۸۶ء میں کشمیر فتح کیا۔

۲۔ نور الدین جہانگیر، ۱۶۰۵ء تا ۱۶۲۷ء = ۱۰۱۴ھ تا ۱۰۳۷ھ۔

۳۔ داور بخش، جہانگیر کے سب سے بڑے بیٹے شہزادہ خسرو کا بیٹا، ۱۶۲۷ء = ۱۰۳۷ھ۔ خسرو ۱۶۲۲ء ہی میں فوت ہو چکا تھا۔

۴۔ شہاب الدین شاہ جہاں، ۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۷ء = ۱۰۳۷ھ تا ۱۰۶۸ھ۔

۵۔ مراد بخش، شاہ جہاں کا چوتھا بیٹا، ۱۶۵۷ء = ۱۰۶۸ھ۔

۶۔ شاہ شجاع، شاہ جہاں کا دوسرا بیٹا، ۱۶۵۷ء = ۱۰۶۸ھ۔

۷۔ محی الدین اورنگزیب عالمگیر، ۱۶۵۸ء تا ۱۷۰۷ء = ۱۰۶۸ھ تا ۱۱۱۸ھ۔

۸۔ اعظم شاہ، اورنگزیب عالمگیر کا دوسرا بیٹا، ۱۷۰۷ء = ۱۱۱۸ھ۔

۹۔ کام بخش، اورنگزیب عالمگیر کا چوتھا بیٹا، ۱۷۰۷ء = ۱۱۱۹ھ۔

۱۰۔ قطب الدین معظم شاہ عالم بہادر، ۱۷۰۷ء تا ۱۷۱۲ء = ۱۱۱۹ھ تا ۱۱۲۴ھ۔

۱۱۔ عظیم الشان، شاہ عالم بہادر کا دوسرا بیٹا، ۱۷۱۲ء = ۱۱۲۴ھ۔

۱۲۔ معز الدین جہاندار شاہ، شاہ عالم بہادر کا سب سے بڑا بیٹا، ۱۷۱۲ء = ۱۱۲۴ھ۔

۱۳۔ محی الدین فرخ سیر، عظیم الشان کا بیٹا، ۱۷۱۳ء تا ۱۷۱۹ء = ۱۱۲۴ھ تا ۱۱۳۱ھ۔

۱۴۔ رفیع الدرجات، رفیع الشان کا بیٹا اور جہاندار شاہ کا تیسرا بھتیجا، ۱۷۱۹ء = ۱۱۳۱ھ۔

۱۵۔ رفیع الدولہ شاہ جہاں ثانی، رفیع الشان کا بیٹا اور جہاندار شاہ کا دوسرا بھتیجا، ۱۷۱۹ء = ۱۱۳۱ھ۔

۱۶۔ ناصر الدین محمد شاہ، معظم شاہ عالم بہادر کے چوتھے بیٹے جہان شاہ کا بیٹا اور جہاندار شاہ کا بھتیجا، ۱۷۱۹ء تا ۱۷۴۸ء = ۱۱۳۱ھ تا ۱۱۶۱ھ۔

۱۷۔ محمد ابراہیم، رفیع الشان کا بیٹا اور جہاندار شاہ کا بھتیجا (محمد شاہ کے ساتھ بیک وقت)، ۱۷۱۹ء تا ۱۷۲۰ء = ۱۱۳۱ھ تا ۱۱۳۲ھ۔

۱۸۔ مجاہد الدین احمد شاہ بہادر، محمد شاہ کا بیٹا، ۱۷۴۸ء تا ۱۷۵۴ء = ۱۱۶۱ھ تا ۱۱۶۷ھ۔ اس کے بعد ۱۷۵۲ء میں کشمیر افغان حکمران احمد شاہ درانی کے قبضے میں چلا گیا۔

باب ششم — مغلوں کے عہد میں کشمیر

چک خواہ کیسے ہی بہادر تھے، ان میں کامیاب حکمرانوں اور منتظمین کے لیے ضروری اوصاف مفقود تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا اقتدار، جو صرف ایک نسل یعنی تقریباً اکتیس برس پر محیط تھا، تیزی سے اپنے انجام کو پہنچا۔ کشمیر پر مغلوں کی ابتدائی کوششوں کا اعادہ غیر ضروری ہے کیونکہ ان کا بیان گزشتہ باب میں آ چکا ہے۔ ان کا آغاز بابر سے ہوتا ہے، ہمایوں اور مرزا حیدر دُغلت کے ہاں ان کا تسلسل قائم رہتا ہے، اور اکبر کے ہاتھوں یہ کامیابی سے ہمکنار ہوتی ہیں۔ اکبر نے علی شاہ چک کے زمانے میں کشمیر کے معاملات میں مداخلت کا آغاز کیا۔ پھر اس نے لوہریا گوہر شاہ چک کے خلاف یوسف شاہ چک کی مدد کی۔ بعد ازاں اس نے یوسف کو نظربند کیا اور بالآخر یوسف کے بیٹے یعقوب کو بے دخل کر کے کشمیر کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔ مغلوں نے کشمیر پر ۱۶۶ برس حکومت کی۔ تاہم شہنشاہ محمد شاہ کے عہد میں انتشار انگیز قوتیں زور پکڑ گئیں، اور ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ کے حملے نے مغل سلطنت کی عظیم الشان عمارت کے انہدام کو تیز تر کر دیا۔ نادر شاہ نے افغانستان کو اپنی قلمرو میں شامل کر لیا۔ اس کی وفات کے بعد احمد شاہ درانی نے افغانستان پر مکمل تسلط حاصل کیا اور کشمیر کو اُس وقت اپنی مملکت میں شامل کیا جب محمد شاہ کا بیٹا شہنشاہ احمد شاہ دہلی کے تخت پر متمکن تھا۔

آخری چک فرماں روا کی آخری کوشش

۱۵۸۶ء میں اکبر کی فتح کے بعد کشمیر نے مغل اقتدار کے آگے آسانی سے سرِ تسلیم خم نہ کیا۔ معزول چک بادشاہ یعقوب شاہ اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی بازیابی کے لیے اب بھی سرگرمِ عمل تھا۔ یعقوب کا بھائی ابراہیم چک اور ملک حیدر چاڈورہ کا بھائی علی ملک چاڈورہ اس سے آ ملے۔ انہوں نے چیر وانی (تحصیل بڈگام میں) کے مقام پر مغلوں کو غافل پا کر جا لیا، اور یعقوب شاہ چک بادشاہ کی حیثیت سے دوبارہ سری نگر میں داخل ہوا۔

چیر وانی اور چیر اُڈر دو نام ہیں جو کشمیر کی فارسی تواریخ میں ایک ہی مقام کے لیے آتے ہیں۔ چیر وانی کے معنی چیر یعنی جنگلی خوبانی کے باغ کے ہیں، جب کہ چیر اُڈر سے مراد جنگلی خوبانیوں کا اُڈر یا کریوہ، یعنی دریا آوردہ سطحِ مرتفع ہے۔ یہ مقام بڈگام سے، جو اسی نام کی تحصیل کا صدر مقام ہے، چار میل کے فاصلے پر واقع ہے، اور خود بڈگام سری نگر سے نو میل دور ہے۔ کریوہ یا اُڈر کے سرے پر ایک قلعہ تھا جو اب کھنڈر ہے۔ چیر وانی یا چیر اُڈر بظاہر پونچھ اور کشمیر کے مابین جنگ کا ایک موزوں میدان رہا ہے، کیونکہ یہ سری نگر سے توشہ میدان اور وہاں سے پونچھ جانے والے راستے پر واقع ہے۔ چیر وانی یا چیر اُڈر سری نگر سے 13 میل اور توشہ میدان سے 15 میل کے فاصلے پر ہے۔ مہاراجہ گلاب سنگھ کے وزیرِ اعظم دیوان جوالا سہائے نے اسے آباد کیا اور اسے نیا نام دیا۔ ۱۹۴۱ء میں اس کی آبادی 769 تھی۔

اس کے بعد شمسی چک، سید حسین بیہقی اور شمس ڈولی نے مغلوں کو شکست دی۔ سارا ملک برسرِپیکار تھا اور کشمیر کا ہاتھ سے نکل جانا قریب نظر آتا تھا۔

[بہارستانِ شاہی قدیم ترین زمانے سے ۱۰۲۳ھ (۱۶۱۴ء) تک کی تاریخِ کشمیر ہے۔ مصنف، جس کا نام مذکور نہیں (Add 16,706، ریو (Rieu) کا کیٹلاگ، جلد اول،

۱۸۷۹ء، صفحات 296-297)، بظاہر ایک کشمیری، سید ابو المعالی بیہقی، کا وابستہ تھا، جسے وہ اپنی تاریخ کے آخری دور میں نمایاں مقام دیتا ہے۔ یہ سید ابو المعالی سید مبارک خان بیہقی کا دوسرا بیٹا تھا، جو ۹۸۶ھ (۱۵۷۸ء) میں چند ماہ کے لیے کشمیر کے تخت پر بٹھایا گیا اور ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں جلاوطنی کے عالم میں فوت ہوا۔ ابو المعالی نے ان پے در پے فتنوں میں سرگرم حصہ لیا جو اکبر کے ہاتھوں فتحِ کشمیر سے پہلے کئی برس تک ملک میں برپا رہے، اور اسی بنا پر اسے راجہ مان سنگھ کی کمان میں دیا گیا جس کے تحت اس نے چوبیس برس خدمات انجام دیں۔ مان سنگھ کی وفات ۱۰۲۱ھ (۱۶۱۲ء) کے بعد اسے حیدر ملک چاڈورہ کے ہمراہ شہنشاہ جہانگیر کے حضور پیش کیا گیا جس نے اسے منصب عطا کیا۔

چنانچہ اس ابو المعالی کو اُس ابو المعالی سے خلط ملط نہیں کرنا چاہیے جسے بدایونی "عالی نسب سید اور ملکِ کاشغر کا باشندہ" قرار دیتا ہے اور جو ہمایوں کے امرا میں سے تھا۔ اس نے ماہ چوچک بیگم کی بیٹی فخر النسا سے شادی کی، بیرم خان سے اس کے جھگڑے رہے، اور بالآخر اکبر کے جلوس کے نویں سال عیدِ رمضان کے موقع پر کابل میں مرزا سلیمان کے ہاتھوں گلا گھونٹ کر ہلاک کر دیا گیا۔ طبقاتِ اکبری (ڈی (De) کے انگریزی ترجمے، ص 734) اور اکبر نامہ (بیوریج (Beveridge) کے انگریزی ترجمے، جلد 2، ص 154) کے مطابق یہ ابو المعالی بھی اکبر کے جلوس کے پہلے سال کشمیر پر تاخت کے ارادے سے آیا تھا اور بھمبر اور راجوری کے درمیان واقع قصبے نوشہرہ میں مقیم رہا۔ ابو المعالی بارہ مولا کی جانب بڑھا اور پٹن کے قریب مرکلہ کے مقام پر غازی چک کے ہاتھوں شکست کھا کر "راہِ فرار اختیار کر گیا۔" شاہ ابو المعالی کی اس یورش کا ذکر پنڈت شُکا نے کنگز آف کشمیرا (ص 389) میں کیا ہے۔]

کشمیر کے فاتح اور نائب السلطنت قاسم خان میر بحر نے بالآخر اکبر سے مدد طلب کی، جس نے پچیس ہزار سواروں کی ایک قوی فوج کے ساتھ سید یوسف خان رضوی مشہدی کو روانہ کیا۔ شہنشاہ نے مزید ہدایت کی کہ محمد بٹ اور بابا خلیل، جو دو بااثر کشمیری امرا تھے اور اُس وقت اس کے دربار میں مقیم تھے، سید یوسف کے ہمراہ جائیں اور اسے ہر ممکن مدد بہم پہنچائیں۔ ان امرا نے کئی طاقت ور چکوں کو اپنی جانب مائل کر لیا۔ عین اسی زمانے میں یعقوب کے اپنے امرا کے ساتھ ناعاقبت اندیشانہ رویّے اور ہندوؤں اور سنیوں کے ساتھ اس کے غیر منصفانہ سلوک نے اگست ۱۵۸۹ء میں اس کے قطعی زوال کی راہ ہموار کر دی۔ اکبر سے تین برس کی کشمکش کے بعد یعقوب نے اس کے آگے ہتھیار ڈال دیے اور سید ابو المعالی بیہقی اور ابراہیم خان المعروف ایبا خان کے ہمراہ کشتواڑ میں گوشہ نشین ہو گیا۔ اس طرح ۱۵۸۹ء میں کشمیر کی آزادی کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ قاسم خان میر بحر کئی کشمیری امرا کے ساتھ دربار میں حاضر ہوا اور اپنی جگہ سید یوسف خان رضوی مشہدی کو بطور گورنر چھوڑ گیا۔

یوسف شاہ چک کا انجام

یوسف شاہ چک کو بہار جلاوطن کر دیا گیا، جہاں وہ صوبے کے گورنر مان سنگھ کی نگرانی میں نظر بند رہا۔ لگ بھگ ایک برس بعد یوسف شاہ چک کو ”پانچ صدی“ کے منصب پر مامور کیا گیا، جس کے ساتھ 2,100 سے 2,500 روپے ماہانہ تک تنخواہ اور بہار میں ایک جاگیر وابستہ تھی۔ اگرچہ یہ منصب کسی معزول فرماں روا کے شایانِ شان ہرگز نہ تھا، تاہم یوسف شاہ نے کئی برس مان سنگھ کے تحت اسی حیثیت میں خدمات انجام دیں۔ اس کی وفات کا وقت اور کیفیت اکبر کے مؤرخین کے ہاں مذکور نہیں معلوم ہوتی۔ لیکن حیدر ملک چاڈورہ کا

بیان ہے کہ یوسف ہندوستان میں شدید جنون اور گہرے مالیخولیا کے باعث فوت ہوا، کیونکہ وہ اپنے وطن، اپنی سلطنت اور اپنی صاحبِ کمال ملکہ حبہ خاتون سے جدا کر دیا گیا تھا۔

تاریخِ اعظمی، تاریخِ حسن اور تاریخِ خلیل مرجان پوری، سب اس نام کو ایبا خان لکھتی ہیں، جب کہ پنڈت نارائن کول عاجز اسے امینہ خان لکھتا ہے۔

قدیم ترین زمانے سے ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) تک کی تاریخِ کشمیر نارائن کول عاجز کی تصنیف ہے۔ کشمیری امرا کے اصرار پر مصنف نے اس کی تاریخ لکھنے کا آغاز شاہ عالم کے عہدِ حکومت کے چوتھے سال ۱۱۲۲ھ (۱۷۱۰ء) میں کیا۔ عارف خان نامی ایک کشمیری نے، جو صوبے دار کا نائب اور دیوان تھا، کشمیر کی سنسکرت تواریخ جمع کر رکھی تھیں، اور ابراہیم خان، جو بعد میں علی مردان خان کہلایا، ان کے مندرجات سے واقفیت کا خواہش مند تھا۔ مصنف کے پیشِ نظر ملک حیدر چاڈورہ کی تاریخ بھی تھی۔ نارائن کول نے اس تمام سنسکرت اور فارسی مواد کو اختصار کے ساتھ موجودہ تلخیص کی صورت دی جو اس کی تاریخِ کشمیر کے نام سے معروف ہے۔ نارائن کول فارسی کا عمدہ شاعر بھی تھا۔

کشمیر کے معزول فرماں روا کے ساتھ جو سلوک روا رکھا گیا اسے، ڈاکٹر وی۔ اے۔ سمتھ (V. A. Smith) کے الفاظ میں، فیاضانہ قرار نہیں دیا جا سکتا (سمتھ کی ”اکبر“، ص 240-41)۔ درحقیقت یہ اکبر کے کردار پر نمایاں ترین دھبوں میں سے ایک ہے۔ ابوالفضل کہتا ہے کہ اکبر نے یوسف شاہ کا یہ تقرر اس غرض سے کیا تھا کہ کشمیر کی حکمرانی پر بحالی کے لیے اس کی اہلیت کو جانچا جائے۔ لیکن اس امر کا کوئی ثبوت نہیں کہ اکبر نے کبھی اُس ظلم کی تلافی کی تجویز بھی پیش کی ہو جو اس نے یوسف شاہ چک پر روا رکھا تھا — وہی یوسف جس

نے، ملک حیدر چاڈورہ کی شہادت کے مطابق جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، جہانگیر کی خاطر شیر افگن کا قصہ تمام کیا اور اکبر کے عظیم مغنی میاں تان سین کی اصلاح کی!

کشمیر میں یہ خیال عام ہے کہ اکبر نے لوگوں کے لباس میں تبدیلی کرائی، اور یوں زنانہ پن لیے ہوئے فیرن (فارسی "پیراہن" سے، یعنی لمبا ڈھیلا کرتا) کانگڑی — یا کشمیری میں کانگر، یعنی آتش دان — کے ساتھ رائج ہوا۔ لیفٹیننٹ نیوال (Lieutenant Newall) (ص 434) کہتا ہے: "اور یہ ممکن ہے کہ منظم جبر اور حوصلہ شکن ستم کے ایک طویل سلسلۂ اقدامات میں سے اس ایک اقدام نے اس قوم کا، جو کبھی بہادر اور جنگ جو تھی، کردار بدلنے میں اپنا اثر دکھایا ہو۔" تاہم اس روایت کے لیے کوئی مستند سند موجود نہیں۔

یہ بیان کہ سلطان زین العابدین نے "ہندوؤں کا غرور توڑنے کی کوشش میں کانگر اور فیرن کے استعمال پر اصرار کیا" بادی النظر میں ناقابلِ یقین ہے، کیونکہ ہندوؤں کے بارے میں سلطان کا رویہ معروف ہے، اور اس نے اُن ہندوؤں کو، جو ملک سیہ بھٹ کے خوف سے وادی چھوڑ گئے تھے، واپس آ کر دوبارہ آباد ہونے کی دعوت دی تھی۔

کشمیر میں اکبر کا عہدِ حکومت

مئی ۱۵۸۹ء میں اکبر خود گھوڑے پر اور پیدل سفر کرتا ہوا کشمیر پہنچا۔ ابوالفضل کی سی دقتِ بیان کے ساتھ کہا جائے تو "ظلِ الٰہی نے 25 خرداد (5 جون ۱۵۸۹ء) کو آٹھ گھنٹے چار منٹ گزرنے پر شہر سری نگر میں اپنے عَلَم نصب کیے۔" پنڈت شُکا لکھتا ہے کہ "جلال الدین نے آشاڑھ کی ساتویں روشن قمری تاریخ کو برہمن لڑکوں کو سونے کے عطیوں سے خوش کیا اور انہوں نے اسے دعائیں دیں۔ پھر وہ مارتنڈ گیا اور برہمنوں کو موتیوں اور سونے سے آراستہ

گائیں دیں۔ وہ کشمیرا کو اس کے انگوروں، اخروٹ کے درختوں اور بلند و دل کش جنگلوں کے ساتھ دیکھ کر شاد ہوا۔" (کنگز آف کشمیرا، جلد III، ص 417)

کشمیر کے بارے میں تین مشہور قصیدے

اکبر نے ایک مہینہ قصبوں، دیہات، چشموں اور ندیوں کی سیر میں گزارا، جن میں سب سے اہم پامپور کی جامع مسجد تھی۔ پامپور زعفران کے لیے مشہور ہے اور سری نگر سے تقریباً 9 میل کے فاصلے پر دریائے جہلم کے کنارے واقع ہے۔

شاعر عرفی بھی شہنشاہ کے ہمراہ تھا اور اس نے وہ مشہور قصیدہ لکھا جس کے پہلے دو مصرعے یہ ہیں:

ھر سوختہ جانے کہ بہ کشمیر درآید گر مرغِ کباب است کہ با بال و پر آید

اینڈریو ولسن (Andrew Wilson) ۱۸۷۵ء میں لکھتا ہے: "ہندوستان کے جھلسے ہوئے میدانوں سے اپریل یا مئی میں اس وادیِ جہلم میں آنا یقیناً نہایت فرحت بخش ہوگا، اور یہ تو کسی مرتے ہوئے آدمی کو بھی از سرِ نو زندہ کر سکتی ہے۔" گویا عرفی تنہا نہیں — عرفی کے دو سو برس بعد اینڈریو ولسن اس کی تصدیق کرتا ہے۔ اور یہی تصدیق سندھ کے سابق گورنر سر لانسلٹ گراہم (Sir Lancelot Graham) نے بھی کی جب اس نے ۱۹۴۳ء میں سون مرگ کے مقام پر مجھ سے کہا کہ وہ مرنے کے قریب تھا اور کشمیر کی آب و ہوا نے اسے نئی زندگی بخش دی۔

منشی غلام حسین طباطبائی اپنی سیر المتاخرین (جلد اول، ص 199) میں اکبر کے جلوس کے چونتیسویں سال اس کی کشمیر آمد کے موقع پر کشمیر کی مدح میں کہے گئے چند اشعار نقل کرتا ہے۔

یہ خیال نہ کیا جائے کہ یہ محض وادیِ خوش حال کی ایک تفریحی سیر تھی۔ اکبر نے یہ اعلان کر کے کہ کوئی سپاہی کسی شہری کو نہ ستائے، اپنی رعایا کے جذبات کا احترام کیا۔ اس نے اپنی فوج کا پڑاؤ شہاب الدین پور یا شادی پور میں مقرر کیا، جو خطِ مستقیم میں سری نگر کے شمال مغرب میں تقریباً نو میل کے فاصلے پر ہے، اور خود باغ حسن شاہ چک، خواجہ بازار، نوہٹہ، سری نگر میں قیام کیا۔ صوبے دار سید یوسف خان رضوی مشہدی کی جانب سے شہنشاہ کی خدمت میں ان معروضات پر کہ تشخیصِ لگان بہت زیادہ ہے، شہنشاہ نے قاضی نور اللہ اور توتا رام کو ہدایت کی تھی کہ پیداوارِ اراضی پر ایک رپورٹ پیش کریں اور اس پر محصول کو یکساں بھی کر دیں۔ لیکن چونکہ اس مجوزہ اقدام سے اہل کاروں اور زمین داروں دونوں کے مفادات خطرے میں پڑتے تھے، اس لیے شہنشاہ کے مقرر کردہ حکام کو اپنے کام میں خاصی رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا۔

قاضی نور اللہ نے شہنشاہ کو اس صورتِ حال کی اطلاع دی، جس نے اس کی مدد کے لیے حسن بیگ اور شیخ عمر کو روانہ کیا۔ قاضی نے کشمیری فوج کی تنخواہ جنس کے بجائے نقد مقرر کر دی۔ اس اقدام نے اُس طوفان کو، جو پہلے ہی پک رہا تھا، یکایک بھڑکا دیا۔ شُکا بھی قاضی کی اس سختی کو موردِ الزام ٹھہراتا ہے جو خود مغلوں کے مابین جھگڑوں کا باعث بنی (جلد III، ص 418)۔ صوبے دار کے اہل کار اور زمین دار دونوں متحد ہو گئے، اور یادگار مرزا کو، جو سید یوسف خان رضوی مشہدی کا چچازاد بھائی تھا اور اس کی غیر حاضری میں — کیونکہ

وہ خود اکبر کو وادی سے باہر تک رخصت کرنے گیا تھا — بطور ناظم چھوڑا گیا تھا، بادشاہ قرار دے دیا گیا۔ کشمیر ایک بار پھر بغاوت کی لپیٹ میں تھا۔ لیکن اس بغاوت کے فرو کرنے میں دیر نہ لگی اور یہ صرف اکیاون دن جاری رہی۔ یادگار مرزا گرفتار ہوا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ شہزادہ سلیم نے سید یوسف خان رضوی مشہدی کی سفارش کی اور شہنشاہ نے اسے معاف کر دیا۔ اس بغاوت کے نتیجے میں اکبر نے شیخ فیضی، میر شریف آملی اور خواجگی محمد حسین کو مرَراج کے حسابات کی جانچ پر مامور کیا، جب کہ خواجہ شمس الدین خافی اور کیار (کافی وار) مان سنگھ کراج کے حسابات کی پڑتال کے لیے بھیجے گئے۔ اگرچہ خریف کی فصل اٹھ چکی تھی، پھر بھی وہ اپنی مہارت سے اس کا تخمینہ لگانے میں کامیاب رہے۔ شُکا لکھتا ہے کہ اسی زمانے میں شہنشاہ نے شیخ فیضی کو حکم دیا کہ "ایک ہزار نقرئی سکے اُن برہمنوں اور فقیروں میں تقسیم کرے جو دیہات میں، جنگلوں میں اور دیگر مقامات میں رہتے تھے۔" (ص 423)۔ اکبر نے قلیچ خان کو کشمیر کا گورنر مقرر کیا۔ قلیچ چھ برس اس منصب پر فائز رہا اور اس نے یہ عرصہ بیشتر چکوں کے استیصال اور شورش پسندوں کی سرکوبی میں صرف کیا۔

بعض اوقات کہا جاتا ہے کہ مغلوں نے کشمیری پنڈتوں کو کسی اعلیٰ منصب پر فائز نہیں کیا۔ یہ درست نہیں۔ پنڈت توتا رام مرزا یوسف خان کا پیش کار یعنی نائب تھا، اور پنڈت مہادیو علی مردان خان کا پیش کار تھا جسے اس نے انتظام کے کل اختیارات سونپ رکھے تھے۔

نگر نگر کی تعمیر

پہلے دورے کے دوران اکبر نے اپنے گورنر سید یوسف خان رضوی مشہدی کو ہدایت کی تھی کہ ہری پربت یا کوہِ ماراں (لفظی معنی: سانپوں کی پہاڑی) کے دامن کے گرد نگر نگر — یا شُکا

کے بقول (ص 426) ناگا نگری — تعمیر کرے، اور یہ کام ایک کروڑ دس لاکھ کی لاگت سے مکمل ہوا۔ اس عظیم برج دار سنگین فصیل کی تعمیر، جیسا کہ مشہور کیا گیا، بنیادی طور پر لوگوں کو روزگار فراہم کرنے کی غرض سے شروع کی گئی تھی۔ شاید اس تعمیر کی آڑ میں اہلِ وادی پر رعب بٹھانا بھی مقصود تھا۔ شُکا کہتا ہے کہ مغلوں کو فصیل کے اندر رہنا تھا تاکہ سپاہی مقامی لوگوں کو ستا نہ سکیں (ص 426)۔ اس کام کی نگرانی...

اس کی تعمیر ایک کشمیری، میر محمد حسین کنت، کی نگرانی میں ہوئی اور یہ جہانگیر کے عہد میں مکمل ہوئی۔ محل کے اندر ایک چھوٹا سا باغ تھا جس میں ایک مختصر عمارت واقع تھی؛ جہانگیر کے بیان کے مطابق اکبر اکثر اسی میں بیٹھا کرتا تھا۔ چونکہ یہ عمارت خستہ حال ہو چکی تھی، اس لیے جہانگیر نے معتمد خان کو مامور کیا کہ باغ کو درست کرے اور عمارت کی مرمت کرائے۔ اس عمارت کو "استاد کاریگروں کے ہاتھوں کی مصوری سے" ایسا آراستہ کیا گیا کہ وہ "نگار خانۂ چین کے لیے باعثِ رشک" بن گئی، اور جہانگیر نے اس باغ کا نام نورافزا رکھا (توزک، انگریزی ترجمہ، جلد دوم، ص 150-151)۔ محلات تعمیر ہوئے اور باغات لگائے گئے، جنھوں نے اس ملک کے قدرتی حسن کو دوبالا کر دیا۔ ۱۵۹۲ء (۱۰۰۰-۱۰۰۱ھ) میں کشمیر کے اپنے دوسرے دورے کے دوران اکبر نے تبت کلاں اور تبت خرد — جو تبتِ صغیر یعنی بلتستان کے حصے تھے — کے حکمران اجو رائے کے خلاف، جس نے مزاحمت کی تھی، فوجی کارروائی کی ہدایت کی۔ نتیجتاً اجو رائے کو معزول کر کے اس کی جگہ علی رائے کو مقرر کیا گیا جو اسی نواح میں ایک ریاست کا مالک تھا۔ جہانگیر نے علی رائے کے بیٹے علی محمد کا ذکر کیا ہے جسے اس کے باپ نے مغل دربار سے وابستگی کے لیے روانہ کیا تھا (جلد دوم، ص 288)۔

اس دوسرے دورے میں طبقاتِ اکبری کے مصنف بخشی نظام الدین احمد اکبر کے ہمراہ تھے۔ [خواجہ نظام الدین احمد، جن کا سنِ ولادت ۹۵۸ھ (۱۵۵۱ء) قرار دیا جا سکتا ہے، خواجہ مقیم ہروی (ہرات کے باشندے) کے فرزند تھے۔ خواجہ مقیم بابر کے عمال میں سے تھے اور اس کے عہد کے اواخر میں دیوانِ بیوتات، یعنی شاہی عمارات و سامان کے نگران، یا شاید شاہی خانہ داری کے مہتمم، کے منصب پر فائز تھے۔ خواجہ مقیم نے ہمایوں کے وزیر کے فرائض بھی انجام دیے اور اکبر کی حکومت کے بھی عہدے دار رہے۔ ان کے فرزند خواجہ نظام الدین احمد تاریخ کے طالب علم ہونے کے علاوہ شعرا کے سرپرست تھے اور بظاہر خود بھی شعر کہتے تھے۔ ڈاکٹر بینی پرشاد (Dr. Baini Prashad) نے بی۔ ڈے (B. De) کے طبقاتِ اکبری کے انگریزی ترجمے کے دیباچے میں اس امر کی نشان دہی کی ہے کہ خواجہ کی تاریخی امور سے دلچسپی اور بحیثیت مصنف ان کی مہارت کا ثبوت یہ ہے کہ جب اکبر نے ۹۹۰ھ (۱۵۸۲ء) میں سلاطینِ اسلام کی تاریخ یعنی تاریخِ الفی کی تدوین کا حکم دیا تو اس نے خواجہ کو اس کے سات مصنفین میں شامل کیا۔

خواجہ کے تصوف اور علومِ دینیہ سے شغف کا اندازہ صوفیہ، مشائخ اور بالعموم اہلِ دین سے ان کے تعلق سے ہوتا ہے۔ بلوخمان (Blochmann) کے بقول "نظام الدین ایک متقی مسلمان تھے"، مگر اس کے باوجود وہ "اپنے مذہبی خیالات کو اپنے تک محدود رکھ کر اکبر کی نظروں میں بلند سے بلند تر مقام حاصل کرتے چلے گئے۔" وہ ان دو تین اشخاص میں سے ہیں جن سے راسخ العقیدہ ملا عبدالقادر بدایونی خوش ہے۔ عالم ہونے کے علاوہ نظام الدین ایک اچھے سپاہی اور منتظم بھی تھے۔ ایک روایت کے مطابق وہ اپنی عمر کے پینتیسویں برس سے اکبر کے دربار سے وابستہ تھے۔ ۹۸۰ھ (۱۵۷۲ء) میں خواجہ گجرات میں بخشی مقرر ہوئے،

جہاں ان کا فریضہ محکمۂ فوج کی سربراہی اور بھرتی، معائنوں اور فوج سے متعلق دیگر امور کی نگرانی تھا۔

گجرات کی خدمات کے صلے میں خواجہ کو گھوڑا اور خلعت عطا ہوئی اور ان کے وظیفے میں اضافہ کیا گیا۔ بعد ازاں خواجہ نے رنِ کچھ کے علاقے سورٹھ میں ایک کامیاب مہم سر کی۔ اس کے بعد ۱۰۰۰ھ (۱۵۹۱-۹۲ء) میں وہ بخشی کے منصب پر مقرر ہوئے۔ آئینِ اکبری کے مطابق میر بخشی سلطنت کے امرا میں شمار ہوتا تھا۔

جس زمانے میں نظام الدین اکبر کے ہمراہ کشمیر آئے، وہ شہنشاہ کے خاص منظورِ نظر تھے۔ خواجہ کا اپنا بیان ہے کہ کشمیر سے متعلق ان کی روایت، جو اکبر کے عہدِ حکومت کے اڑتیسویں سال کے اختتام پر ختم ہوتی ہے، "اجمالی انداز" میں لکھی گئی ہے، تاہم "بیشتر بڑے واقعات اختصار کے ساتھ بیان کر دیے گئے ہیں۔" قاری اس آخری بات سے پوری طرح اتفاق کرے گا۔ اور مسٹر ڈے نے فارسی متن کی تدوین، انگریزی ترجمے اور عالمانہ حواشی کے ذریعے پوری تصنیف کو نہایت قابلِ فہم اور واضح بنا دیا ہے۔

بخشی نظام الدین احمد نے، جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، کشمیر کے باب میں طبقات کی تالیف کے لیے (۱) تاریخِ مرزا حیدر اور (۲) تاریخِ کشمیر سے استفادہ کیا۔ اول الذکر دراصل تاریخِ رشیدی ہے، جس پر ہم پہلے گفتگو کر چکے ہیں۔ دوسرا ماخذ وہ تاریخِ کشمیر ہے جس کے مصنف کا نام مذکور نہیں، لیکن ڈاکٹر بینی پرشاد اپنے دیباچے (ص xxx) میں لکھتے ہیں کہ غالباً یہ راج ترنگنی کا وہی فارسی ترجمہ ہے جو ۹۹۸ھ میں اکبر کے لیے سنسکرت سے ملا شاہ محمد شاہ آبادی نے کیا تھا — شاہ آباد کشمیر میں ویری ناگ سے کچھ ہی فاصلے پر واقع ہے — اور جسے ۹۹۹ھ (۱۵۹۰ء) میں ملا عبدالقادر بدایونی نے آسان اسلوب میں از سرِ نو لکھا۔ یہ مخطوطہ

برٹش میوزیم میں محفوظ ہے (ریو (Rieu) کی فہرست، جلد اول، ص 296، Add. 24,032)۔ [اس کا حوالہ "کشیر" کے صفحات 163-164 پر ملے گا۔] طبقات کا اختتام ۱۰۰۲ھ کے واقعات پر ہوتا ہے۔ فرشتہ اور دیگر مؤرخین صاحبِ طبقات کے بعد آتے ہیں۔

[شہنشاہ کی معیت میں لاہور کے قیام کے دوران خواجہ نظام الدین احمد نے دریائے راوی کے کنارے ایک باغ لگایا یا خریدا تھا، اور اسی باغ میں انھیں ۱۴ صفر ۱۰۰۳ھ (۱۹ اکتوبر ۱۵۹۴ء) کو، عمر کے پینتالیسویں برس میں وفات پانے کے بعد، سپردِ خاک کیا گیا — ایسے وقت میں جب توقع تھی کہ وہ اکبر کے ہاں مزید بلند مرتبے پر فائز ہوں گے۔ مصرع "گوھر بے‌بہا رفت ز دنیا" (ایک گوہرِ بے بہا دنیا سے رخصت ہو گیا) سے ان کی تاریخِ وفات نکلتی ہے۔]

اکبر نے ۱۵۹۷ء کا موسمِ گرما کشمیر میں گزارا، مالگزاری کا نسبتاً ہلکا تخمینہ رائج کیا اور اوائلِ سرما میں لاہور لوٹ گیا۔ اکبر کے عہد کے اواخر میں کشمیر میں سخت قحط پڑا، جس نے ایسی تشویش ناک صورت اختیار کر لی کہ شہنشاہ کو متاثرین کی مصیبت کم کرنے کے لیے سیالکوٹ سے غلہ اور اجناس منگوانا پڑیں۔ پادری — فادر ہیرونیمو زیویئر (Father Hierosme Xavier)، جو سینٹ فرانسس زیویئر (St. Francis Xavier) کے بھتیجے کے بیٹے تھے، اور بینوا دے گوئس (Benoist de Góis) — جو اکبر کی فرمائش پر اس کے ہمراہ کشمیر آئے تھے، اس قحط کی آنکھوں دیکھی روداد بیان کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ قحط اس قدر شدید تھا کہ "بہت سی مائیں بے سہارا ہو گئیں اور اپنے بچوں کی پرورش کا کوئی ذریعہ نہ رکھنے کے باعث انھیں شہر کے عام مقامات پر برائے فروخت پیش کرنے لگیں۔ اس رقت انگیز منظر پر ترس کھا کر فادر نے ان میں سے بہت سے ننھے بچے خرید لیے، جو بپتسمہ پانے کے

کچھ ہی دیر بعد اپنی روحیں اپنے خالق کے سپرد کر گئے۔ ایک مسلمان نے بچوں کے ساتھ فادر کی یہ فیاضی دیکھ کر اپنا ایک بچہ بھی لا کر اسے پیش کیا؛ مگر فادر نے وہ بچہ اس کی ماں کو واپس کر دیا اور اس کی پرورش کے لیے کچھ رقم بھی دی، کیونکہ وہ اسے بپتسمہ دینے پر آمادہ نہ تھا، اس لیے کہ اگر وہ بچ بھی جاتا تو اس ملک میں اس کے مسیحی زندگی بسر کر سکنے کا امکان کم ہی تھا۔"

باج تمغہ نامی محصول کی معافی کے بعد اراضی کا جو نیا تخمینہ عمل میں آیا، اس کے نتیجے میں محاصل میں وہ اضافہ ہوا جو، سرکاری عمال کے اندراج کے مطابق، ایک لاکھ کھروار سے متجاوز تھا۔ اکبر کے عہد کا ایک کھروار تین من آٹھ سیر کے برابر تھا اور اکبری سکے کے سولہ دام کے مساوی شمار ہوتا تھا۔ (کھروار کے لغوی معنی "گدھے کا بوجھ" ہیں؛ کشمیر میں بڑی مقداریں تولنے کا یہی معیاری پیمانہ ہے۔ اس لفظ کا اختصار "کھر" ہے — جو راج ترنگنی کے "ہاری" سے تعلق رکھتا ہے — اور آج کل ایک کھروار دو من سے کچھ زائد کے برابر ہے۔ دیکھیے باب دہم کے ذیلی عنوان "اوزان وپیمائش" کا حاشیہ۔) عام حالات میں ایک من چاول پانچ آنے میں مل جاتا تھا۔ آئینِ اکبری (جلد دوم، ص 134) کے مطابق اکبر کے عہد میں صوبۂ کشمیر میں کابل اور قندھار بھی شامل تھے۔

بھمبر

بھمبر میدانی علاقے کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے جو اسی نام کے ندی نالے کے دائیں کنارے پر واقع ہے؛ یہ نالہ وزیرآباد کے قریب دریائے چناب میں جا گرتا ہے۔ یہ قصبہ گجرات سے

تقریباً 29 میل شمال میں، جہلم سے 22 میل مشرق میں اور سیالکوٹ سے 50 میل شمال مغرب میں ہے۔

یہ مقام اس اعتبار سے خاصی اہمیت رکھتا ہے کہ میدانوں سے کشمیر جانے والے راستے کا نقطۂ آغاز یہی ہے؛ پیر پنجال یا پانتسال کے راستے یہ سری نگر سے تقریباً 150 میل کے فاصلے پر ہے۔ قصبہ، جس کی عمارتیں بیشتر پتھر کی بنی ہوئی ہیں، جنوب کے سوا ہر جانب سے پانچ چھ سو فٹ بلند ایک نیچی پہاڑی میں گھرا ہوا ہے۔ قصبے کے وسط میں ایک پرانی مغل سرائے ہے اور شمال کی جانب اینٹوں کی ایک بے حقیقت گڑھی یعنی چھوٹا قلعہ؛ اول الذکر عمارت تھانے اور ضلعی افسر کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔

قصبے کے جنوب میں مسافروں کے قیام کے لیے دو عمارتیں ہیں۔ پڑاؤ کے لیے ایک اچھا میدان بھی موجود ہے جسے ندی سے پانی میسر آتا ہے۔ یہ ندی عموماً اتھلی اور قابلِ عبور ہوتی ہے، مگر اس میں اچانک طغیانی آجایا کرتی ہے۔ قدیم زمانے میں بھمبر پر ایک خود مختار راجہ کی حکومت تھی؛ اس خاندان کے آخری فرد سلطان خان نے کشمیر پر رنجیت سنگھ کے عزائم کی مخالفت کی، اور کہا جاتا ہے کہ راجہ گلاب سنگھ نے — جو اپنے ابتدائی دور میں سلطان خان ہی کا ملازم تھا — اسے اندھا کرا دیا۔

بھمبر کے قدیم راجاؤں کے محل کے کھنڈر گاؤں کے قریب، کشمیر کی جانب جانے والی سڑک کے بائیں ہاتھ، اب بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔

(تصویر کی) دوسری جانب دکھائی گئی اس چھوٹی مسجد کے سامنے کے رخ میں تین محرابیں ہیں۔ "بیرونی سطح موسم کی مسلسل دست برد سے میلی ہو چکی ہے۔ یہ اصلاً منقش پھول بوٹوں سے آراستہ تھی، جو اندرونی دیواروں پر — جہاں وہ موسم کی سختیوں سے محفوظ رہے —

اب بھی خاصی تازگی کے ساتھ موجود ہیں۔ دیواری آرائش کے نچلے حصے میں خانوں میں منقسم ایک ازارہ ہے، جس کے خانے گہرے سرخ رنگ کے ہیں اور نہایت باریک کام کی پھول دار بیلوں سے مزین ہیں۔ محرابوں کا رخ، ان کے اندرونی قوس اور کونیے وغیرہ سب سرو، کھجور اور طرح طرح کے دیگر درختوں اور پھولوں کی — فطری بھی اور روایتی بھی — مصوری سے ڈھکے ہوئے ہیں۔ پوری سطح روغنی اور چمک دار ہے۔ اطراف میں دو کھڑکیاں ہیں جن میں اصلاً ستارہ نما سوراخوں والی اینٹوں کی جالیاں لگی تھیں۔ عمارت کا اندرونی ڈھانچہ چونے میں چنے ہوئے بے تراش پتھروں پر مشتمل ہے، جس پر چونے اور بجری کا موٹا استر چڑھایا گیا اور اس کے اوپر گچ کی ایک نسبتاً پتلی تہہ، جو مصوری کی زمین کا کام دیتی تھی۔ یہ مسجد ایک نہایت دلچسپ یادگار ہے۔" — (کشمیر کی آثارِ قدیمہ کی رپورٹ سے ماخوذ؛ نیز دیکھیے ص 520۔)

اکبر کے میر عمارت (چیف انجینئر) محمد قاسم خان نے گجرات، بھمبر اور شوپیاں کے راستے سلطنت کی عظیم شاہراہ کی جو از سرِ نو تعیین اور تعمیر کی، اس نے ہندوستان سے آمد و رفت کی باقاعدگی کو یقینی بنا دیا۔ فیضی انہی اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:

بحکم خسرو والا کوہ کنان ہزار جو رواں کرد صاف تر از شیر چنان بکوہ و خارہ را تراشیدند کہ بہر موکب شاہی سزد رہ و مسیر

جہانگیر

جہانگیر فطرتاً قدرت کے حسن کا دلدادہ تھا، اس لیے کشمیر اسے خاص طور پر بھاتا تھا۔ اس نے کشمیر کے آٹھ دورے کیے، جن میں سے دو اپنے والد کی معیت میں اور چھ اپنے عہدِ

حکومت میں—یعنی جلوس کے چودھویں، سولھویں، اٹھارھویں، انیسویں، بیسویں اور اکیسویں برس۔ جہانگیر کے ہمراہ اس کی حسین ملکہ نورجہاں ہوتی تھی، "جس کی رومان پرور طبیعت، معلوم ہوتا ہے، اس کے شوہر اور شہنشاہ کو وادی کے دور افتادہ اور دلکش ترین گوشوں تک کھینچ لے جاتی تھی" (لیفٹیننٹ نیول (Lieut. Newall) کا کشمیر کی اسلامی تاریخ کا خاکہ، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، نمبر 5، ۱۸۵۴ء، ص 436)۔

"ان خوش گوار تفریح گاہوں میں سے بہت سی آج بھی ان مقامات کے طور پر دکھائی جاتی ہیں جہاں شاہی جوڑا ان شاہانہ بے فکری کے دنوں میں داد عیش دیا کرتا تھا۔" شاہی جوڑے نے یقیناً اپنا وقت ہر نوع کی جشن آرائیوں میں بسر کیا ہو گا۔ گرمیوں کی راتوں میں ڈل جھیل کی سطح پر شان دار چراغاں اور حیرت انگیز آتش بازی کا عکس جھلملاتا ہو گا اور فضا "نغمہ و رقص کی صداؤں سے گونجتی ہو گی۔" مسز سٹیورٹ (Mrs. Stuart) اپنی کتاب "گارڈنز آف دی گریٹ مغلز" (لندن، ۱۹۱۸ء، ص 176) میں لکھتی ہیں کہ اکبر، جہانگیر اور اس کی نورجہاں ہندوستان میں کہیں زیادہ زندہ و تابندہ شخصیتیں ہیں، بہ نسبت اس کے کہ الزبتھ یا سٹیورٹ خاندان کے فرماں روا انگلستان میں ہوں۔ کہا جاتا ہے کہ جہانگیر نے اپنی ملکہ کی خوشنودی کے لیے چنار کا درخت اس کے وطن ایران سے لا کر کشمیر میں متعارف کرایا۔

مگر یہ بات درست نہیں۔

کشمیری لفظ "بووَن" (bawayn) جہانگیر سے پہلے کشمیر میں چنار کے وجود کا ثبوت ہے؛ خود جہانگیر چناروں کے تنوں کے گھیر اور ان کے پھیلے ہوئے سائے کا ذکر حیرت سے کرتا ہے۔ سفر کی روداد، ملک اور اس کے باشندوں، ان کے لباس اور طرزِ زندگی سے متعلق جہانگیر کے تاثرات، اس کے رنگارنگ دلفریب مناظر کا بیان، نیز مردوں، عورتوں اور اشیا پر اس

کے تبصرے—یہ سب اس کی توزک میں اس کے مخصوص و بے مثال اسلوب میں نہایت جیتے جاگتے انداز سے قلم بند ہیں۔

چنار کے بارے میں شمس العلماء سر جیونجی جمشید جی مودی (Sir Jivanji Jamshedji Modi) اس درخت کا سراغ ایران میں لگاتے ہیں۔ انھیں اس کا ذکر پہلوی کتاب بندہش میں ملتا ہے [بندہش زند اوستا کی اکیس کتابوں میں سے ایک کی شرح ہے؛ اس میں تخلیقِ عالم کا وہ بیان درج ہے جو زند اوستا میں آیا ہے]۔ ہیروڈوٹس (Herodotus) کا بیان ہے کہ چنار کو اخمینی بادشاہوں—مثلاً زرکسیز (Xerxes) اور اس کے باپ دارا (Darius)—کے ہاں بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔ بعد کے اہلِ فارس چنار کو "درختِ فضل" کہتے ہیں، اور بعض لوگ تہران کو "چناروں کا شہر" کہتے ہیں۔ اسی نسبت سے لانگ فیلو (Longfellow) کے یہ مصرعے ہیں: "شبنم کی آب و تاب سے روشن، جنگل کا ہر چمکتا درخت یوں جگمگا اٹھا جیسے وہ چنار جسے ایرانی نے ملبوسات اور جواہر سے آراستہ کیا تھا" (ایونجلین، حصہ اول، II، مصرعے 22-23)۔

پلینی (Pliny) اپنی نیچرل ہسٹری (کتاب XII، باب 1، ص 357-358) میں لکھتا ہے کہ چنار بحیرۂ آیونین کے راستے جزیرہ دیومیدیا میں لایا گیا تاکہ دیومید کی قبر کو زینت بخشے۔ وہاں سے یہ سسلی اور بعد ازاں اٹلی منتقل ہوا، جہاں اسے "ایک نہایت انوکھے، نایاب اور مخصوص درخت" کی حیثیت سے پورے جزیرہ نما میں لگایا گیا۔ پھر یہ فرانس کے مقامات تروَن اور تورنے تک پہنچایا گیا، جہاں یہ گویا خود زمین کا ایک عطیہ شمار ہونے لگا؛ جو لوگ اس کے سائے میں چلتے پھرتے اور تازہ دم ہوتے، انھیں "اہلِ روما کو محصول ادا کرنا پڑتا تھا۔" اسپین میں بھی چنار موجود تھا۔ پلینی کے بقول یہ سب کچھ اس زمانے کے لگ بھگ

ہوا جب گال قوم نے روما کو تاراج کیا تھا۔ چنار کی قدر و منزلت اس درجہ بڑھی کہ لوگ "اسے شراب سے سینچا کرتے تھے۔" پلینی نے اٹلی کے کئی ایسے عظیم الجثہ چناروں کی مثالیں دی ہیں جن کے کھوکھلے تنوں میں بادشاہوں اور شہنشاہوں نے بزم آرائی کی جگہیں بنا رکھی تھیں (جرنل آف دی اینتھروپولوجیکل سوسائٹی آف بمبئی، جلد 03-1901، VI، نمبر 8، ص 427-434)۔ جہانگیر نے بھی کشمیر کے بڑے بڑے چناروں کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے: "میں خود گھوڑے پر سوار تھا؛ پانچ مزید زین کیے ہوئے گھوڑوں اور دو خواجہ سراؤں سمیت ہم اس (کھوکھلے تنے) کے اندر چلے گئے" (انگریزی ترجمہ، جلد دوم، ص 154)۔ چنار وسط ایشیا کے خطے فرغانہ کا بھی مقامی درخت ہے۔

جہانگیر نے بہت سے محلات اور گرمائی قیام گاہیں تعمیر کرائیں۔ اس نے مشہور شالیمار باغ کی تعمیر مکمل کی۔ مانس بل، اچھ بل اور ویری ناگ وغیرہ کے محلات کے کھنڈر دلکش مقامات کے انتخاب میں نورجہاں کے ذوق کی گواہی دیتے ہیں۔

آنجہانی جسٹس شاہ دین نے اپنی معروف نظم "شالامار" میں اس منظر کی نہایت خوب صورت تصویر کھینچی ہے—

نورجہاں جو حسن میں ... اور قد من جیس سرو لب جوئبار ھو

آکر پہان ... تھی وہ دلفریب قربان جس پہ جان سے سو لالہ زار ھو

اور آنا اُسکے ساتھہ شہِ می پرست کا جسکی نگہ سے چشم طرب میں خمار ھو

اور وہ عشرت ... سامان عیش ...

بیرن شونبرگ (Baron Schonberg) غالباً انہی ایام کی ایک دل گداز تصویر کھینچتا ہے، جب وہ لکھتا ہے: ”کشمیر، جو نوعِ انسانی کا مشہور گہوارہ ہے، وہ خطہ جسے مشرقی اقوام کی داستانوں نے مذہبی تقدس عطا کیا اور جسے مغربی شعرا کے تخیل نے ارضی فردوس کے تمام حسن و جمال کا پیراہن پہنایا ہے — وہ کشمیر جس کے گرد ایشیائی افسانوی ادب کی ساری سرمستی و رعنائی اور ایشیائی تاریخ کی اس قدر شان و شوکت لپٹی ہوئی ہے — کون سا اہلِ یورپ ہے جو کشمیر کا نام سنے اور اس کے ذہن میں اکبر کا جلال، جہانگیر کی شان اور نورجہاں کا حسن نہ آجائے؟“

ٹامس مور (Thomas Moore) نے وادیِ کشمیر میں جہانگیر اور نورجہاں کے ان رومان پرور ایام کو اپنی مثنوی لالہ رخ میں نہایت خوب صورت شاعری کا جامہ پہنایا ہے:

”آہ! محبوب کے قریب ہونا، جیسا کہ ہر جگہ ہوتا ہے، لذتوں میں سب سے بڑھ کر لذت ہے — کیسا سرور اس شخص کے نصیب میں ہے جو چاندنی اور نغمے میں اپنے اس محبوب کو پہلو میں لیے جھیلِ کشمیر پر یوں دھیرے دھیرے تیرتا چلا جائے! اگر عورت بدترین ویرانے کو بھی دل کش بنا سکتی ہے تو سوچو، ذرا سوچو کہ وہ کشمیر کو کیسی جنت بنا دیتی ہوگی! یہی کچھ اکبر کے ذی شان فرزند نے محسوس کیا،

جب وہ اقتدار اور شان و شوکت اور فتوحاتِ جنگ کے تمغوں سے، سب کچھ فراموش کر کے، اپنی نوجوان نورمحل — روشنیِ حرم — کے ساتھ اس وادی کی طرف اڑ چلا؛ جب وہ فاتح آزاد اور بے تاج ہو کر اس جھیل کے کناروں پر صرف اپنی محبوبہ کے ساتھ گھومتا پھرتا تھا،

تو ان پھولوں کے ہاروں میں، جو وہ شوخی سے باڑوں سے نوچ لیا کرتی، اسے وہ شان نظر آتی جس کا مقابلہ اس کا تاج نہ کر سکتا تھا؛ اور اس کی نازک گردن پر ڈھلکتی زلف کے ادنیٰ سے ادنیٰ خم کو وہ اپنے دل میں تختِ عالم پر ترجیح دیتا تھا ! ایک حسن وہ ہے جو ہمیشہ یکساں تابندہ رہتا ہے، گرمیوں کے دن کی دھوپ کے طویل تسلسل کی طرح چمکتا ہی چلا جاتا ہے، اور کوئی سایہ اسے نرمی نہیں بخشتا،

یہاں تک کہ محبت اس شکوہ کی یکسانیت میں سو جاتی ہے:

مگر وہ حسن یہ نہ تھا — آہ ! ہرگز ایسا نہ تھا — جس نے نوجوان نور محل کو مسرت کا ایسا جادو بخشا ! بلکہ وہ دل کشی تھی جو ہر دم متحرک رہتی ہے اور خزاں کے نرم، سایہ دار دنوں پر پڑنے والی روشنی کی طرح کھیلتی ہے — کبھی یہاں، کبھی وہاں — اڑتے اڑتے حرارت بانٹتی ہوئی، ہونٹوں سے رخسار تک، رخسار سے آنکھوں تک؛ کبھی دھند میں گھلتی ہوئی اور کبھی کرنوں میں پھوٹتی ہوئی، جیسے کسی ولی کو خواب میں جنت کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں ! جب وہ متفکر ہوتی تو یوں معلوم ہوتا کہ وہی لطافت، وہ سب سے بڑھ کر دل ربائی، اس کے چہرے ہی کے ساتھ پیدا ہوئی ہے ! اور جب خفا ہوتی — کیونکہ پُرسکون ترین اقلیموں میں بھی ہلکی ہوائیں کبھی کبھی پھولوں کو جھنجھوڑ دیا کرتی ہیں — تو وہ مختصر، عارضی خفگی گویا

ایک نئے حسن کو بیدار کر دیتی، ان پھولوں کی طرح جو ہلائے جانے پر سب سے زیادہ مہکتے ہیں۔ وہاں حرم کی مکینیں بھی مسکراتی ہیں — مغرب کی دوشیزائیں، جن کے بال آفتاب کی مانند روشن ہیں؛ اور وادیِ نیل کے باغ کی حسینائیں، وہاں کے گلابوں جیسی نازک؛ قبرص کی چٹانوں کی دخترانِ محبت، جن کی زلفوں میں پافوس کے ہیرے جگمگاتے ہیں؛ پریوں جیسے سبک اندام، جیسے قندھار کے زریں مرغزاروں میں ہوا کرتے ہیں؛

اور وہ بھی جن کی خواب آلود آنکھوں کے سامنے، ان کے اپنے تابناک ختائی کنجوں میں، ایسی قوسِ قزح رنگ تتلیاں چمکتی ہیں

کہ وہ یہ گمان کر سکتی ہیں کہ ان کے گرد دھوپ میں آہیں بھرتے شاداب پھولوں کو کسی جادو نے اڑنا سکھا دیا ہے۔

ہر جوان چیز، ہر حسین چیز، مشرق و مغرب سے آکر وہاں شرماتی جھلکتی ہے، سوائے — سوائے — اے نور محل! تُو جو ان سب میں حسین ترین اور عزیز ترین ہے،

وہ یگانہ ہستی، جس کی مسکراہٹ تنہا چمکتی تھی — ایک جہان میں بس ایک، بے مثل!"

(پافوس قبرص کا ایک شہر تھا جو افرودیتی یعنی وینس سے منسوب اور اسی کے لیے مقدس تھا۔)

"دسترخوان پھلوں اور شراب سے سجا تھا؛ سنہرے انگوروں سے، ان جیسے جو قزوین کی پہاڑیوں پر چمکتے ہیں؛ پگھلتی مٹھاس سے بھرے اناروں سے، اور ناشپاتیوں سے،

اور ان نہایت شاداب سیبوں سے جو کابل اپنے ہزاروں باغوں میں پیدا کرتا ہے؛ کیلے، سنہرے بھی اور سبز بھی؛ ملایا کے شہد آگیں مینگوسٹین؛ بخارا کے شیریں میوے اور آلوچے؛ سمرقند کے دور دراز باغوں کی سوغاتیں؛ اور بصرہ کی کھجوریں، اور خوبانیاں — تخمِ شمس — ایران کی سرزمین سے؛ ساتھ ہی وِشنا چیری کے لذیذ مربے، نارنگی کے پھولوں کے مربے، اور ان جنگلی تازہ بیریوں کے جنھیں نوعمر غزال

عراق کی سنگلاخ گھاٹیوں میں چرا کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ نفیس ترین ظروف میں مسکرا رہا تھا — خالص صندل کی لکڑی کی ٹوکریوں میں، اور اُس جزیرے کے چینی مرتبانوں میں جو بحرِ

ہند کی موجوں تلے ڈوبا ہوا ہے اور جہاں سے خوش قسمت غوطہ خور اکثر ایسے ظروف نکال لاتا ہے جو بادشاہوں کے ایوانوں کی زینت بنتے ہیں۔ اور ہر اقلیم اور ہر رنگ کی شرابیں بھی اپنی سیال تابانی بکھیر رہی تھیں؛ عنبریں روزولی — بحرِ اخضر کے تاکستانوں سے ابلتی ہوئی روشن شبنم؛ اور شیرازی شراب، جو یوں لہکتی بہتی تھی گویا وہ بڑا اور نایاب جوہر — وہ لعل جس کے عوض قبلائی خان نے ایک شہر کی دولت پیش کی تھی — پگھل کر وہاں جاموں میں شرما رہا ہو! اور سلیم ہر ایک سے جی بھر کر پیتا ہے،

اور گویا اس نے ٹھان لی ہے کہ یہ سیلاب اس کے دل کی گہرائیوں تک پہنچ کر رہے —
چاروں طرف ایک فرحت بخش طوفان بکھیرتا ہوا،

(قزوین، ایران میں، یورپ کو جانے والی مرکزی شاہراہ پر واقع ہے؛ سولہویں اور سترہویں صدی کے سیاح اس کا املا اسی طرح لکھتے ہیں جیسا اوپر متن میں ہے۔ "تخمِ شمس" ایک قسم کی نہایت لذیذ خوبانی ہے۔ وِشنا دراصل وِشنیا ہے، جو اصلاً یونانی مگر اب روسی لفظ ہے اور اس کے معنی چیری کے ہیں؛ وِشنیا خود روس اور ترکستان میں ایک عمدہ چیری ہے۔ "ایراک" اب "عراق" لکھا جاتا ہے، مگر یہاں غالباً ایران کے علاقے عراقِ عجم کی طرف اشارہ ہے جو قم کے مغرب میں ہمدان اور اصفہان کے درمیان واقع ہے۔ روزولیو ایک اطالوی شراب کا نام ہے؛ یہاں شاید عنبریں رنگ کی روزولی، یعنی زرد شراب مراد ہے۔ بحرِ اخضر سے مراد خلیجِ فارس ہے۔ قبلائی خان ایک منگول فرمانروا (پیدائش ۱۲۱۶ء، وفات ۱۲۹۴ء) اور چنگیز خان کا پوتا تھا؛ وہ ۱۲۵۹ء سے ۱۲۹۴ء تک چین اور وسطِ ایشیا پر بحیثیتِ شہنشاہ حکمران رہا۔)

”جو جلد کوئی گوشہ ایسا نہ چھوڑے گا جو ڈوبنے سے بچ رہے اور جس پر محبت اپنے پر ٹکا سکے۔ ادھر آؤ، ادھر آؤ — ہم شب و روز ان لذتوں میں محو رہتے ہیں جو کبھی ختم نہیں ہوتیں؛ گرمیوں کی موجوں کی طرح، جوں ہی ایک ڈھلتی ہے، دوسری ویسی ہی شیریں اور تابندہ چلی آتی ہے۔ اور جو محبت تمام ہو جاتی ہے وہ دم توڑتے توڑتے ایک نئی محبت کو جنم دے جاتی ہے — ویسی ہی گرم جوش، مسرت میں ویسی ہی بے مثال؛ اور آہ! اگر زمین پر کہیں فردوس ہے تو یہیں ہے، یہیں ہے!“

اگر فردوس بر روی زمین است ھمین است و ھمین است و ھمین است

”نقاب الٹ چکی — جادو چل گیا — اور سلیم نے اپنی نور محل کو، اپنے حرم کی روشنی کو، پہلے سے بھی زیادہ دلکتی شرم و حیا کے عالم میں اپنے سینے سے لگا لیا ہے! اور مٹ جانے والی ناراضگیاں ہر روشن نگاہ کے سحر کو اور بڑھا دیتی ہیں؛ اور ہر ابھرتی مسکراہٹ اس لیے اور بھی پیاری معلوم ہوتی ہے کہ کچھ دیر کو اس کی روشنی گم رہی؛ اور اب، اپنی تمام آہوں کے صلے میں اور بھی شادمان، جب اس کا سر اس کے بازو پر ٹکا ہے، وہ ہنستی آنکھوں سے اس کے کان میں سرگوشی کرتی ہے: ”میرے محبوب! جشنِ گلاب یاد رکھنا!“” — ٹامس مور

ملک حیدر چاڈورہ

ملک حیدر چاڈورہ، جس کی تاریخ سے ہم نے استفادہ کیا ہے، کے متعلق یہاں چند کلمات ضروری ہیں۔ ملک حیدر نے کشمیر کی تاریخ، ابتدائی زمانے سے اپنے عہد تک، فارسی زبان میں ۱۰۲۷ھ (۱۶۱۷ء) میں، یعنی جلوسِ جہانگیری کے بارہویں سال، تصنیف کی۔ جو نسخہ میں نے خان بہادر مولوی ظفر حسن، بی اے (علیگ)، او بی ای، ریٹائرڈ ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل

آثارِ قدیمہ، نشیمن، دہلی دروازہ، دہلی سے مستعار لے کر استعمال کیا، اس کے صفحات کی کل تعداد 235 اور اوراق کی تعداد 118 ہے۔ اس کی تقطیع 7×4 انچ ہے اور اوراق کا تحریری حصہ 5¼×2¾ انچ ہے۔ ہر صفحے پر سطروں کی تعداد 17 ہے۔ یہ مخطوطہ ۱۱۱۷ھ = ۱۷۰۵ء کے مؤرخہ مخطوطے کی نقل ہے۔ اس مخطوطے پر ایک اور تاریخ بھی درج ہے: ریواڑی، 16 ستمبر ۱۸۹۳ء، 8 بھادوں سموت 1950، 5 ربیع الاول ۱۳۱۰ھ — جو غالباً ۱۱۱۷ھ والے نسخے سے اس کی نقل کی تاریخ ہے۔ برٹش میوزیم کے مخطوطے Add. 8906 (جلد اول، صفحہ 297) کے اوراق 224 ہیں، تقطیع 10¾×6¼ انچ، ہر صفحے پر 12 سطریں، خطِ نستعلیق میں، مؤرخہ شوال ۱۲۱۶ھ (۱۸۰۲ء)؛ اور Add. 16,705 (صفحہ 298) کے اوراق 230 ہیں، تقطیع 8¼×4½ انچ، ہر صفحے پر 16 سطریں، رواں نستعلیق میں، جو غالباً سترہویں صدی عیسوی کا ہے۔

آغا حکیم علی (Agha Hakim ʾAli)، بی اے، ڈی ایس (میلان، اٹلی)، ڈائریکٹر شعبۂ ریشم بانی، سری نگر نے مجھے حیدر ملک کی تاریخ کا ایک اور نسخہ فراہم کیا جو اصلاً مرحوم ملک اسد اللہ کی ملکیت تھا اور اب حاجی محمد جواد، ساکن زڈی بل، سری نگر کے قبضے میں ہے۔ یہ نسخہ نہایت صاف ہے؛ اس کے صفحات 262، تقطیع 9¾×6¼ انچ، ہر صفحے پر 13 سطریں، رواں نستعلیق میں، مؤرخہ ۱۲۹۷ھ (۱۸۷۹ء) ہے۔

ملک حیدر اور اس کا بھائی ملک علی کشمیری امرا میں سے تھے اور حسین شاہ چک کے وزیر ملک محمد ناجی کی نسل سے تھے۔ اپنی تاریخ کے آخری حصے میں ملک حیدر لکھتا ہے کہ اس نے اپنی عمر کے چوبیس برس یوسف شاہ چک کی خدمت میں گزارے اور بہار میں اس کی جاگیر کی طرف اس کی جلاوطنی میں بھی اس کے ہمراہ رہا۔ ملک حیدر نے بحیثیت فوجدارِ جائس

(جائس، جو "جیش" بمعنی لشکرگاہ سے ماخوذ ہے، متحدہ صوبوں کے ضلع رائے بریلی کی تحصیل سلون میں ریلوے لائن پر واقع ایک قصبہ ہے، جو لکھنؤ سے سلطان پور جانے والی سڑک پر ہے؛ یہاں اصلاً ایک قلعہ تھا جو اُدیا نگریا اُجیلے کنگر کہلاتا تھا) راجا بلبھدر کے خلاف مہم نہایت کامیابی سے سر انجام دی، اور اس حملے میں شیر افگن خان سے بذاتِ خود نبرد آزما ہوا جس میں شیر افگن ۱۰۱۶ھ (۱۶۰۷ء) میں مارا گیا۔ اپنے بھائی علی ملک کے ساتھ اس نے شیر افگن کی بیوہ مہر النسا بیگم (جو بعد میں نورجہاں کہلائیں) کی ہر خطرے سے حفاظت کی اور اس راہ میں زخم بھی کھایا۔ مہر النسا نے جہانگیر سے حیدر کی پرزور سفارش کی، جس نے اسے "چغتائی" اور "رئیس الملک" کے خطابات عطا کیے اور حکومتِ کشمیر میں ایک منصب بھی دیا۔ تاریخِ خلیل مرجان پوری (ص 166) میں مذکور ہے کہ مہر النسا نے جان کی امان کے لیے فی الواقع یوسف شاہ چک کے گھر میں پناہ لی تھی۔

جب جہانگیر کے عہد میں سری نگر کی جامع مسجد آتش زدگی سے جل گئی تو ملک حیدر کا باپ ملک حسن، جو شیعہ تھا، دوسرے سرکردہ شیعوں کے ہمراہ اس آتش زدگی میں ملوث ہونے کے الزام میں ماخوذ ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اسی بنا پر، نورجہاں کے ایما پر، حیدر نے اپنے خرچ سے اس مسجد کو از سرِ نو تعمیر کرایا، جیسا کہ اس قطعۂ تاریخ سے ظاہر ہے جس کا یہ مصرع محفوظ ہے:

بتاریخ ہزار و بیست و نہ از ہجرت سید

جامع مسجد، جو اصلاً سلطان سکندر نے تعمیر کرائی تھی، عہدِ جہانگیری سے پہلے بھی دو مرتبہ جزوی طور پر آگ سے تباہ ہو چکی تھی اور اسے سلطان حسن شاہ نے اور بعد ازاں ابراہیم ماگرے نے از سرِ نو تعمیر کرایا تھا۔ ملک حیدر نے کشمیر میں اصلاح اور رفاہِ عام کے متعدد

کام انجام دیے۔ اس کے بھائی علی ملک کو ۳۰-۱۰۲۹ھ (۲۰-۱۶۱۹ء) میں کشتواڑ کی فتح کا سہرا دیا جاتا ہے۔

مؤرخ رئیس الملک حیدر ملک کی قبر سری نگر سے تقریباً 10 میل کے فاصلے پر ژوڈر یعنی چاڈورہ میں ہے۔

چاڈورہ، جس سے ملک حیدر کا تعلق تھا، کشمیری زبان میں "ژوڈر" بولا جاتا اور چاڈورہ لکھا جاتا ہے۔ یہ نگام پرگنے کا ایک گاؤں ہے جو خود نگام سے تقریباً ایک میل کے فاصلے پر اور سری نگر سے کوئی دس میل جنوب میں واقع ہے۔ میر شمس الدین عراقی کی خانقاہ (مزار)، جو اصلاً دولت شاہ چک نے تعمیر کرائی تھی، اسے بھی ملک حیدر ہی نے از سرِ نو تعمیر کرایا۔

شاہی سیاح جہانگیر لکھتا ہے: "اتوار، 7 اردی بہشت کے روز میں سوار ہو کر گاؤں چاڈورہ گیا جو حیدر ملک کا وطن ہے۔ فی الحقیقت یہ نہایت خوش گوار قطعۂ زمین ہے، جس میں بہتی ندیاں اور بلند و بالا چنار ہیں۔ اس کی درخواست پر میں نے اس جگہ کا نام نورپور (شہرِ نور) رکھا۔" اس نام میں نورجہاں اور نورالدین جہانگیر کی طرف اشارہ ہے۔ وہ آگے لکھتا ہے: "راستے میں ایک درخت تھا جسے ہل ہل کہتے ہیں؛ جب کوئی اس کی ایک شاخ پکڑ کر ہلاتا ہے تو پورا درخت جنبش میں آجاتا ہے۔ عوام کا خیال ہے کہ یہ حرکت اسی ایک درخت کا خاصہ ہے۔ اتفاق سے مذکورہ گاؤں میں میں نے اسی قسم کا ایک اور درخت دیکھا جو اسی طرح جنبش کرتا تھا؛ اور مجھے معلوم ہوا کہ یہ خاصیت اس نوع کے تمام درختوں میں مشترک ہے، کسی ایک درخت تک محدود نہیں۔ شہر سے ہندوستان کی جانب ڈھائی کوس کے فاصلے پر گاؤں راولپور میں ایک چنار ہے جو اندر سے جلا ہوا ہے۔ اس سے پچیس برس پہلے، جب میں خود گھوڑے پر سوار تھا، پانچ اور زین شدہ گھوڑوں اور دو خواجہ سراؤں سمیت ہم اس

کے اندر داخل ہوئے تھے۔۔۔ اکبر نامہ میں لکھا ہے کہ میرے والد نے چونتیس آدمیوں کو اس کے اندر لے جا کر ایک دوسرے کے قریب کھڑا کیا تھا۔" (توزکِ جہانگیری کا انگریزی ترجمہ از الیگزینڈر راجرز (Alexander Rogers)، مرتبہ ہنری بیورج (Henry Beveridge)، ۱۹۱۴ء، جلد دوم، صفحات 154-155۔)

عہدِ جہانگیری کے کشمیر پر ایک ولندیزی پروٹسٹنٹ کی نظر

فرانسسکو پیلسارٹ (Francisco Pelsaert)، اہلِ اینٹورپ، ایک ولندیزی پروٹسٹنٹ تھا جو ولندیزی ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں ۱۶۲۱ء سے ۱۶۲۷ء تک سات برس ہندوستان میں مقیم رہا۔ پیلسارٹ ترقی کرتے کرتے ولندیزی بیڑے کا صدر بنا۔ اپنے آجروں کے نام اس کی تجارتی رپورٹ، جو ۱۶۲۶ء میں لکھی گئی، "ریمونسٹرانسی" (Remonstrantie) کے عنوان سے طبع شدہ ہے۔ 88 صفحات کے اس کتابچے میں پیلسارٹ ہمیں جہانگیر کے عہد کے کشمیر کی سرسری جھلکیاں دکھاتا ہے (ص 33-36)۔ اگرچہ اس کے مشاہدات ہر جزئیے میں پوری طرح درست نہیں اور ان میں کئی ابہام بھی ہیں، تاہم مجموعی حیثیت سے یہ اقتباس عام قاری کے لیے، اس زمانے کے ایک متعصب پروٹسٹنٹ تاجر کے نقطۂ نظر کے اعتبار سے، اپنی دلچسپی رکھتا ہے۔ پیلسارٹ لکھتا ہے:

"شہرِ کشمیر (یعنی سری نگر) خود نہایت خوش گوار پھل دار اور دیگر درختوں سے آراستہ ہے، اور دو بڑے دریا اس کے پہلو سے بہتے ہیں۔

ان میں سے بڑا دریا ویرناگ، اچھ بل اور متن (جس سے مراد دریائے لدر ہے) کی جانب سے آتا ہے؛ دوسرا شہر سے تین کوس کے فاصلے پر زمین سے کنویں یا چشمے کی طرح پھوٹتا ہے اور

اس کا منبع ایک اندرونِ ملک جھیل پر سالورہ گاؤں کے پاس ہے [سولر یا سالورہ گاؤں کسی زمانے میں انچار جھیل کے کنارے واقع تھا—تلہ مولہ کے بڑے چشمے سے 1¼ میل کے فاصلے پر؛ سولر سری نگر سے 13¾ میل ہے]؛ مگر ان دونوں میں سے کسی کا پانی شیریں یا صحت بخش معلوم نہیں ہوتا، اور باشندے اسے پینے سے پہلے ابال لیتے ہیں، جب کہ بادشاہ اور بڑے امرا کے لیے پانی دور سے لا کر پہنچایا جاتا ہے۔"

سوئنڈیسے وے (Swindesseway)—یعنی کشمیر کا دریائے سندھ، جو گاؤں گدور کے پاس سے گزرتا ہے اور سڑک اور کشتی کے راستے سری نگر سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر ہے—سے تین یا چار کوس دور، جہاں کا پانی شفاف اور برف کی مانند سفید ہے۔ بادشاہ جہانگیر نے دس بارہ کوس کے فاصلے سے عمدہ پانی قلعے تک پہنچانے کے لیے لکڑی کی ایک آبی گزرگاہ کی تعمیر شروع کرائی، مگر یہ بھانپ کر کہ دشمن یا شرپسند عناصر اسے بآسانی زہر آلود کر سکتے ہیں، پورے دس ہزار روپے صرف کرنے کے بعد اس نے یہ منصوبہ ترک کر دیا۔ کشمیر میں باہر سے آنے والے لوگ عموماً پیچش کے مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور بہت سے اسی سے ہلاک ہو جاتے ہیں؛ اس کا سبب لازماً پانی ہے، نیز پھلوں کی وہ فراوانی جو یہاں میسر ہے۔

"شہر کے مشرق کی جانب ایک عظیم قلعہ واقع ہے، جس کی سرمئی پتھر کی دیوار پوری نو یا دس فٹ موٹی ہے اور جو اسے ایک بلند چٹانی پہاڑی سے ملاتی ہے۔ اس پہاڑی کی چوٹی پر ایک بڑا محل ہے اور شمال کے رخ کچھ نیچے یا نصف بلندی پر ایک اور محل، نیز الگ الگ راستوں والی دو تین رہائش گاہیں بھی ہیں، مگر اہم عمارتیں جنوب میں مشرق کے رخ پر واقع ہیں۔ اس قلعے کے وسط میں بادشاہ کا محل ہے، جو اپنی شان و شوکت سے زیادہ اپنی بلندی اور وسعت کے اعتبار سے قابلِ ذکر ہے۔ ملکہ شمالی جانب بادشاہ کے پہلو میں رہتی ہے؛

اس کے برابر میں اس کا بھائی آصف خان، اور کچھ آگے مقرب خان مقیم ہے۔ [شیخ حسن، جسے مقرب خان کا خطاب ملا تھا، کچھ عرصہ دہلی کا حاکم رہا۔ وہ بچپن ہی سے ہمیشہ جہانگیر کی خدمت اور حضوری میں رہا تھا۔] دوسری یعنی جنوبی جانب بادشاہ کا سب سے چھوٹا بیٹا سلطان شہریار رہتا ہے، جس کی شادی ملکہ کے پہلے شوہر سے پیدا ہونے والی اس کی بیٹی سے ہوئی ہے۔ جنوب مغرب میں خواجہ ابوالحسن نیز دیگر امرائے کبار رہتے ہیں، اور یہ سب قلعے کے اندر اور پہاڑی کے گرداگرد تقریباً ایک کوس کے گھیرے کے دائرے میں آباد ہیں۔

"شہر بہت وسیع ہے اور اس میں بہت سی مسجدیں ہیں—یہی نام ان کے ہاں عبادت گاہوں کا ہے۔ مکانات چیڑ کی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں، جن کی درزیں مٹی سے بھر دی جاتی ہیں، اور ان کا اندازِ تعمیر ہرگز حقیر نہیں۔

یہ مکان خوش نما معلوم ہوتے ہیں اور دیہاتیوں کے بجائے شہریوں کے شایانِ شان ہیں، اور ان میں ہوا کی آمد و رفت کے لیے کھڑکیوں یا شیشوں کے بجائے خوب صورت اور فن کارانہ جالیاں بنی ہوتی ہیں۔ ان کی چھتیں مسطح اور پوری طرح مٹی سے ڈھکی ہوتی ہیں، جن پر باشندے اکثر پیاز اگاتے ہیں، یا وہ گھاس سے ڈھکی رہتی ہیں، چنانچہ برسات کے موسم میں یہ سبز چھتیں اور باغات دور سے دیکھنے پر شہر کو نہایت حسین بنا دیتے ہیں۔

"ملک اور شہر کے باشندے بیشتر غریب ہیں، لیکن جسمانی اعتبار سے مضبوط ہیں، خصوصاً مرد، جو کسی ہندوستانی کے مقابلے میں پورا دُگنا بوجھ اٹھا سکتے ہیں؛ یہ بات اس لحاظ سے حیرت انگیز ہے کہ مردوں اور عورتوں کو خوراک بہت کم ملتی ہے۔ ان کے بچے جب تک چھوٹے اور کم سن ہوتے ہیں نہایت خوب صورت اور گورے چٹے ہوتے ہیں، مگر بڑے ہو

کر اپنے طرزِ زندگی کے باعث — جو انسانوں سے زیادہ حیوانوں کا سا ہے — زرد رُو اور بدصورت ہو جاتے ہیں۔ عورتیں پستہ قد، میلی کچیلی، جوؤں بھری اور بدشکل ہوتی ہیں۔ وہ موٹے سرمئی اونی کپڑے کا لباس پہنتی ہیں جو گلے سے کمر تک کھلا ہوتا ہے۔ ماتھے پر وہ ایک طرح کی سرخ پٹی باندھتی ہیں اور اس کے اوپر ایک بدنما، سیاہ اور میلا کپڑا ہوتا ہے جو سر سے کندھوں پر ہوتا ہوا ٹانگوں تک لٹکتا ہے؛ سوتی کپڑا بہت مہنگا ہے اور ان کی پیدائشی مفلسی انہیں بدلنے کے لیے دوسرا جوڑا رکھنے سے محروم رکھتی ہے۔

"یہ کٹر مسلمان ہیں۔ ان کا بارہواں بادشاہ تھا (عبارت مبہم ہے) جس نے اس عقیدے کو اختیار کیا، اس سے پہلے کہ بادشاہ اکبر کے سپہ سالار راجا بھگوان داس نے حیلہ و تدبیر سے اس ملک کو زیر کیا، کیونکہ بلند پہاڑ اور دشوار گزار راستے طاقت کے بل پر فتح کو ناممکن بنائے ہوئے تھے۔

"کشمیر میں کئی قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں، مثلاً سیب، ناشپاتی، اخروٹ وغیرہ، لیکن ذائقے میں یہ ایران یا کابل کے پھلوں سے کمتر ہیں۔ دسمبر، جنوری اور فروری میں سردی نہایت شدید ہوتی ہے اور مسلسل بارش اور برف باری رہتی ہے؛ پہاڑ برف سے سفید رہتے ہیں، سوائے ان مقامات کے جہاں گرم موسم میں دھوپ پڑتی ہے، جس سے دریاؤں میں زبردست سیلاب آجاتے ہیں۔

"بادشاہ کو اس ملک سے خصوصی شغف کی وجہ یہ ہے کہ جب ہندوستان میں گرمی بڑھتی ہے تو نہایت تیز شراب اور افیون کے بے تحاشا استعمال کے باعث — اور یہ زیادتیاں اس کی جوانی میں اس سے بھی بڑھی ہوئی تھیں — اس کا جسم بھٹی کی طرح جلنے لگتا ہے۔ وہ عموماً مارچ یا اپریل میں لاہور سے روانہ ہوتا ہے اور مئی میں کشمیر پہنچتا ہے۔ یہ سفر پُرخرچ ہونے

کے علاوہ نہایت دشوار اور پُرخطر بھی ہے، کیونکہ بار بردار جانور پہاڑ عبور نہیں کر سکتے اور تقریباً ہر چیز آدمیوں کے سروں پر اٹھا کر لے جانی پڑتی ہے۔ تمام امرا اس جگہ کو کوستے ہیں، کیونکہ یہ امیر کو غریب بنا دیتی ہے اور غریب وہاں اپنا پیٹ نہیں بھر سکتے، اس لیے کہ ہر شے حد درجہ گراں ہے؛ مگر بظاہر بادشاہ اپنی رعایا کی فلاح پر اپنے آرام یا لطف کو ترجیح دیتا ہے۔

"کشمیر سے آگرہ برآمد کرنے کے لیے زعفران کے سوا کچھ نہیں جاتا، جس کی دو قسمیں ہیں۔ جو شہر کے قریب پیدا ہوتا ہے وہ آگرہ میں 20 تا 24 روپے فی سیر بکتا ہے؛ دوسری قسم، جو یہاں سے دس کوس (؟) کے فاصلے پر کاستو واری (Casstuwary) یعنی کشتواڑ میں پیدا ہوتی ہے، سب سے عمدہ ہے اور عموماً 28 تا 32 روپے فی سیر (تیس پیسے وزن کا سیر) فروخت ہوتی ہے۔ بہت سے پمری بھی بُنے جاتے ہیں؛ یہ تین گز لمبے اور دو گز چوڑے کپڑے ہیں جو اس اون سے بُنے جاتے ہیں جو بالوں سے زیادہ مشابہ ہوتی ہے اور بھیڑ کے پچھلے دھڑ پر اگتی ہے — نہایت باریک اور ریشم کی طرح نرم۔ یہ یہاں (یعنی آگرہ میں) سردی کے باعث جاڑوں میں بطور اوڑھنی پہنے جاتے ہیں اور بہت خوش نما اور نفیس معلوم ہوتے ہیں، اور ان کی سطح بوراتوس (boratos — ایک باریک اونی کپڑا جو اس دور میں یورپ میں رائج تھا) جیسی ہوتی ہے۔ اخروٹ، جو یہاں بکثرت ہوتے ہیں، آگرہ کو برآمد کیے جاتے ہیں۔

"آگرہ سے کشمیر بھیجی جانے والی اشیا میں موٹا اَن دھلا سوتی کپڑا، مقامی کھپت کے لیے سوت، نیز کالی مرچ اور افیون شامل ہیں۔ جائفل، لونگ اور جاوتری بہت گراں ہیں اور ان کا استعمال یہاں معروف نہیں؛ البتہ جیسا کہ متوقع ہے، جب بادشاہ یہاں قیام پذیر ہوتا ہے تو یہ سب چیزیں یہاں لائی جاتی ہیں۔"

جہانگیر کے عہد کے حاکموں قلیچ خان اور سعادت خان نے چکوں کو نہایت سختی سے کچل دیا۔ ان کی ساری نخوت جاتی رہی۔ بے چارے چکوں نے عاجزانہ طرزِ زندگی اختیار کر لیا اور یا تو چھوٹے موٹے پیشے اپنا لیے یا کاشت کار، کسان اور سائیس بن کر بس گئے۔ اعتقاد خان نے زراعت پیشہ طبقے پر سخت اور ظالمانہ پابندیاں عائد کیں۔ اسی نے پھلوں کے باغات کی قرقی و ضبطی اور جنگلات اور دیہات کو مخصوص کر لینے کی بری رسم کی بنیاد ڈالی۔ اس نے بیگار بھی لی، خاص طور پر زعفران کے پھول چننے کے سلسلے میں، جو شاہی محاصل کا ایک ذریعہ تھا۔ تاہم شاہ جہاں نے اپنی تخت نشینی کے بعد ایک خصوصی فرمان جاری کر کے یہ تمام رسمیں منسوخ کر دیں۔

جہانگیر نے اپنی رعایا کی فلاح و بہبود سے غفلت نہیں برتی۔

۱۶۲۱ء (۱۰۳۱ھ) میں اس نے "رعایا اور سپاہیوں کو آسودگی پہنچانے کے لیے" رسومِ فوج داری کا تکلیف دہ محصول موقوف کر دیا۔ اس نے راجوری میں مسلمان عورتوں کے اپنی ان ہندو بہنوں کی تقلید میں جان دینے کو ممنوع قرار دیا جو اپنے شوہروں کی نعشوں کے ساتھ خود کو شعلوں کی نذر کر دیتی تھیں۔ ۱۶۱۹ء میں جہانگیر کی آمد سے کچھ ہی پہلے بارہ برس کی ایک لڑکی کو اس کے مرے ہوئے شوہر کی قبر میں زندہ دفن کر دیا گیا تھا۔* بے مقدور لوگوں کے ہاتھوں پیدائش کے وقت بیٹیوں کا گلا گھونٹ دینے کا سلسلہ بند کرایا گیا۔ اس نے ہندو مردوں اور مسلمان عورتوں کے باہمی نکاح کو بھی ممنوع ٹھہرایا۔ مسلمان لڑکیوں کو ہندو بنا کر پھر ان کے ہندو شوہروں کے ساتھ نذرِ آتش کیے جانے کی تعداد ایک زمانے میں راجوری اور بھمبر میں چار ہزار تک جا پہنچی تھی۔ شاہ جہاں نے اس معاملے میں اپنے والد کی روش کی پیروی کی۔ شاہ جہاں کے عہد میں، اس کی حکومت کے ساتویں سال، بھمبر کے

مسلمانوں کی ان ہندوؤں کے خلاف شکایات کی تحقیقات کرائی گئیں جنہوں نے قرآن جلایا تھا اور مسلمانوں پر ظلم ڈھایا تھا۔ تفتیشی عہدے دار شیخ محمود گجراتی کی رپورٹ پر حکم جاری ہوا کہ اگر کوئی ہندو اسلام قبول کرنا چاہے تو اس کا خاندان اس کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہ ڈالے۔ موجودہ ڈوگرہ عہدِ حکومت میں کوئی ہندو اسلام قبول کرنے پر خاندانی جائیداد میں اپنے حصے کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ سفر میں پیش آنے والی دشواریوں کے پیشِ نظر جہانگیر نے حکم دیا کہ مناسب منزلوں پر اس کے اور حرم کے لیے موزوں قیام گاہیں تعمیر کی جائیں۔ مزید برآں اس نے ویری ناگ کے چشمے پر ایک باغ بنانے کا حکم دیا۔ اس باغ میں ایک نگار خانہ تھا جس میں ہمایوں، اکبر، جہانگیر اور ایران کے شاہ عباس کی تصویریں بنی ہوئی تھیں۔

- فرانسس گلیڈون (Francis Gladwin) کی ”دی ہسٹری آف جہانگیر“، مرتبہ وی آر آئینگر (V. R. Aiyangar)، پال اینڈ کمپنی، مدراس، ۱۹۳۰ء، صفحہ 92۔

ہم عصر مصنف فرانسسکو پیلسارٹ (Francisco Pelsaert) کے بقول ویری ناگ ”نہایت دل کش تفریح گاہ تھی جہاں بادشاہ کے پاس پورے ہندوستان کی بہترین شکار گاہیں تھیں۔“ اس کے حاکموں میں سے دو، دلاور خان اور ارادت خان، نے بھی باغ تعمیر کرائے — ایک سری نگر کے جنوب مشرق میں واقع اس براری نمبل جھیل پر جسے مار نالہ سیراب کرتا ہے، اور دوسرا سوپور سے پانچ میل جنوب میں واقع گاؤں ناؤپور میں۔ جہانگیر نے کشمیر کے انتظام کے لیے یکے بعد دیگرے سات صوبے دار مقرر کیے۔ قلیچ خان (۱۶۰۶ء) اور ارادت خان (۱۶۲۰ء) کے سوا سب عادل تھے اور ان کے عدل کی بے شمار مثالیں ملتی ہیں۔ کشمیر کے ہندوؤں نے شہنشاہ جہانگیر سے قلیچ خان کی شکایت کی،

جس نے جعفر برمکی کے بلیغ و موجز انداز میں (دیکھیے مبرد کی الکامل، لاہور، ۱۳۳۷ھ = ۱۹۲۸ء، جلد اول، صفحہ 301) اسے حسبِ ذیل تنبیہ بھیجی:—

پناھا ! داد خواھان تو بسیان شکر گذاران توع ... آب سحاب ... حکومت

1۔ قزوینی کی بادشاہ نامہ، صفحات 444-5؛ نیز عبدالحمید لاہوری کی بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ دوم، صفحہ 58۔ 2۔ عبدالحمید کی بادشاہ نامہ، جلد اول، حصہ دوم، صفحہ 585۔ 3۔ جہانگیرز انڈیا: فرانسسکو پیلسارٹ کی ریمانسٹرانسی (The Remonstrantie of Francisco Pelsaert)، ۱۹۲۵ء، صفحہ 33۔ 4۔ محمد الدین فوق، مکمل تاریخِ کشمیر، حصہ دوم، صفحہ 198۔

[اے پناہِ حکومت ! تیرے داد خواہ بہت ہیں اور شکر گزار کم۔ پیاسی خلق پر ابر کا پانی برسا، ورنہ اپنا منصبِ حکومت چھوڑ دے۔]

دبستان کا بیان ہے کہ پنڈت سری کانت کو، جو ہندو علوم سے واقف اور شاستروں کا عالم ایک کشمیری تھا، جہانگیر نے ہندوؤں کے منصف (قاضی) کے منصب پر سرفراز کیا تاکہ شخصی قانون اور رسم و رواج کے ہر معاملے میں انہیں مکمل خود مختاری حاصل رہے۔ اپنی خودنوشت کے مطابق جہانگیر نے ایک کشمیری خاتون سے نکاح کیا تھا: ”اس کے بعد کشمیر کے راجا کی بیٹی سے، جو جوگیوں کے حلقے سے تعلق رکھتی تھی، میرے ہاں ایک اور بیٹی پیدا ہوئی جو ایک برس کی عمر میں فوت ہو گئی۔“ علاقائی توسیع کے اعتبار سے جہانگیر کے عہدِ حکومت میں کشتواڑ کی فتح عمل میں آئی۔ اس فتح کا بیان شاہی روزنامچہ نگار کی زبان میں نقل کیے جانے کے لائق ہے۔ یہ تحریر تقریباً کسی جدید جنگی نامہ نگار کی رپورٹ معلوم ہوتی ہے: — ”میرے (جلوس کے) چودھویں سال الٰہی مہینے شہریور کی دسویں تاریخ کو دلاور خان دس

ہزار سوار وپیادہ کے ساتھ کشتواڑ کی تسخیر پر کمر بستہ ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے حسن نامی کو گرد علی میر بحر کے ہمراہ شہر کی حفاظت اور علاقے کے انتظام پر مامور کیا۔ چونکہ گوہر چک اور ایبا چک بحیثیت وارث کشمیر پر دعویٰ رکھتے تھے اور کشتواڑ میں فتنہ انگیزی کر رہے تھے اور وادیِ ضلالت وتباہی میں سرگرداں تھے، اس لیے اس نے از راہِ احتیاط اپنے بھائیوں میں سے ایک، یبت، کو ایک دستے کے ساتھ دیسو میں چھوڑا جو پیر پنجال کے کوتل (درے) کے قریب واقع ہے۔ اسی مقام پر اپنی فوج تقسیم کر کے وہ خود ایک دستہ لے کر سنگین پور کے راستے تیزی سے آگے بڑھا؛ اپنے بیٹے جلال کو نصر اللہ عرب اور علی ملک کشمیری اور جہانگیری ملازموں کی ایک جماعت کے ساتھ دوسرے راستے سے روانہ کیا، اور اپنے بڑے بیٹے جمال کو سرفروش نوجوانوں کے ایک دستے کے ساتھ اپنی فوج کے ہراول کے طور پر آگے بھیجا۔ ساتھ ہی اس نے دو اور دستے اپنے دائیں اور بائیں پیش قدمی کے لیے متعین کیے۔

چونکہ از راہِ احتیاط اس راستے پر گھوڑے نہیں جا سکتے تھے، اس لیے اس نے کچھ گھوڑے اپنے ساتھ لیے، مگر اپنے سپاہیوں کے تقریباً تمام گھوڑے پیچھے چھوڑ کر کشمیر (یعنی سری نگر) بھجوا دیے۔ نوجوانوں نے کمر پر فرض شناسی کا کمربند باندھا اور پیدل پہاڑوں پر چڑھ گئے۔ لشکرِ اسلام کے غازی بدنصیب کافروں سے مورچہ بہ مورچہ لڑتے ہوئے نرکوٹ تک جا پہنچے، جو دشمن کے مضبوط ٹھکانوں میں سے ایک تھا... بدبخت ایبا چک اہلِ فساد کی ایک بڑی تعداد سمیت مارا گیا۔

ایبا کی موت سے راجا بے بس اور پست ہمت ہو گیا اور اس نے راہِ فرار اختیار کی، اور پل عبور کر کے بھنڈرکوٹ میں جا ٹھہرا جو دوسری جانب واقع ہے... دلاور خان نے بھنڈرکوٹ

کے مقابل اپنی فوجیں صف آرا کیں... الغرض چار مہینے اور دس دن تک دلاور خان بھنڈرکوٹ پر پائے ہمت جمائے دریا عبور کرنے کی کوششیں کرتا رہا... دلاور خان کے بیٹے جلال نے درباری ملازموں میں سے چند اور تقریباً دو سو افغانوں کے ایک دستے کے ساتھ بخیریت دریا عبور کیا، راجا پر اچانک حملہ کر دیا اور فتح کے نقارے زور شور سے بجا دیے۔ سپاہی راجا پر جھپٹے اور اسے گرفتار کر لیا... دلاور خان... دریائے مارو عبور کر کے مندل پہنچا، جو اس ملک کا دارالحکومت تھا اور دریا سے تین کوس کے فاصلے پر ہے۔ راجا کے گھر میں (یعنی اس کے نکاح میں) راجائے جموں سنگرام کی بیٹی اور راجا باسو کے بیٹے سورج مل کی بیٹی تھیں۔ سنگرام کی بیٹی سے اس کی اولاد بھی تھی۔ فتح سے پہلے وہ اپنے اہل و عیال کو پناہ کے لیے راجا جسوال اور دوسرے زمینداروں کے پاس بھیج چکا تھا... دلاور خان راجا کو ہمراہ لے کر آستان بوسی کے لیے حاضر ہوا اور نصر اللہ عرب کو سوار و پیادہ فوج کے ساتھ ملک کی حفاظت پر چھوڑ گیا۔"

1۔ شیا اور ٹرائر (Shea and Troyer) کا ترجمہ، صفحات 164-165۔ 2۔ دی ویلی آف کشمیر (The Valley of Kashmir)، صفحہ 194، حاشیہ 2۔

دلاور خان کے عہدِ حکومت میں، روایت ہے کہ ایک دمدار ستارے کے نمودار ہونے کے بعد چوہے اس قدر کثرت سے پیدا ہوئے کہ فصلوں کو خاصا نقصان پہنچا۔ پھر طاعون کی وبا نے ملک کو ایسی شدت سے اپنی لپیٹ میں لے لیا کہ مُردوں کو آخری رسوم ادا کیے بغیر دریا میں بہا دیا جاتا تھا۔ اس کا حال خود جہانگیر کی زبانی سنیے: "آج کے دن (بدھ، ۱۷ اسفندارمذ، جلوسِ جہانگیری کا بارہواں سال = ۱۶۱۷ء) واقعہ نویس کی رپورٹ پہنچی کہ طاعون نے ملک (کشمیر) میں پوری طرح جڑ پکڑ لی ہے اور بہت سے لوگ لقمۂ اجل بن چکے ہیں۔ علامات یہ

تھیں کہ پہلے دن سر درد اور بخار ہوتا اور ناک سے کثرت سے خون بہتا؛ دوسرے دن مریض چل بستا۔ جس گھر میں ایک شخص مرتا، اس گھر کے سب مکین موت کے منہ میں چلے جاتے۔ جو کوئی مریض یا میت کے قریب جاتا، وہ بھی اسی طرح مرض میں مبتلا ہو جاتا۔ ایک واقعہ یہ ہوا کہ ایک لاش گھاس پر پھینک دی گئی؛ اتفاق سے ایک گائے آئی اور اس گھاس میں سے کچھ کھا گئی تو وہ مر گئی، اور جن کتوں نے اس کا گوشت کھایا وہ بھی مر گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ موت کے خوف سے باپ اپنی اولاد کے پاس نہ جاتے اور اولاد باپ کے قریب نہ پھٹکتی۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ جس محلے سے اس مرض کا آغاز ہوا تھا وہیں آگ بھڑک اٹھی اور تقریباً تین ہزار مکان جل گئے۔۔۔ مجھے امید ہے کہ قادرِ مطلق اپنے گنہگار بندوں پر رحم فرمائے گا اور وہ ایسی آفتوں سے کلیتاً نجات پا جائیں گے۔“

”توزکِ جہانگیری“، انگریزی ترجمہ از الیگزینڈر راجرز (Alexander Rogers) و ہنری بیورج (Henry Beveridge)، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن، ۱۹۱۴ء، جلد دوم، صفحات 135-139۔

”اسی روز (بدھ، ماہِ آذر کی پہلی تاریخ = مارچ ۱۶۱۷ء، جلوسِ جہانگیری کا بارہواں سال) کشمیر کی رپورٹیں میرے سامنے پیش ہوئیں۔ ایک یہ تھی کہ ایک ریشم فروش کے گھر دو لڑکیاں ایسی پیدا ہوئیں جن کے دانت نکلے ہوئے تھے اور ان کی پشتیں کمر تک آپس میں جڑی ہوئی تھیں، مگر سر، بازو اور ٹانگیں الگ الگ تھیں؛ وہ تھوڑی مدت زندہ رہ کر مر گئیں۔“ جہانگیر کے عہد میں کشمیر سے ۷،۴۶،۰۰۰ دام مالگزاری وصول ہوتی تھی، جو بلاشبہ اس امر کی دلیل ہے کہ اس کے دورِ حکومت میں کشمیر کی خوشحالی کو فروغ نصیب ہوا۔

شاہ جہاں

شاہ جہاں نے اپنے عہدِ حکومت میں پانچ سات برس کے وقفوں سے چار مرتبہ کشمیر کا دورہ کیا۔ پہلی آمد ۱۰۴۳ھ (یعنی ۱۶۳۴ء) میں ہوئی، جب شاہ جہاں ۵ جون کو سری نگر پہنچا۔ ”تاریخِ شاہجہاںِ دہلی“ کا مصنف لکھتا ہے: ”اس صوبے کے دل فریب حسن نے شاہ جہاں کو مسحور کر دیا، اور اگرچہ اس کے ہمراہ مصوروں کی کوئی جماعت نہ تھی جو اس کے قدرتی حسن کی تصویر کشی کرتی، تاہم اس کے دربار میں متعدد قادر الکلام انشا پرداز موجود تھے جنہوں نے کشمیر کا حال ایسے رنگین اور مرقع نگارانہ اسلوب میں بیان کیا ہے جو صورت میں نثر مگر روح کے اعتبار سے شاعری ہے۔“ مرزا اینائے قزوینی (پادشاہ نامہ، برٹش میوزیم، Or. 173) اور جلال الدین طباطبائی (پادشاہ نامہ، برٹش میوزیم، Or. 1676) کی لکھی ہوئی کشمیر کی توصیفیں اور قدسی و کلیم کے منظوم بیانات اسی کی مثالیں ہیں۔

مرزا اینائے قزوینی اس موقع پر شاہی ہمرکاب تھا۔ شاہ جہاں کی دوسری آمد جنوری تا اکتوبر ۱۶۴۰ء میں ہوئی۔ ایک اور آمد ۱۶۴۵ء میں مذکور ہے۔ آخری آمد ۱۶۵۱ء میں ہوئی، جو تاہم سیلابوں اور طوفانوں کے باعث مختصر رہ گئی اور شاہ جہاں لاہور لوٹ گیا۔ شاہ جہاں کی پہلی آمد ہی کے موقع پر بھمبر کے ہندو راجا نے قبولِ اسلام کا اعلان کیا اور اسے ”راجۂ دولت مند“ (یعنی صاحبِ دولت راجا) کا خطاب عطا ہوا۔

1. ”توزکِ جہانگیری“، انگریزی ترجمہ از راجرز و بیورج، رائل ایشیاٹک سوسائٹی، لندن، ۱۹۰۹ء، جلد اول، صفحات 442-443۔

2. ایضاً، صفحہ 406۔ 3. ”تاریخِ شاہجہاںِ دہلی“ از ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکسینہ (Dr. Banarsi Prasad Saksena)، دی انڈین پریس لمیٹڈ، الٰہ آباد، ۱۹۳۲ء، صفحات 314-17۔

شاہ جہاں نے مجموعی طور پر نو صوبہ دار مقرر کیے، جن میں سے دو، یعنی ظفر خان اور علی مردان خان، دوبارہ بھی مامور ہوئے۔ اعتقاد خان، جسے جہانگیر نے مقرر کیا تھا، اس وقت تک اپنے منصب پر برقرار رہا جب تک اس کی زیادتی اور جابرانہ طرزِ حکومت اس کی معزولی کا سبب نہ بن گئی۔ شہزادہ مراد ۱۶۴۰ء میں کشمیر آیا اور ایک برس صوبہ دار رہا؛ اس کے بعد علی مردان خان مامور ہوا۔ اپنے قیام کے دوران شہزادہ مراد نے شاہ آباد کے ملکوں کی ایک بیٹی سے نکاح کیا۔ حسن کے بیان کے مطابق شاہ آباد پہلے ویری ناگ پرگنہ کہلاتا تھا اور شاہ جہاں نے اسے شاہ آباد کا نام دیا۔

ظفر خان کا اصل نام احسن اللہ خان احسنؔ تھا۔ ظفر خان کا خطاب اسے شاہ جہاں نے اس کی فتح مندانہ جرأت اور ثابت قدمی کے صلے میں عطا کیا تھا۔ وہ اعتقاد خان کا جانشین ہوا۔ درحقیقت صوبہ داری پر احسن اللہ کے والد ابوالحسن تربتی کا تقرر ہوا تھا، مگر وہ اس قدر ضعیف اور سالخوردہ تھے کہ منصب کے گراں بار فرائض بہ نفسِ خود انجام نہ دے سکتے تھے، چنانچہ بیٹے نے باپ کی نیابت کی۔ ظفر خان کے عمدہ نظم و نسق نے بادشاہ کی تحسین حاصل کی اور وہ اپنے منصب پر مستقل کر دیا گیا۔

تبت کی قطعی تسخیر ظفر خان ہی کے ہاتھوں انجام پائی، جس کی مختصر تفصیل یہ ہے: چکوں کو تبتِ خرد (بلتستان) میں پناہ مل گئی تھی۔ جہانگیر کے صوبہ دارِ کشمیر ہاشم خان ولد قاسم خان میر بحر نے سکردو کے علی رائے مرزبان (محافظِ سرحد) کو مطیع کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔

شاہ جہاں کے زمانے میں علی رائے کے بیٹے عبدال نے حبیب چک اور احمد چک کو پناہ دی۔ چنانچہ ظفر خان نے عبدال کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ مغل اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کرے

اور ۱۶۳۴ء میں شاہ جہاں کے نام کا خطبہ پڑھے۔ مگر عبدال نے اگلے دو برسوں کے اندر اطاعت سے انحراف کر دیا۔ شاہ جہاں نے ظفر خان کو تبتِ خرد کی تسخیر کا حکم دیا۔ ظفر خان نے دو ہزار سواروں اور دس ہزار پیادوں کے ساتھ عبدال کو دوبارہ اطاعت قبول کرنے اور دس لاکھ روپے تاوان ادا کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس لڑائی کے دوران عبدال کے پندرہ سالہ بیٹے دولت نے، تبتِ خرد میں نیل آب یعنی دریائے سندھ کے اُس پار شکر کے مقام پر واقع اپنے قلعے سے نکل کر شب خون مارنے میں، خاصی جرأت دکھائی، مگر مغل فوج کے میر فخر الدین نے اسے پسپا کر دیا۔ مغلوب ہونے پر دولت اپنے باپ کا نقد و جواہر لے کر فرار ہو گیا۔ بہرحال ظفر خان عبدال کو اور حبیب چک اور احمد چک کے خاندانوں کو کشمیر لے آیا اور عبدال کے وکیل محمد مراد کو ملک کا انتظام سونپ گیا۔ ظفرؔ کی یادگار بالخصوص وہ اقدام ہے جس کے ذریعے اس نے وہ سختیاں دور کیں جو اعتقاد خان نے اہلِ کشمیر پر روا رکھی تھیں اور جنہیں ایک کشمیری شاعر نے بادشاہ کی سالگرہ کے موقع پر بادشاہ کی شان میں کہی گئی ایک مؤثر اور معنی خیز نظم میں نہایت خوبی سے شاہ جہاں کے گوش گزار کیا تھا۔ شاعر پہلے شعر میں بادشاہ سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ "ہم اہلِ کشمیر کو حضور کے دیوانِ عدالت میں ایک فریاد پیش کرنی ہے"؛ اور دوسرے شعر میں کہتا ہے کہ زعفران تو غمگین اور افسردہ دلوں کو ہنسا دیتا ہے، مگر یہاں بے گناہ لوگ زعفران ہی کے سبب رلائے جاتے ہیں! چنانچہ اسی غرض سے ظفر خان نے شاہ جہاں سے ایک فرمان حاصل کیا، جو پتھر پر کندہ کر کے سری نگر کی جامع مسجد کے دروازے کی عمارت میں نصب کیا گیا اور آج تک وہیں موجود ہے۔ اس فرمان کا ترجمہ یہ ہے: اللہ اکبر — شاہ جہاں بادشاہ، حامیٔ دین۔

نقل فرمانِ سعادت نشانِ حضرتِ سلیمان جاہ، صاحب قرانِ ثانی، جو ۷ اسفندارمذ (فروری) الٰہی (یعنی اکبری تقویم کے مطابق) کو کمترین بندگانِ درگاہ، ظفر خان نامی، کی درخواست پر

اس غرض سے قلم بند ہوا کہ کشمیرِ جنت نظیر میں سابق صوبہ داروں کے زمانے میں جو زیادتیاں روا رکھی گئیں اور جو ان علاقوں کی رعایا اور باشندوں کی پریشانی کا باعث تھیں، ان کا ازالہ کیا جائے۔

چونکہ ہماری عالی ہمت رعایا کی آسودگی کی طرف متوجہ ہے، اس لیے ہم نے بعض ایسے دستوروں کی منسوخی کا حکم دیا جو کشمیر کے خوب صورت ملک میں باشندگانِ ملک کے لیے رنج و تکلیف کا باعث بن گئے تھے۔ ان امور میں سے ایک یہ ہے کہ زعفران چننے کے موسم میں لوگوں کو بیگار میں پکڑ کر اس کام پر لگا دیا جاتا تھا اور تھوڑے سے نمک کے سوا انہیں کوئی اجرت نہ دی جاتی تھی، جس سے رعایا کو بڑی تکلیف پہنچی۔ ہم نے حکم دیا کہ زعفران چننے کے سلسلے میں کسی شخص کو کسی طرح ستایا نہ جائے؛ اور خالصہ اراضی پر پیدا ہونے والے زعفران کے بارے میں لازم ہے کہ مزدوروں کو راضی رکھا جائے اور انہیں مناسب اجرت دی جائے؛ اور جو زعفران جاگیر میں عطا کی گئی زمینوں پر پیدا ہو، وہ ساری جنس کی صورت میں جاگیردار کے حوالے کی جائے تاکہ وہ جس طرح چاہے اسے چنوا لے۔ دوسری شکایت یہ ہے کہ کشمیر کے بعض صوبہ داروں کے زمانے میں چاول کے فی خروار دو دام لکڑی (ایندھن) کی مد میں وصول کیے جاتے تھے، اور اعتقاد خان کی حکومت میں اسی مد میں فی خروار چار دام لیے جانے لگے۔ چونکہ اس بنا پر بھی رعایا سخت پریشان تھی، ہم نے حکم دیا کہ لوگوں کو اس محصول سے کلیتاً سبکدوش کر دیا جائے اور لکڑی (ایندھن) کی مد میں کچھ نہ لیا جائے۔ ایک اور شکایت یہ ہے کہ جس گاؤں کی مالگزاری چار سو خروار شالی سے زیادہ ہوتی، اس پر لازم تھا کہ مقامی حکام کو سالانہ دو بھیڑیں فراہم کرے؛ اعتقاد خان نے اپنے دورِ حکومت میں ہر بھیڑ کے عوض ٦٦ دام وصول کیے۔ چونکہ اس بنا پر بھی لوگ بہت تنگ تھے، ہم نے تاکیدی حکم دیا کہ یہ سلسلہ موقوف کیا جائے؛ نہ بھیڑیں لی جائیں اور نہ ان کے

عوض روپیہ؛ رعایا اس محصول کی ادائیگی سے معاف رکھی جائے۔ علاوہ ازیں اعتقاد خان نے اپنے عہدِ منصب میں ہر ملاح پر، خواہ وہ جوان ہو یا بوڑھا یا لڑکا، یکساں ۷۵ دام فی کس محصول عائد کر دیا، حالانکہ پہلے سے یہ دستور چلا آتا تھا کہ جوان پر ۶۰ دام، بوڑھے پر ۱۲ دام اور لڑکے پر ۳۶ دام عائد کیے جائیں۔ ہم نے حکم دیا کہ سابق دستور بحال کیا جائے، اعتقاد خان کی روا رکھی ہوئی زیادتی کا ازالہ ہو اور لوگ اس پر عمل نہ کریں۔ ایک اور شکایت یہ ہے کہ صوبہ دار پھلوں کے موسم میں ہر اس چھوٹے بڑے باغ میں، جس میں اچھا پھل دکھائی دیتا، اپنے آدمی بٹھا دیتے تھے تاکہ وہ ان کے لیے پھل کی نگرانی کریں، اور ان باغوں کے مالکوں کو پھل استعمال نہ کرنے دیتے تھے؛ اس سے ان لوگوں کا اتنا نقصان ہوا کہ بعض نے (تنگ آکر) پھل دار درخت ہی برباد کر ڈالے۔ ہم نے حکم دیا کہ کوئی صوبہ دار کسی کے باغ یا باغیچے کے پھل پر قدغن نہ لگائے۔ مناسب ہے کہ صوبۂ کشمیر کے موجودہ اور آئندہ زمانوں کے عالی مرتبہ حاکم، لائق عاملِ مالگزاری اور اہل کار ان احکام کو دائمی اور ابدی سمجھیں اور ان ضابطوں میں کسی تغیر و تبدل کو راہ نہ دیں۔ جو کوئی ان میں کوئی تغیر یا تبدل روا رکھے گا، وہ خدا کی لعنت اور بادشاہ کے غضب کا سزاوار ہو گا۔— تحریر بتاریخ ۲۶ آذر (مارچ) الٰہی (یعنی اکبری تقویم کے مطابق)۔

1. اعتقاد خان مرزا شاہ پور اعتماد الدولہ کا بیٹا اور آصف خان اور نورجہاں کا بھائی تھا۔ جہانگیر کے عہدِ حکومت کے سترہویں سال میں وہ کشمیر کی صوبہ داری پر مقرر ہوا۔ حبیب چک اور احمد چک نے بغاوت کر کے فتنہ برپا کیا، مگر انہیں تبت کی طرف فرار ہونا پڑا۔ اعتقاد خان کا انتقال ۱۰۶۰ھ (۱۶۵۰ء) میں آگرہ میں ہوا۔

2. یہ ترجمہ (1) ریورنڈ آئی لوونتھال (Rev. I. Loewenthal)، جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، کلکتہ، ۱۸۶۵ء، جلد XXXIII، نمبر 3، ۱۸۶۴ء، صفحات 288-90، اور (2) سر جیونجی جمشید جی مودی (Sir Jivanji Jamshedji Modi)، جرنل آف دی بمبئی برانچ آف دی رائل ایشیاٹک سوسائٹی، نیو سیریز، ۱۹۲۶ء، جلد اول، صفحات 199-202 کے انگریزی تراجم میں ترمیم کر کے تیار کیا گیا ہے۔

احسن اللہ خان نے ملک کی زیبائش میں اضافے کے لیے کئی باغ لگائے۔ اس نے کشمیر میں نئے پھلوں اور پھولوں کی متعدد قسمیں بھی متعارف کرائیں۔ وہ ایک صاحبِ کمال شخص تھا اور اس نے اصفہان کے مرزا محمد علی صائبؔ کی سرپرستی کی، جو بعد میں ایران کا ملک الشعرا بنا؛ وہیں سے اس نے ظفر خان کو ایک شعر لکھ بھیجا اور اس سے پانچ ہزار روپے انعام پایا۔ ظفرؔ بھی ادبی رہنمائی کے باب میں صائبؔ کا احسان مند تھا۔

ظفر خان نے خود بھی کشمیر کی مدح میں ”ہفت منزل“ کے نام سے ایک مثنوی یادگار چھوڑی ہے، جو اس نے شاہ جہاں کی تیسری آمد کے موقع پر تحصیل کولگام کی خوش منظر آبشار اہرہ بل پر اسے پیش کی۔ اپنی مثنوی میں ایک جگہ ظفر خان کہتا ہے، جس کا مفہوم یہ ہے: ”جب تک کشمیر قائم ہے، اے خدا! مجھے جنت کے باغ کی یاد نہ دلا۔ ہر شخص کو اس کی مراد عطا فرما — بلبل کو باغ، اور مجھے کشمیر!“ ظفر خان کی دو اور مثنویاں بھی معروف ہیں: ایک ”جلوۂ ناز“ اور دوسری ”میخانۂ راز“۔

”احسن الحکایات“، جو حافظ محمد رضا کی اکتیس حکایتوں کا مجموعہ ہے، احسنؔ ہی کے عہدِ حکومت میں کشمیر میں تصنیف ہوئی۔

ظفر خان کا بیٹا محمد آشنا، جس کا خطاب عنایت خان تھا، داروغۂ کتب خانہ یعنی شاہی کتب خانے کے مہتمم کے منصب پر فائز رہا۔ آشناؔ شاعر تھا اور اس نے "ملخص" کے نام سے شاہ جہاں کے عہدِ حکومت کے ابتدائی تیس برسوں کی تاریخ بھی لکھی۔ یہ ظفر خان کی شعر و ادب کی سرپرستی ہی کا ثمرہ تھا کہ ابو طالب کلیمؔ نے اپنے "پادشاہ نامہ" میں ۱۰۴۶-۴۷ھ (۱۶۳۶-۳۷ء) میں تسخیرِ تبت کے لیے کی گئی ظفر خان کی مہم کا ذکر کیا۔

[ظفر خان "احسنؔ" — شاید یہاں ظفر خان کے بارے میں ایک مختصر نوٹ درکار ہے۔ خواجہ مرزا احسن اللہ کا تخلص احسنؔ تھا۔ وہ خواجہ ابوالحسن تربتی کا بیٹا تھا (یعنی تربتِ حیدری کا باشندہ، جو ایران کے خطہ خراسان میں مشہد کے جنوب میں واقع ایک قصبہ ہے)۔ خواجہ ابوالحسن ایک زمانے میں شہزادہ دانیال کا مشیر اور دکن کا دیوان رہا، بعد میں میر بخشی ہوا، اور اسے رکن السلطنت کا خطاب حاصل تھا۔ جہانگیر کے عہدِ حکومت کے انیسویں سال ۱۰۳۳ھ (۱۶۲۳ء) میں احسن اللہ کابل کا صوبہ دار مقرر ہوا اور اسے ظفر خان یعنی "صاحبِ فتح" کا خطاب اور ڈیڑھ ہزاری منصب عطا ہوا، جو بعد میں بڑھا کر ڈھائی ہزاری کر دیا گیا۔

شاہ جہاں کے عہدِ حکومت کے پانچویں سال ۱۰۴۱ھ (۱۶۳۱ء) میں وہ اپنے والد کے نائب کی حیثیت سے کشمیر بھیجا گیا، جن کا کشمیر کی صوبہ داری پر تقرر ہوا تھا۔ بانکی پور کیٹلاگ (جلد سوم، صفحہ 117) کے مطابق احسن اللہ اس منصب پر شاہ جہاں کے عہد کے چھبیسویں سال تک فائز رہا، جس کے بعد اس کا تبادلہ ٹھٹھہ کر دیا گیا۔ لیکن درحقیقت ظفر خان ایک برس اپنے والد کا نائب رہا اور دو مرتبہ کشمیر کا صوبہ دار مقرر ہوا: پہلی بار ۱۰۴۲ھ

(۱۶۳۲ء) میں سات برس کے لیے اور دوسری بار ۱۰۵۲ھ (۱۶۴۲ء) میں چار برس کے لیے، جس کی تائید شاہنواز خان کی "مآثر الامرا" (صفحات 757-59) سے ہوتی ہے۔]

احسن اللہ قد کا پستہ مگر نہایت ذہین اور حاضر جواب تھا۔ اس کا والد پکا سنی تھا، مگر وہ خود پُرجوش شیعہ تھا۔

احسن اللہ نے بزرگ خانم سے نکاح کیا جس سے اس کا ایک بیٹا مرزا محمد طاہر پیدا ہوا، جسے، جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے، عنایت خان کا خطاب دیا گیا۔

احسن اللہ کا انتقال ۱۰۷۳ھ (۱۶۶۲ء) میں لاہور میں ہوا اور وہ مغل پورہ میں اپنے والد کی قبر کے قریب دفن ہوا۔ عنایت خان ۱۰۸۱ھ (۱۶۷۰ء) میں کشمیر میں فوت ہوا۔ مرزا خورشید احسن اللہ کا بھائی تھا۔

خواجہ خاوند محمود بخاری ظفر خان کے عہدِ حکومت میں کشمیر آئے اور ان کے ورود سے سلسلۂ نقشبندیہ کو نئی تقویت ملی، چنانچہ شاعر مشربی نے کہا—

شادمانی زآنکہ در کشمیریاں

خواجہ والا گہر

از وجودش ظاہر و باطن بہ مشتاقان رسید

ابراہیم خان، جو بعد میں علی مردان خان کے نام سے مشہور ہوا، اصلاً ایرانی تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اسے قندھار میں ایک خزانہ ہاتھ آیا، مگر وہ اسے اپنے آقا شاہِ ایران کے حوالے کرنے پر آمادہ نہ تھا، اس لیے اس نے شاہ جہاں کی پناہ حاصل کی۔

علی مردان عادل اور فیاض تھا۔

وہ اپنا مال اس فراخ دلی سے لٹاتا تھا کہ خود شاہ جہاں بھی حیران رہ جاتا۔ چنانچہ عوام میں بلاشبہ یہ مشہور ہو گیا کہ علی مردان کے پاس پارس پتھر (اکسیر) ہے۔ جیسا کہ لارنس (Lawrence) نے لکھا ہے، لوگوں کا اعتقاد تھا کہ اسی پتھر کی بدولت وہ پیر پنجال کے راستے پر، جو ہندوستان کو جاتا ہے، شان دار سرائیں تعمیر کرنے پر قادر ہوا۔ پنڈت مہادیو علی مردان خان کے دوسرے دورِ حکومت میں اس کا میر منشی تھا۔ پنڈت مہادیو نے بھی اپنے آقا کی فیاضی سے خاصا فائدہ اٹھایا۔

باغات لگانے کے علاوہ علی مردان نے متعدد سرائیں تعمیر کرائیں اور ہیرہ پور کی سڑک کی مرمت بھی کرائی۔ عیش پسند طبیعت کے باوجود وہ بالعموم ملک کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا تھا۔ شہنشاہ کو بھی اہلِ کشمیر کی مادی ترقی اور خوش حالی سے کچھ کم دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ جب تربیت خان کے ایام میں سخت قحط پڑا تو شہنشاہ نے امدادی انتظامات کے لیے قابل افسر مقرر کیے۔

تربیت خان اس کام سے عہدہ برآنہ ہو سکا، اس لیے اسے معزول کر دیا گیا۔

لاہور، جالندھر، سیالکوٹ، کلانور اور پنجاب کے دیگر اضلاع سے غلہ روانہ کیا گیا تاکہ مصیبت زدگان میں مفت تقسیم ہو۔ تمام ملکاؤں اور شہزادوں نے اس غرض سے قائم کردہ امدادی فنڈ میں رضاکارانہ چندہ دیا۔ تاہم لشکر خان کے عہدِ حکومت میں، جو شاہ جہاں کے ماتحت آخری صوبہ دار تھا، ملک میں خوش حالی کا ایسا دور آیا کہ شالی یعنی بے چھلے چاول کا خروار نہایت ارزاں داموں دستیاب تھا۔

پس ٹیورنیئر (Tavernier) کی یہ بات بے جا نہ تھی کہ شاہ جہاں "اپنی رعایا پر بادشاہ کی حیثیت سے اتنی حکومت نہیں کرتا تھا جتنی ایک باپ کی حیثیت سے اپنے کنبے اور اولاد پر۔"

مشہور شعرا کی کہکشاں

جہانگیر اور شاہ جہاں دونوں کے عہد میں کشمیر کلیم، قدسی، اوجی، طغرا، میر الٰہی، ندیم، فصیحی، فہمی اور خواجہ مومن جیسے نامور شعرا کی کہکشاں سے جگمگا رہا تھا۔ ان کے اشعار اکثر اہلِ لغت کے ہاں بطور سند نقل ہوتے ہیں۔

ان شعرا میں سے بعض بلاشبہ ایرانی الاصل تھے، مگر وہ اپنے وطن سے بڑھ کر کشمیر سے محبت کرتے تھے اور انہوں نے اپنی زندگیاں یہیں بسر کیں۔ ظفر خان نے اپنے دیوان کے دیباچے میں مولانا حیدر محمد، محمد مقیم جوہری اور قاضی محمد قاسم المعروف قاضی زادہ کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور انہیں کشمیر میں اپنے زمانے کے ممتاز شعرا شمار کیا ہے۔ اتنے سارے اہلِ علم و فضل کی موجودگی نے ادب اور لطیف نگارشات میں اس ملک کے علمی کمالات کو چار چاند لگا دیے۔

اورنگ زیب عالمگیر

اپنے پیش رووں کے برعکس اورنگ زیب عالمگیر صرف ایک بار کشمیر آیا۔ ۱۶۶۴ء کے موسمِ گرما میں وہ سخت علیل ہوا اور صحت کی بحالی کے لیے اگلے مہینوں میں کشمیر آیا۔

شہزادی روشن آرا شہنشاہ کے ہمراہ تھی۔ برنیئر (Bernier) ۱۶۶۵ء کے اوائل میں وادی میں پہنچا۔ اس کے سفرنامے میں اس شاہی سفر کی نہایت مرقع کش روداد ملتی ہے۔ تاہم اس سفر کا تجربہ شہنشاہ کے لیے خوش گوار نہ رہا۔ دریائے چناب کے عبور کے وقت سخت افراتفری کا منظر تھا۔ پھر درۂ پیر پنجال میں بیگمات کو لے جانے والا ایک ہاتھی پیچھے ہٹا اور اس نے اپنے عقب کے پندرہ جانوروں کو کھائی میں دھکیل دیا۔ تین چار عورتیں ہلاک ہوئیں۔ کچھ ہاتھی لڑھکتے ہوئے کھڈ یعنی گہری گھاٹی کی تہہ تک جا پہنچے۔ متعدد آدمی خاصے شدید زخمی ہوئے۔ پس شاعر جان محمد قدسی نے بے جا نہ کہا تھا:

رہم پچیدہ تر از موے زنگی

چوں دم ۔۔۔ فرنگی

[راستہ حبشی کے بالوں کے پیچ و خم سے زیادہ پیچیدہ ہے، اور تیزی میں فرنگی کی تلوار جیسا ہے۔]

عاقل خان نے گویا اس کے جواب میں کہا ہے:

ہمواریٔ رہ گلشن کشمیر ندارد

نواب ظفر خان احسن کہتا ہے—

دربن رہ عمر خضر و صبر ایوب

کہ حضری ہم گم کند

سرا اندیشہ راہیست جانکاہ

بہم پچیدہ میگردد چو مکذوب

اورنگ زیب عالمگیر کے سفرِ کشمیر سے ریاست کے ضروری امور میں کوئی خلل واقع نہ ہوا۔ تمام افسران اس کے ہمراہ تھے اور ہر محکمے کے فیصلے لشکرگاہ سے سلطنت کے گوشے گوشے تک پہنچائے جاتے تھے۔ ہر منزل پر برق رفتار سوار قاصد تیار کھڑے رہتے اور شاہی فرامین دیوانِ عام کے خیمے میں مہر لگتے ہی مختلف صوبوں کو روانہ کر دیے جاتے۔ امرا، جیسا کہ دارالحکومت میں دستور تھا، روزانہ حضورِ شاہی میں حاضری دیتے، اور فریادوں کی سماعت ہر صبح اسی باقاعدگی سے ہوتی جیسے شہنشاہ کے دہلی میں قیام کے زمانے میں ہوتی تھی۔ عرض گزار دربار کے ساتھ ساتھ چلتے تھے اور شاہی لشکرگاہ میں حاضری کے اضافی اخراجات کے معاوضے کے طور پر سرکاری خزانے سے انہیں ایک مختصر وظیفہ دیا جاتا تھا۔ اس شان سے اورنگ زیب عالمگیر کشمیر پہنچا۔ ملک کے حسن اور ٹھنڈی، صحت بخش آب و ہوا نے عالمگیر کو آمادہ کیا کہ وہ کچھ عرصے کے لیے کارِ سلطنت سے ذہن کو فارغ کر لے۔ وہ طرح طرح کی تفریحات کی خاطر وادی میں گھومتا پھرا اور جلد ہی اس کی وہ جسمانی توانائی بحال ہو گئی جسے امورِ سلطنت کی مسلسل مشغولیت اور حالیہ بیماری نے سخت نقصان پہنچایا تھا۔ یہاں ڈاکٹر برنیئر نے، جو شہنشاہ کے وزیرِ خارجہ دانش مند خان کی ملازمت میں تین سو روپے ماہوار پر تھا، عالمگیر کی خدمت کی اور اس کی صحت کی بحالی میں مدد دی۔ جس موسمِ گرما میں برنیئر کشمیر آیا، فدائی خان، جو میر آتش (توپ خانے کا سربراہ) اور عالمگیر کا معتمد رضاعی بھائی تھا، بھمبر کے درے کے نیچے بطور محافظ متعین رہا، تا آنکہ گرمی کا زور ٹوٹا اور شہنشاہ واپس لوٹا۔

لیفٹیننٹ کرنل الیگزینڈر ڈاؤ (Lieut.-Colonel Alexander Dow) نے، اورنگ زیب کی وفات کے پینسٹھ برس بعد ۱۷۷۲ء میں، اپنی تصنیف ”ہسٹری آف ہندوستان“ (لندن، ۱۷۷۲ء) میں لکھا: ”اورنگ زیب، جس کے لیے کارِ سلطنت ہی تفریح تھا، سلطنت کے معاملات کے وسیع ترین علم کو انتھک محنت کے ساتھ جمع کیے ہوئے تھا۔ اس نے ہر ضلع سے ادا ہونے والے محاصل، ماتحت عدالتوں کے طریقِ کار، حتیٰ کہ متعدد قاضیوں کے کردار اور مزاج تک سے اپنے آپ کو جزئیات کی حد تک باخبر رکھا۔ اس نے حکم دیا کہ لگان کے دفاتر سب کے معائنے کے لیے کھلے رکھے جائیں تاکہ عوام جبری وصولی اور سرکار کے جائز مطالبات میں تمیز کر سکیں۔ اس نے حکم دیا کہ مختلف عدالتوں کے ضوابط، احکامِ قرآنی اور شاہی فرامین سے قائم شدہ قواعد کے ماہرین سرکاری خرچ پر موجود رہیں اور مقدمات کے معاملات میں غربا کو مشورہ دیں۔ اس نے مقررہ رقوم سے زائد مقدمات میں اپیل کا طریقہ رائج کیا؛ فیصلے کی غلطی پر قاضیوں کو معتوب کیا اور بدعنوانی اور جانب داری پر انہیں سخت سزائیں دیں۔ اس کی سرگرمی نے حکومت کی عظیم مشین کو اس کے تمام اعضا سمیت حرکت میں رکھا؛ اس کی نافذ نظر ظلم کا تعاقب اس کی خفیہ ترین کمین گاہوں تک کرتی تھی، اور اس کے سخت گیر عدل نے اس کے وسیع و عریض ممالکِ محروسہ میں امن قائم کیا اور املاک کو تحفظ بخشا۔“

اورنگ زیب عالمگیر کے مقرر کردہ صوبہ داروں کی تعداد چودہ تھی، جن میں سے ابراہیم خان تین بار اس منصب پر فائز ہوا جب کہ سیف خان دو بار بھیجا گیا۔ علی مردان خان کے بیٹے ابراہیم خان ہی کے زمانے میں کشمیر میں پیدا ہونے والے شاعر مرزا داراب جویا نے شہرت پائی۔ اس کے دیوان میں غزلیات کا آغاز اس شعر سے ہوتا ہے—

الٰہی رہ نما سوئے ۔۔۔ این مدہوش غافل را

زدردت جامہ ۔۔۔ چوں طاؤسی کن دل را

کاروبارِ سلطنت کے دباؤ اور ریاست کے تمام محکموں پر شہنشاہ کی ذاتی توجہ کے باوجود وہ اس صوبے کی فلاح و بہبود میں دل و جان سے دلچسپی رکھتا تھا۔ رقعاتِ عالمگیری (صفحہ 95) میں عالمگیر کا یہ قول کہ—

کشمیری دربن ۔۔۔ نیست کہ مقرر ۔۔۔

[اس صوبے میں کوئی کشمیری ایسا نہیں جسے میں مقرر کروں] — کشمیریوں کے لیے یقیناً باعثِ فخر ہونا چاہیے، کیوں کہ یہ بات عالمگیر جیسے بلند معیار کے سخت گیر اور کڑے محتسب کی زبان سے نکلی ہے۔ عالمگیر کی چوکس نگاہ سے کوئی چیز اوجھل نہ رہتی تھی۔ اور وہ عوام کی حالت سنوارنے کے لیے مؤثر اقدامات کرنے میں کوئی تامل نہ کرتا تھا۔ ابراہیم خان کو فرقہ وارانہ جھگڑوں میں شیعوں کی پشت پناہی کرنے کے باعث دو بار صوبہ داری سے معزول کیا گیا۔ اسی طرح مظفر خان کو بھاری محاصل عائد کرنے کی بھاری قیمت چکانی پڑی۔ پس یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مغل صوبہ داروں کو کشمیر میں کھلی چھوٹ حاصل تھی۔ رعایا کے ساتھ نرمی اور انصاف کا برتاؤ ہوتا تھا اور صوبہ دار، مظفر خان اور ابو نصر خان جیسے شاذ استثناؤں کے سوا، عدل کے سرگرم علم بردار تھے۔ سیف خان نے خواجہ محمد صادق نقشبندی کو کوڑے لگوا کر ہلاک کرا دیا، کیوں کہ اس نے سرکاری حسابات میں خرد برد کے الزام میں ماخوذ ایک ہندو اہل کار کو ایسی ہی سزا دی تھی۔ سیف خان شاہ جہاں کا ہم زلف تھا، کیوں کہ دونوں کی بیویاں آپس میں بہنیں تھیں۔ وہ دو بار صوبہ دار رہا۔ قوام الدین خان مجرموں کے لیے ''تختہ کلاہ'' یا ''کلاہِ تختہ'' یعنی لکڑی کی ٹوپی کی ایجاد کے باعث مشہور ہے، جو غالباً

یورپ کی "احمقوں کی ٹوپی" کے قیاس پر تھی۔ اعتماد خان، افتخار خان، حفظ اللہ خان، اسلام خان اور فاضل خان نے، جو یکے بعد دیگرے صوبہ دار ہوئے، غیر جانب داری سے کام کیا اور بہ نفسِ نفیس انصاف کرنے اور رعایا کی دیکھ بھال میں اپنی سی پوری کوشش کی۔ سیف خان نے اپنے دوسرے دورِ حکومت میں ۱۶۷۰ء کے لگ بھگ وادی کی مردم شماری کرائی۔ حسن کی روایت کے مطابق اس مردم شماری میں کشمیر کی آبادی 12,43,033 نفوس پر مشتمل تھی جن میں 90,400 پیادہ اور 4,812 سوار شامل تھے۔

اس روایت کے لیے کوئی سند پیش نہیں کی گئی اور نہ کوئی تفصیلات دستیاب ہیں، اس لیے اس پر کوئی تبصرہ ممکن نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ مردم شماری اس مردم شماری کے خطوط پر ہوئی ہو جو اکبر کے عہد میں ۹۸۹ھ = ۱۵۸۱ء میں ہندوستان کی مغل سلطنت میں کرائی گئی تھی۔ مغل صوبہ داروں نے باغات لگا کر، مسجدیں تعمیر کر کے، مسافر خانے بنا کر اور گاؤں آباد کر کے ملک اور اس کے شہروں کی عمومی رونق بڑھانے کی بھی کوشش کی۔ اس زمانے کے ایک جاگیردار چودھری مہیش پنڈت کا باغ حسن اور ذوق کے نمونے کے طور پر مذکور ہے۔ ان صوبہ داروں نے کاشت کار طبقے کو ان بھاری محاصل سے نجات دلائی جو پچھلے صوبہ داروں نے عائد کیے تھے۔ فاضل خان کا نام ایک مشہور مدرسے سے وابستہ ہے۔

اسی کے زمانے میں موئے مبارکِ رسول خواجہ نور الدین اشباری کے ذریعے کشمیر لایا گیا۔ فاضل خان نے کشمیریوں کے لیے منصبوں کی سفارش کی اور شہنشاہ نے اس کی سفارشات منظور کیں۔

کشمیری منصب دار

عنایت اللہ غالباً کشمیری منصب داروں میں اولین تھا۔ وہ چار ہزاری منصب تک پہنچا اور فرخ سیر کے عہد (۱۷۱۷ء) میں شاہی دیوانِ خالصہ (وزیرِ محاصل) مقرر ہوا۔

آتش زدگی، قحط، زلزلہ اور سیلاب — ان میں سے ہر ایک آفت وقفے وقفے سے نازل ہو کر عوام کو خاصی مصیبتوں سے دوچار کرتی رہی، جن میں املاک کا نقصان بھی شامل تھا۔ ان دنوں عین وقت پر ان آفات کا مناسب تدارک مشکل تھا۔ اس کے باوجود جہاں کہیں ممکن ہوا، مصیبت کے ازالے کے لیے فوری اقدامات کیے گئے۔ کاوڈورہ کی آتش زدگی کے بعد اورنگ زیب عالمگیر نے ابراہیم خان کو فوری اور واضح احکام کے ساتھ روانہ کیا کہ لوگوں کے مکانات کی تعمیرِ نو میں ان کی مدد کرے اور کیے گئے اقدامات کی پیش رفت کی رپورٹ بھیجے۔ مکانات کی تعمیرِ نو کے بعد ہی جامع مسجد کی، جو اس آگ میں جل کر تباہ ہو گئی تھی، ازسرِ نو تعمیر کی کوشش کی گئی۔

ان دنوں شیعوں اور سنیوں کے مابین فرقہ وارانہ تصادم غیر معمولی بات نہ تھی۔

درحقیقت اس زمانے کے واقعات کو آج کے نقطۂ نظر سے پرکھنا غلطی ہے۔ خود یورپ اصلاحِ مذہب (ریفارمیشن) کی کڑی آزمائش سے گزر رہا تھا۔ مذہبی جذبات ہر جگہ تلخ تھے۔ کشمیر میں تو یہ کیفیت اور بھی شدید تھی جہاں میر شمس الدین عراقی کی شیعی عقائد کی کامیاب تبلیغ بارآور ثابت ہو چکی تھی۔ چنانچہ شیعہ اور سنی دونوں کے اذہان جوش و اشتعال کی حالت میں تھے۔ مزید برآں، نو مسلک شیعہ لازماً بڑے پُرجوش اور بعض اوقات متعصب رہے ہوں گے۔ چک، جو بہ اعتبارِ عقیدہ شیعہ تھے، ابھی حال ہی میں اپنے اقتدار سے محروم ہوئے تھے۔ شیعوں کے رنجیدہ اذہان اس امر کو ذاتی اور مذہبی، دونوں طرح کی شکایت سمجھتے تھے۔ پس یہ امر باعثِ تعجب نہیں کہ شیعوں اور سنیوں کے مابین فسادات اور

ہنگامے غیر معمولی نہ تھے۔ کشمیر سے متعلق خارجی امور میں بھی کئی واقعات قابلِ ذکر ہیں۔ مثلاً قلمقوں نے تبت کلاں پر حملہ کیا۔ تبت کلاں کا حکمران دلدل نمجال چونکہ خود ملک کے دفاع سے قاصر تھا، اس لیے اس نے شہنشاہِ دہلی سے مدد چاہی۔ چنانچہ اُس وقت کے صوبہ دار ابراہیم خان نے فدائی خان کو حکم دیا کہ قلمقوں کو نکال باہر کرے۔ یہ مہم کامیابی سے انجام پائی۔

مگر بعد میں جب اس ملک کے حکمران نے بغاوت کی تو سیف خان نے اس کی گوشمالی کی۔ بالآخر اس نے اسلام قبول کر لیا،

1۔ کاوڈورہ سری نگر میں مخدوم صاحب کے مزار کے قریب ایک بڑے محلے کا نام ہے۔ 2۔ قلمق، قلماق یا قلمیق ایک منگول قوم کا ترکی نام ہے۔ سولھویں صدی میں یہ لوگ اویرات (وفاق) کے نام سے وسطِ ایشیا کے اس وسیع خطے میں خانہ بدوشی کرتے پھرتے تھے جو التائی اورتیان شان، صحرائے گوبی اور جھیل بلخاش اور بحیرۂ کیسپین کے درمیان واقع ہے۔ اپنی درندگی کے باعث یہ قلمق بدمخلوق یعنی بدخلقت قلمق کہلاتے ہیں۔ قلمق بدھ مت کے پیرو تھے، برخلاف چینی بولنے والے ڈونگانوں کے، جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔

اور تبت واپس جا کر اس نے ایک عالی شان مسجد تعمیر کرائی۔ اسی طرح راجوری کے راجہ نے اپنی شکست کے بعد اسلام قبول کیا، اور ابراہیم خان کی صوبہ داری کے تیسرے دور میں اس کی ریاست اسے واپس کر دی گئی۔ جموں کا راجہ کھلی بغاوت پر اتر آیا اور حفظ اللہ خان نے، جو ۱۶۸۶ء میں ابراہیم خان کا جانشین ہوا تھا، اسے مطیع کیا۔ کاشغر کا حکمران عبداللہ خان ۱۶۶۷ء–۱۶۶۸ء کے لگ بھگ حجِ بیت اللہ کے سفر پر مکہ جاتے ہوئے کشمیر سے گزرا۔ ایک روایت کے مطابق اسے اپنی سلطنت مجبوراً اپنے بیٹے نوازش خان کے

حوالے کرنی پڑی تھی۔ صوبہ دار مبارز خان نے، جو سیف خان کا جانشین تھا، عبداللہ خان کا شاہانہ انداز میں استقبال اور ضیافت کی۔

اور جب اس کے بہت عرصے بعد عبداللہ خان کا بھتیجا ارسلان خان اپنے ہی بیٹے کے خلاف مدد کے لیے کشمیر آیا تو ابراہیم خان نے، جو ۱۷۰۱ء تا ۱۷۰۶ء والیٔ کشمیر رہا، یہ معاملہ عالمگیر کے حضور پیش کیا۔ احکام موصول ہونے پر ابراہیم خان نے شہنشاہ کی منشا اس پناہ گزیں شہزادے تک پہنچائی اور اسے ہدایت کی کہ وہ کابل کے گورنر سے مدد طلب کرے۔ درحقیقت عالمگیر کا ارادہ کاشغر کی تسخیر کا تھا، مگر اسے اس مہم پر نکلنے سے باز رکھا گیا۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر اُس زمانے میں مغلیہ سلطنت کی ایک مضبوط سرحدی چوکی تھا۔

لالہ رخ

کاشغر کے عبداللہ خان کا ذکر آئے تو قاری اس دل چسپ حوالے سے لطف اندوز ہونے کی تحریص سے شاید ہی باز رہ سکے جو تھامس مور (Thomas Moore) کی مشہور نظم ”لالہ رخ“ (یعنی لالہ رخسار) سے متعلق ہے، اگرچہ اس کے ہیرو اور ہیروئن، ان کا حسب نسب اور ان کی شادی سب کچھ سراسر تخیلی ہے۔ تھامس مور (مئی ۱۷۷۹ء تا فروری ۱۸۵۲ء) ایک آئرش شاعر اور موسیقار تھا۔ ۱۷۹۸ء میں مور نے تعلیم مکمل کی اور اگلے برس مڈل ٹیمپل میں قانون کی تحصیل کے لیے انگلستان روانہ ہوا۔ لندن میں اسے نمایاں سماجی کامیابیاں نصیب ہوئیں، مگر انہی کامیابیوں نے اسے ایسے اخراجات میں مبتلا کر دیا جو اس کی بساط سے کہیں بڑھ کر تھے۔ اس کے ناشروں نے پیشگی رقوم دے کر اسے قرضوں سے

نجات دلائی۔ ۱۸۱۴ء میں مور نے لانگ مینز (Longmans) کے اشاعتی ادارے سے تین ہزار گنی کے عوض ایک مشرقی موضوع پر منظوم رومانوی داستان لکھنے کا معاہدہ کیا۔ اس غرض سے مور ڈونگلٹن پارک کے قرب و جوار میں ایک جھونپڑی نما مکان میں گوشہ نشین ہو گیا، جہاں لارڈ موئرا (Lord Moira) کے کتب خانے کی مدد سے وہ رفتہ رفتہ مطالعے کے ذریعے مشرقی مناظر اور مشرقی معاشرت سے آشنائی حاصل کرتا گیا۔ ”دی ایمرلڈ سیٹ ود پرلز“ کی مصنفہ فلورنس پاربری (Florence Parbury) کے بقول (ملاحظہ ہوں اس کتاب کے حواشی) شاہِ بخارائے خرد کی اورنگ زیب کے ہاں حاضری کی تفصیلات لیفٹیننٹ کرنل الیگزینڈر ڈاؤ (Lt.-Col. Alexander Dow) کی ”تاریخِ ہندوستان“ (لندن، ۱۸۰۳ء، جلد سوم، صفحات 418-19) میں ملتی ہیں۔ قارئین کی معلومات کے لیے میں وہ عبارت ذیل میں نقل کرتا ہوں:

”شہنشاہ (اورنگ زیب) کی شان و شوکت اور فیاضی کے اظہار کا ایک موقع اس کے عہدِ حکومت کے گیارھویں سال کے آغاز میں پیش آیا۔ بخارائے خرد کا بادشاہ عبداللہ، جو چنگیزِ اعظم کی نسل سے تھا، اپنے بیٹے الیرس کے حق میں تختِ سلطنت سے دست بردار ہو کر مکہ کے سفر کے ارادے سے تبت میں داخل ہوا۔ اس نے اورنگ زیب کو پیغام بھیجا کہ اسے اور اس کے ہمراہیوں کو ہندوستان سے گزرنے کی اجازت مرحمت کی جائے۔ شہنشاہ نے والیٔ کشمیر کو حکم دیا کہ اس شاہی زائر کا استقبال ہر ممکن شان و شوکت سے کیا جائے اور سرکاری خرچ پر اسے آسائش و آرام کی ہر شے مہیا کی جائے۔ اضلاع کے حکام کو حکم ہوا کہ وہ اپنے تمام ہمراہیوں سمیت صوبہ بہ صوبہ عبداللہ کی ہم رکابی کریں۔ جن جن مقامات سے اس کا گزر ہونا تھا وہاں کی افواج کو ہدایت کی گئی کہ اسے پورے فوجی اعزاز پیش کیے جائیں؛ اور اسی شان سے وہ دہلی پہنچا اور شہر کے دروازوں پر شہنشاہ نے اس کا استقبال کیا۔

سات مہینے دارالحکومت میں قیام کے بعد اسے اسی شان و شوکت کے ساتھ سورت پہنچایا گیا جہاں سے وہ عرب کے لیے بحری سفر پر روانہ ہوا۔"

"لالہ رخ" ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئی اور فوراً ہی مقبول ہو گئی۔ مور کی شہرت تیزی سے پورے یورپ میں پھیل گئی۔ کہا گیا کہ "اس عہد کی کسی نظم کے اتنے ترجمے غیر ملکی زبانوں میں نہیں ہوئے۔" لیکن مور کے اپنے زمانے کے شعرا، جو اسے جانتے بھی تھے اور پسند بھی کرتے تھے، "لالہ رخ" کو کبھی خاطر میں نہ لائے۔ لی ہنٹ (Leigh Hunt) نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا کہ "اس کا عمومی اسلوب حد سے زیادہ رنگین ہے۔"

مور بنیادی طور پر عشقیہ شاعر تھا اور محبت کے موضوع پر لکھ کر ہی اس نے کامیابیاں سمیٹیں۔ "کشمیر میں جشنِ گل" کی کہانی "نہایت پر تکلف آرائش" سے مزین ہے۔ سٹیفن گوئن (Stephen Gwynn) اپنی کتاب "تھامس مور" (انگلش مین آف لیٹرز، ۱۹۰۵ء، صفحہ 90) میں لکھتا ہے کہ "لالہ رخ نہایت ثانوی درجے کی تخلیق ہے اور ادب میں اس کا مقام بیشتر ایک متروک ذوق کے نمونے کے طور پر باقی ہے۔" فلورنس پاربری کہتی ہے: "کشمیر حسن و جمال کا ایک خواب ہے" اور "حیرت اس بات پر ہے کہ مور نے ایک ایسی سرزمین کو، جو اس نے کبھی دیکھی ہی نہ تھی، اس قدر واضح اور صحیح انداز میں بیان کر دیا۔" (دی ایمرلڈ سیٹ ود پرلز، از فلورنس پاربری — سمپکن، مارشل، ہیملٹن، کینٹ اینڈ کمپنی لمیٹڈ، لندن)۔ "کسی نظم کو لالہ رخ سے بڑھ کر مقبولیت کبھی نصیب نہیں ہوئی، کیونکہ اس کے ترجمے یورپ کی تمام اور مشرق کی بیشتر زبانوں میں ہو چکے ہیں، جب کہ روبنسٹائن (Rubinstein)، شومان (Schumann)، فیلیسیاں ڈیوڈ (Félicien David)، سر سٹرن ڈیل بینیٹ (Sir Sterndale Bennett) اور کئی دوسرے موسیقاروں نے اس کی

داستان کے مختلف حصوں پر مبنی اوپیرا ترتیب دیے ہیں۔" "مور کی نبوغِ فن کو سب سے شان دار خراجِ تحسین وہ عظیم الشان تقریب تھی جو ۱۸۲۲ء میں گرینڈ ڈیوک نکولس کی آمد کے موقع پر فریڈرک اوّل کے محلات میں منعقد ہوئی۔ نظم کی مختلف کہانیاں زندہ جھانکیوں، نغموں اور رقصوں کی صورت میں پیش کی گئیں اور تمام کردار شاہی خاندان اور اہلِ دربار نے ادا کیے۔" اس شان دار جشن کے اختتام پر ملکۂ روس نے، جس نے خود "لالہ رخ" کا کردار ادا کیا تھا، آہ بھر کر کہا: "تو کیا اب سب کچھ ختم ہو گیا؟ کیا کوئی شاعر ایسا نہیں جو دوسروں کو اور آنے والے زمانوں کو اس مسرت کا کچھ تصور دے سکے جو آج شام ہمیں نصیب ہوئی ہے؟"

اس پر بیرن دلا موت فوکے (Baron de la Motte Fouqué) نے اس کوشش کا وعدہ کیا، اور اسی عظیم جشن سے "لالہ رخ" کے اس جرمن ترجمے کا آغاز ہوا جو فوکے کے قلم سے انجام پایا۔ فرانسیسی رقاص ژول ژوزف پیرو (Jules Joseph Perrot) نے ۱۸۴۶ء میں لندن، پیرس اور میلان میں اپنی پیش کشوں میں "لالہ رخ" کو موضوع بنایا۔

اس ضمن میں "دی آکسفرڈ کمپینین ٹو انگلش لٹریچر" (مرتبہ سر پال ہاروی (Sir Paul Harvey)، کلیرینڈن پریس، آکسفرڈ، ۱۹۳۷ء، صفحہ 439) کا بیان بھی دل چسپی سے پڑھا جائے گا۔ ہم مور اور اس کی "لالہ رخ" کے پس منظر کے بارے میں لکھ چکے؛ اب خود کتاب "لالہ رخ" کے متعلق چند سطریں۔ "لالہ رخ" منظوم مشرقی داستانوں کا ایک سلسلہ ہے جسے ایک نثری قصہ باہم مربوط رکھتا ہے؛ یہ تھامس مور کی تصنیف ہے اور ۱۸۱۷ء میں شائع ہوئی۔ نثری قصے میں شہنشاہ اورنگ زیب کی بیٹی لالہ رخ کے دہلی سے کشمیر کے اس سفر کا بیان ہے جو بخارا کے نوجوان بادشاہ سے شادی کی غرض سے اختیار کیا گیا۔ راستے میں

وہ اور اس کا قافلہ ان چار داستانوں سے دل بہلاتے ہیں جو کشمیر کا ایک نوجوان شاعر فرامرز سناتا ہے؛ شہزادی اس شاعر کی محبت میں گرفتار ہو جاتی ہے، اور منزلِ مقصود پر پہنچنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بخارا کا بادشاہ ہے۔ خود پسند ناظرِ حرم فدلادین (فضل الدین) کے کردار سے مزاح کا عنصر پیدا کیا گیا ہے: راہ کے پے در پے حادثات نے اس کا مزاج بگاڑ رکھا ہے، جس کا غبار وہ ("ایڈنبرا" کے نقادوں کے انداز میں) نوجوان شاعر کے اشعار پر تیکھی نکتہ چینیوں کی صورت میں نکالتا ہے، اور جب اس نوجوان کی اصل حقیقت کھلتی ہے تو اسے اسی قدر خفت اٹھانی پڑتی ہے۔ چاروں داستانیں یہ ہیں:

"خراسان کا نقاب پوش پیغمبر": حسین و جمیل زیلیکا اپنے محبوب عظیم کی جدائی کے غم میں، جسے مردہ تصور کر لیا گیا تھا، نیم دیوانہ ہو کر جنت میں داخلے کے وعدے پر مقنع کے حرم میں پھانس لی جاتی ہے، جو ایک کریہہ المنظر شعبدہ باز ہے اور پیغمبری کا دعوے دار بنا بیٹھا ہے۔ عظیم جنگوں سے واپس آ کر زیلیکا کو مقنع کے عقد میں پاتا ہے اور خلیفہ کی اس فوج میں شامل ہو جاتا ہے جو مقنع کی کفر گوئی کی سزا دینے چلی ہے۔ مقنع شکست کھا کر تیز زہر کے ایک کڑاہے میں کود کر ہلاک ہو جاتا ہے۔ زیلیکا موت کی متلاشی ہو کر اس کے نقاب اوڑھ لیتی ہے اور پیغمبر سمجھ کر عظیم کے ہاتھوں ماری جاتی ہے اور اسی کی بانہوں میں دم توڑ دیتی ہے۔

"جنت اور پری": ایک پری سے — جو ان حسین فضائی روحوں میں سے ہے جو خوشبوؤں پر جیتی ہیں اور جو گرے ہوئے فرشتوں کی نسل سے ہیں — وعدہ کیا جاتا ہے کہ اگر وہ جنت کے دروازے پر وہ نذرانہ لے آئے جو آسمان کو سب سے زیادہ عزیز ہے تو اسے جنت میں داخلہ مل جائے گا۔ پہلے وہ اس نوجوان مجاہد کے خون کا ایک قطرہ لاتی ہے جو ہندوستان کو غزنی

کے جابر محمود سے آزاد کرانے کی خاطر جان دیتا ہے، مگر اس سے دروازہ نہیں کھلتا۔ پھر وہ اس مصری دوشیزہ کی آخری آہ لاتی ہے جو اپنے طاعون زدہ محبوب کے غم میں جان دے دیتی ہے؛ یہ بھی بے سود رہتی ہے۔ آخر میں ندامت کا وہ آنسو، جو ایک مجرم کی آنکھ سے اس کے بچے کی خدا کے حضور دعا نے نکالا تھا — اور اسی سے دروازہ کھل جاتا ہے۔

"آتش پرست": یہ قدیم فارس کے ان گبروں یعنی آتش پرستوں کی داستان ہے جنہوں نے فاتح مسلمانوں کے خلاف اپنی مزاحمت جاری رکھی۔ نوجوان گبر حافد اس امیر الحسن کی بیٹی ہندا کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے جسے یہ مزاحمت فرو کرنے کے لیے عرب سے بھیجا گیا تھا۔ حافد ان چٹانوں پر چڑھ جاتا ہے جن پر ہندا کا بالاخانہ واقع ہے اور اس کا دل جیت لیتا ہے۔ کچھ عرصے بعد ہندا گبروں کے ہاتھوں گرفتار ہوتی ہے اور اس پر یہ راز کھلتا ہے کہ اس کا محبوب انہی کا سردار ہے۔ گبروں کا بھید غداری سے الحسن پر کھول دیا جاتا ہے اور حافد خود کو چتا کی آگ میں ڈال دیتا ہے۔ ہندا اس کشتی سے، جس میں اسے واپس اس کے باپ کے پاس لے جایا جا رہا تھا، چھلانگ لگا کر ڈوب جاتی ہے۔

"نورِ حرم": یہ اکبرِ اعظم کے بیٹے سلیم کی محبوب بیوی نور محل کا قصہ ہے۔ وادیٔ کشمیر میں جشنِ گل منایا جا رہا ہے، مگر نور محل اپنے شوہر سے روٹھی ہوئی ہے۔ جادوگرنی نمونہ اسے ایک سحر آمیز نغمہ سکھاتی ہے جسے نور محل نقاب اوڑھ کر سلیم کی بزم میں گاتی ہے اور یوں اس کی محبت دوبارہ جیت لیتی ہے۔

مور خود لکھتا ہے: "اورنگ زیب کے عہدِ حکومت کے گیارھویں برس بخارائے خرد کے بادشاہ عبداللہ نے، جو چنگیزِ اعظم کی براہِ راست اولاد میں سے تھا، اپنے بیٹے کے حق میں تخت سے دست بردار ہو کر روضۂ رسول کی زیارت کا قصد کیا، اور کشمیر کی دل کش وادی

سے گزر کر ہندوستان میں داخل ہوا اور راہ میں کچھ عرصے کے لیے دہلی میں مقیم ہوا۔ اورنگ زیب نے اس کی ایسی پر شکوہ مہمان نوازی کی جو مہمان اور میزبان دونوں کے شایانِ شان تھی، اور بعد ازاں اسی شان و شوکت کے ساتھ اسے سورت تک پہنچایا گیا جہاں سے وہ عرب کے لیے بحری سفر پر روانہ ہوا۔ شاہی زائر کے قیامِ دہلی کے دوران اس کے بیٹے شہزادے اور شہنشاہ کی سب سے چھوٹی بیٹی لالہ رخ کی شادی طے پائی — وہ شہزادی جسے اس عہد کے شعرا نے لیلیٰ اور شیریں اور دیول دیوی سے، بلکہ ان تمام حسیناؤں سے بڑھ کر جمیل قرار دیا جن کے نام اور جن کی داستانہائے محبت فارس اور ہندوستان کے نغموں کی زینت ہیں۔ طے یہ پایا کہ رسمِ عروسی کشمیر میں ادا ہو گی، جہاں نوجوان بادشاہ، جوں ہی امورِ سلطنت مہلت دیں، پہلی بار اپنی حسین دلہن سے ملے گا اور اس سحر انگیز وادی میں چند ماہ کے آرام کے بعد اسے برف پوش پہاڑوں کے پار بخارا لے جائے گا۔

"دہلی سے لالہ رخ کی روانگی کا دن ایسا شان دار تھا جیسا اسے آفتاب کی تابانی اور جشن کی آرائش بنا سکتی تھی۔ بازار اور حمام سب نفیس ترین غالیچوں سے ڈھکے تھے؛ دریائے جمنا پر سیکڑوں طلائی کشتیاں یوں رواں تھیں کہ ان کے پرچم پانی میں جھلملا رہے تھے؛ اور گلیوں میں حسین بچوں کے غول، اس فارسی جشن کی مانند جسے "گل ریزی" کہتے ہیں، چاروں طرف لطیف ترین پھول بکھیرتے پھرتے تھے، یہاں تک کہ شہر کا گوشہ گوشہ یوں معطر ہو گیا جیسے ختن سے مشک کا کوئی قافلہ اس میں سے گزرا ہو۔ شہزادی اپنے مہربان باپ سے رخصت ہوئی، جس نے جدائی کے وقت اس کے گلے میں یمن کا ایک عقیق پہنایا جس پر قرآن کی ایک آیت کندہ تھی، اور ان فقیروں کے لیے خاصا نذرانہ روانہ کرنے کے بعد جو اس کی بہن کے مقبرے میں چراغِ دائم روشن رکھتے تھے، عاجزی کے ساتھ اپنے لیے تیار کی گئی

پالکی میں سوار ہوئی؛ اور جب اورنگ زیب آخری نگاہ ڈالنے کے لیے اپنے جھروکے میں کھڑا ہوا تو جلوس آہستہ آہستہ لاہور کی راہ پر روانہ ہو گیا۔

"مشرقی دنیا نے ایسی شان دار سواری شاذ ہی دیکھی تھی۔ نواحی باغات سے شاہی محل تک شان و شکوہ کی ایک مسلسل قطار تھی۔ راجاؤں اور مغل امرا کی شان دار وضع قطع، جو شاہی عنایت کے ان نشانوں سے ممتاز تھے یعنی اپنی پگڑیوں میں کشمیری بگلے کے پر اور اپنی زینوں کے قربوس پر چاندی کے کناروں والے چھوٹے نقارے؛ ان کے سواروں کی بیش قیمت زرہیں، جو اس موقع پر اپنے چاندی کے تبر زینوں کی چمک اور اپنے سونے کے گرزوں کی گرانی میں قدر خان اعظم (گیارھویں صدی کے اواخر کے خاقانِ ترکستان) کے محافظوں سے بازی لے جانے کی کوشش کر رہے تھے؛ پالکیوں کی چوٹیوں پر سنہری صنوبری کلغیوں (بڑے طلائی گھنڈوں) کی جھلملاہٹ؛ ہاتھیوں کی مرصع جھولیں، جن کی پیٹھوں پر قدیم طرز کے چھوٹے چھوٹے مندروں کی شکل کے برجک بنے تھے جن میں لالہ رخ کی خواتین گویا تعویذ گنبدوں میں براجمان تھیں؛ خود شہزادی کی پر تکلف ڈولی کے گلابی پردے، جس کے سامنے ایک نازنین کم سن کنیز پردوں کے بیچ سے آرگس تیتر کے پروں کا پنکھا جھل رہی تھی؛ اور تاتاری اور کشمیری کنیزوں کے وہ دل کش دستے جو نوجوان بادشاہ نے اپنی دلہن کی ہم رکابی کے لیے بھیجے تھے اور جو چھوٹے عربی گھوڑوں پر ڈولی کے دونوں جانب رواں تھے— غرض ہر شے تابناک، خوش ذوق اور پر شکوہ تھی، اور اس نے ناظرِ اعظمِ حرم، نکتہ چیں اور مشکل پسند فدلادین (فضل الدین) تک کو محظوظ کر دیا، جو شہزادی کے عین پیچھے اپنی پالکی میں چلا آ رہا تھا۔

”سفر کے ابتدائی دنوں میں لالہ رخ کو، جس نے اپنی ساری زندگی دہلی کے شاہی باغوں کے سائے میں گزاری تھی، ان مناظر کے حسن میں، جن سے قافلہ گزر رہا تھا، اپنے ذہن کی دل چسپی اور تخیل کی تسکین کا وافر سامان مل گیا؛ اور جب شام کے وقت یا دن کی گرمی میں وہ شاہراہ سے ہٹ کر ان گوشہ نشین اور رومان انگیز مقامات کا رخ کرتے جو اس کے پڑاؤ کے لیے منتخب کیے گئے تھے— کبھی کسی چھوٹی ندی کے کنارے جس کا پانی جھیلِ گوہر کے پانی جیسا شفاف تھا؛ کبھی کسی بر گد کے مقدس سائے تلے جہاں سے نظر ہرنوں سے بھرے کسی سبزہ زار پر کھلتی تھی؛ اور اکثر ان چھپے ہوئے سایہ دار گوشوں میں جنہیں مغربی جزیروں کے ایک سیاح نے ”اداسی، لطف اور امان کے مقامات، جہاں گرد و پیش کی ساری رفاقت جنگلی موروں اور قمریوں پر مشتمل ہے“ کہا ہے— تو وہ ان مناظر میں، جو اس قدر دل کش اور اس کے لیے اس قدر نئے تھے، ایک ایسا سحر محسوس کرتی جس نے کچھ عرصے کے لیے اسے ہر دوسری تفریح سے بے نیاز کر دیا۔ مگر لالہ رخ نوجوان تھی، اور نوجوانوں کو تنوع مرغوب ہوتا ہے؛ اور اس کی خواتین اور ناظرِ اعظم فدلادین کی گفتگو (جو ظاہر ہے کہ اس کے خیمے میں باریابی کا واحد مجاز شخص تھا) ان بہت سی فارغ گھڑیوں کو، جو نہ خواب گاہ کی نذر ہوتی تھیں نہ پالکی کی، پوری طرح شگفتہ نہ رکھ سکتی تھی۔

”ایک چھوٹی سی فارسی کنیز تھی جو وینا پر میٹھے سُر میں گاتی تھی اور گاہے گاہے اپنے وطن کے قدیم گیتوں سے— وامق و عذرا کی محبت، زریں موزال اور اس کی محبوبہ رودابہ کے قصوں، اور رستم کی ہولناک سفید دیو سے لڑائی کے ذکر سے— شہزادی کو لوری دے کر سلا دیتی تھی۔ کبھی وہ دہلی کی ان خوش ادا رقاصاؤں سے دل بہلاتی جنہیں بڑے مندر کے برہمنوں نے قافلے کے ہمراہ جانے کی اجازت دے رکھی تھی۔

”پھر یاد آیا کہ دولہا کی جانب سے بھیجے گئے خدمت گزاروں میں کشمیر کا ایک نوجوان شاعر بھی شامل ہے جو مشرقی داستانیں سنانے کے اپنے مخصوص انداز کے باعث ساری وادی میں مشہور ہے، اور جسے اس کے شاہی آقا نے شہزادی کے خیمے میں باریابی کا شرف عطا کیا ہے تاکہ وہ اپنی دل پذیر داستان سرائی سے سفر کی اکتاہٹ دور کرنے میں مدد دے...“

”... قرأت کے وقفوں کو موسیقی سے دل چسپ بنانے کی غرض سے اُس نوجوان کشمیری کے ہاتھ میں ایک کتارا تھا (یہ لفظ عربی ”قیتار“ سے ماخوذ ہے، جس کے معنی گٹار، بربط یا چنگ کے ہیں) — ویسا ہی ساز جیسا قدیم زمانوں میں مغرب کی عرب دوشیزائیں الحمرا کے باغوں میں چاندنی راتوں کو سنا کرتی تھیں — اور نہایت عاجزی کے ساتھ یہ تمہید باندھنے کے بعد کہ جو قصہ وہ سنانے والا ہے اس کی بنیاد خراسان کے اُس نقاب پوش پیغمبر کے واقعات پر ہے جس نے ۱۶۳ھ میں پوری مشرقی سلطنت میں کھلبلی مچا دی تھی...“

”اب وہ لاہور کے شان دار شہر میں آپہنچے تھے، جس کے عظیم الشان اور بے شمار مقبرے اور مزارات — جہاں موت آسمان کے ساتھ برابر کی عزت بانٹتی معلوم ہوتی تھی — لالہ رخ کے دل اور تخیل پر گہرا اثر ڈالتے، اگر اِس دنیا کے جذبات پہلے ہی اس پر پوری طرح غالب نہ آچکے ہوتے۔ یہاں اس کا استقبال کشمیر سے روانہ کیے گئے قاصدوں نے کیا، جنھوں نے اسے اطلاع دی کہ بادشاہ وادی میں پہنچ چکا ہے اور اس کے استقبال کے لیے شالیمار کے ایوانوں میں جو پر تکلف تیاریاں ہو رہی ہیں ان کی نگرانی خود فرما رہا ہے۔“

”اب وہ کچھ عرصے کے لیے حسن ابدال کی سرسبز و شاداب وادی میں آرام کر رہے تھے، جو کشمیر کی جانب شہنشاہوں کی سالانہ نقلِ مکانی میں ہمیشہ سے ان کی پسندیدہ آرام گاہ رہی تھی۔“

"یہاں اکثر نورِ ایمان جہانگیر کو اپنی محبوب اور حسین نور محل کے ساتھ سیر کرتے دیکھا گیا تھا۔"

"حسن ابدال سے کوئی دو میل کے فاصلے پر وہ شاہی باغ تھے جو کتنی ہی حسین آنکھوں کی نگرانی میں پروان چڑھ کر خوب صورت ہوئے تھے، اور اب بھی خوب صورت تھے، اگرچہ وہ آنکھیں اب انہیں دیکھ نہیں سکتی تھیں۔ یہ مقام، اپنے پھولوں اور اپنے مقدس سکوت کے ساتھ — جسے صرف اُن پرندوں کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ توڑتی تھی جو ان پہاڑوں کے صاف شفاف پانی سے بھرے سنگِ مرمر کے حوضوں میں غوطہ زن ہوتے — لالہ رخ کے لیے خوشبو، خنکی اور گویا آسمانی سکون کا وہ سب کچھ تھا جس کا اس کا دل تصور کر سکتا تھا..."

"بھلا کون ہے جس نے وادیِ کشمیر کا ذکر نہ سنا ہو — جس کے گلاب روئے زمین کے شاداب ترین گلاب ہیں، جس کے مندر اور غار ہیں، اور جس کے چشمے ایسے شفاف ہیں جیسے محبت سے روشن وہ آنکھیں جو ان کی لہروں پر جھکی ہوں؟

"آہ! اسے غروبِ آفتاب کے وقت دیکھو — جب گرمیوں کی کوئی شام رخصت ہوتے ہوئے جھیل پر اپنی گرم تابانی یوں بکھیر دیتی ہے جیسے کوئی شرم سے گلنار دلہن، رخصت سے پہلے رات کو آئینے میں اپنی آخری جھلک دیکھنے کے لیے ٹھہر گئی ہو!

"جب مزارات شاخوں اور پتوں کے جھرمٹ میں آدھے چھپے آدھے چمکتے دکھائی دیتے ہیں، اور ہر ایک اپنے اپنے مخصوص مراسم سے اُس گھڑی کو متبرک بناتا ہے۔

"یہاں کسی مینار سے دعا و مناجات کے نغمے بلند ہو رہے ہیں۔

"یہاں مجوسی اپنا عطر سے بھرا آتش دان جھلا رہا ہے، اور وہاں قربان گاہ پر کسی ہندوستانی رقاصہ کی کمر سے بندھی سریلی گھنٹیوں کی پیٹی جھنکار رہی ہے۔ یا پھر اسے چاندنی میں دیکھو — جب اس کے محلوں، باغوں اور مزاروں پر نرم و شیریں روشنی دمکتی ہے؛ جب آبشاریوں جھلملاتی ہے جیسے تاروں کی کوئی تیز بارش، اور جزیرۂ چناراں سے اٹھتا ہوا بلبل کا نغمہ اُن قہقہوں اور قدموں کی ہلکی بازگشت سے ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے جو اُن ٹھنڈی، چمکتی روشوں سے آتی ہے جہاں نوجوان جمع ہوتے ہیں —

"یا صبح کے وقت، جب اجالے کا جادو ہر لمحہ کوئی نیا عجوبہ بیدار کرتا ہے؛ جوں جوں دن آہستہ آہستہ پھوٹتا ہے، پہاڑ، گنبد اور چشمے ایک ایک کر کے تاریکی سے یوں نمودار ہوتے ہیں گویا ابھی ابھی سورج کے بطن سے پیدا ہوئے ہوں۔

"جب خوشبو کی روح دن کے ساتھ ہی بیدار ہو کر اپنے شب گزیدہ پھولوں کے حرم سے چپکے سے نکل آتی ہے؛ اور شوخی سے بھری ہوا کسی عاشق کی طرح سپیدار کے نوجوان درختوں سے چھیڑ چھاڑ کرتی ہے، یہاں تک کہ وہ سراپا لرز اٹھتے ہیں۔ جب مشرق پہلی امیدوں کی روشنی کی طرح گرم ہوتا ہے، اور دن اپنے نور کا پرچم لہرائے اُس کوہستانی دروازے سے جھانکتا ہے جو وادیِ نشاط سے دنیا کی طرف پرشکوہ انداز میں کھلتا ہے!

"مگر نہ کبھی شب کو نہ روز کو، نہ بہار کی شبنم میں نہ گرمیوں کی دھوپ میں، یہ شیریں وادی ایسی شادمان دکھائی دی جیسی اب دکھائی دیتی ہے — سراپا محبت اور سراپا نور، دن کو نظارے اور رات کو جشن! ہر پیشانی پر پہلے سے زیادہ مسرور مسکراہٹ جھلکتی ہے، اور ہر دل پہلے سے کہیں جلد کھل اٹھتا ہے۔ اور ہر سو وجد ہی وجد ہے — کیونکہ اب وادی اپنا جشنِ گلاب منا رہی ہے؛ وہ پُرمسرت زمانہ جب لذتیں چاروں طرف فراوانی سے برستی ہیں اور ان کی

بارش میں دل موسم کے گلاب کی طرح کھل جاتے ہیں — وہ گلِ صد برگ، جو شبنم برسنے کے ساتھ ساتھ کھلتا چلا جاتا ہے،

"اور اس کی ہر پتی اپنے حصے کی شبنم پا لیتی ہے۔

"یہ وہ وقت تھا جب پُرسکون اور خنک جھیل پر شام کی گھڑی اتری، جب دن اپنے تپتے شعلے کو بارہ مولہ کے درختوں کی اوٹ میں چھپا چکا تھا، جب دوشیزائیں اپنے مرصع بستروں سے — جہاں وہ دھوپ کا سارا زمانہ سوتی رہی تھیں — تازہ دم ہو کر سر اٹھانے لگیں، اور چاندنی اور کھیل کود کے لیے بیدار ہوئیں۔

"ایسے آغاز کے بعد شاہ و ملکۂ بخارا کی خوش بختی میں بھلا کیا شبہ رہ سکتا ہے۔"

اورنگ زیب عالمگیر اپنے عہدِ حکومت کے نصفِ آخر میں ہندوستان (شمالی ہند) میں مقیم نہ رہا۔ دکن نے اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لی تھی، اور وہیں وہ پچاس برس پر محیط طویل دورِ حکومت کے بعد ۱۷۰۷ء میں رحلت کر گیا۔ شہنشاہ کا کشمیر میں کل قیام صرف تین ماہ رہا۔

کشمیر کا عظیم شاعر ملا طاہر غنی اورنگ زیب عالمگیر ہی کے عہد میں فوت ہوا۔ مرحوم سر محمد اقبال کے اجداد نے، جو سپرو ذات کے کشمیری برہمن تھے، اسی عہد میں اسلام قبول کیا۔

نامزد گورنر نوازش خان رومی کشمیر کی راہ میں تھا کہ اسے عالمگیر کی وفات کی خبر ملی۔

ایک برس بعد جعفر خان نوازش خان رومی کا جانشین ہوا۔ جعفر خان ظالم اور بادہ خوار ثابت ہوا، اور ایک برس تین ماہ کی گورنری کے بعد کثرتِ مے نوشی سے ہلاک ہوا۔ کشمیر میں گورنر اور اعلیٰ عہدے دار جب منصب سنبھالتے تو موروثی مغنی ایسے مواقع کے اعزاز میں منعقدہ پرشکوہ استقبالی تقریبات میں ان کا خیر مقدم کیا کرتے تھے۔ عالمگیر نے یہ رسم بند کرا دی

تھی۔ جعفر خان کی گورنری کے زمانے میں قاضی حیدر المعروف "قاضی خان" نے، جو پیدائشی کشمیری تھا اور عالمگیر کے تحت قاضی القضاۃ یعنی منصفِ اعلیٰ کے اہم منصب پر فائز رہا تھا، وفات پائی۔ قاضی کی میت ڈل کے کنارے پرگنہ پھاک کے گاؤں بچھ پور میں اس کے اپنے باغ میں سپردِ خاک کی گئی۔

عالمگیر کی وفات کے بعد تخت کے لیے ایک مختصر مگر شدید کشمکش برپا ہوئی جس کا انجام یہ ہوا کہ اس کے دو بیٹے اور تین پوتے میدانِ جنگ میں کام آئے۔ اس کا سب سے بڑا زندہ بیٹا معظم شاہ عالم پشاور کے قریب جمرود میں تھا کہ ۲۲ مارچ ۱۷۰۷ء کو اسے باپ کی وفات کی خبر ملی اور وہ آگرہ کی طرف روانہ ہوا، اور لاہور سے ۲۴ میل شمال میں پل شاہ دولہ کے مقام پر بہادر شاہ کے لقب سے اپنی تاج پوشی کر لی۔ اسی اثنا میں اعظم شاہ احمد نگر میں اپنے باپ کے لشکرگاہ پہنچ کر ۱۴ مارچ کو تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ لیکن باہمی معرکوں میں اعظم شکست کھا گیا اور جون میں جان سے بھی گیا۔ کام بخش نے، جس نے بیجاپور میں اپنی تاج پوشی کی تھی، ۱۳ جنوری ۱۷۰۹ء کو حیدرآباد دکن سے کوئی چار میل باہر اپنے انجام کو پہنچایا گیا۔ اس کے بعد بہادر شاہ فروری ۱۷۱۲ء تک حکمران رہا اور اسی ماہ کی ۲۷ تاریخ کو فوت ہوا۔

متاخر مغل

بہادر شاہ کی وفات کے وقت اس کے چاروں بیٹے — جہاندار شاہ، عظیم الشان، رفیع الشان اور جہان شاہ — اس کے ہمراہ لاہور میں موجود تھے۔ بھائیوں میں جنگ چھڑ گئی اور بالآخر جہاندار شاہ فتح یاب ہوا۔ مگر اس نے اپنے آپ کو عیش و عشرت کے حوالے کر دیا، چنانچہ

جنوری ۱۷۱۳ء میں عظیم الشان کے بیٹے فرخ سیر نے خود کو تخت نشین کیا اور ۱۷۱۹ء تک حکومت کی، جب سادات برادران عبداللہ اور حسین علی نے سازش کی۔ انہوں نے اپریل ۱۷۱۹ء میں فرخ سیر کا گلا گھونٹ دیا۔ بیس برس کے نوجوان رفیع الدرجات کو تخت پر بٹھایا گیا، مگر وہ تپِ دق کا مریض تھا، اس لیے ۴ جون ۱۷۱۹ء کو اسے اپنے بڑے بھائی رفیع الدولہ کے لیے جگہ خالی کرنا پڑی۔ وہ قلعے کے اندر سادات برادران کا گویا قیدی بن کر رہا، یہاں تک کہ ۲۸ ستمبر ۱۷۱۹ء کو جہان شاہ (بہادر شاہ کے چوتھے بیٹے) کے بیٹے روشن اختر کی ناصر الدین محمد شاہ کے لقب سے تاج پوشی ہوئی۔

محمد شاہ کے زمانے میں سادات برادران نے ۱۴ اکتوبر ۱۷۲۰ء کو رفیع الدرجات اور رفیع الدولہ کے بھائی شاہ زادہ محمد ابراہیم کو تخت پر بٹھا دیا۔ ابراہیم کے نام کا سکہ بھی جاری ہوا، مگر وہ گرفتار کر کے محمد شاہ کے حضور لایا گیا، جس نے شاہانہ انداز میں اس کی پذیرائی کی اور اسے نگرانی میں رکھا۔ پھر نادر شاہ منظر پر نمودار ہوا۔ اس کے حملۂ ہند نے فطری طور پر مغل اقتدار کو کمزور کر دیا، اور دہلی نے ایک ہولناک قتلِ عام دیکھا۔ البتہ احمد شاہ درانی کے حملے کو ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کے بیٹے شاہ زادہ احمد شاہ نے سرہند سے دس میل شمال مغرب میں مانو پور کے قریب پسپا کر دیا۔

محمد شاہ کی استسقا کے مرض سے وفات پر شاہ زادہ احمد ۲۹ اپریل ۱۷۴۸ء کو مجاہد الدین احمد شاہ بہادر کے لقب سے دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ۱۷۵۱ء میں احمد شاہ درانی نے دہلی کے مغل فرماں روا احمد شاہ سے پنجاب اور ملتان کی دست برداری کا مطالبہ کیا اور اسے منوا لیا۔ پنجاب کے حصول ہی نے درانی کو اس قابل بنایا کہ وہ ہندوستان پر اپنے تیسرے حملے کے دوران ۱۷۵۲ء میں کشمیر پر قبضہ کر لے۔

اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے شاہ عالم کے عہد کے گورنروں نے ملک کا انتظام چلانے کے لیے اپنی جگہ نائب بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ بعد کے برسوں میں اس روش کو خاصا رواج حاصل ہوا۔ امانت خان اور مشرف خان دونوں خواجہ عنایت اللہ کے نائب تھے، جو نوازش خان رومی کی جانشینی پر مامور ہوا تھا۔ اس کے سوا شاہ عالم (بہادر شاہ اول) کے مختصر عہدِ حکومت میں، جو ۱۷۱۲ء میں ختم ہوا، قلم بند کرنے کے لائق کوئی خاص بات نہیں۔

اس زمانے میں کشمیر میں پیش آنے والا واحد قابلِ ذکر واقعہ ۱۱۲۴ھ (۱۷۱۳ء) میں راجہ مظفر خان بمبا کی بغاوت اور اس کا دراوہ اور کرناوہ (موجودہ کرناہ) پر قبضہ ہے، جو دونوں صوبہ دارِ کشمیر کی جاگیریں تھیں۔

[تاریخِ حسن، اوراق 258-59؛ تاریخِ خلیل مرجان پوری، ورق 234۔ دراوہ ایک پرگنے کا نام ہے جو کرناو کے راجاؤں کی مملوکہ اراضی کا حصہ تھا، اور اس خاندان کے آخری فرد شیر احمد کے زمانے تک وہاں کے باشندے بظاہر جاگیردارانہ خدمت کی شرائط پر اپنی زمینیں بلا لگان رکھتے چلے آئے تھے۔ دراوہ دریائے کشن گنگا کی وادی میں واقع ہے، جو جہلم کا ایک معاون دریا ہے۔ کرناو یا کرناہ اب ضلع مظفرآباد کی ایک تحصیل ہے، جو کشمیر کے شمال مغرب میں دریائے کشن گنگا کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔]

گورنر عنایت اللہ خان شہنشاہ جہاندار شاہ کی ۱۱۲۴ھ میں وفات کے باعث اسے زیر کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ تاہم یہ کام اگلے فرماں روا فرخ سیر کے عہد میں علی محمد خان نے انجام دیا۔ اسی صوبہ دار نے پونچھ کے زمیندار ابوالفتح کو بھی سزا دی۔ لیکن علی محمد خان اچھا گورنر ثابت نہ ہوا؛ ناروا ٹیکس عائد کرنے کی پاداش میں اسے واپس بلا لیا گیا۔ فرخ سیر کی

والدہ صاحبہ نسواں کشمیری خاتون تھی۔ اس کے بھائی خواجہ عنایت اللہ کو شائستہ خان کا خطاب حاصل تھا۔ جب ۱۷۱۵ء میں فرخ سیر کی شادی جودھ پور کے اجیت سنگھ کی بیٹی سے ہوئی تو شائستہ خان ہی کو دلہن کو اس کے وطن جودھ پور سے دہلی لانے کے لیے بھیجا گیا۔ عنایت اللہ چار ہزاری منصب تک پہنچا اور اپریل ۱۷۱۷ء میں سلطنت کا وزیرِ مالیات مقرر ہوا۔ ''اس نے کوشش کی کہ انتظامِ سلطنت کو ان خرابیوں سے پاک کرے جو حال ہی میں اس میں در آئی تھیں، اور اورنگ زیب کے زمانے کے ضوابط اور نظم و ضبط کو بحال کرے۔'' اسی بات نے دشمنوں کا ایک انبوہ اس کے خلاف کھڑا کر دیا۔

محمد مراد کشمیری

محمد مراد کشمیری رکن الدولہ اعتقاد خان بہادر فرخ شاہی کے خطاب کے ساتھ ہفت ہزاری منصب اور دس ہزار سوار کے مرتبے تک پہنچا، اور مراد آباد کی سرکار رکن آباد کے نئے نام سے اس کا صوبہ ٹھہری۔ محمد مراد نے اورنگ زیب عالمگیر کے رضاعی بھائی میر ملک حسین خان جہاں کوکلتاش کے تحت ملازمت اختیار کی تھی۔ بعد ازاں وہ شاہ عالم اول کی لشکرگاہ سے وابستہ ہوا۔ اس کے عروج کا آغاز جہاندار شاہ کے زمانے میں ۱۷۱۳ء میں ہوا اور فرخ سیر کے عہد میں یہ عروج اپنے نقطۂ کمال کو پہنچا۔ مراد سلطنتِ دہلی کا میرِ ثانی یعنی دوسرا میر تھا۔ شہنشاہ نے ایک دن دربار میں امرائے کبار سے کہا: ''تم نے سنا ہی ہوگا کہ اعتقاد خان ہماری والدۂ معظمہ کے عزیزوں میں سے ہے۔'' فرخ سیر سے اپنی وفاداری میں مراد سادات برادران کی سازشوں کا حریف بن گیا اور سید حسین علی کے مکان میں نظربند کر دیا گیا۔ ۱۲ رمضان ۱۱۲۹ھ (۲ مئی ۱۷۱۷ء) کو مراد نے بہتر برس کی عمر میں دہلی میں وفات پائی۔

نہرو خاندان کی ہجرت

فرخ سیر کے زمانے میں سنسکرت اور فارسی کے ایک عالم پنڈت راج کول نے شاہی دورۂ کشمیر کے دوران شہنشاہ کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔ شہنشاہ ہی کے ایما پر راج کول کا خاندان ۱۷۱۶ء کے لگ بھگ دہلی ہجرت کر گیا۔ یہی خاندان بعد میں الہ آباد کے نہرو خاندان کے نام سے معروف ہوا، اور اسی نے پنڈت موتی لال نہرو اور ان کے فرزند پنڈت جواہر لال نہرو کو جنم دیا۔

[ولیم ارون (William Irvine) کی ”لیٹر مغلز“، سر جادو ناتھ سرکار (Sir Jadunath Sarkar) کا مرتبہ ایڈیشن، جلد اول، ص 144، ص 304 اور ص 342؛ کیمبرج ہسٹری آف انڈیا، جلد چہارم، ص 337؛ جواہر لال نہرو کی خودنوشت (An Autobiography)، جان لین، دی باڈلی ہیڈ، لندن، طبع مکرر جنوری ۱۹۴۱ء، ص 1۔]

محمد شاہ

ناصر الدین محمد شاہ ۱۷۱۹ء میں نوعمری ہی میں دہلی کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ محمد شاہ نہایت خوب رو، قوی الجثہ اور توانا تھا، مگر بے عملی کی خانہ نشین زندگی اور عیاشی کی زیادتی نے جلد ہی اس کی صحت تباہ کر دی، اور صرف چالیس برس کی عمر تک پہنچتے پہنچتے وہ مستقل علیل ہو چکا تھا۔ افیون کی لت نے اس خرابی کو اور بڑھا دیا، اور بالآخر اس نشے کی عادت نے اسے ایسا کمزور اور لاغر کر دیا کہ اس کے لیے اپنے محل سے نکلنا بھی ناممکن ہو گیا۔ سر جادو ناتھ سرکار کا بیان ہے کہ جب محمد شاہ میں جوانی کے جذبات کی آگ بجھ چکی تو اس پر ایک گہری افسردگی طاری ہو گئی، اور اپنی زندگی کے آخری دور میں وہ فقرا کی صحبت میں بیٹھنا

اور ان سے طویل گفتگوئیں کرنا پسند کرتا تھا، اور کسی صاحبِ باطن کی طرح روحانی مسائل پر بحث کرتا۔ اگرچہ اس نے اپنے فرائضِ سلطنت سے غفلت برتی، تاہم "وہ گستاخانہ غرور، خودسری اور بے جا سنگ دلی کی ہوس سے پاک تھا، اور دوسروں کے لحاظ و مروت سے بھی عاری نہ تھا۔" اس نے حوصلہ مندی کا ثبوت اُس وقت دیا "جب اپنے دوستوں کے مشورے کے مطابق بنگال کی طرف فرار ہونے کے بجائے وہ اپنی رعایا اور دارالسلطنت کو پُرتشدد یورش کی ہولناکیوں اور مشتعل فاتحین کی جبری غلامی سے بچانے کے لیے رضاکارانہ طور پر نادر شاہ کی قید میں چلا گیا۔"

[دی ماڈرن ریویو (The Modern Review)، کلکتہ، دسمبر ۱۹۳۱ء، ص 611۔]

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اب تک دور دراز صوبوں کے حسنِ انتظام کا بڑا سبب شہنشاہ کا ذاتی کردار ہی رہا تھا۔ مگر محمد شاہ اور اس کے امرا نے اپنے آپ کو تن آسانی اور عیش و عشرت کی زندگی کے سپرد کر دیا۔ کرنل الیگزینڈر ڈاؤ (Colonel Alexander Dow) کہتا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر اپنی وفات کے وقت ایک مکمل طور پر مستحکم سلطنت چھوڑ گیا تھا۔ اس کا شیرازہ محمد شاہ کے عہد (۱۷۱۹ء–۱۷۴۸ء) میں بکھرنا شروع ہوا، جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس نے ایک بار ایک اہم سازش کی ہنگامی رپورٹ کو "بے معنی جھنجھٹ" قرار دے کر شراب کے مٹکے میں پھینک دیا — دفترِ بے معنی غرقِ مئے ناب اولیٰ — اور محمد شاہ اپنی اس بادہ نوشی کے اثرات سے دو دن بعد تک سنبھل نہ سکا۔

تاہم محمد شاہ نے "کبھی خون بہانے یا خدا کی مخلوق کو ایذا پہنچانے کی اجازت نہیں دی۔" اس کے عہد میں رعایا نے چین و آرام سے زندگی بسر کی، اور سلطنت —

بظاہر اپنا وقار اور اعتبار برقرار رکھے ہوئے تھی۔ دہلی کی بادشاہت کی بنیادیں درحقیقت بوسیدہ ہو چکی تھیں، مگر محمد شاہ نے اپنی زیرکی سے انہیں کھڑا رکھا۔ اسے بابر کے خاندان کا آخری حکمران کہا جا سکتا ہے، کیونکہ اس کے بعد بادشاہت کے پاس نام کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔" (سیر المتاخرین، جلد III، صفحہ 25)۔ محمد شاہ ۱۷۴۸ء میں انتقال کر گیا؛ وہ انتیس برس تک تخت نشین رہا تھا۔

محمد شاہ کے عہد میں کشمیر کی تاریخ مقامی فسادات اور باہمی خانہ جنگیوں کے سلسلے کے سوا کچھ اور پیش نہیں کرتی۔ اس کے دور میں کشمیر سیاسی زندگی کے ایک نئے مرحلے میں داخل ہوا، کیونکہ صوبہ دار، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، بہ نفسِ نفیس اپنے صوبوں پر حکمرانی سے مکمل طور پر دست کش ہو گئے اور اپنی جگہ ایسے معتمد گماشتے مقرر کرنے لگے جو حسنِ سلوک اور حسنِ انتظام کے لیے ان کے سامنے جواب دہ تھے۔

میر عنایت اللہ خان

محمد شاہ نے میر عنایت اللہ خان کو کشمیر کی صوبہ داری عطا کی۔ عنایت اللہ خان پیدائشی کشمیری تھا اور قاضی موسیٰ شہید کی نسل سے تھا جو یعقوب شاہ چک کے زمانے میں قتل ہوا تھا۔ عنایت اللہ ابتدا میں میر عنایت اللہ کہلاتا تھا اور بعد میں میر عنایت اللہ خان کے نام سے معروف ہوا۔ اس کے چھ بیٹے تھے جن میں زیادہ نمایاں یہ تھے: بڑا بیٹا ہدایت اللہ، جو پہلے وزارت خان اور پھر سعد اللہ خان میر سامان کے نام سے مشہور ہوا، اور چھوٹا بیٹا عطیت اللہ خان، جسے اس کے والد کا نام عنایت اللہ خان بطور خطاب دیا گیا۔ میر عنایت

اللہ کشمیر میں "ینا سیر" کے نام سے جانا جاتا ہے کیونکہ اس نے حضرت مخدوم کے مزار کی فصیل یعنی "سیر" تعمیر کرائی تھی؛ "ینا" دراصل عنایت اللہ ہی سے ماخوذ عرفیت ہے۔

اس کی والدہ حافظہ مریم اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں شاہی حرم کی خواتین کو، خصوصاً زیب النسا کو، تعلیم دیتی تھیں۔ حافظہ مریم کی والدہ جان بیگم، جو ملا شریف میر عدل کی بیٹی تھیں، شاہ جہاں کے زمانے میں شہزادیوں کی معلمہ تھیں۔

اورنگ زیب عالمگیر کو عنایت اللہ کی اہلیت پر اس قدر اعتماد تھا کہ جب مملکت کے وزیر اعظم نواب عمدۃ الملک مدار المہام جعفر خان علیل ہو گئے تو اس نے عنایت اللہ کو وزیر اعظم مقرر کر دیا۔ احکامِ عالمگیری اسی عنایت اللہ کی مرتب کردہ ہے۔ تمام دستخط شدہ شاہی فرامین اسی نے جمع اور مدون کیے، جو کلماتِ طیبات کے عنوان سے مشہور ہوئے۔ عالمگیر عنایت اللہ کے علمی و ادبی کمالات کا بڑا قائل تھا اور اس کی انشا، اسلوب اور طرزِ خوش نویسی سے متاثر تھا۔ عنایت اللہ خوب رو، خوش خو، سنجیدہ مزاج اور نہایت راست باز تھا۔ اس کی عادات سادہ تھیں اور وہ فقرا و درویشوں کی صحبت کو پسند کرتا تھا۔

بذاتِ خود عنایت اللہ ایک فرض شناس آدمی معلوم ہوتا ہے، جس نے ملک کے حسنِ انتظام کے پیشِ نظر اپنے نائب منتخب کیے۔ اس کے نائب میر احمد خان نے اپنی نیک اور منصفانہ حکمرانی سے اپنے پیش رووں کی زیادتیوں کی خاطر خواہ تلافی کی۔ لیکن ایک عجیب گوشے سے فتنہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ملا عبد النبی محتوی خان عرف محبوب خان، جسے اس کے معتقدین نے دین دار خان کا لقب دیا تھا، اپنے علم کی بدولت شاہ عالم بہادر کے عہد میں کشمیر کے شیخ الاسلام کے منصب تک پہنچ چکا تھا۔ مآثر الامرا (جلد III، صفحہ 761) میں "محتوی یا محبوب خان ملا عبد النبی" کا ذکر اپنے وقت کے اہلِ علم میں ہوا ہے اور اسے ایسا

شخص بتایا گیا ہے جو اشاعتِ اسلام کے پردے میں اپنی اغراض کے حصول میں خود غرض تھا۔ ملا ایک بڑا زمین دار بھی تھا۔ پنڈت محصولی منشیوں کے ملا محتوی کے گماشتوں سے رشوت طلب کرنے کے ایک واقعے پر اس نے اس بدعنوان منشی طبقے کے فوری مقاطعے کے احکام صادر کر دیے۔ پنڈت مجلس رائے، صرافِ پادشاہی یعنی شاہی خزانچی، نے ان پابندیوں کی اطلاع کشمیر کے میر بخشی شاہ پور خان کو دی۔ میر بخشی شیعہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نزاعات بڑھتے گئے، اور پنڈتوں اور شیعوں نے شیخ الاسلام کی مخالفت میں ہاتھ ملا لیے۔ فسادات پھوٹ پڑے اور ملا محتوی خان شیعوں کے ایک گروہ کے ہاتھوں قتل ہو گیا۔

اس کے دو چھوٹے بیٹے بھی موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

عبد النبی کا بیٹا ملا شرف الدین اپنے باپ کا جانشین ہوا اور فتنہ و فساد کا سلسلہ جاری رکھا۔ صوبہ دار میر عنایت اللہ خان کا نائب میر احمد خان حالات پر قابو نہ پا سکا، چنانچہ اسے ہٹا دیا گیا۔ دوسرا نائب عبد اللہ خان بھی ناکام رہا اور اس کی جگہ تیسرا نائب مومن خان نجم ثانی مقرر ہوا، مگر وہ بھی شیخ الاسلام کو روکنے میں ناکام رہا۔ بغاوتیں بدستور جاری تھیں۔ عنایت اللہ نے صوبہ داری کے منصب سے استعفا دے دیا۔ لاہور کا مغل نائب السلطنت عبد الصمد خان احراری سیف الدولہ بہادر دلیر جنگ — جس نے بندہ بیراگی کو شکست دی تھی اور جو ۱۷۲۰ء تا ۱۷۲۶ء لاہور کے گورنر زکریا خان کا باپ تھا — ۱۷۲۰ء میں اس منصب پر مامور ہوا۔

عبد الصمد احراری نے عبد اللہ خان دہبیدی کو، جو اصلاً ایران میں شیراز اور اصفہان کے تقریباً وسط میں واقع گاؤں دہبید کا باشندہ تھا، اپنا نائب بنایا۔

سیف الدولہ ایک بڑی فوج لے کر لاہور سے روانہ ہوا۔ اس نے شیخ الاسلام ملا شرف الدین (محتوی خان کے بیٹے اور جانشین) کے خلاف، جو اپنے باپ کے بعد بغاوت کا سرغنہ بن چکا تھا، فوری تادیبی کارروائی کی۔ سیف الدولہ نے ملا کو قتل کرا دیا اور پچاس باغیوں کو پھانسی دی۔ اس نے سابق شیخ الاسلام ملا محتوی خان کی پنڈتوں پر عائد کردہ وہ پابندیاں بھی اٹھا دیں جن کے تحت انہیں ایک عرصے کے لیے پگڑی باندھنے، سواری کرنے اور ماتھے پر تلک یا سیندور کا نشان لگانے سے روک دیا گیا تھا—یہ پابندیاں کم و بیش ان کہیں زیادہ سخت اور ذلت آمیز پابندیوں سے مشابہ تھیں جو زیریں سندھ کے اُس وقت کے دارالحکومت برہمن آباد کے جاٹوں اور لوہانوں پر برہمن حکمران چچ نے عائد کی تھیں (ہسٹری آف انڈیا ایز ٹولڈ بائی اٹس اون ہسٹورینز، از ایلیٹ اور ڈاؤسن (Elliot and Dowson)، جلد I، صفحہ 151)۔ پنڈتوں نے اس اقدام کی اس قدر قدر کی کہ ان میں سے ایک نے سیف الدولہ عبد الصمد کی شان میں کشمیری زبان میں یہ شعر کہا:

"حقا! آو صمد پھڑان زین، نہ رود کنہ شرف، نہ رود کنہ دین۔" (فی الواقع صمد نہایت تیزی سے آپہنچا اور شرف الدین کا کہیں نشان نہ رہا۔ لفظی مفہوم یہ ہے کہ "صمد گھوڑے کی زین توڑتا ہوا آیا، اور نہ کہیں شرف—یعنی حضرتِ موصوف—باقی رہا اور نہ دین—یعنی اس کا مذہبی جوش و خروش۔")

۱۷۲۴ء مطابق ۱۱۳۷ھ میں عنایت اللہ تیسری بار کشمیر کا گورنر مقرر ہوا، مگر چند ماہ بعد دہلی میں وفات پا گیا۔ اگلے نامزد گورنر عقیدت خان نے میر فیروز الدین نواب ابو البرکات خان فیروز جنگ صافی کو—اس کا بعد کا مکمل خطاب یہی تھا—اپنا نائب مقرر کیا، مگر وہ ناکام ثابت ہوا۔ ۱۷۲۷ء میں عقیدت خان کی جگہ اغر خان آیا۔ اغر خود کشمیر آیا، مگر لوگوں پر ظلم

ڈھانے لگا اور ابو البرکات کو، جس نے اس کی مخالفت کی تھی، قیدی بنا کر دہلی بھیج دیا۔ اہلِ کشمیر اغر کے مظالم پر اس قدر مشتعل ہو گئے کہ آخرکار انہوں نے اسے نکال باہر کیا۔ وہ بھاگ کر بارہ مولا پہنچا جہاں اسے اپنی معزولی کے احکام موصول ہوئے۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دل دلیر خان پانی پتی فخر الدولہ بہادر اور عطیت اللہ عرف عنایت اللہ خان ثانی — جو پہلے میر عنایت اللہ خان کشمیری کا چھوٹا بیٹا تھا — گورنر ہوئے۔ ابو البرکات، جو نیابت کے منصب سے ہٹایا جا چکا تھا، دہلی سے رہائی پا کر آتش زدگی، سیلاب، زلزلوں اور آندھیوں کے زمانوں میں عوامی مقصد کے علَم بردار کی حیثیت سے نمودار ہوا اور لوگوں کی مدد کرتا رہا۔ اس نے گورنر عنایت اللہ ثانی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا، پونچھ کے سرکردہ زمین داروں محمد زمان اور ولی محمد سے ساز باز کی، اور ۱۶ شوال ۱۱۵۴ھ مطابق ۱۷۴۱ء کو ان کے شریکِ کار پنڈت دیا رام کے ہاتھوں گورنر کو قتل کرا دیا۔ مغل نائب یا تو ہمسایہ سرداروں اور امرا سے برسرِپیکار رہتے تھے یا خود اپنے آقا سے، جیسا کہ خود ابو البرکات کا معاملہ تھا جب وہ نائب کے منصب پر فائز تھا۔

مغلوں سے افغانوں کو انتقالِ اقتدار کا آغاز

نادر شاہ کی افغانستان میں موجودگی اور پھر اس کی ہندوستان پر یورش نے تمام صوبوں پر ناموافق اثر ڈالا، خصوصاً کشمیر پر، جو احمد شاہ درانی کے وطن افغانستان سے کچھ دور نہ تھا؛ کابل اور قندھار، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، اکبر کے عہد میں صوبہ کشمیر ہی میں شامل تھے۔ جب نادر شاہ نے ہندوستان کا تاج محمد شاہ کے سر پر رکھا تو شہنشاہ نے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے دریائے سندھ کے مغرب میں واقع اپنی سلطنت کے صوبے، کشمیر سے سندھ تک، پیش کر دیے۔ تاہم معلوم یہ ہوتا ہے کہ اصل کشمیر نادر شاہ کی عمل داری میں شامل

نہیں ہوا۔ لیکن ملا خلیل مرجان پوری کی تاریخِ کشمیر اور پیر حسن شاہ کی تاریخِ حسن کا بیان ہے کہ فخر الدولہ نے ۱۱۵۲ھ مطابق ۱۷۳۹ء میں نادر شاہ سے کشمیر کی صوبہ داری کا پروانہ حاصل کیا، چالیس دن نادر کے نام پر حکومت کی اور نادر کا سکہ بھی رائج کیا۔ مگر بعد ازاں فخر الدولہ نے، غالباً دہلی سے نظر ثانی شدہ احکام ملنے پر، عنایت اللہ خان ثانی کو محمد شاہ کا صوبہ دار تسلیم کر لیا اور سری نگر چھوڑ گیا۔ اس کے بعد حالات نے مل جل کر اقتدار کو مزید متزلزل کر دیا اور کشمیر میں طوائف الملوکی زور پکڑ گئی۔ احمد شاہ کے عہد میں بھی، جو نادر شاہ کی وفات کے ایک سال بعد ۱۷۴۸ء میں محمد شاہ کے بعد دہلی کے تخت پر بیٹھا، صورتِ حال میں کوئی بہتری نہ آئی۔

کشمیر کی یہ حالت تھی جب ۱۷۴۷ء میں بعض امرا نے احمد شاہ درانی کو، جو نادر شاہ کی جگہ لے چکا تھا، کشمیر کے الحاق کے لیے خط لکھا۔ جب یہ خط مغل عامل افراسیاب کے ہاتھ لگا تو یہ امرا کھلی بغاوت پر اتر آئے اور انہوں نے ہندوستان کے مغل شہنشاہ احمد شاہ سے ایک گورنر مقرر کرنے کی درخواست کی۔ چنانچہ عارضی انتظام کے طور پر میر مقیم کانٹھ کو گورنر مقرر کیا گیا، مگر ابو البرکات کے بیٹے ابو القاسم نے اسے جلد ہی نکال باہر کیا۔ ۱۷۵۲ء میں جب احمد شاہ درانی لاہور میں ہندوستان پر حملے کی تیاری کر رہا تھا، میر مقیم اور کشمیر کے خواجہ ظہیر دیدہ مری نے اس سے مدد کی التجا کی۔ اس پر احمد شاہ درانی نے عبد اللہ خان ایشک آقاسی کو ایک خاصی بڑی فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ کچھ بے نتیجہ مذاکرات کے بعد مغل ناظم ابو القاسم نے گنڈ نعمت (شوپیاں کے قریب) کے مقام پر پندرہ دن تک افغانوں سے جنگ کی۔ اس کا سپہ سالار گل خان خوباری اسے چھوڑ گیا، جس پر کشمیر کا آخری مغل گورنر ابو القاسم فرار ہو گیا اور گرفتار کر لیا گیا۔ وادیِ کشمیر افغانوں کے قبضے میں چلی گئی۔

مغلیہ عہدِ حکومت کے فوائد کا خلاصہ

افغانوں کے ذکر کی طرف بڑھنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم مغلوں سے متعلق اپنے تبصرے کا خلاصہ کر دیں۔ مغل عموماً ملک اور اہلِ ملک کی فلاح و بہبود کے خواہاں رہے۔ شہنشاہوں کی وادی میں آمد نے اس کی تجارت کو مہمیز دی اور اس کی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کی۔ مسٹر ڈبلیو سی سمتھ (W. C. Smith) کا خیال ہے کہ مغلیہ سلطنت متوسط طبقے کی حلیف تھی اور اپنے سب سے شاداب دور میں متوسط طبقے کی تجارت اس کی آمدنی کی ایک ثانوی مگر نہایت اہم بنیاد تھی، جب کہ بنیادی ماخذ زمین تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ جہانگیر کے عہد میں کشمیر میں تانبے کی کانیں چلائی جاتی تھیں اور شہنشاہ نے یہ کانیں ایک فردِ واحد کو کام میں لانے کے لیے عطا کر دی تھیں۔ جہانگیر ہی کو، شاید، ایک اعتبار سے وادی کی سیاحتی تجارت کے آغاز کا بانی کہا جا سکتا ہے۔ ایک سو چھیاسٹھ برس کے اُس پورے عرصے میں، جب کشمیر مغلوں کے زیرِ نگیں رہا، 63 گورنروں میں سے صرف چھ ایسی مثالیں ملتی ہیں جن میں کشمیریوں کے ساتھ جابرانہ سلوک روا رکھا گیا۔ مستشرق اور ۱۷۷۲ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم کرنل الیگزینڈر ڈاؤ (Colonel Alexander Dow) کے بقول، جس کا حوالہ ہم پہلے دے چکے ہیں، ”بیشتر فرماں رواؤں کی غیر معمولی صلاحیتوں نے، اور سب کے نرم خو اور انسان دوست کردار نے، پورے دو سو برس تک ہندوستان کو دنیا کی سب سے شاداب سلطنت بنائے رکھا۔“ سر جدو ناتھ سرکار (Sir Jadu Nath Sarkar) نے ہندوستان کے لیے مغلیہ سلطنت کے حسبِ ذیل چھ عطیوں کا ذکر کیا ہے: (۱) تمام صوبوں میں یکساں طرزِ نظمِ حکومت؛ (۲) ایک سرکاری زبان؛ (۳) سکے کا ایک یکساں نظام؛ (۴) اعلیٰ ملازمتوں کا ایک کل ہند کیڈر، جس کے افسر ہر تین چار سال بعد ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں تبادلہ

پاتے تھے؛ (۵) بڑی افواج کی ایک صوبے سے دوسرے صوبے میں مسلسل نقل و حرکت؛ اور (٦) مرکزی دارالحکومت سے معائنہ کار افسروں کی روانگی۔ ان میں اس امر کا اضافہ بھی کیا جا سکتا ہے کہ مغل حکمرانوں نے ہندوستان میں فن کی جو سرپرستی کی اور اس سے جو دلچسپی برتی، اس کی نظیر دنیا کی کسی تہذیبی تاریخ میں نہیں ملتی۔

اس باب کے اختتام کے لیے اس سے بہتر کوئی صورت نہیں کہ ہم پٹنہ یونیورسٹی کے فاضل سابق وائس چانسلر اور بہار کے سابق وزیر ڈاکٹر سچدانند سنہا (Dr. Sachchidananda Sinha) کا کشمیر میں مغلوں سے متعلق ایک اقتباس نقل کریں۔ ڈاکٹر سنہا لکھتے ہیں: ”جب سے اکبر نے کشمیر کو اپنی مملکت میں شامل کیا، وادی نے اس پر اور اس کی اولاد پر اپنا سحر طاری کر دیا۔ جتنا عرصہ کشمیر تختِ دہلی کے زیرِ نگیں رہا، وہ عظیم ترین مغل شہنشاہوں کے لیے سرچشمۂ الہام بنا رہا۔ اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب — ہر ایک نے باری باری اسے اپنی گرمائی آرام گاہ بنایا۔ جہانگیر پکار اٹھا تھا: ’فی الحقیقت یہی وہ جنت ہے جس کی پیشین گوئیاں اہلِ کلیسا کرتے آئے ہیں اور جس کے گیت شاعر گاتے رہے ہیں۔‘ تقریباً ڈیڑھ صدی تک یہ چاروں عظیم شہنشاہ دور دراز دہلی اور آگرہ سے پیر پنجال کے پار شاہانہ کر و فر کے ساتھ آتے رہے — جگمگاتے جلو اور پرشکوہ دبدبے کے ساتھ، محافظ دستوں اور درباروں، خراجوں اور بیگار کے ساتھ — ہندوستانی دربار کی گرد آلود چکاچوند سے نکل کر کشمیر کے ٹھنڈے اور پرسکون موسمِ گرما میں۔ اور جہانگیر نے، جب وہ اپنے مرضِ مرگ میں مبتلا ہوا اور جان گیا کہ اس کا وقت قریب ہے، اپنی وسیع ہندوستانی مملکت کے تمام خطوں میں سے اسی ایک خطے کا رخ کیا اور بہرام گلہ میں، اپنی محبوب اور پسندیدہ سرزمین سے گویا نظر آنے کے فاصلے پر، وفات پائی۔ اس نے چودہ موسمِ گرما وادیِ کشمیر میں گزارے تھے؛ وہ

بہار میں نیلک اور جنگلی سوسن کے کھلنے کے ساتھ وادی میں داخل ہوتا اور خزاں میں زعفران کے پھول کھل چکنے پر ہندوستان کے میدانوں کی جانب واپس روانہ ہو جاتا تھا۔"

بہرام گلہ پونچھ کی تحصیل مینڈھر کا ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس کی آبادی 328 ہے۔ یہ جہانگیر کی پسندیدہ شکارگاہ تھی۔ ایک بلند پہاڑ کے دامن میں بندوق ٹکانے کے لیے ایک دیوار تعمیر کی گئی تھی، اور دیہاتی لوگ پہاڑ کی ڈھلوان سے ہرن ہانک کر نیچے لاتے اور جہانگیر کے لیے عمدہ شکار مہیا کرتے تھے۔ ایک پیادہ سپاہی اپنے آگے ایک ہرن ہانک رہا تھا کہ اس کا پاؤں پھسل گیا؛ وہ پہاڑ سے گر کر ہلاک ہو گیا۔ اس واقعے نے جہانگیر پر ایسا اثر کیا کہ اس نے شکار ترک کر دیا اور نہایت ملول ہو کر اپنے خیمے میں جا بیٹھا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے ملک الموت اسی بدنصیب شخص کے روپ میں اس کے پاس آیا ہو۔ اسی لمحے سے وہ یاس میں ڈوب گیا۔ وہ حسبِ معمول سہ پہر کو بہرام گلہ سے روانہ ہو کر تقریباً تین بجے اپنی منزل تھنہ پہنچا اور وہاں سے راجوری کی طرف بڑھا۔ رات بھر اسے سانس لینے میں سخت دشواری رہی اور اتوار کی صبح اس نے دم توڑ دیا۔ یہ ۲۸ صفر ۱۰۳۷ھ مطابق ۲۸ اکتوبر ۱۶۲۷ء کا دن تھا۔ جہانگیر اس وقت اپنی عمر کے ساٹھویں اور عہدِ حکومت کے بائیسویں سال میں تھا۔

باب ہفتم – افغانوں کے عہد میں کشمیر

افغانوں کے عہد میں کشمیر (۱۷۵۲ء تا ۱۸۱۹ء)

اس سے قبل کہ ہم افغانوں کے عہد میں کشمیر کی صورتِ حال پیش کریں، یہ جاننا ضروری ہے کہ افغانوں میں سے کشمیر پر حملہ آور کون تھا، اس کے جانشین کون تھے، اور افغانستان میں اقتدار کے لیے ان کی باہمی کشمکش کیا رہی، کیونکہ افغان سیاست کے اثرات فطری طور پر اس عہد میں کشمیر کے حالات و واقعات پر مرتب ہوتے رہے۔ مغل عہدِ حکومت کے بیان میں ہم نے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا تھا، کیونکہ وہاں حملہ آور آگرہ سے آیا تھا اور ہندوستان میں مغل تاریخ کے عمومی خد و خال عام قاری کو خاصے معلوم ہیں۔ افغانوں کے معاملے میں آگرہ یا دہلی نہیں بلکہ دور دراز کے ہرات، قندھار اور کابل تھے جنہوں نے وادیِ کشمیر کے باشندوں کی قسمت پر اثر ڈالا۔ چنانچہ افغانستان کے واقعات پر ایک طائرانہ نظر ”کشیر“ کے قاری کو سری نگر کے اسٹیج پر کھیلے جانے والے ڈرامے کا پس منظر سمجھنے میں مدد دے گی۔

احمد شاہ درانی

احمد شاہ درانی، جس نے ۱۷۵۲ء میں کشمیر فتح کیا، محمد زمان خان کا بیٹا تھا، جو صوبہ ہرات میں آباد ابدالی قبیلے کی پوپلزئی شاخ کے سدوزئی خاندان کا ایک افغان تھا۔ زمان خان کا باپ عبداللہ خان، حیات سلطان کا بیٹا تھا۔ سدوزئی خاندان کا یہ نام اس کے سردار سدو کے نام

پر پڑا، جس نے سولہویں صدی میں ایران کے شاہ عباس اعظم سے بعض مراعات حاصل کی تھیں۔ سدو کا رفیق محمد تھا؛ اسی محمد کی نسل سے حاجی جمال خان تھا، جو پائندہ خان کا باپ تھا — وہی پائندہ خان جس کا بیٹا امیر دوست محمد خان بعد میں کابل پر حکمران ہوا۔ زمان خان ہجرت کر کے ملتان جا بسا تھا، جہاں احمد پیدا ہوا۔ احمد کی پیدائش کی صحیح تاریخ البتہ معلوم نہیں؛ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (Encyclopaedia of Islam) نے ۱۷۲۲ء اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا (Encyclopaedia Britannica) نے ۱۷۲۴ء لکھا ہے، اس لیے ۱۷۲۲ء تا ۱۷۲۴ء کو تخمینی زمانہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سدوزئی، جن سے زمان خان کا تعلق تھا، شیعہ تھے، اور اسی بنا پر یہ قیاس کیا گیا کہ ان کا نام "عبدِ علی" یعنی خلیفہ علیؓ کے خادم سے ماخوذ ہے۔ سید جمال الدین اسد آبادی، جو افغانی کے نام سے معروف ہیں، اسی مناسبت سے یہ نام "عبد علی" لکھتے ہیں۔ لیکن چونکہ ابدالی بعد میں کٹر سنی ہو گئے، اس لیے دوسری روایت یہ ہے کہ انہیں ابدالی اس لیے کہا گیا کہ وہ اس خاندان کے بانی ابدال کی اولاد تھے، جسے یہ لقب اس کے اپنے پیر خواجہ ابو احمد ابدال چشتی نامی بزرگ نے عطا کیا تھا۔

ابدال کے چار پوتے تھے: پوپل، بارک، ہلوکو اور موسیٰ۔ پوپل کے چھ بیٹے تھے جن میں تیسرا بامی تھا، اور بامی کا سب سے بڑا بیٹا سدو تھا۔ ماؤنٹ اسٹوارٹ ایلفنسٹن (Mountstuart Elphinstone) کے بقول درانیوں کے دو بڑے خاندان، جن کا نظامِ حکومت ہر دور میں جمہوری رہا، پوپلزئی اور بارکزئی تھے۔ سدوزئی، یعنی شاہی نسل، پوپلزئیوں ہی کی ایک شاخ تھی، اور بامیزئی — جن کے سپرد وزارت رہی — اسی خاندان کی دوسری شاخ تھے۔ اثر و رسوخ میں پوپلزئیوں کے بعد دوسرے درجے پر، مگر وسعت میں ان سے بڑھ کر، بارکزئیوں کا قبیلہ تھا۔ احمد خان کا بڑا بھائی ذوالفقار خان تھا۔

نادر شاہ کی آمد سے پہلے ایران میں بدامنی پھیلی تو زمان، ذوالفقار اور احمد ملتان سے ہرات لوٹ آئے۔ افغانوں نے نادر شاہ کے خلاف بغاوت کی، مگر اس نے انہیں شکست دی۔ سزا کے طور پر نادر نے قندھار میں آباد غلزئیوں کو ہرات منتقل کر دیا اور سدوزئیوں کو ہرات سے قندھار جانے پر مجبور کیا۔ افغانوں کی اس نقل مکانی کے دوران ذوالفقار اور احمد گرفتار کر لیے گئے، غالباً اس بنا پر کہ انہوں نے نادر کے احکام کے خلاف کوئی احتجاج یا ان میں مداخلت کی تھی۔ ذوالفقار اور احمد نادر کو ہونہار نوجوان دکھائی دیے۔ بڑا بھائی ۱۷۳۷ء میں ایک بڑے قبیلے کی سرداری تک پہنچا اور آگے چل کر ہرات کا حاکم مقرر ہوا، جہاں وہ غلزئیوں سے ایک لڑائی میں کام آیا۔ احمد اپنے روشن خد و خال، تیز فہمی اور نمایاں شجاعت کی بنا پر نادر کے ذاتی عملے میں شامل کر لیا گیا۔

نادر شاہ ۹ جون ۱۷۴۷ء کی شب مشرقی ایران میں مشہد کے قریب قتل کر دیا گیا۔ اس کے بعد جو افراتفری پھیلی اس میں احمد خان نے خزانے کے بڑے حصے اور مشہور ہیرے کوہِ نور یعنی ”روشنی کے پہاڑ“ پر قبضہ کر لیا اور تیزی سے قندھار کی طرف روانہ ہوا۔ راستے ہی میں، اکتوبر ۱۷۴۷ء میں، افغان سرداروں نے اسے اپنا قائد منتخب کیا اور احمد شاہ کے نام سے پکارا۔ حاجی جمال — پائندہ خان کا باپ اور دوست محمد خان کا دادا — جو خود بھی امیدوار تھا، احمد شاہ کے حق میں دست بردار ہو گیا۔ احمد شاہ کی تاج پوشی قندھار کی مسجد میں اس طرح عمل میں آئی کہ اس کے سر پر ایک پیمانہ گندم انڈیلا گیا، جو افغانوں کے نزدیک فراوانی اور خوش حالی کی علامت ہے۔ اس طرح احمد شاہ وہ پہلا شخص تھا جس نے سلطنتِ افغانستان کی بنیاد رکھی۔ پہلے حاجی جمال اور بعد ازاں شاہ ولی خان بامیزئی اشرف الوزراء یعنی وزیرِ اعظم مقرر ہوا۔

احمد شاہ ابدالی "درانی" کیونکر بنا، اس کی توجیہ یوں بیان کی جاتی ہے کہ اس کے پیر محمد صابر شاہ نے اسے دُرِّ دوراں یعنی "زمانے کا موتی" کہا تھا؛ مگر سردار محمد حیات خان کی "حیاتِ افغانی" (صفحہ 129) کے بیان کے مطابق احمد شاہ نے دُرِّ دُرّاں یعنی "موتیوں کا موتی" کہلانا پسند کیا، اور اسی نسبت سے ابدالیوں پر درانی کا اطلاق ہونے لگا۔ البتہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام دُرِّ دوراں والی روایت کو رد کر کے دُرِّ دُرّاں ہی کو قبول کرتا ہے۔ احمد شاہ اس وقت تقریباً پچیس برس کا تھا۔

احمد شاہ نے ان صوبوں پر، جو نادر نے شہنشاہ محمد شاہ سے چھینے تھے، درانی سلطنت کا حصہ قرار دے کر دعویٰ کیا؛ ان میں قندھار، غزنی، کابل، ہزارہ، پشاور، ڈیرہ جات، ملتان اور سندھ شامل تھے۔ احمد شاہ نے ہندوستان پر دس حملے کیے؛ پانچواں حملہ وہ تھا جس کے نتیجے میں ۱۷۶۱ء میں پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں کو شکست ہوئی۔ اسی کے تیسرے حملے کے دوران ۱۷۵۲ء میں کشمیر ان حالات میں سلطنت میں شامل کر لیا گیا جو "کشیر" کے گزشتہ باب کے آخر میں بیان ہو چکے ہیں۔

۱۷۵۷ء میں اپنے چوتھے حملے کے دوران احمد شاہ نے تیمور کی شادی عالمگیر ثانی کی بیٹی زہرہ بیگم سے کرائی اور خود دہلی کے شہنشاہ محمد شاہ کی بیٹی حضرت بیگم سے نکاح کیا۔

احمد شاہ کی پُر مشغلہ زندگی کی تفصیلات میں جائے بغیر یہاں اتنا کہنا کافی ہے کہ وہ اکتوبر ۱۷۷۲ء (۱۱۸۶ھ) میں ناک کے ناسور سے پیدا ہونے والی پیچیدگیوں کے باعث وفات پا گیا۔ افغانوں میں اسے نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا؛ وہ اسے احمد شاہ بابا کہتے اور ایک بزرگ کی حیثیت سے اس کا احترام کرتے تھے۔ قندھار میں اس کا مقبرہ "بست" یعنی

جائے امان قرار دیا گیا ہے، جہاں مجرموں تک کو ہاتھ نہیں لگایا جا سکتا۔ ایلفنسٹن کے الفاظ میں احمد شاہ "خود ایک عالمِ دین اور مصنف تھا اور ہمیشہ ولی کہلانے کا آرزومند رہتا تھا"۔

تیمور شاہ

احمد شاہ کا جانشین اس کا بیٹا تیمور شاہ ہوا، جو دسمبر ۱۷۴۶ء میں ایران کے شہر مشہد میں اس وقت پیدا ہوا تھا جب احمد شاہ نادر کی ملازمت میں تھا۔ احمد شاہ کے تین اور بیٹے سلیمان شاہ، سکندر شاہ اور پرویز تھے۔ وزیر شاہ ولی خان اپنے داماد سلیمان کو تخت پر بٹھانا چاہتا تھا، چنانچہ تیمور شاہ کے ایما پر وزیر کو قتل کر دیا گیا اور قاضی فیض اللہ وزیرِ اعظم نامزد ہوا۔ اور سردار پائندہ خان کو، جو حاجی جمال خان کا بیٹا اور بارکزئیوں کا سردار تھا، سرفراز خان کا خطاب دیا گیا؛ وہ شاہ ولی خان کا ساتھ چھوڑ کر تیمور کی طرف آملا تھا۔ پائندہ خان، جیسا کہ بیان ہو چکا، بعد میں امیر دوست محمد خان کے باپ کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ درحقیقت پائندہ خان نے اپنے ہی بھائی رحیم داد خان کی جگہ لی تھی، جس کا تند مزاج لوگوں کو پسند نہ تھا۔ تیمور نے اپنا دارالحکومت قندھار سے کابل منتقل کر دیا کیونکہ وہ نسبتاً پُرامن تھا، مگر سردیاں عموماً پشاور میں گزارتا تھا۔ تیمور نے ہندوستان پر پانچ حملے کیے۔ جب وہ اپنے چوتھے حملے میں، زیادہ تر پنجاب میں سکھوں کے ساتھ، الجھا ہوا تھا تو کشمیر کے حاکم آزاد خان نے اس کے اقتدار کے خلاف بغاوت کر دی۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

تیمور شاہ نے دسمبر ۱۷۹۰ء میں بخارا (ترکستان) کے بادشاہ مراد شاہ کو شکست دی، جو افغان علاقے پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔

سید جمال الدین افغانی کے بیان کے مطابق تیمور کے حرم میں تین سو عورتیں تھیں اور ان میں ایک بھی افغان نہ تھی، اور اس نے ۳۲ بیٹے چھوڑے۔

بالآخر تیمور شاہ ۲۰ مئی ۱۷۹۳ء کو وفات پا گیا اور کابل میں دفن ہوا، جو اسے اپنی پوری سلطنت میں سب سے زیادہ عزیز تھا۔

زمان شاہ

زمان شاہ پائندہ خان بارکزئی کی اس حمایت سے، جو تیمور کی چہیتی ملکہ کے ذریعے حاصل کی گئی تھی، تیمور کا جانشین ہوا۔ اس کی عمر تقریباً تیئیس برس تھی اور اس کی سلطنت کابل، غزنی، قندھار، ہرات، خراسان، بلخ، پشاور، کشمیر، سندھ، ملتان، بہاولپور اور ڈیرہ اسماعیل خان و ڈیرہ غازی خان کے ڈیرہ جات پر مشتمل تھی۔ تاہم زمان شاہ کو مشکلات کا سامنا رہا، جو عموماً اس کے بھائیوں، بھتیجوں اور ایران کی طرف سے پیش آتی تھیں۔ بھائی ترتیب وار یہ تھے: (۱) ہمایوں، (۲) محمود، (۳) زمان، (۴) عباس، (۵) شجاع، (٦) شاہ پور اور (۷) فیروز۔ ہمایوں کا ایک بیٹا احمد تھا؛ محمود کے بیٹے نادر مرزا اور کامران تھے؛ اور زمان کے چار بیٹے تھے، جن میں حیدر، قیصر اور ناصر شامل تھے۔

ایران کے قاجار خاندان کا بانی آغا محمد خان ایک موقع پر بلخ کا مطالبہ کر بیٹھا، مگر اپنے ہی ملک پر روسی حملے کے باعث اسے یہ ارادہ ترک کرنا پڑا۔ زمان شاہ کی ہندوستان میں پیش قدمیاں ہندوستان کے انگریزوں کے لیے تشویش کا باعث تھیں، خصوصاً جب وہ ۱۷۹۷ء میں لاہور میں مقیم تھا۔ ۱۷۹۸ء میں وہ دوبارہ لاہور آیا اور غیر مقبول افغانوں کو نظر انداز کر کے رنجیت سنگھ کو لاہور کا راجا مقرر کیا، اور آغا محمد خان قاجار کے جانشین فتح علی شاہ

قاجار کے خطرے سے نمٹنے کے لیے ہرات لوٹ گیا اور اپنے بھائی شجاع الملک کو ہرات کا حاکم بنایا۔

اپنے پیش روؤں کے برعکس زمان کی پالیسی یہ تھی کہ سرداروں کو اپنے دربار میں تو رکھے مگر امورِ سلطنت میں ان سے مشورہ نہ کرے۔ چنانچہ بارکزئیوں کے سردار، قزلباش یعنی افغانستان میں آباد ایرانی، اور دیگر معززین اس سے بدظن ہو گئے۔ ایلفنسٹن کے مطابق زمان کی غلطیوں کا سرچشمہ یہ تھا کہ اس نے رحمت اللہ سدوزئی کو وفادار خان کے خطاب کے ساتھ منصبِ وزارت کے لیے منتخب کیا (صفحہ 568)۔ اور وفادار نے اپنا اقتدار سرفراز خان کے خلاف اس الزام پر استعمال کیا کہ سرفراز خان زمان کے خلاف سازش کر رہا ہے اور شاہ شجاع کے لیے کام کر رہا ہے۔

۱۷۹۹ء کے اواخر میں وزیرِ اعظم وفادار خان کے گستاخانہ رویے کے باعث کابل میں سرکردہ سرداروں نے ایک سازش تیار کی۔ راز فاش ہو گیا اور سازشی، جن میں بارکزئیوں کا سردار سرفراز خان بھی شامل تھا، قتل کر دیے گئے۔ پائندہ خان کے اکیس بیٹوں میں سب سے بڑا فتح خان بچ نکل کر خراسان پہنچا، جہاں وہ تیمور کے دوسرے بیٹے شہزادہ محمود سے جا ملا۔ محمود نے فتح خان کے مشورے پر زمان شاہ کے خلاف پیش قدمی کی۔

زمان کے اہم حلیف احمد خان نورزئی کو توڑ لیا گیا، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ زمان کو جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ وفادار خان قتل کر دیا گیا۔ زمان نے اپنے ایک پکے حامی عاشق خان شنواری کے قلعے میں پناہ لی، جو جلال آباد سے تقریباً پچیس میل مغرب میں شنواری علاقے میں واقع ہے، مگر عاشق خان نے اس سے غداری کی۔ ایلفنسٹن کا بیان ہے کہ عاشق ہی کے قلعے میں زمان نے کوہِ نور اپنے کمرے کی دیوار میں چھپا دیا تھا، جہاں سے وہ بعد میں شجاع کی تخت

نشینی پر نکالا گیا۔ فتح خان کے بھائی اسد خان نے ایک جراح کے ہمراہ ۱۸۰۱ء میں زمان کی آنکھیں ضائع کرا دیں۔

"تاریخِ جنگِ افغانستان" (History of the War in Afghanistan، لندن، ۱۸۵۷ء، جلد اول، صفحہ 23) کا مصنف جان ولیم کے (John William Kaye) لکھتا ہے: "یوں زمان شاہ کا زوال ہوا — وہ افغان فرماں روا جس سے کبھی سب لرزتے تھے اور جس کے ہندوستان پر متوقع حملے کا خوف برسوں برطانوی ہندوستانی حکومت کے ایوانِ مشاورت پر ایک ہولناک سائے کی طرح چھایا رہا۔ وہ بینائی کے زیاں کے بعد تقریباً نصف صدی زندہ رہا اور لدھیانہ کے ایک نظر انداز وظیفہ خوار کی حیثیت سے، ان گنے چنے لوگوں کے لیے جنہیں یاد تھا کہ کبھی اس کے نام سے کیسی ہیبت پیدا ہوتی تھی، زوال یافتہ عظمت کا ایک عجیب نظارہ پیش کرتا رہا — انسانی حالات کی ناپائیداری کی ایسی مثال جس کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل ہی سے ملتی ہے۔ آخرکار وہ عمر سے بھرپور مگر اعزازات سے تہی دست حالت میں مرا، اور اس کی موت بمشکل کسی اخبار کی خبر یا کسی سرکاری دستاویز کے ایک پیراگراف کے قابل سمجھی گئی۔"

کے (Kaye) کے بیان کے مطابق زمان لدھیانہ آیا، نابینا ہونے کے بعد تقریباً نصف صدی زندہ رہا اور انگریزوں کا ایک نظر انداز وظیفہ خوار بنا رہا۔ لیکن جمال الدین افغانی کے بقول زمان امیرِ بخارا کے پاس گیا، جہاں اس کی خوبصورت بیٹی امیر سے بیاہی گئی؛ ایران کے فتح علی شاہ قاجار نے تہران میں اس کا استقبال کیا، وہاں سے زمان بغداد گیا جس کا والی اس وقت داؤد تھا، اور بالآخر حجاز میں فوت ہوا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ زمان لدھیانہ ہی میں

انگریزوں کے وظیفہ خوار کی حیثیت سے، چار ہزار روپے ماہوار پاتے ہوئے، فوت ہوا اور سرہند میں ایک بڑے گنبد تلے اپنی بیوی کے پہلو میں دفن ہے۔

زمان کے نابینا کیے جانے کے وقت شجاع کی عمر بیس برس سے متجاوز تھی۔

شجاع الملک

۱۸۰۱ء میں زمان شاہ کے زوال پر شجاع الملک نے، جو پشاور میں اپنے عہدے پر متعین تھا، خود کو افغانستان کا بادشاہ قرار دے کر ستمبر ۱۸۰۱ء میں کابل پر چڑھائی کی۔ فتح خان نے شجاع کو شکست دی۔ زمان اور شجاع کا بڑا بھائی محمود سات برس کے انتظار، کشمکش اور ناکامیوں کے بعد ۱۸۰۱ء میں کابل کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ اس نے اپنے سرداروں کے ساتھ فیاضانہ برتاؤ کیا۔ وزیر فتح خان کو، جسے ہم پائندہ خان (سرفراز خان) کے سب سے بڑے بیٹے کی حیثیت سے پہلے ہی جان چکے ہیں، "شاہ دوست" کا خطاب دیا گیا۔ وہی افغانستان کا وارِک (Warwick) یعنی بادشاہ گر ہے۔ شاہ ولی خان بامیزئی کے بیٹے شیر محمد خان کو مختار الدولہ کا نام دیا گیا۔

سردار عبداللہ خان ہلوکوزئی — جسے کشمیری مؤرخین الکوزئی اور بعض علی کوزئی لکھتے ہیں اور جو یار محمد خان کا والد تھا — شاہ زمان کے حکم پر کابل کے بالا حصار میں محبوس تھا۔ اسے اس قلعے سے رہا کر کے کشمیر کا حاکم مقرر کیا گیا۔ محمود کے اپنے بیٹے کامران مرزا کو شاہ شجاع سے لڑنے کے لیے روانہ کیا گیا، جو درۂ خیبر کے دشوار گزار پہاڑوں میں پناہ گزیں ہو گیا۔ محمود کے دونوں حریف — شاہ شجاع اور شہزادہ قیصر، زمان کا بیٹا، جو اپنے والد کے عہد میں ہرات پر قابض تھا مگر اب اسے کھو چکا تھا — راستے سے ہٹ چکے تھے، چنانچہ محمود امن و سکون

سے حکمرانی کرنے لگا۔ البتہ غلزئیوں اور درانیوں کے مابین دو بار فسادات ہوئے جو فرو کر دیے گئے۔

محمود کی تخت نشینی کے ڈھائی برس بعد کابل میں شیعہ سنی یعنی قزلباش اور افغان تصادمات نے ملک میں اضطراب برپا کر دیا۔ محمود تن آسان واقع ہوا تھا اور فتح خان شجاع کا سراغ لگانے کی کوشش میں دارالحکومت سے غیر حاضر تھا۔ محمود کی جانب سے اہلِ سنت کے ساتھ بے اعتنائی نے انہیں مایوس کر دیا۔ فتح خان کابل لوٹا تو اس نے حالات قابو سے باہر پائے۔ شجاع ان دنوں علاقۂ آفریدی میں شاہی جواہرات فروخت کر کے اپنی اور اپنے چند رفیقوں کی گزر اوقات کر رہا تھا کہ اسے کابل آنے کے لیے تعجیلی پیغام بھیجا گیا۔ اس کی آمد تک انقلاب مکمل ہو چکا تھا: محمود کابل کے بالا حصار میں قید کر دیا گیا اور شجاع ۱۳ جولائی ۱۸۰۲ء کو اسی شہر میں تخت نشین ہوا۔ فتح خان فرار ہو گیا۔ عاشق خان شنواری، جس نے زمان سے غداری کی تھی، قتل کر دیا گیا اور یوں اپنے کیفرِ کردار کو پہنچا۔

شاہ شجاع اپنی خودنوشت سوانح میں — جو اس نے ۱۸۲۷–۱۸۲۶ء میں لدھیانہ میں تحریر کی، جس کا ترجمہ توپ خانے کے مرحوم لیفٹیننٹ بینٹ (Lieutenant Bennet) نے کیا اور جو کلکتہ منتھلی جرنل (The Calcutta Monthly Journal)، ۱۸۳۹ء میں شائع ہوئی — لکھتا ہے: ”شاہ محمود نے ۔۔۔ قرآن پر یہ حلف اٹھانے کے بعد کہ وہ دوبارہ غداری کا مرتکب نہ ہو گا، اپنے چند معتمد خواص کو شاہی عفو کی درخواست کے ساتھ بھیجا، جو ہم نے قبول کی اور اس کے مرتبے کے شایانِ شان پورے احترام کے ساتھ اسے بیرونی قلعے سے اندرونی قلعے میں منتقل کرا دیا۔“ فتح خان نے بھی معافی چاہی اور اسے بھی عفو مل گیا۔ اس کے بعد شجاع کشمیر کو مرعوب کرنے کے لیے نکلا، کیونکہ عبداللہ خان ہلوکوزئی خودمختاری

اختیار کرتا جا رہا تھا۔ شجاع ابھی اسی مہم میں مصروف تھا کہ فتح خان نے شہزادہ قیصر کو اس کے چچا کے تخت کے دعوے پر آمادہ کر کے میدان میں اتار دیا۔ شاہ شجاع فطری طور پر اس نئے خطرے کے مقابلے کے لیے عجلت سے واپس لوٹا اور اسے فرو کر دیا۔ قیصر کے والد زمان اور مختار الدولہ کی سفارش پر — جو محمود کا ساتھ چھوڑ کر شاہ شجاع سے آملا تھا — نوجوان شہزادے کو معاف کر دیا گیا۔ انہی ایام میں ایلفنسٹن (Elphinstone) کا سفارتی مشن پشاور پہنچا اور ۲۵ فروری سے ۱۴ جون ۱۸۰۹ء تک وہاں مقیم رہا۔

اگست ۱۸۰۹ء میں نملہ کے مقام پر محمود کے ہاتھوں پسپائی کے بعد جب شاہ شجاع نے کابل کے حالات ناموافق پائے تو اس نے اپنا حرم اور اپنا نابینا بھائی زمان شاہ راولپنڈی روانہ کر دیے۔ اس نے "اپنی شکستہ قسمت کو سنوارنے کی نئی کوششیں" کیں، مگر اسے پے در پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔

اس نے پشاور پر چڑھائی کی اور وہاں کے حاکم محمد عظیم خان بارکزئی سے بالا حصار یعنی شاہی قلعہ چھین لیا، مگر ۱۸۱۲ء میں جہاں داد خان اسے پہلے پشاور کے قلعے میں لے گیا اور بعد ازاں صوبہ دارِ کشمیر — جہاں داد کے بھائی اور مختار الدولہ کے بیٹے عطا محمد خان بامزئی — کی رشوت ستانی کے باعث وہ وادیٔ کشمیر پہنچا دیا گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شجاع تقریباً ایک برس کشمیر میں مقیم رہا۔ شجاع لکھتا ہے: "جب شاہ محمود نے ہمارے ساتھ روا رکھے گئے سلوک کا حال سنا تو اس کے دل میں برادرانہ محبت کے مخفی جذبات بیدار ہو گئے اور اس نے فوراً بارکزئی علاقے میں ایک فوج بھیجی۔ عطا محمد خان کے پورے قبیلے کو تاراج کرنے کے بعد وہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو اسیر کر لے گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کارروائی سے مطلوبہ نتیجہ، یعنی ہماری قید سے رہائی، حاصل نہ ہوا تو اس نے فتح خان کی سرکردگی میں

ایک فوج کشمیر روانہ کی۔" عطا محمد اس سے نبرد آزما ہونے کے لیے آگے بڑھا، مگر اس کے اپنے سپاہی وزیر سے جا ملے۔ ۱۸۱۳ء کے اوائل میں جب فتح خان کی یلغار کا خطرہ سر پر آ پہنچا تو عطا محمد نے اپنے ہی قیدی سے مدد کی التجا کی۔ شاہ شجاع کہتا ہے: "یہ دیکھ کر کہ ہماری اعانت کے بغیر اس کی خلاصی ممکن نہیں، وہ ننگے سر، ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے میں ننگی تلوار لیے، گلے میں رسی ڈالے ہماری قید گاہ میں حاضر ہوا اور کتابِ مقدس کے واسطے سے ہماری بخشش کا طلب گار ہوا۔" اسے معاف کر دیا گیا۔

فتح خان نے رنجیت سنگھ سے مدد طلب کر رکھی تھی، چنانچہ سکھ مہم کا سالار موہکم چند کشمیر پر بڑھا، جب کہ فتح خان دوسری سمت سے کشمیر پر حملہ آور ہو رہا تھا۔ باغی ناظم نے اطاعت قبول کر لی۔ شجاع کہتا ہے: "موہکم چند نے رنجیت سنگھ کی جانب سے ہمیں اطلاع دی کہ اس کا آقا خواہش مند ہے کہ ہم رہائی پاتے ہی لاہور چلیں اور اس شہر میں اپنے حرم کی اقامت گاہ میں قیام کریں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ ہمارے جانے سے اس کے آقا کی ناموری میں اضافہ ہو گا۔ فتح خان کی درخواست کے مطابق ہم نے یہ بات مان لی اور موہکم چند اور دیگر سنگھوں کے ہمراہ لاہور کی جانب کوچ کیا، جب کہ فتح خان کابل میں شاہ محمود کے پاس لوٹ گیا۔"

جلد ہی صاف عیاں ہو گیا کہ رنجیت سنگھ کی نظر کوہِ نور ہیرے پر ہے۔ لاہور پہنچنے کے دوسرے ہی روز رنجیت کے ایک ایلچی نے اپنے آقا کے نام پر یہ جوہرِ نایاب طلب کیا۔ جلاوطن بادشاہ نے اس مطالبے پر غور کے لیے مہلت چاہی۔

شاہ شجاع لکھتا ہے: "پھر ہم ضروریاتِ زندگی کی تنگی سے دوچار ہوئے اور ہماری قیام گاہ پر پہرے بٹھا دیے گئے۔ ایک مہینہ اسی حال میں گزر گیا۔ پھر رنجیت سنگھ کے معتمد ملازم

ہمارے پاس حاضر ہوئے اور دریافت کیا کہ آیا ہمیں نقد زر درکار ہے اور کیا ہم ہیرے کے بارے میں کسی معاہدے اور عہدنامے پر آمادہ ہوں گے۔ ہم نے اثبات میں جواب دیا۔ اگلے روز رام سنگھ چالیس پچاس ہزار روپے لایا اور پھر کوہِ نور کا تقاضا کیا، جس کے متعلق ہم نے وعدہ کیا کہ کوئی معاہدہ طے پا جانے پر ہم اسے مہیا کر دیں گے۔ اس کے دو دن بعد رنجیت سنگھ بذاتِ خود آیا۔ دوستانہ یقین دہانیوں کے بعد اس نے ایک کاغذ پر کسم کے رنگ سے مہر ثبت کی اور بابا نانک کے گرنتھ اور اپنی تلوار کی قسم کھا کر حسبِ ذیل عہد و پیمان تحریر کیا: یہ کہ اس نے کوٹ کمالیہ، جھنگ اور کلانور کے علاقے ہمیں اور ہمارے ورثا کو ہمیشہ کے لیے دے دیے؛ نیز یہ کہ ہمارے تخت کی بازیابی کے لیے وہ فوج اور خزانے سے مدد دے گا۔ ہم نے بھی اقرار کیا کہ اگر ہم کبھی تخت نشین ہوئے تو رنجیت سنگھ کو ہمیشہ اپنا حلیف سمجھیں گے۔ پھر اس نے خود یہ تجویز پیش کی کہ ہم آپس میں دستار بدل لیں — جو سکھوں کے نزدیک دائمی دوستی کا پیمان ہے — اور تب ہم نے اسے کوہِ نور دے دیا۔"

جان ولیم کے (John William Kaye) کے بقول (جلد اول، صفحات 110-111) رنجیت سنگھ نے اس بے بس بادشاہ سے ہر وہ چیز چھین لی جو لینے کے قابل تھی، اور شجاع کہتا ہے کہ "اس سب کے بعد بھی اس نے اپنا ایک وعدہ بھی پورا نہ کیا۔" فی الواقع اس بدقسمت شاہ پر توہین آمیز سلوک کے پہاڑ توڑے گئے؛ اس پر جاسوس مقرر کیے گئے اور اس کی قیام گاہ کے گرد پہرے دار متعین کر دیے گئے۔

شجاع لکھتا ہے: "ہمیں برطانوی حکومت کی پیش کردہ دوستی کا خیال آیا اور لدھیانہ میں پناہ کی امید بندھی ۔۔۔ حرم کی خواتین اپنے خدام سمیت، سب مقامی لباس پہنے، بہ حفاظت لدھیانہ کی چھاؤنی پہنچ گئیں۔" مگر خود اس کی اپنی رہائی کی صورت ابھی نکلنی باقی تھی۔ شاہ

شجاع مزید لکھتا ہے: ”ہماری ذات پر پہرے داروں کے سات حلقے متعین کر دیے گئے اور مسلح افراد جلتی مشعلیں لیے ہمارے بستر کی نگرانی کرتے تھے ۔۔۔ کئی مہینے اسی طرح گزر گئے۔“

بالآخر شجاع نے رنجیت کی ساری تدبیریں ناکام بنا دیں۔ فقیر کے بھیس میں وہ دو ساتھیوں کے ہمراہ گلی میں نکلا اور شہر پناہ کے نیچے سے گزرنے والے بڑے گندے نالے کے راستے باہر نکل گیا۔ لاہور سے نکل کر لدھیانہ کا رخ کرنے کے بجائے شجاع جموں کی جانب بڑھا؛ رنجیت سنگھ سے ناراض کچھ سکھ اس سے آملے اور وہ کشتواڑ جا پہنچا، جہاں کے راجا نے اس کی مہمان نوازی کی۔ شجاع صاف گوئی سے کہتا ہے: ”بے کار زندگی سے اکتا کر ہم نے کشمیر پر حملے کے منصوبے بنائے۔“ کشتواڑ کے راجا نے آدمیوں اور روپے سے مدد کی پیش کش کی۔ مگر، بقول کے، شاہ شجاع کے نوشتۂ تقدیر میں یہ لکھا ہی نہ تھا کہ اس کی کوئی مہم ناکامی کے سوا کسی اور نتیجے پر منتج ہو۔ کشمیر پر اس کا حملہ شکست اور تباہی پر ختم ہوا۔ وہ خود کہتا ہے: ”ہم عظیم خان کی چھاؤنی سے صرف تین منزل کے فاصلے پر تھے اور کشمیر کا خوش منظر شہر (یعنی سری نگر) پوری طرح نگاہوں کے سامنے تھا کہ برف دوبارہ گرنے لگی اور طوفان دو دن تک بلا توقف پوری شدت سے جاری رہا۔ ہمارے ہندوستانی سپاہی ایسی سردی سے ٹھٹھر کر رہ گئے جس کا ان کے گرم خطوں میں کبھی احساس تک نہیں ہوتا؛ ہمارے عقب کا راستہ برف سے بند ہو چکا تھا اور رسد ابھی بہت دور تھی۔ تین دن تک ہماری فوج فاقوں سے قریب المرگ رہی۔ بہت سے ہندوستانی مر گئے۔ ہم نہ آگے بڑھ سکتے تھے اور نہ پسپائی خطرے سے خالی تھی۔ پسپائی کا فیصلہ کرنے سے پہلے بہتوں کے ہاتھ پاؤں برف سے گل کر ضائع ہو چکے تھے۔“

کشتواڑ کے راجا کے پرزور اصرار پر شجاع نو ماہ تک اپنے میزبان کی مہمان نواز چھت تلے مقیم رہا۔ پھر وہ کُلو سے ہوتا ہوا لدھیانہ کے سفر کے لیے دریائے ستلج کے پار اترا اور ستمبر ۱۸۱۶ء میں اپنے اہلِ خانہ سے جا ملا۔ اس نے دو برس سکون سے بسر کیے۔ ادھر درانی سلطنت اندرونی خلفشار سے پارہ پارہ ہو رہی تھی؛ کابل پر بارکزئی سرداروں کا غلبہ تھا اور شاہ محمود اور دیگر شہزادے ان کے اقتدار کے لیے خطرہ بنے ہوئے تھے۔ اسی اثنا میں عظیم خان نے شاہ شجاع کو دعوت دی کہ وہ کابل کے تخت پر اپنے دعوے کی تجدید کرے۔ شجاع، جو آرام سے اکتا چکا تھا اور، بقول کے، ماضی کے تجربات سے سبق نہ لے سکا تھا، اس نئی مہم میں کود پڑا — اور نتیجہ صرف یہ نکلا کہ ناکامیوں کی اس طویل فہرست میں ایک اور ناکامی کا اضافہ ہو گیا، جس فہرست کو مکمل ہونے میں ابھی تقریباً ایک چوتھائی صدی اور درکار تھی۔ جن دنوں شاہ شجاع لدھیانہ میں تھا، فتح خان مغربی افغانستان کی سمت سے آنے والی قاچاری یلغار کے مقابلے کے لیے نکلا۔ اسی مہم کے دوران فتح خان کے چھوٹے بھائی دوست محمد خان کی اس نازیبا حرکت نے — کہ اس نے شہزادہ کامران کے محل میں شہزادے کی بہن تقیہ بیگم کے بدن سے جواہرات جڑا کمربند نوچ لیا — کامران سے اس بے حرمتی کے انتقام کی قسم اٹھوا دی۔

دوست محمد جان بچانے کے لیے کشمیر میں اپنے بھائی عظیم خان کے پاس بھاگ گیا اور کامران نے اپنے غیظ کا نشانہ فتح خان کو بنایا: پہلے اسے اندھا کیا اور پھر اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے۔ شاہ شجاع اس سفاکی کا کوئی ذکر نہیں کرتا؛ وہ صرف اتنا کہتا ہے کہ فتح خان کے حوصلے بڑھ گئے تھے اور وہ زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا کہ شہزادہ کامران نے وزیر کی زندگی کا خاتمہ کر دیا۔ دوست محمد نے اپنے بھائی کے قتل کا انتقام لینے کا عزم کر لیا۔ عظیم خان نہ اس منصوبے سے متفق ہوا اور نہ اس نے اس کی انجام دہی کا بیڑا اٹھایا، البتہ

مہم کے اخراجات کے لیے تین چار لاکھ روپے دے دیے۔ اس وقت کابل کا برائے نام حکمران کامران کا نوجوان اور خوب رو بیٹا شہزادہ جہانگیر تھا، مگر عملاً زمامِ کار سابق والیٔ کشمیر عطا محمد خان بامزئی کے ہاتھ میں تھی، جس نے کامران کو فتح خان کے قتل پر اکسایا تھا۔ دوست محمد خان نے کابل پر پیش قدمی کی، عطا محمد خان بامزئی کی موت کا سامان کیا اور خود کابل کا مالک بن بیٹھا، اگرچہ اس نے تیمور کے بیٹوں میں سے ایک، شہزادہ سلطان علی، کو برائے نام تخت پر بٹھا دیا۔ اس پر محمود اور کامران ہرات سے اتر آئے اور عظیم خان کشمیر سے آپہنچا۔ ۱۸۱۸ء میں عظیم خان نے شاہ شجاع کو پھر لدھیانہ سے یہ کہہ کر بلوایا کہ فتح خان کے اعزہ نے اسے تخت پر بحال کرنے کی قسم کھائی ہے اور یہ کہ عظیم خان خود اس کے استقبال کے لیے پشاور تک بڑھے گا اور کشمیر کی تمام فوج اور خزانے کے ساتھ اس کی مدد کرے گا۔ ایک چال کے ذریعے محمود اور کامران کو فرار پر مجبور کر دیا گیا، مگر شجاع پھر بھی تاج سے محروم ہی رہا۔ دوست محمد خان نے کابل اور غزنی اپنے پاس رکھے اور باقی صوبے اپنے بھائیوں میں بانٹ دیے۔

اس مرحلے پر ہم کابل اور کشمیر کے اس ربط و تعلق کا سلسلہ ۱۸۱۹ء پر ختم کرتے ہیں، جب سکھوں نے کشمیر فتح کر لیا۔

کشمیر میں افغانوں کا ناخوشگوار آغاز

افغانوں نے کشمیر میں اپنے عہد کا آغاز برے انداز سے کیا۔ افغان حاکم عبداللہ خان اسحاق آقاسی — شاہ غاصی ایک منگول منصب ہے، بمعنی داروغۂ دربار، جو غالباً چنگیز خان کی اولاد کے توسط سے وسطِ ایشیا کے درباروں میں رائج ہوا — نے چھ ماہ کشمیر پر حکومت کی، مگر اس

کی زبردستی وصولیوں سے تنگ آکر کم وبیش اسّی بڑے تاجر ہندوستان میں اپنے آبائی شہروں کو لوٹ گئے۔ تجارت پر سخت اثر پڑا اور اونچے طبقوں کے لوگ مصیبت میں مبتلا ہوئے۔ کشمیر سے روانگی سے قبل عبداللہ خان نے سکھ جیون مل کو منتظم، اعظم خان کو کشمیر میں افغان افواج کا بخشی، اور خواجہ عبداللہ عرف خواجہ کیچک (کوچک کی بگڑی ہوئی صورت) کو منتظم کا نائب مقرر کیا۔ اس نے خواجہ ابوالحسن باندے کو سکھ جیون کا مشیر بھی بنا دیا۔ کابل واپسی پر عبداللہ خان نے ایک کروڑ روپے اپنے آقا کی نذر کیے، جو اس نے کشمیر کے نڈھال عوام سے نچوڑے تھے۔ وہ سابق مغل نائب ابوالقاسم خان صافی اور نواب ابوالبرکات خان فیروز جنگ صوفی کے فرزند میر فیروز الدین کو بھی اپنے ہمراہ کابل لے گیا، جن پر احمد شاہ درانی نے خاصی عنایات کیں۔

عبداللہ خان اسحاق آقاسی کی کشمیر سے روانگی کے بعد ملک کا انتظام سکھ جیون نے بحیثیت ناظم یعنی منتظم سنبھالا اور خواجہ ابوالحسن باندے ناظم کے مشیرِ اعلیٰ کے طور پر کام کرتا رہا۔ افسوس کہ افغان عہدِ حکومت میں کل چودہ حاکموں میں سے کئی نے کابل سے اپنا رشتہ منقطع کر کے ملک کے خودمختار فرمانروا بننے کی کوشش کی، کیونکہ افغان حکمران ایرانی یا ہندوستانی مہمات میں یا تختِ افغانستان کے لیے باہمی کشمکش میں الجھے رہتے تھے۔

ان ناظموں میں سے بعض نے کچھ مدت خودمختاری کے مزے لوٹے، مگر بالآخر انہیں اطاعت پر مجبور کر دیا گیا۔ سب سے پہلے سکھ جیون نے ایک کشمیری رئیس ابوالحسن باندے کی مدد سے خودمختاری کا اعلان کیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا سبب احمد شاہ درانی کا اپنی مہمات کے لیے کیا گیا بھاری مالی مطالبہ تھا، جس کے متعلق سکھ جیون کا خیال تھا کہ وہ پورا

نہیں کیا جا سکتا، کیونکہ عبداللہ خان پہلے ہی وادی سے ایک کروڑ روپے جیسی خطیر رقم سمیٹ کر لے جا چکا تھا۔

خواجہ کیجک، ملک حسن خان ایرانی، اعظم خان اور مرزا خان نے اس کی مخالفت کی، مگر بارہ مولا کے مقام پر سکھ جیون کے ہاتھوں شکست کھائی، جس نے دہلی میں عالمگیر ثانی سے رابطہ استوار کر لیا تھا۔ اس کے بعد سکھ جیون نے عبداللہ خان اسحاق آقاسی کی قیادت میں ہونے والا حملہ بھی پسپا کر دیا۔ سکھ جیون کو خودمختاری کے اعلان کی جرأت اس بنا پر ہوئی کہ احمد شاہ درانی پنجاب کی مہمات اور ۱۷۶۱–۱۷۵۹ء میں لڑی جانے والی پانی پت کی تیسری جنگ میں مرہٹوں کی سرکوبی میں الجھا ہوا تھا۔

ایک شدید قحط نے کچھ عرصے سکھ جیون کی توجہ اپنی جانب مبذول رکھی۔ ابوالحسن باندے نے قحط زدہ عوام کی مصیبتیں کم کرنے میں بڑی اہلیت کا ثبوت دیا۔ اس نے تخمی غلے کے قرضے جاری کر کے بہت سوں کو بھوک سے مرنے سے بچا لیا۔ یہ قرضے پوری طرح ۱۲۵۰ھ (۱۸۳۴ء) میں جا کر وصول ہو سکے۔

پنجاب کو ابتری کے عالم میں پا کر سکھ جیون مل نے سیالکوٹ، بھمبر اور اکھنور کی تسخیر کی کوشش کی، مگر حاکمِ سیالکوٹ یار خان کے ہاتھوں اسے سخت شکست اٹھانی پڑی، جس کا بڑا سبب جموں کے راجا رنجیت دیو کی رقابت تھی۔

سکھ جیون کا ایک معزز شخص میر مقیم کی ریشہ دوانیوں کے باعث ابوالحسن بانڈے سے جھگڑا ہو گیا؛ اس نے ابوالحسن کو پونچھ کی طرف بھگا دیا، اس کے عزیزوں سے انتقام لیا اور خود میر مقیم کو اس کی جگہ مقرر کر دیا۔ لیکن سکھ جیون کو بھی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھ جیون مل کا ایک حریف راجہ رنجیت دیو موجود تھا، جسے درانی وزیرِ اعظم

شاہ ولی خان نے آمادہ کیا کہ وہ آکر کشمیر کی بازیابی کے لیے ایک مہم کی رہنمائی کرے۔ تقریباً تین ہزار افغان سپاہ، جس کے ساتھ رنجیت دیو کا ایک دستہ بھی شامل کر دیا گیا تھا، نورالدین خان بامزئی کی کمان میں دی گئی۔ یہ چھوٹی مہم، جو جون میں روانہ ہوئی، ناکام رہی، کیونکہ کشمیر کی طرف جانے والے تمام درے سختی سے محفوظ تھے اور سیلاب زدہ دریاؤں اور چڑھے ہوئے ندی نالوں کو عبور کرنا دشوار ثابت ہوا۔ دوسری مہم، جو اکتوبر ۱۷۶۲ء میں زیادہ بڑے پیمانے پر منظم کی گئی، مکمل طور پر کامیاب رہی۔ درانی فوج توشہ میدان کے راستے کشمیر میں داخل ہوئی۔ سکھ جیون مل پچاس ہزار سپاہ لے کر حملہ آوروں کے مقابلے پر آیا، لیکن عین معرکے کے وقت اس کا سپہ سالار بخت مل اس کا ساتھ چھوڑ گیا۔

چنانچہ سکھ جیون مل، جو آٹھ برس چار ماہ حکمرانی کر چکا تھا، بہ آسانی شکست کھا کر گرفتار ہو گیا۔ اسے فوراً نشتر سے اندھا کر دیا گیا اور لاہور بھیج دیا گیا، جہاں احمد شاہ درانی اُن دنوں قیام پذیر تھا۔ سکھ جیون کو زنجیروں میں جکڑ کر احمد شاہ کے سامنے پیش کیا گیا، جس نے اسے پامال کرا کے ہلاک کرا دیا۔ اس سزا کی شدت اس وقت قابلِ فہم ہو جاتی ہے جب ہم یاد کریں کہ سکھ جیون نے بار بار کی تنبیہوں کے باوجود افغانستان کے خلاف بغاوت کی تھی اور تقریباً نو برس تک اپنے آقا سے سرکشی جاری رکھی تھی۔ بعد ازاں اس نے عالمگیر ثانی کے ساتھ ایک سازش میں شرکت کی تھی تاکہ کشمیر میں برائے نام مغل اقتدار بحال کیا جائے اور اپنا سکہ ڈھالنے کی اجازت حاصل کی جائے، اور اس نے منصب داروں کی تمام جاگیریں ضبط کر لی تھیں۔ عالمگیر نے اسے راجہ کا خطاب عطا کیا تھا۔

راجہ سکھ جیون مل ذات کا کھتری تھا، جو کابل میں پیدا ہوا اور وہیں تعلیم پائی۔ اس کا خاندان اپنا سلسلۂ نسب بھیرہ، خوشاب (پنجاب) سے جوڑتا تھا۔ اس نے احمد شاہ درانی کے

وزیر شاہ ولی خان کی ملازمت اختیار کی اور ترقی کرتے کرتے والیٔ کشمیر کے منصب تک پہنچا؛ اس سے قبل ایک مرتبہ اسے پنجاب کے صوبہ دار معین الملک سے خراج وصول کرنے پر بھی مامور کیا گیا تھا۔

اپنے عہدِ حکومت کے آغاز میں سکھ جیون مل ایک اچھا حکمران معلوم ہوتا تھا۔ درحقیقت اس نے مسلمانوں کے ساتھ بڑی مروت کا برتاؤ کیا۔ خزانۂ عامرہ کا مصنف غلام علی آزاد بلگرامی، جو سکھ جیون کا ہم عصر تھا، اس کے بارے میں لکھتا ہے:

مشار الیہ جوان خوشرو، شائستۂ قربِ اسلام - جمیع مزاراتِ بزرگانِ کشمیر را ترمیم نمود - و ھر روز بعد فراغ از دیوان دو صد کس مسلمین را بروش خود الوان اطعمہ میخوراند - و در ھر ماہ دوازدھم و یازدھم طعام نیاز ساختہ بہ مردم تقسیم می نمود - و ھر کس را چہ درویش و چہ غیر، در خور حال مراعاتی می کرد - و در ھر ھفتہ مشاعرہ مقرر کردہ مجلس شیلانی میکشید - فرمود کہ تاریخ کشمیر از ابتدای آبادی تا زمان او تحریر کنند - امروز در موزونان کشمیر نظیر ندارد -

"وہ ایک خوبرو نوجوان تھا، عمدہ اوصاف کا مالک اور اسلام کی طرف مائل۔ دربار کے امور سے فراغت کے بعد وہ روزانہ دو سو مسلمانوں کو طرح طرح کے کھانے کھلاتا تھا۔ ہر مہینے کی گیارہویں اور بارہویں تاریخ کو وہ نیاز کا کھانا پکوا کر لوگوں میں تقسیم کراتا۔ دربار میں آنے والے ہر شخص پر، خواہ وہ محتاج ہو یا نہ ہو، عنایات کرتا۔ ہر ہفتے میں ایک بار وہ مشاعرہ منعقد کرتا، جس میں تمام نامور شعرا شریک ہوتے، اور اس کے اختتام پر ضیافت دیتا۔ اس نے پانچ (بعض کے نزدیک سات) بہترین اہلِ علم کو اس کام پر مامور کیا کہ کشمیر کی ابتدائے آبادی سے اس کے اپنے زمانے تک کی تاریخ مکمل کریں۔ ہر مصنف کو دس دس معاون

فراہم کیے گئے۔ ان مؤرخوں کا سربراہ محمد توفیق تھا، جس کا تخلص توفیق تھا اور جو کشمیری میں لالہ جی کے نام سے معروف تھا۔ وہ آج کشمیر میں بے نظیر شاعر ہے۔"

راجہ سکھ جیون مل علم و ادب اور تہذیب سے محبت اور ذوقِ لطیف میں ایک اور عظیم کھتری، عزت مآب آنجہانی مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر، مدار المہامِ حیدرآباد دکن، کا پیش رو معلوم ہوتا ہے۔ ابوالحسن بانڈے سے جھگڑے کے بعد سکھ جیون نے میر مقیم کی جگہ بھی پنڈت مہانند در کو دے دی، جس کی اکساہٹ پر وہ ظالم بن گیا اور اس نے مسلمانوں کو خاصی سختیوں کا نشانہ بنایا، حتیٰ کہ اذان تک کی ممانعت کر دی اور ان پر طرح طرح کی دوسری پابندیاں عائد کیں۔ اپنی المناک موت سے پہلے، جب اسے اندھا کیا گیا، تو اس نے درد و الم سے لبریزیہ اشعار کہے:

سر بسر احوالِ جہان نادیدہ بہ عاقبت چشم از وضعِ جہان پوشیدہ بہ ھرکہ چون من داشت جا بر فرقِ گل چون گدایان در بدر گردیدہ بہ زین چمن عبرت چیدہ ام زین سیہ مار جہان ترسیدہ بہ گر تہی شیرش دھد زھرت عوض تا دید آخر نا دیدنی را

ضمناً یہ امر دلچسپ ہے کہ احمد شاہ درانی نے ایک موقع پر کشمیر کی حکومت مغلانی بیگم کو پیش کی تھی، جو ۱۷۵۴ء تا ۱۷۵۶ء لاہور کی حکمران رہی تھی۔ راجہ سکھ جیون نے اسے سالانہ خراج دینے کا وعدہ کیا۔ اسی وعدے نے اسے کشمیر کے ان درباریوں کی پیشکش قبول کرنے سے باز رکھا جو سکھ جیون کے خلاف سازش کر رہے تھے۔ لیکن وعدہ کیا ہوا خراج کسی طرف سے بھی مغلانی بیگم تک کبھی نہ پہنچا۔

کشمیر پر احمد شاہ درانی کے اقتدارِ اعلیٰ کی از سرِ نو بحالی ایک شعر میں بیان ہوئی ہے۔ راجہ سکھ جیون کی جانشینی میں نورالدین خان بامزئی والیٔ کشمیر مقرر ہوا۔ اس نے کچھ عرصہ کشمیر

پر حکومت کی (اس کے پہلے دورِ حکومت کی مدت کے بارے میں اختلافِ رائے ہے: لیفٹیننٹ نیوال (Lt. Newall) اسے آٹھ برس بتاتا ہے، تاریخِ حسن اسے صرف تین ماہ تک محدود کرتی ہے، جبکہ تاریخِ خلیل اور دیوان کرپا رام کی گلزارِ کشمیر دو برس لکھتی ہیں) اور اس تھکے ہارے ملک کی بحالی کی کوشش کی۔ اس کے عہد میں لوگ مجموعی طور پر خوش حال اور آسودہ رہے۔ اس کے جانشین بلند خان نے ناروا محاصل معاف کر دیے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے ساتھ یکساں سلوک روا رکھا۔ ۱۷۶۵ء میں نورالدین خان بامزئی دوبارہ والی مقرر ہوا۔ میر مقیم کانٹھ اور پنڈت کیلاش در اس کے مشیر تھے، اور مؤخر الذکر ملک کی مالگزاری کا ذمہ دار تھا۔ میر مقیم نے نورالدین کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ پنڈت کیلاش در سے مالگزاری کی روزانہ ادائیگی کا مطالبہ کرے، مگر کیلاش در نے اپنے ایک آلۂ کار حکیم میر کے ذریعے اپنے حریف کی موت کا سامان کر دیا۔ جب یہ راز فاش ہوا تو نورالدین نے مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ غالباً اسی چشم پوشی کے باعث اسے اپنی معزولی کے احکام کا پیشگی اندیشہ ہو گیا۔ اپنے بھتیجے جان محمد خان کو اپنی جگہ چھوڑ کر نورالدین اپنا مقدمہ پیش کرنے کابل روانہ ہو گیا۔

اسی اثنا میں لعل خان خٹک نے جان محمد خان کو ہٹا دیا اور دہشت گردی اور ظلم و ستم کا سلسلہ شروع کر دیا۔ نورالدین کی جگہ پُر کرنے کے لیے کابل سے خرم خان روانہ کیا گیا، لیکن اس کے داخلے کی مزاحمت لعل خان خٹک نے کی، جو شکست کھا کر سری نگر کے مغرب میں پٹن کے قریب واقع بیرو کے قلعے میں جا بیٹھا۔ میر مقیم کانٹھ کا بیٹا فقیر اللہ، جو اپنے باپ کے قتل کا انتقام لینے کے موقع کی تلاش میں تھا، اب سلطان محمود بمبا کی فوج کے ساتھ سوپور میں نمودار ہوا۔ لعل خان خٹک نے اس کا مقابلہ کیا، لیکن دوبارہ شکست کھا کر ایک آنکھ سے محروم ہو کر اپنے قلعے کو لوٹ گیا۔ چنانچہ فقیر اللہ ۱۷۶۷ء میں اچانک خود کو والی کی مسند

پر پا کر حیران رہ گیا۔ بمبا قبیلے میں سے اس کے حلیفوں نے عوام پر ظلم ڈھائے۔ گیارہ ماہ تک کشمیر کسی اقتدار سے آشنا نہ رہا۔ درحقیقت یہ عجیب بات ہے کہ احمد شاہ درانی نے ایسی صورتِ حال کیوں کر گوارا کی۔ بالآخر ۱۷۶۹ء میں نورالدین تیسری مرتبہ والی مقرر ہوا، کیونکہ ملک میں امن و امان قائم کرنے کے قابل کوئی اور شخص نہ سمجھا گیا۔ فقیر اللہ تحصیل پلوامہ کے گاؤں گوری پور (یا گانڈی پور، آبادی ۲۱۲) کے قریب نورالدین کے خلاف ایک ناکام معرکے کے بعد مظفرآباد کے حکمران کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ فقیر اللہ مزید مزاحمت کا ارادہ رکھتا تھا کہ کثرتِ مے نوشی کے باعث ایک شدید مرض میں مبتلا ہو کر شادی پور میں چل بسا۔ نورالدین نے دو برس حکومت کی اور شورش پسندوں کو آہنی ہاتھ سے کچل دیا۔

پنڈت کیلاش در نے اپنے سرپرست خرم خان کو، اس کے قیامِ کابل کے دوران، کشمیر کی صوبہ داری کے حصول کی کوشش پر آمادہ کر رکھا تھا۔ اس مقصد میں وہ بالآخر ۱۷۷۰ء میں کامیاب ہوا اور نورالدین کو عہدے سے سبکدوش کر دیا۔ خرم خان حکمرانی کی اہلیت سے عاری نکلا، اور جب اس نے بزدلی کا بھی مظاہرہ کیا تو اس کے سپہ سالار امیر محمد خان جوان شیر قزلباش نے اسے نکال باہر کیا اور خود والی بن بیٹھا۔ کسی آئندہ ہنگامی صورت میں کسی بیرونی فرماں روا سے مدد طلب کرنے کے بجائے جوان شیر نے ہانجیوں یعنی ملاحوں کو منظم کیا، جو ایک تنومند طبقہ تھا اور اس کے مقاصد کی تکمیل کی صلاحیت رکھتا تھا۔ امیر محمد خان جوان شیر نے شیرگڑھی کا قلعہ تعمیر کرایا، جو کچھ عرصہ قبل تک مہاراجہ بہادرِ کشمیر کی رہائش گاہ رہا ہے، اور وہ پل بھی بنوایا جو امیرا کدل کے نام سے معروف ہے۔ کشمیری زبان میں کدل پل کو کہتے ہیں۔ (مہاراجہ ہری سنگھ نے شیرگڑھی کا نام بدل کر نرسنگھ گڑھ رکھ دیا ہے؛ امیرا کدل کو از سرِ نو تعمیر کے بعد "پرتاپ کدل" کا نام دیا گیا، لیکن لوگ پرانا ہی نام استعمال کرتے ہیں۔ یہی حال شیرگڑھی کا ہے؛ زبانِ خلق میں وہ شیرگڑھی ہی ہے۔)

سونا لنک نامی جزیرے پر ایک عمارت کی از سرِ نو تعمیر اور امیر آباد باغ بھی اسی والی کی یادگاریں ہیں۔ لیکن اس نے شاہی محلات اور دیگر عمارتیں، جن میں اکبر کا درشنی باغ اور ڈل پر واقع جھروکۂ شاہی بھی شامل تھے اور جنہیں مغل بادشاہوں اور ان کے امرا نے تعمیر کرایا تھا، ڈھا کر تخریب کا ارتکاب کیا۔

۱۳ اپریل ۱۷۷۲ء کو احمد شاہ درانی کی وفات نے امیر محمد خان جوان شیر کو اتنی جرأت دلائی کہ وہ باقاعدہ ایک خود مختار حکمران بن بیٹھا۔ وہ چھ برس برسرِ اقتدار رہا۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں پر ظلم ڈھاتا تھا، اور اس نے پنڈت کیلاش در کو قتل کرا کے میر مقیم کے خون کا بدلہ لیا۔ اس کے بعد اس کی حکومت اپنے پیش کار یعنی میر منشی میر فاضل خان کے باعث ظلم اور زبردستی کے لیے بدنام ہو گئی۔ اسی زمانے میں سری نگر کو دریائے جہلم کے سیلاب سے بہت نقصان پہنچا۔

بالآخر ۱۷۷۶ء میں احمد شاہ درانی کے بیٹے تیمور شاہ نے حاجی کریم داد خان بامزئی کو کشمیر کی حکومت پر مقرر کیا۔ حاجی کا تعلق قندھار سے تھا۔ اس نے اپنے رسالے کی قیادت کرتے ہوئے پانی پت کی لڑائی میں حصہ لیا تھا۔ امیر محمد خان جوان شیر کو شکست دینے کے بعد حاجی نے اسے زنجیروں میں جکڑ کر کابل بھیج دیا، جہاں وہ خاصے عرصے تک قید رہا، لیکن بالآخر تیمور شاہ نے اسے معاف کر دیا۔

"امیر خان، ایک ایرانی، جو کشمیر کے گزشتہ والیوں میں سے تھا، نے جھیل (ڈل) کے مشرقی کنارے پر ایک قلعہ بند محل تعمیر کرایا،" جارج فارسٹر (George Forster) نے ۱۷۸۳ء میں لکھا۔ "وہ اپنا بیشتر وقت اسی گوشۂ عافیت میں گزارا کرتا تھا، جو ایشیائی تعیش کی گوناگوں اقسام سے لطف اندوزی کے لیے عجب طور پر موزوں بنایا گیا تھا؛ اور آج بھی اس کا ذکر

محبت اور حسرت کے ساتھ کیا جاتا ہے؛ کیونکہ انہی لوگوں کی طرح وہ بھی زندہ دل، عشرت پسند اور لذائذِ خور و نوش کا بے حد دلدادہ تھا۔ کوئی ملاح یا اس کی بیوی ایسی نہیں جو اس خان کا ذکر وجد کے عالم میں نہ کرے اور کبھی کی فراواں معیشت کو اسی سے منسوب نہ کرے۔ اس والی نے، اپنے بہت سے پیش رووں کی طرح، اپنے صوبے کی قدرتی قوت اور دارالحکومت سے اس کی دوری پر بھروسا کرتے ہوئے اپنے آقا (تیمور شاہ، افغانوں کے برسرِ اقتدار فرماں روا) کے خلاف بغاوت کی۔ اس کے خلاف بھیجی گئی فوج قلیل اور بے سر و سامان تھی، اور دروں پر متعین چند جری آدمی اسے بہ آسانی پسپا کر سکتے تھے۔ لیکن عین وقتِ ضرورت پر بزدل اور متلون مزاج کشمیریوں نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا، اور اس ایرانی کے ساتھ اپنے اس طرزِ عمل کا جواز یہ پیش کیا کہ اگر وہ کشمیر میں رہ جاتا تو وہ ان سب کو مذہبِ علی کا پیرو بنا لیتا اور انہیں امیدِ نجات سے محروم کر دیتا۔" امیر جوان شیر قزلباش تھا، جو افغانستان میں پیدا ہوا اور وہیں پروان چڑھا۔

حاجی کریم داد نے اپنے عہدِ حکومت کا آغاز سکردو کے راجہ مراد خان کو زیرِ اطاعت لانے سے کیا، جس سے اس نے خراج وصول کیا اور یرغمالی طلب کیے۔ اس کارنامے پر تیمور شاہ نے اسے شجاع الملک کا خطاب عطا کیا۔ اس کے بعد کریم داد نے جموں کے راجہ رنجیت دیو کو شکست دی، جس نے تیس ہزار کی فوج کے ساتھ کشمیر پر حملہ کیا تھا۔ پھر اس نے اپنی فوجیں مظفرآباد کے سردار محمود خان کے خلاف روانہ کیں، جس نے امیر محمد خان جوان شیر کے خلاف اس کی مہم میں رکاوٹیں ڈالی تھیں۔ اس کارروائی میں کریم داد کو کٹھائی (جو اب تحصیل اوڑی میں ہے) کے سردار فتح خان کی غداری کے باعث خاصی خفت اٹھانا پڑی، جو تارقلی خان اور اس کی فوج کو ایک تنگ درے میں لے گیا اور وہاں انہیں تمام ہتھیاروں اور ساز و سامان سے محروم کر دیا۔ واپسی پر تارقلی کو فوراً موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

۱۱۹۵ھ (۱۷۸۰ء) میں کریم داد خان نے بذاتِ خود محمود خان کے خلاف فوج کشی کی، لیکن بیرا خان کاکڑ کے بیٹے بہادر خان کے ہاتھوں پسپا ہوا۔ اگلے سال وہ کشتواڑ کی تسخیر میں زیادہ خوش نصیب رہا۔

حاجی کریم داد خاصا سنگ دل تھا اور اشتعال پر ہندو اور مسلمان دونوں کو یکساں قتل کر دیتا تھا۔ اپنے بے اصول محصل اسلم ہرکارہ کے ذریعے اس کی جبری وصولیاں بدنامِ زمانہ مغل صوبہ دار اعتقاد خان کی وصولیوں سے بھی بڑھ گئیں اور بہتوں کو ترکِ وطن پر مجبور کر دیا۔ زرِنیاز نامی محصول، جو منصب داروں اور جاگیرداروں پر عائد تھا، عہدے داروں اور زمین داروں سے وصول کیا جاتا؛ زرِ اشخاص نامی ایک اور محصول تاجروں اور مہاجنوں سے؛ اور زرِ جبوب، جو غلے پر محصول تھا (جبوب، جس کا واحد حب ہے، غلے کو کہتے ہیں)، کاشتکاروں سے لیا جاتا تھا۔ بعض پنڈتوں کو، جو کریم داد کے خلاف بمبا سرداروں کے ساتھ ایک سازش میں شریک تھے، دھوئیں سے دم گھٹنے کی سزا دی گئی۔

کریم داد نے ان کی رہائی کے عوض ایک بھاری تاوان وصول کیا جو "زرِ دود" کہلاتا تھا؛ دود کے معنی دھوئیں کے ہیں۔ دلارام قلی کے مشورے پر اس نے شال بافوں سے ہر شال کی قیمت پر فی روپیہ ایک آنہ کے حساب سے "داغِ شال" نامی محصول وصول کرنا شروع کیا۔ اس کے نیک اعمال میں مسجد کے وقف کے کرایوں کی آمدنی سے جامع مسجد کی چھت کی مرمت اور اولیائے کرام کے مزارات کی زیارت شامل ہے۔ اس نے خانقاہِ نقشبندیہ (واقع خواجہ بازار، سری نگر) کے سجادہ نشین خواجہ کمال الدین نقشبندی کے قتل کا انتقام اس طرح لیا کہ انور ملک شہاب آبادی اور اس کے ان ساتھیوں کو، جنہوں نے خواجہ کو قتل کیا

تھا، تختۂ دار پر چڑھا دیا۔ خواجہ کا قتل امیر جوان شیر کے زمانے میں ہوا تھا جو شیعہ تھا۔ کریم داد نے شیعوں کے ساتھ سخت رویہ روا رکھا۔

ہرکارہ کے لغوی معنی قاصد یا پیامبر کے ہیں۔ داغِ شال، یعنی شال پر مہر لگانا، اس سرکاری محکمے کا نام بھی رہا ہے جو تجارتِ شال کی نگرانی کرتا تھا۔

اس نے امیر جوان شیر کا بسایا ہوا امیر آباد بھی تباہ و برباد کر دیا، جو جھیل ڈل پر، پرگنہ میر بحری کے موضع نند پور کے قریب واقع تھا۔ کریم داد کے عہدِ حکومت میں تین مہینے تک وقفے وقفے سے زلزلے آتے رہے اور بہت سے لوگ بے گھر ہو گئے۔ وہ سات برس کی حکمرانی کے بعد ۱۱۹۷ھ (۱۷۸۳ء) میں فوت ہوا۔ اس کا بیٹا آزاد خان چونکہ کسی مہم پر گیا ہوا تھا، اس لیے اس کی موت کو اس کی واپسی تک پوشیدہ رکھا گیا۔

آزاد خان ۱۷۸۳ء میں اپنے والد حاجی کریم داد خان کا جانشین ہوا۔ وہ ”باصلاحیت تھا اور اس نے اپنا اقتدار قائم کرنے میں غیر معمولی توانائی کا مظاہرہ کیا۔“ جارج فورسٹر (George Forster) نے ۱۷۸۳ء میں لکھا: ”آزاد خان اٹھارہ برس کا ہے۔ اس میں جوانی کی برائیاں کم ہی ہیں۔ نہ وہ حرم کی لذتوں کا دلدادہ ہے نہ شراب کا؛ حتیٰ کہ حقہ تک نہیں پیتا۔ لیکن وہ درشت خو اور تند مزاج ہے۔“ اسی تند مزاجی اور درشت خوئی کی بنا پر اسے کشمیر کا نادر شاہ کہا جاتا ہے۔ اس کے مزاج میں یہ انوکھا تضاد تھا کہ اپنے غلاموں اور مصاحبوں کو تو شان دار لباس پہناتا مگر خود نہایت سادہ کپڑے پہنتا تھا۔ وہ اکثر شکار کے لیے نکلا کرتا تھا۔

آزاد نے دلارام قلی کو اپنا پیش کار یعنی میر منشی مقرر کیا۔ اس نے تین ہزار سکھ ملازمت میں لیے اور اپنی فوج کی تنظیمِ نو کی۔ پھر اس نے ہمسایہ سرداروں پر اپنا اثر و رسوخ بڑھانے کی طرف توجہ کی۔

سب سے پہلے کشتواڑ کے راجا کو سرِ اطاعت خم کرنے پر مجبور کیا گیا۔ پونچھ کا رستم خان اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور شہر چھوڑ گیا، جسے ایک ہفتے تک لوٹا گیا۔ لیکن بعد میں رستم خان نے گراں قدر تحائف پیش کر کے اسے راضی کر لیا، اور آگے چل کر رستم کی بیٹی آزاد کے عقد میں آئی۔ اس شادی سے پیدا ہونے والے بیٹے کا نام فتح جنگ خان رکھا گیا۔

راجوری کے راجا کو بھی مطیع کر لیا گیا۔ آزاد خان نے مائسمہ کے میدان کو، جو اُس وقت سری نگر شہر کی حدود سے باہر تھا، سیراب کرنے کے لیے ایک نہر نکالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس غرض سے اس نے مرراج اور کامراج کے دیہاتیوں سے بیگار لی، لیکن کام مکمل نہ کر سکا۔

آزاد خان تیمور شاہ کی اطاعت کے بندھن سے آزاد ہونا چاہتا تھا جو ۱۷۸۵ء میں ہندوستان پر اپنی چوتھی یلغار میں مصروف تھا۔ تاہم تیمور نے ایک معزز درباری مرزا محمد علی کو، جو کفایت خان نصرت کے خطاب سے سرفراز تھا، اس سے خراج وصول کرنے کے لیے روانہ کیا۔ کفایت خان تین لاکھ روپے لے کر لوٹا، لیکن اس کا مشن پوری طرح کامیاب نہ رہا۔ تب تیمور شاہ نے آزاد خان کے بڑے بھائیوں مرتضیٰ خان اور زمان خان کو اس کی گوشمالی کے لیے مامور کیا۔ مگر وہ تین دن کی لڑائی کے بعد شکست کھا گئے اور قحط اور ہیضے نے انہیں دوبارہ کوشش سے باز رکھا۔ چنانچہ آزاد خان کی خودمختاری کا سلسلہ جاری رہا۔ آزاد خان کے چچازاد پہلوان خان اور بعض دیگر افراد نے اس کی جان لینے کی ناکام کوشش کی، جس کے بعد وہ کھلی بغاوت پر اتر آئے، لیکن بالآخر پکڑے گئے اور موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔

آزاد خان کے عہد میں ملک ایک ہولناک قحط میں مبتلا ہوا۔ نمک تک چار روپے فی سیر پر دستیاب نہ تھا۔ زلزلے کے پے در پے جھٹکوں نے عوام کی مصیبتوں میں مزید اضافہ کر

دیا۔

لوگوں نے تیمور شاہ سے فریاد کی اور التجا کی کہ وہ ان کی داد رسی کے لیے فوری اقدام کرے۔ ایلفنسٹن (Elphinstone) اس واقعے کو تیمور کی ۱۷۸۶ء کی مہمِ سندھ اور ۱۷۸۸ء میں بہاول خان والیٔ بہاولپور کے خلاف مہم کے درمیانی عرصے میں رکھتا ہے۔ سیف الدولہ مدد خان درانی اور پائندہ خان بارکزئی پچاس ہزار سوار و پیادہ لے کر آئے۔ مظفرآباد سے ایک دستہ پائندہ خان کی سرکردگی میں بارہ مولا کے راستے روانہ کیا گیا، جہاں اس کی آزاد خان سے مڈبھیڑ ہوئی۔ مدد خان درانی خود دوسرے دستے کے ساتھ کرناہ کے راستے بڑھا اور سری نگر میں داخل ہو گیا۔ اس پر آزاد خان زینہ کوٹ اور جھیل ہوکر سر سے متصل خوشی پورہ کے کریوہ کی جانب پسپا ہوا، جہاں اس کے سردار اس کا ساتھ چھوڑ گئے۔ سخت مشکلات میں گھر کر وہ پونچھ بھاگ گیا۔ جب ہر طرف سے گھیر لیا گیا تو اس نے خود کو گولی مار کر ہلاک کر لیا۔ اس وقت اس کی عمر صرف ۲۷ برس تھی۔ بیرن ہیوگل (Baron Hügel) کہتا ہے:

”اگرچہ اس نے عوام پر سخت مظالم ڈھائے، تاہم آزاد خان کے مسرفانہ طرزِ زندگی کے باعث مالگزاری اور محاصل سے جمع شدہ روپیہ بالواسطہ طور پر پھر اہلِ وطن کے ہاتھوں میں گردش کرنے لگا، جنہوں نے اپنی مصنوعات کی برآمد میں اضافے سے بے پناہ منافع بھی کمایا۔“

اس کے بعد سیف الدولہ مدد خان درانی نے نو مہینے حکومت کی — اور وہ بھی اسی طرح بری۔ ایک کشمیری پنڈت نے صورتِ حال کو آدھے مصرعے میں دردمندی سے یوں بیان کیا:

رسید مدد کہ آزاد را

(یعنی مدد ظلم میں آزاد سے بھی بڑھ گیا۔) وہ ابھی امن و امان بحال نہ کر پایا تھا کہ میر داد خان کو اس کی جگہ بھیج دیا گیا۔ اس امیر نے سات مہینے حکومت کی اور ناروا محاصل عائد کیے۔ اس نے کامراج کے میر جعفر خان کو مطیع کیا۔ میر داد ۱۷۸۸ء میں فوت ہوا۔

اگلا اہم گورنر جمعہ خان درانی ہلوکوزئی تھا جو چار برس اس منصب پر فائز رہا۔ مفتیِ اعظم کشمیر قاضی عزیز الدین کی احسن التواریخ میں مذکور ہے کہ جمعہ خان ۲۷ شعبان ۱۲۰۲ھ (۱۷۸۷ء) کو کابل سے پکھلی کے لیے روانہ ہوا، جہاں سے اس نے اپنے بھتیجے کو پیش قدمی کے لیے آگے بھیجا۔ جمعہ خان خود رمضان میں کشمیر میں داخل ہوا۔ اس نے میر جعفر خان کو قید سے رہا کیا۔ نامور شاعر منشی بھوانی داس کاچرو نے جمعہ خان کی مہر کے لیے ایک خوب صورت طغرا مہیا کیا:

چو حق تقسیم روزنیک و بد کرد

کامراج کے حسن علی خان بمبہ، پونچھ کے رستم علی خان اور راجوری کے کرم اللہ خان — سبھی نے سرکشی کے آثار دکھائے اور سبھی کو کامیابی سے شکست دی گئی۔ جمعہ خان کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اس نے قاضی اور منصف کے مناصب سے متعلق واجبات ٹھیکوں کے ذریعے وصول کیے۔ اس کے حکم سے شیعوں کو اپنے ایامِ عزا منانے سے روک دیا گیا۔ شہر کے خانیار (خانیار کے لغوی معنی خانوں کا محلہ ہیں) اور رعناواری نامی حصے اس شدید سیلاب سے متاثر ہوئے جو قاضی زادہ بند — جسے اب سدِ قاضی زادہ یا سوتھو کہتے ہیں — کے پانی کے زوردار ریلے کے آگے ٹوٹ جانے سے آیا تھا۔ جمعہ خان ہلوکوزئی ۱۷۹۳ء میں پیچش سے فوت ہوا اور سید قمر الدین خوارزمی (متوفی ۹۰۷ھ = ۱۵۰۱ء، مدفون

در حدودِ شیر گڑھی) کے مزار کے احاطے میں دفن ہوا۔ بعد ازاں اس کی میت قندھار منتقل کر دی گئی۔

رحمت اللہ نے ۱۷۹۲ء میں میر ہزار خان کی آمد تک عارضی طور پر نظمِ حکومت سنبھالے رکھا۔ ہزار کے دورِ حکومت میں تیمور شاہ ۱۸ مئی ۱۷۹۳ء کو کابل میں انتقال کر گیا، جب کہ وہ چھٹی بار ہندوستان پر حملے کی تیاری کر رہا تھا۔ اگلے حکمران زمان شاہ نے میر ہزار خان کو اس کے منصب پر برقرار رکھا۔ لیکن میر ہزار خان خود مختار گورنر بن بیٹھا اور اپنے والد مرزا خان کو قید کر دیا جسے کابل سے اس غرض سے بھیجا گیا تھا کہ وہ اسے اعلانِ خودمختاری سے باز رکھے۔ میر ہزار شیعوں اور ہندوؤں پر سخت تھا اور اس نے ہندوؤں پر جزیہ عائد کیا۔

زمان شاہ نے اس کی گوشمالی کے لیے سپہ سالار احمد خان شاہینک باشی اور رحمت اللہ خان کو مقرر کیا۔ بظاہر ایلفنسٹن کا اشارہ اسی واقعے کی طرف ہے جب وہ کہتا ہے کہ ۱۷۹۳ء کے باقی مہینے اور ۱۷۹۴ء کا کچھ حصہ کشمیر کی تسخیر میں صرف ہوئے (صفحہ 566)۔ میر ہزار کے متعدد امرا اس کا ساتھ چھوڑ گئے تو اس نے خانقاہِ معلیٰ میں پناہ لی، مگر بعد میں اسے بہلا پھسلا کر باہر لایا گیا اور قید کر دیا گیا۔ اس کا عہدِ حکومت ایک برس دو مہینے پر محیط رہا۔

۱۷۹۴ء میں رحمت اللہ خان نے چار مہینے حکومت کی، لیکن احمد خان شاہینک باشی سے جھگڑنے کی پاداش میں واپس بلا لیا گیا۔ ۱۷۹۴ء ہی میں کفایت خان اس کا جانشین ہوا۔ کفایت ایک فیاض اور نیک نیت انسان تھا۔ اس کے ایک برس کے مختصر قیام کے دوران شیعہ سنی جھگڑے بند رہے۔ اس نے کامراج میں بمبہ قبیلے کی بغاوت فرو کی۔ خانیار کا ایک باغ اس کے نام سے منسوب ہے۔ تاہم اس کے امرا کے مابین ایک سنگین جھگڑے کے نتیجے میں وہ ۱۷۹۵ء میں معزول کر دیا گیا۔ اس کے بعد ارسلان خان کو کشمیر کی گورنری

تفویض ہوئی۔ مغلوں کے عہدِ آخر کے صوبے داروں کے دستور پر چلتے ہوئے اس نے اپنی جگہ حکومت کرنے کے لیے امیر محمد خان جوان شیر کو بھیج دیا۔ محمد خان کے بعض عزیز، جو جوان شیر قبیلے کے ایک دستے کے افسر تھے، اس کے خلاف باغی ہو گئے اور اسے شیر گڑھی کے قلعے میں محصور کر لیا۔ مصالحت طے پا جانے پر محمد خان نے اپنا اقتدار ان کے ساتھ بانٹ لیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے بعد احمد شاہ درانی کے وزیرِ اعظم شاہ ولی خان کا بیٹا حافظ شیر محمد خان مختار الدولہ کابل سے حکم پا کر کشمیر پہنچا۔ وہ تمام متحارب فریقوں کو اپنے ہمراہ کابل لے گیا۔ یہی مختار الدولہ بعد میں زمان شاہ کا وزیرِ اعظم بنا۔

عبد اللہ خان ہلوکوزئی نے ۱۷۹۵ء میں گورنری کا خالی منصب سنبھالا۔ اس نے تقریباً گیارہ برس ملک پر حکومت کی۔ اس کے عہد کے ابتدائی تین برسوں میں ملک کا انتظام اس کے بھائیوں میں سے کوئی نہ کوئی چلاتا رہا، جنہوں نے بظاہر اپنے فرائض خلوص اور دیانت داری سے انجام دیے۔ ۱۲۱۳ھ (۱۷۹۸ء) میں کابل سے واپسی پر اس نے منظم انداز میں اپنی قوت بڑھانی اور بلند عزائم پالنے شروع کر دیے، غالباً اس وقت جب اس نے دیکھا کہ کابل میں حکومت تیزی سے ہاتھ بدل رہی ہے۔ پہلے اس نے دارالحکومت کو ان سرداروں اور امرا کے وجود سے پاک کیا جن سے اسے عداوت کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔

پھر اس نے کم حیثیت لوگوں کو اونچے مناصب پر فائز کیا۔ اس نے تیس ہزار آدمیوں پر مشتمل ایک فوج بھی بھرتی کی اور ہمسایہ سرداروں سے اتحاد قائم کیے۔ اسی سلسلے میں اس نے مظفر آباد کے سردار فتح خان بمبہ کی بیٹی سے شادی کی۔ اس نے ملک پر نرمی اور انصاف سے حکومت کی۔ ۱۸۰۰ء میں عبد اللہ خان کا اپنے دیوان ہر داس سے جھگڑا ہو گیا جو دیوان نند رام کا پروردہ تھا۔ نند رام اُس رحمت خان کا منظورِ نظر تھا جسے زمان شاہ نے "وفادار

خان" کا خطاب دیا تھا اور جو کابل میں وزیرِ اعظم تھا۔ نند رام زمان شاہ کے عہد میں کابل میں وزارت کے مرتبے تک پہنچا اور اسی بنا پر اس کے اپنے لوگوں کو زبانِ طعن دراز کرنے کا موقع ملا۔

نند رام کے مرتبے نے کشمیری پنڈتوں کو اتنا حوصلہ دے دیا کہ وہ قومی فخر میں، اگرچہ چپکے چپکے، یہ کہنے لگے:

سکہ زد در کابل ۔۔۔ مسلماناں بخوانید رام رام

عبد اللہ خان کے اس جھگڑے کا نتیجہ بالآخر اس کی واپس طلبی اور پھر کابل کے بالا حصار میں اس کی قید کی صورت میں نکلا۔ کشمیر چھوڑنے سے پہلے اس نے اپنی جگہ اپنے بھائی عطا محمد خان کو مقرر کیا اور اسے نیز مظفر آباد کے سردار کو خفیہ طور پر لکھا کہ ملک کو اس کے لیے اپنے قبضے میں رکھیں اور نئے گورنر کی مزاحمت کریں۔ کابل کے وزیر وفادار خان نے عبد اللہ خان کے بھائی وکیل خان کو، جو اس وقت کشمیر ہی میں تھا، گورنر مقرر کیا اور اپنے احکام کی تعمیل کرانے کے لیے ملا احمد خان کو بھیجا۔ عطا محمد خان نے پہلے وکیل خان کو قتل کیا اور پھر ملا احمد خان کو شکست دے کر گرفتار کر لیا۔

۱۲۱۶ھ (۱۸۰۱ء) میں زمان شاہ کو گرفتار کر کے اندھا کر دیا گیا اور اس کے بھائی محمود شاہ، حکمرانِ ہرات، کو افغانستان کا بادشاہ قرار دیا گیا۔ ان حالات نے باغیوں کے حوصلے اور بھی بڑھا دیے۔ مزید یہ کہ عبد اللہ خان نے سازش کی اور پشاور کے بالا حصار کے قلعہ دار جان نثار علی خان کے ہمراہ، جسے اس نے ایک لاکھ روپے نذر کیے، بھاگ کر کشمیر پہنچ گیا۔ پھر اس نے کشمیر میں اپنے معاملات کی طرف توجہ دی، پرگنہ بیرو میں ایک قلعہ تعمیر کیا، اور آخر کار خراج روک کر اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ جی ٹی وین (G. T. Vigne) نے عبد اللہ

خان کے زمانے میں کشمیر میں تانبے کی کانوں کے چلنے کا جو ذکر کیا ہے وہ اس کی فارغ البالی کی توجیہ کر سکتا ہے۔

اس مرحلے پر کابل حکمرانوں کی تبدیلی سے دوچار تھا۔ محمود شاہ نے، جس نے زمان شاہ کو معزول کیا تھا، خود اپنے بھائی شجاع الملک کے ہاتھوں معزولی پائی۔ (زمان شاہ اور شجاع الملک ایک ہی ماں — یوسفزئی قبیلے کی ایک خاتون — کے بطن سے تھے۔) شجاع نے ۱۸۰۶ء میں حافظ شیر محمد خان مختار الدولہ کو کشمیر کو زیرِ اطاعت لانے کے لیے روانہ کیا۔ شیر محمد خان مظفرآباد پہنچا اور بنیادی طور پر اپنے حریف کو غافل پا کر جا لینے کی غرض سے مذاکرات کا ڈھونگ رچایا۔ ہمسایہ راجاؤں سے کمک پانے کے بعد اس نے عبد اللہ خان کی فوج پر اچانک حملہ کر دیا؛ وہ پسپا ہوئی مگر سوپور سے نیچے پوہرو اور جہلم کے سنگم پر واقع موضع دوآب گاہ میں اس نے مقابلہ کیا، جہاں سے عبد اللہ خان اپنے قلعۂ بیرو کو بھاگ گیا۔ حافظ شیر محمد خان کے بیٹے عطا محمد خان کو اس قلعے کے محاصرے کا حکم دیا گیا۔ اسی محاصرے کے دوران، ۱۸۰۷ء میں، عبد اللہ خان کا انتقال ہو گیا۔ جیسا کہ ایلفنسٹن کہتا ہے، عبد اللہ خان اعلیٰ صلاحیتوں اور بڑی ہمت کا آدمی تھا۔ افغان اور کشمیری دونوں اسے پسند کرتے تھے۔ ”اس کی انصاف پسندی اور انتظامِ عدل میں اس کی مہارت، اس کی فیاضی، اس کی خوش خلقی اور اس کی شاہانہ شان و شوکت کی داد دی جاتی ہے۔ وہ علم و شعر کا بھی بڑا سرپرست تھا۔ شاید کسی درانی نے ایسا کردار نہیں چھوڑا جسے اس قدر عام طور پر سراہا گیا ہو“ (صفحات 595-96)۔ ایلفنسٹن کا سفارتی وفد ۲۵ فروری ۱۸۰۹ء کو پشاور پہنچا اور ۱۴ جون کو پشاور سے روانہ ہوا۔

۱۸۰۹ء میں کابل ایک بار پھر تخت کے مختلف دعویداروں کے مابین کشمکش اور آویزش کا اکھاڑا بنا۔ محمود شاہ کو رہا کر دیا گیا، جب کہ زمان کا بیٹا شہزادہ قیصر اور محمود کا بیٹا شہزادہ کامران ایک دوسرے کے خلاف جنگیں لڑتے رہے۔ انہی خانہ جنگیوں میں احمد شاہ درانی کے وزیر شاہ ولی خان کا بیٹا حافظ شیر محمد خان مختار الدولہ مارا گیا، اور شجاع الملک عظیم خان کے ہاتھوں شکست کھا کر رنجیت سنگھ کی پناہ میں چلا گیا۔

حافظ شیر محمد خان مختار الدولہ قتل ہونے سے پہلے پانچ مہینے کے قیام کے بعد کشمیر چھوڑ چکا تھا اور شاہ شجاع کی منظوری سے اپنے بیٹے عطا محمد خان کو اپنا نائب مقرر کر گیا تھا۔ (لیفٹیننٹ نیوال (Lt. Newall) صفحہ 452 پر اس گورنر کو عبد اللہ خان کا بیٹا لکھتا ہے، جب کہ صفحہ 450 پر اسی شخص کا بھائی قرار دیتا ہے۔) اس کی تقرری کا سال، یعنی ۱۲۲۱ھ (۱۸۰۶ء)، "افضالِ رحمانی" کے مادۂ تاریخ سے برآمد ہوتا ہے۔ عطا محمد خان کا شان دار عہدِ حکومت کشمیر پر افغان اقتدار کے ریگ زاروں میں ایک وسیع نخلستان کی مانند ہے۔ عوام نے اس کے زیرِ سایہ خوش حالی پائی۔

مجموعی طور پر خاصی ترقی ہوئی۔ اس کے دورِ حکومت کے ایک سال میں تجارت کے احیا کی بدولت ایک کروڑ روپیہ خزانے میں داخل ہوا۔ دیگر ذرائع سے حاصل ہونے والی آمدنی بھی دگنی ہو گئی۔ بہت سے لوگوں کے ہاتھ دفینے لگے جو انہیں اپنے پاس رکھنے کی اجازت دے دی گئی۔ بیشتر اہم مقدمات وہ ذاتی طور پر خود نمٹاتا تھا اور وراثت کے متنازع معاملات میں ہر دعویدار کا حصہ خود مقرر کر دیتا تھا۔

اس نے اپنی عوامی اور نجی زندگی میں سادگی کو شعار بنائے رکھا اور اہلِ علم و تقویٰ کا واجب احترام ملحوظ رکھا۔ چرار شریف میں اس کی تعمیر کردہ عمارتیں آج بھی موجود ہیں۔ ۱۸۱۰ء

کے لگ بھگ ندھان سنگھ اٹھا رنجیت سنگھ سے بددل ہو کر پنجاب چھوڑ گیا اور عطا محمد خان کی ملازمت اختیار کر لی۔

۱۸۱۰ء میں عطا محمد خان نے اپنی خودمختاری کا اعلان کر دیا، کیونکہ شاہ شجاع اور شاہ محمود یکے بعد دیگرے اس کے خلاف فوجی مہمات روانہ کرتے رہے تھے۔ اس نے بزرگ شیخ نورالدین ریشی کے نام کا سکہ جاری کیا، جس پر ایک نہایت موزوں عبارت کندہ تھی، جو "کشیر" کے قاری نے صفحہ 101 پر ضرور ملاحظہ کی ہوگی۔ شاہ شجاع الملک نے عطا محمد کے نامزد جانشین اکرم خان اور ایک اور خان کو اس غرض سے روانہ کیا کہ اسے اقتدار سے محروم کر کے اطاعت پر مجبور کیا جائے۔

یہ فوجیں تحصیل راجوری کے مقام شاہدرہ پر بری طرح شکست کھا گئیں، اور عطا محمد فتح مندی کے ساتھ اپنے دارالحکومت واپس آیا۔ (ہیوگل (Hügel) کے سفرنامے، صفحہ 369، کے مطابق شاہدرہ ایک گاؤں ہے جس کی آبادی مردم شماری کے موقع پر ۷۷۳ تھی۔) اب اس نے سوپور، بارہ مولہ اور کوہِ ماراں کی چوٹی پر قلعہ بندیاں کیں، اور مظفرآباد سے آگے دیگر فوجی اہمیت کے حامل مقامات پر متعدد چھوٹے قلعے اور برجیاں تعمیر کروائیں۔ اس نے آئندہ کسی ہنگامی صورتِ حال کے پیشِ نظر گولہ بارود کے ذخیرے بھی جمع کر لیے۔

دیوان نند رام اور اپنے بھائی جہانداد خان کے ذریعے اس نے یہ چال چلی کہ شجاع الملک کو تلمبہ سے کشمیر آنے کی دعوت دی۔ تلمبہ پنجاب میں ملتان سے ۶۰ میل شمال مشرق میں راوی اور چناب کے سنگم پر واقع ایک قصبہ ہے، جہاں شجاع ان دنوں قیام پذیر تھا، کیونکہ تیمور شاہ کے دوسرے بیٹے محمود شاہ نے اسے افغانستان سے بے دخل کر دیا تھا۔ شجاع حسن خان اور ہدایت اللہ کے ہمراہ کشمیر پہنچا۔ عطا محمد نے معزول بادشاہ شجاع کو کوہِ

ماراں (ہری پربت) کے قلعے میں نظربند کر دیا اور اپنے بھائی جہانداد خان کو قلعۂ اٹک پر قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔

رنجیت سنگھ کی کشمیر میں دلچسپی کیوں کر پیدا ہوئی

شاہ محمود کے وزیر فتح خان نے اٹک اور کشمیر کے حاکموں کو اس امداد کی سزا دینے کا تہیہ کر لیا جو انہوں نے زمان شاہ اور شاہ شجاع کو پہنچائی تھی۔ اس طرح علاقوں کے باہمی قرب کے باعث فتح خان اور رنجیت سنگھ کے مابین قریبی روابط قائم ہوئے۔ ۱۸۱۳ء میں ان دونوں کے درمیان ایک معاہدہ طے پایا، جس کی رو سے یہ قرار پایا کہ رنجیت سنگھ مالِ غنیمت میں حصے — آٹھ لاکھ روپے کے نذرانے — اور بعض متوقع فوائد کے عوض نہ صرف فتح خان کو اپنے علاقوں سے گزرنے کا آزادانہ راستہ دے گا بلکہ اسے سکھ سپاہیوں پر مشتمل ایک امدادی فوج بھی فراہم کرے گا۔ ہنری بیوریج (Henry Beveridge) اپنی کتاب ''اے کامپری ہینسو ہسٹری آف انڈیا'' (جلد سوم، صفحہ 227) میں لکھتا ہے: ''چونکہ فریقین دونوں فریب کاری میں طاق تھے، اس لیے ہر ایک نے اس معاہدے کو محض اپنے ہی فائدے کے لیے استعمال کرنے کی کوشش کی۔'' فتح خان نے کشمیر دوبارہ حاصل کر لینے کے بعد مالِ غنیمت میں حصہ دینے سے یہ عذر تراش کر انکار کر دیا کہ سکھوں نے وعدے کے مطابق اس کی مدد نہیں کی تھی، اور ادھر رنجیت سنگھ نے ایک سازش کے ذریعے اٹک پر قبضہ جما لیا اور اسے چھوڑنے سے انکاری ہو گیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ فتح خان رنجیت سنگھ سے خیر خواہانہ غیر جانب داری کا خواہاں تھا، تاہم اسے رنجیت کی فوج کا وادی میں داخل ہونا گوارا نہ تھا۔ چنانچہ فتح خان، موہکم چند کی قیادت میں پیش قدمی کرنے والے رنجیت کے دستوں سے پہلے ہی عجلت میں کشمیر جا پہنچا، مگر موہکم چند بھی ایک مختصر راستے سے وہاں

پہنچ گیا۔ فتح خان نے سکھوں کو انعام دینے سے اس بنا پر انکار کر دیا کہ انہوں نے کوئی لڑائی نہیں لڑی تھی۔ سکھوں کا اصل حاصل شاہ شجاع کی ذات کا ان کے قبضے میں آجانا تھا۔

اس معاملے کی جملہ تفصیلات کے لیے ہم رنجیت سنگھ کے مؤرخ کنہیا لال، مصنفِ "ظفرنامۂ رنجیت سنگھ"، سے رجوع کرتے ہیں، جس کا انگریزی ترجمہ مسٹر ایچ ریہاٹسک (H. Rehatsek) نے رسالہ "انڈین اینٹی کویری" بابت نومبر ۱۸۸۷ء (صفحات 339-40) میں شائع کیا۔ وہ لکھتا ہے: "اس زمانے میں حسن خان نے، جو افغانستان کے فرماں روا کی جانب سے ضلع پشاور کا حاکم تھا، تحائف کے ہمراہ ایک ایلچی رنجیت سنگھ کے پاس اس اطلاع کے ساتھ بھیجا کہ والیٔ کشمیر عطا محمد نے افغانستان کے موجودہ فرماں روا (محمود شاہ) کی اطاعت سے گردن کشی اختیار کر لی ہے اور جلاوطن شاہ شجاع اس سے جا ملا ہے، جو اس کی مدد سے اپنا تخت واپس حاصل کرنے کا امیدوار ہے؛ لیکن اگر رنجیت سنگھ کی فوجیں فتح خان کی فوجوں کے ساتھ مل کر کشمیر پر حملہ آور ہوں تو والیٔ کشمیر کو فوراً اطاعت پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے اپنے سپہ سالار دیوان موہکم چند کو فی الفور کشمیر کی جانب کوچ کرنے کا حکم دیا، اور جب وہ سرحد پر پہنچا تو فتح خان بھی پشاور کی سمت سے آموجود ہوا۔ تاہم جب انہوں نے پیر پنجال عبور کیا تو معلوم ہوا کہ پہاڑوں کے تمام سردار اور راجے ناموافق ہو چکے ہیں اور ان سے ملاقات سے گریزاں ہو کر راستے سے ہٹ گئے ہیں۔ جب متحدہ افواج وادیٔ کشمیر میں درے کے پار پہلے مقام ہیرہ پور پہنچیں تو انہیں پہلی مزاحمت شوپیاں کے قریب بالاپور میں پیش آئی، مگر انہوں نے عطا محمد کو شکست دی، جو پسپا ہو کر شیرگڑھی کے قلعے میں جا بیٹھا۔ انہوں نے اس قلعے کا محاصرہ کیا اور اس پر اسی وقت قبضہ کر سکے جب سری نگر پر قابض ہو کر افغان نظمِ حکومت قائم کیا جا چکا تھا۔ جب شیرگڑھی کا قلعہ فتح ہوا تو عطا محمد اور شاہ شجاع دونوں قیدی بن گئے، اور فتح خان نے، جو

ان سے جانی دشمنی رکھتا تھا، سمجھا کہ اب وہ اس کی گرفت میں ہیں، مگر موہکم چند نے، جس نے انہیں اپنی حفاظت میں لے لیا، اس کی امیدوں پر پانی پھیر دیا۔" لیکن "تاریخ سلطانی" (صفحات 233-35) کے مطابق فتح خان نے شاہ شجاع کو خود موہکم چند کے حوالے کیا تھا۔

کنہیا لال مزید لکھتا ہے: "افغان سپہ سالار نے فوراً ایک قاصد رنجیت سنگھ کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ روانہ کیا کہ ان دونوں معزز قیدیوں کو اس کے حوالے کرنے کا حکم دیا جائے۔ لیکن یہ مسئلہ چونکہ نہایت پیچیدہ تھا، مہاراجہ نے اس کا فیصلہ عجلت میں کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اور جس اثنا میں رنجیت سنگھ اس سوچ میں تھا کہ کیا جواب بھیجے، تلمبہ سے ایک قاصد شاہ (یا وفا) بیگم، زوجۂ شاہ شجاع، کے تحائف لے کر آپہنچا، جو اسی قصبے میں مقیم تھی۔ اس خاتون نے اپنے اضطراب کا اظہار کرتے ہوئے مہاراجہ سے التجا کی کہ وہ شاہ شجاع کو اس کے دشمن فتح خان کے حوالے نہ کرے بلکہ اسے دربارِ لاہور میں قبول کرے؛ اس صورت میں اس نے وعدہ کیا کہ وہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں مشہور ہیرا کوہِ نور پیش کرے گی، جسے اس نے ایک بیش بہا گوہر اور فی الحقیقت "روشنی کا پہاڑ" قرار دیا۔"

[کوہِ نور ہیرا، جس کا وزن ۹۰۰ رتی یعنی ساڑھے سات سو ستاسی قیراط تھا، ۱۶۵۶ء کے لگ بھگ مملکتِ گولکنڈہ میں دریائے کرشنا کے کنارے کولور نامی مقام سے دستیاب ہوا اور میر جملہ نے اسے غیر تراشیدہ حالت میں شاہ جہاں کی خدمت میں پیش کیا۔ جب ٹیورنیئر (Tavernier) نے ۱۶۶۵ء میں اورنگ زیب عالمگیر کے خزانے میں یہ ہیرا اپنے ہاتھ میں لیا تو اس کا وزن ساڑھے تین سو انیس رتی یعنی تقریباً ۲۶۹ قیراط رہ گیا تھا؛ کہا جاتا ہے کہ ہارٹینسیو بورجیو (Hortensio Borgio) نامی ایک وینیسی شعبدہ باز نے صفائی کے بجائے

فضول گھسائی کر کے اسے اس حجم تک گھٹا دیا تھا۔ جب یہ ہیرا انگریزوں کے قبضے میں آیا تو ایمسٹرڈم میں اس کی از سرِ نو تراش کی گئی، جس سے اس کا وزن گھٹ کر ساڑھے ایک سو چھ قیراط رہ گیا۔ یہ ہیرا اس مشہور تختِ طاؤس میں جڑا ہوا تھا جو شاہ جہاں نے تعمیر کرایا تھا۔ جب نادر شاہ نے فتحِ دہلی کے بعد اس تخت پر قبضہ کر کے اسے توڑا تو کوہِ نور کہیں نہ ملا۔ بالآخر شہنشاہ محمد شاہ کے حرم کی ایک عورت کے ذریعے یہ راز فاش ہوا کہ اس نے ہیرا اپنی دستار میں چھپا رکھا ہے۔ چنانچہ ایک روز نادر شاہ نے نہایت شائستگی سے، ایسے مواقع کی معروف رسم یعنی تبادلۂ دستار کے ذریعے، اسے برادری کی پیشکش کی، جسے شہنشاہ رد نہ کر سکا۔ اس طرح یہ ہیرا نادر شاہ کے قبضے میں آ گیا، جس نے ۱۷۳۹ء میں اسے یہ نام دیا۔ شاہ زمان نے، جس کے ہاتھ یہ ہیرا لگا تھا، اپنی جلاوطنی کے زمانے میں اسے ایک دیوار کی درز میں چھپا دیا، مگر شاہ شجاع نے اسے دوبارہ حاصل کر لیا؛ پھر یا تو وہ اسے رنجیت سنگھ کو دینے پر مجبور ہوا یا رنجیت نے اسے مہمان نوازی کی قیمت کے طور پر چھین لیا۔ آخرکار کوہِ نور ۱۸۴۹ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے قبضے میں آیا، جس نے اسے ملکۂ انگلستان کی خدمت میں پیش کیا اور یوں یہ تاجِ برطانیہ کی زینت بنا۔ اصل جڑاؤ ساخت، نگینوں کے نمونوں سمیت، جیسے اس وقت پہنی جاتی تھی، جیول ہاؤس لندن میں محفوظ ہے، جب کہ کوہِ نور اِس وقت ملکہ الزبتھ کے تاج میں جڑا ہوا ہے۔ اس گوہر کی قیمت ایک لاکھ چالیس ہزار پونڈ لگائی گئی تھی۔ کوہِ نور اور دیگر ہیروں ہی کی بدولت لفظ ”گولکنڈہ“ انگریزی زبان میں ”بے پناہ دولت“ کا مترادف بن گیا ہے، جیسا کہ کنسائز آکسفرڈ ڈکشنری اور مرے (Murray) کی ”اے نیو انگلش ڈکشنری“ میں درج ہے، اور جس کی ایک مثال یہ ہے: شاعری کے شائق کے لیے ”پیرا سیلسس“ ہمیشہ ایک گولکنڈہ رہے گا۔]

"مہاراجہ نے اس پیشکش سے خوش ہو کر شاہ بیگم کی درخواست بہ رضا و رغبت منظور کر لی۔ اسی دوران عطا محمد کا بھی ایک خط آپہنچا، جس میں اس نے بھی التجا کی تھی کہ اسے فتح خان کے حوالے نہ کیا جائے۔ مزید برآں اس نے اپنی خدمات کلیۃً مہاراجہ کے سپرد کرنے کی خواہش ظاہر کی اور اسے قلعۂ اٹک پیش کیا، جو ابھی تک اس قلعہ دار جہانداد خان کے قبضے میں تھا جسے اس نے خود وہاں مقرر کیا تھا۔ اس پر مہاراجہ نے دیوان موہکم چند کو ایک نہایت ستائشی خط بھیجا، جس میں اس کی کارگزاری پر اظہارِ تشکر کے ساتھ اسے تاکید کی گئی کہ اگر فتح خان مزید مزاحمت کرے تو اسے پوری طرح کچل دیا جائے، پھر شاہ شجاع کو پورے اعزاز و اکرام کے ساتھ لاہور لایا جائے، عطا محمد کے ساتھ انتہائی عزت کا برتاؤ کیا جائے، اور اس کے ساتھ اٹک پر قبضے کا بندوبست کیا جائے؛ دیوان نے ان تمام امور کی انجام دہی کا ذمہ اٹھایا۔

"وقتِ مقررہ پر سپہ سالار دیوان موہکم چند فوج سمیت لاہور پہنچا اور اپنے ہمراہ شاہ شجاع کو بھی لایا، جس کا دوستانہ خیر مقدم ہوا اور جس کے گزارے کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا گیا۔ فقیر عزیز الدین کو فوج دے کر اٹک پر قبضے کے لیے روانہ کیا گیا؛ جہانداد خان نے اظہارِ اطاعت کے ساتھ اس کا استقبال کیا اور فوراً قلعہ حوالے کر دیا۔ وہاں سکھ فوج متعین کر دی گئی اور قلعے کی فصیلوں کی مرمت بھی کرا دی گئی۔ مہاراجہ اس کامیاب معاملے سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے عطا محمد کو ایک لاکھ روپے اور خلعت عطا کی۔ اب رنجیت سنگھ کو اس کوہِ نور کا خیال آیا جس کا وعدہ شاہ شجاع کی زوجہ شاہ (یا وفا) بیگم نے کیا تھا، اور وہ اسے حاصل کرنے کا خواہش مند ہوا۔ بیگم فی الواقع اپنے شوہر سے آملی تھی، مگر "روشنی کا پہاڑ" اس وقت تک ہاتھ نہ آیا جب تک رسد بند نہ کر دی گئی، جس پر شاہ شجاع نے بالآخر اسے

حوالے کر دیا۔ اس مسرت انگیز واقعے کی خوشی میں رنجیت سنگھ نے ایک عظیم الشان ضیافت کا اہتمام کیا۔

"مہاراجہ کی بزمِ عیش ابھی ختم نہ ہونے پائی تھی کہ ایک قاصد یہ اطلاع لے کر پہنچا کہ فتح خان قلعۂ اٹک کا محاصرہ کیے ہوئے ہے اور محصور فوج، جو خوراک کی شدید تنگی میں مبتلا ہے، کمک کی منتظر ہے۔ چنانچہ دیوان موہکم چند اور غازی خان کو فی الفور کثیر فوج کے ساتھ روانہ کیا گیا، جو تیز رفتار پیش قدمی کرتے ہوئے اٹک پہنچے۔ سکھوں نے دیکھا کہ گرد و نواح کی ساری آبادی محاصرہ کرنے والوں کی ہمدرد ہے، مگر موسم سخت گرم تھا اور اپنے سرد پہاڑی آب و ہوا کے خوگر افغانوں کے لیے تقریباً ناقابلِ برداشت تھا؛ چنانچہ وہ پہلے ہی معرکے میں شکست کھا گئے، جس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ جلتی پیاس میں مبتلا تھے اور بہت سے سپاہی عین لڑائی کے دوران بھی پیاس بجھانے دریا کی طرف لپکتے رہے۔ محاصرہ اٹھ جانے پر موہکم چند بلا مزاحمت قلعے میں داخل ہوا اور فاقہ زدہ محصور فوج کو وافر خوراک بہم پہنچانے کے بعد اپنے حاصل کردہ تمام مالِ غنیمت سمیت لاہور واپس آیا، جہاں مہاراجہ نے اسے اعزازات سے مالا مال کر دیا۔ چونکہ مہاراجہ نے منت مانی تھی کہ افغان مہم کے کامیاب اختتام پر زیریں ہمالیہ میں جوالا مکھی کی زیارت کرے گا، اس لیے اب وہ اسے پورا کرنے کے لیے روانہ ہوا۔ دیوی کی پرستش بجا لانے، اس کا خزانہ بھرنے اور خیرات میں خطیر رقوم صرف کرنے کے بعد مہاراجہ نے والیٔ کشمیر کو، جو اس کا دشمن تھا، اچانک جا لینے کا عزم کیا اور تمام پہاڑی سرداروں کو اپنی افواج سمیت مدد پر آمادہ کر کے کوچ شروع کر دیا۔ لیکن موسمِ خزاں تھا اور سردی شروع ہو چکی تھی۔ درۂ پیر پنجال کے قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ درہ برف سے بند ہے، چنانچہ رنجیت سنگھ لاہور لوٹ گیا۔ مہاراجہ کو یہ اطلاع دی گئی تھی کہ شاہ شجاع کے پاس بہت سے زیورات اور قیمتی جواہر موجود ہیں، جنہیں فروخت

کرنے پر اسے آمادہ کیا جا سکتا ہے، اور خریداری کی پیشکشوں کے ساتھ فوراً قاصد بھیجے گئے، مگر اس نے جواب دیا کہ وہ ایک بے نوا جلاوطن ہے، اس کے پاس بیچنے کے لیے کچھ نہیں اور وہ بیش بہا کوہِ نور پہلے ہی دے چکا ہے۔ لیکن کوئی عذر کارگر نہ ہوا اور اسے جبراً اس کے تمام قیمتی جواہر سے محروم کر دیا گیا۔ اس کمینہ حرکت نے اسے مشتعل اور غالباً خوف زدہ بھی کر دیا، چنانچہ اس نے اپنے حرم کے فرار کی تدبیر کی اور اسے عملی جامہ پہنایا۔"

مصنف تاہم مزید لکھتا ہے کہ حرم کے فرار کے بعد "شاہ شجاع کو قید کر دیا گیا، مگر وہ رات کے وقت اس کمرے کی دیوار میں، جہاں وہ محبوس تھا، سوراخ کرنے میں کامیاب ہو گیا اور وہاں سے نکل کر پیدل اور بھیس بدل کر برطانوی سرحد تک جا پہنچا، جہاں اس نے اپنا تعارف کرایا اور اس کے ساتھ مہربانی کا سلوک ہوا۔" رنجیت سنگھ کے کردار پر یہ ایک سنگین دھبا ہے کہ اس نے شاہ شجاع کے ساتھ ایسا ذلیل رویہ اختیار کیا، جس کے بڑے بھائی شاہ زمان نے کسی افغان حاکم پر ترجیح دے کر اسے لاہور کا حکمران مقرر کیا تھا۔ مزید برآں شاہ شجاع اس کا مدعو مہمان تھا، کبھی خود فرماں روا رہ چکا تھا، اب مصیبت زدہ ہو کر اسی کی پناہ، سرپرستی اور کفالت میں تھا، اور وہ اس سے "روشنی کا پہاڑ" پہلے ہی چھین چکا تھا!

وزیر فتح محمد خان بارکزئی چند ماہ تک محمود شاہ کے احکام کے تحت کشمیر پر حکمرانی کرتا رہا۔ فتح محمد خان، دوست محمد خان، یار محمد خان اور عظیم خان اور کئی دوسرے، جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے، آپس میں بھائی تھے۔ فتح محمد اپنے بھائی سردار عظیم خان کو اپنی جگہ چھوڑ کر خود کابل واپس چلا گیا۔ وہاں سے اس نے اٹک کے قبضے کی خاطر ایک عظیم لشکر کے ساتھ چڑھائی کی، مگر شکست کھا کر لوٹا۔

۱۸۱۳ء میں سردار محمد عظیم خان نے حکومت کا منصب سنبھالا۔ اس نے پنڈت سہج رام کو دیوان کے عہدے پر برقرار رکھا اور ساتھ ہی دیوان ہیرا داس کو صاحبِ کار یعنی منتظم مقرر کیا۔

سردار محمد عظیم خان، والیٔ کشمیر ۱۸۱۳ء تا ۱۸۱۹ء، جس نے ۱۸۱۴ء میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی کشمیر پر یورش کو پسپا کیا۔

۱۸۱۴ء میں رنجیت سنگھ نے آٹھ لاکھ روپے کی اس دوسری قسط کی وصولی کے لیے، جس کا وعدہ وزیر فتح خان نے اس سے کیا تھا، دس ہزار سکھوں کے ساتھ کشمیر پر حملہ کیا۔ رنجیت سنگھ خود پونچھ میں ٹھہرا رہا، جب کہ اس کی فوج غیر معروف راستوں سے ہوتی ہوئی سالھ گاؤں تک پہنچی۔ ایک اور دستہ توشہ میدان کے راستے ریار (بڈگام سے ۱۵ میل) پہنچا؛ توشہ میدان گلمرگ سے دس میل جنوب مشرق میں واقع ہے اور کشمیر کے خوب صورت ترین مرگوں یعنی سبزہ زاروں میں شمار ہوتا ہے۔ ابتدا میں افغان فوج کا ایک دستہ پسپا کر دیا گیا۔ شوپیاں کے قصبے پر حملہ کیا گیا، مگر یہ یلغار ناکام رہی اور سکھ پہاڑی دروں کی طرف پیچھے ہٹ گئے۔

عظیم خان اس موقع پر پوری طرح عہدہ برآ ثابت ہوا اور اس نے مرکزی فوج کا مقابلہ کیا۔ سکھوں کو شدید بارش اور سخت سردی کے پیدا کردہ ناموافق حالات نے، اور ہیوگل کے بقول رسد کی قلت نے بھی، خاصا زچ کر رکھا تھا۔

جب رنجیت سنگھ کو یہ اطلاع ملی کہ اس کی ہیرہ پور والی فوج آخری سپاہی تک ہلاک ہو چکی ہے تو اپنا سارا سامان اور فوج کا ایک بڑا حصہ کھو دینے کے بعد وہ خود ۳۰ جولائی ۱۸۱۴ء کو

تقریباً تنِ تنہا بھاگ کر منڈی پہنچا۔ عبداللہ خان نے ضلع میرپور میں کوٹلی کے درے تک اس کا تعاقب کیا اور کثیر مالِ غنیمت کے ساتھ واپس آیا، جس میں رنجیت سنگھ کا محبوب گھوڑا لیلی بھی شامل تھا۔

رنجیت سنگھ کی روانگی نے سکھ فوج کے حوصلے پست کر دیے اور وہ آٹھ روز کی لڑائی کے بعد پسپا ہو گئی۔

[توشہ میدان کے راستے کی تاریخی اہمیت کا بہترین ثبوت یہ ہے کہ کشمیر پر حملے کی غرض سے کی جانے والی مہمات کے لیے دو مواقع پر یہی راستہ منتخب کیا گیا۔ محمود غزنوی نے ۱۰۲۱ء میں کشمیر پر حملہ کیا تو ابو ریحان البیرونی اس کے ہمراہ تھا۔ محمود ناکام رہا۔ رنجیت سنگھ بھی کشمیر پر اپنے اسی پہلے حملے میں ناکام ہوا۔ ہیون سانگ (Hiuen Tsang) تقریباً ۶۳۳ء میں توشہ میدان ہی کے راستے پونچھ آیا تھا۔]

آئیے اس مہم کا احوال ظفرنامہ رنجیت سنگھ کے مصنف کنہیا لال کی زبانی سنیں: ”کشمیر کی تسخیر کی آرزو رنجیت سنگھ کے دل پر دوبارہ غالب آئی تو اس نے وادی کے افغان حکمران محمد عظیم پر حملہ کرنے کا عزم کیا اور سمت ۱۸۷۱ (مطابق ۱۸۱۴ء) میں پہاڑی علاقوں کے متعدد راجاؤں اور ان کی افواج کے ہمراہ اس کے خلاف روانہ ہوا۔ وہ کچھ عرصہ سیالکوٹ میں مقیم رہا، یہاں تک کہ اس کے حلیف اس سے آ ملے، اور پھر وہ پہاڑوں کی جانب پیش قدمی کر گیا جہاں راجوری کا سردار عزخان بھی اس کے استقبال کو آیا اور اطاعت و خراج پیش کیا۔

”پھر رنجیت سنگھ ڈیرہ بہرام، یعنی درۂ پیر پنجال کے قریب واقع بہرام گلہ کی طرف بڑھا، جہاں اس کا سامنا دشمن کی ایک فوج سے ہوا، مگر اس نے اسے شکست دے کر منتشر کر دیا

اور وہ قلعے میں پناہ گزیں ہوئی، جس کا محاصرہ کیا گیا اور اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ پھر وہ آگے بڑھ کر پونچھ پہنچا، جہاں کئی روز قیام کیا اور محمد عظیم کے پاس ایک ایلچی روانہ کیا جس کے ذریعے اس سے اطاعت قبول کرنے کا مطالبہ کیا۔ محمد عظیم نے جواب دیا کہ وہ مہاراجا کا نہیں بلکہ شاہِ کابل کا تابع فرمان ہے، جس نے کشمیر کی حکومت اس کے سپرد کی ہے اور وہ اس کے دفاع کے لیے تیار ہے۔ اب رنجیت سنگھ نے فوراً اس پر حملہ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ کوہِ پیر پنجال عبور کر کے رنجیت ہیرا پور جا پہنچا، جہاں اس نے افغانوں اور کشمیریوں کی کثیر جمع شدہ افواج کو پایا اور ان سے جنگ چھیڑ دی۔ لڑائی کے دوران بارش اس شدت سے برسی کہ سیلاب آگیا، اور سردی اس قدر سخت تھی کہ پنجابیوں کے حوصلے پست ہو گئے اور انہیں شکست ہوئی؛ ان کے تین اعلیٰ افسر، یعنی گوری سنگھ، مہیشا سنگھ اور داسا سنگھ مارے گئے۔ ابھی لڑائی زوروں پر تھی کہ غدار عزخان نے، جو محض جبراً رنجیت سنگھ کی افواج میں شامل ہوا تھا، اسے اطلاع دی کہ ہیرا پور میں چھوڑی گئی اس کی بیشتر فوج قتل یا گرفتار ہو چکی ہے۔

"یہ خبر جھوٹی تھی، مگر سکھوں نے اسے سچ جان لیا، اور رنجیت فوراً نہایت عجلت میں پسپا ہو کر سرحدِ کشمیر پر واقع بھمبر جا پہنچا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ عزخان نے جھوٹا بیان دیا تھا تو اس نے فوراً واپس جا کر محمد عظیم کو زیر کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ تاہم اس کے دربار کے سرداروں نے اس کے برعکس پرزور استدعائیں کیں اور جرأت کے ساتھ اسے مشورہ دیا کہ وہ اپنی افواج سمیت لاہور لوٹ جائے، جسے بالآخر اختیار کرنے پر وہ مجبور ہوا۔ انہوں نے یہ تجویز بھی دی کہ ضرورت پڑنے پر مہم کی تجدید کی تیاریاں لاہور میں کی جا سکتی ہیں، مگر اس دوران مہاراجا کو چاہیے کہ کشمیر کے افغان حکمران کے نام ایک مصالحت آمیز، تاہم دھمکیوں سے آمیختہ، خط روانہ کرے جس میں اسے ہیرا پور کا محاصرہ اٹھانے اور سکھ

محافظ دستے کو بخیریت نکل جانے دینے کی تلقین کی جائے۔ رنجیت سنگھ نے ایسا ہی کیا، اور تھوڑے ہی عرصے میں ہیرا پور کا محافظ دستہ، جو ہتھیار ڈال چکا تھا، اس سے آملا اور محمد عظیم کا دوستانہ جواب بھی لایا۔ اب لاہور کی جانب واپسی کا سفر فوراً شروع ہوا، مگر دیوان موہکم چند، جو کشمیر ہی میں بیمار پڑ چکا تھا، دارالحکومتِ پنجاب پہنچتے ہی چل بسا۔ رنجیت سنگھ کو اس کے نقصان کا بہت رنج ہوا؛ اس نے موہکم چند کے دونوں بیٹوں رام دیال اور موتی رام کو اس کی جگہ دیوان مقرر کیا اور انہیں مختلف فوجی مہمات کی نگرانی سونپی۔"

"مہاراجا نے مجھے بتایا کہ یہ گھوڑا (لیلیٰ) اسے ساٹھ لاکھ روپے اور بارہ ہزار سپاہیوں کی قیمت پر ملا، کیونکہ یہ کئی جنگوں کا باعث بنا۔ یہ پشاور کے یار محمد خان کی ملکیت تھا اور رنجیت سنگھ نے اس جانور کی حوالگی کو صلح کی شرائط میں شامل کر دیا تھا۔ تاہم اس چالاک مسلمان نے، جو اس شرط کو اپنے لیے باعثِ ذلت سمجھتا تھا، کئی بار لیلیٰ کے نام سے کوئی اور گھوڑا بھیج کر اسے ٹالا، اور یہ جنرل وینچورا (General Ventura) کی وضع کردہ تدبیر ہی کی بدولت بالآخر حاصل ہوا۔" —بیرن ہیوگل (Baron Hügel) کا سفرنامہ، لندن، صفحہ 333۔ مورکرافٹ (Moorcroft) نے، جب وہ ۸ مئی ۱۸۲۰ء کو لاہور میں رنجیت سے ملا، گھوڑوں کا اتنا بڑا ذخیرہ دیکھا جو محض دولت سے نہیں خریدا جا سکتا تھا۔ مہاراجا نے فتح خان اور اس کے بھائیوں سے بخارا کے گھوڑوں میں سے بعض بطور تحائف اور بذریعہ خرید حاصل کیے تھے۔ — جرنل آف دی پنجاب یونیورسٹی ہسٹاریکل سوسائٹی، اپریل ۱۹۳۳ء، صفحہ 90۔ "گھوڑوں سے رنجیت کا شغف تقریباً جنون کی حد کو پہنچا ہوا ہے"، ڈبلیو جی آسبورن (W. G. Osborne) نے ۱۸۴۰ء میں لکھا (صفحہ 91)۔ 2۔ ڈاکٹر سٹائن

(Dr. Stein) کی اینشنٹ جیوگرافی آف کشمیر، صفحہ 81۔ 3۔ دی انڈین اینٹی کویری، جلد 17، جنوری ۱۸۸۸ء، صفحہ 18، انگریزی ترجمہ از ای ری ہاتسک (E. Rehatsek)۔

کرنل ڈی آکٹرلونی (Colonel D. Ochterlony)، ایجنٹ گورنر جنرل، نے ۱۳ اگست ۱۸۱۴ء کو لودھیانہ سے خفیہ، سیاسی و امورِ خارجہ کے محکمے کے سیکرٹری حکومت مسٹر جے ایڈم (J. Adam) کو رنجیت سنگھ کی شکستِ فاش کی اطلاع حسبِ ذیل مراسلے میں دی:
"مجھے ابھی ابھی یہ اطلاع ملی ہے کہ رنجیت کی فوج، جو پیر پنجال سے آگے بڑھ چکی تھی، ناظم کی افواج سے ٹکرائی اور خاصے نقصان کے ساتھ شکست کھا گئی۔ چنانچہ رنجیت نے اس کی پسپائی کا حکم دیا، جو ایسی بے ترتیبی اور ابتری سے عمل میں آئی کہ ایک ناگوار فرار کی صورت اختیار کر گئی جسے اس کی تمام ذاتی کوششیں بھی نہ روک سکیں، اور خط کی تاریخ (۲۸ جولائی) تک کشمیری فوج اور پونچھ کا راجا روہ اللہ خان تعاقب کر رہے تھے۔

"قرینِ قیاس ہے کہ یہ صورتِ حال، اور جو مصائب پیش آئے، رنجیت کو اس مہم سے دستبردار ہونے پر آمادہ کر دیں گے، اور اگر وہ کسی قدر باوقار پسپائی میں کامیاب ہو گیا تو میرا خیال ہے کہ اس کا کچھ سہرا اس کی باقاعدہ پلٹنوں کے سر ہو گا، مگر زیادہ تر اس کے مقابل دشمن کی بدانتظامی کے۔"

اس فتح کے بعد عظیم خان نے فطری طور پر ان سرکردہ پنڈتوں سے بازپرس کی جنہیں وہ رنجیت سنگھ کو کشمیر پر حملے کی ترغیب دینے کا تنہا ذمہ دار گردانتا تھا۔ اس سازش میں شرکت کی پاداش میں پنڈتوں کے ساتھ بہت سے مسلمانوں کو بھی نقصان اٹھانا پڑا اور دونوں کی جاگیریں ضبط ہوئیں، جو تاہم تحقیقات کے بعد واپس کر دی گئیں۔ عظیم نے مقامی سپاہ کو

بھی برطرف کر دیا۔ انہی دنوں اہلِ کشمیر ایک قحط میں مبتلا ہوئے جس نے انسانی جانوں کا بھاری خراج وصول کیا۔

شجاع الملک وزیر فتح خان کی گرفت سے آزاد ہوا تو رنجیت سنگھ کے ساتھ ایک نئی الجھن میں گرفتار ہو گیا، جس نے اس سے کوہِ نور ہیرا اور دیگر قیمتی جواہر چھین لیے۔ بعد ازاں شجاع الملک انگریزی علاقے میں چلا گیا اور لودھیانہ میں سکونت اختیار کی، جہاں سے وہ کشتواڑ گیا اور کشمیر کی تسخیر کی ایک دو ناکام کوششیں کیں۔ آخر کار لارڈ آکلینڈ (Lord Auckland) کی مدد حاصل کر کے اس نے کابل اور قندھار پر دوبارہ قبضہ کر لیا، مگر دو برس کی مختصر حکمرانی کے بعد قتل کر دیا گیا۔

عظیم خان نے محاصلِ مالگزاری جمع کرنے کا کام تین پنڈتوں، یعنی بیربل در، مرزا پنڈت اور سکھ رام کے سپرد کر رکھا تھا۔ اول الذکر کے ذمے ایک لاکھ کی رقم واجب الادا تھی۔ جب اس سے ادائیگی کا مطالبہ ہوا تو اس نے عظیم خان سے گستاخانہ گفتگو کی، مگر عظیم خان نے مرزا پنڈت کے ضامن بننے پر اسے بقایا جات کی ادائیگی کے لیے مہلت دے دی۔ پنڈت بیربل در نے اس مہلت سے ملک سے فرار ہونے میں کام لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۸۱۸-۱۹ء کے موسمِ سرما میں برف پوش پہاڑوں کے پار بیربل کا یہ فرار ملک نامدار اور ملک کامدار کی اعانت کی بدولت ممکن ہوا۔ گلاب سنگھ کے بھائی راجہ دھیان سنگھ کے اثر و رسوخ نے بیربل در کے لیے رنجیت سنگھ کے دربار تک آسان رسائی مہیا کر دی۔ ناظمِ مواصلات پنڈت واسا کاک بیربل کی بیوی کو ایک محفوظ مقام تک پہنچا آیا۔ مگر جن لوگوں نے بیربل در کے فرار میں اس کی مدد کی تھی، ان کی خود اس کے داماد پنڈت تلوک چند نے غداری سے

مخبری کر دی۔ ظاہر ہے کہ عظیم خان نے ان پر سختی کی۔ بیربل کی بیوی کدمال دید نے اپنی جان دے دی۔

۱۸۱۹ء میں وزیر فتح خان نے، جس کی آنکھیں حاکمِ ہرات شاہ کامران (محمود کے بیٹے اور تیمور شاہ کے پوتے) نے نکلوا دی تھیں، عظیم خان کو کشمیر سے بلا بھیجا تاکہ وہ امورِ وزارت کی انجام دہی میں اس کی مدد کرے اور کامران سے جنگ کرے۔ عظیم خان نے اپنا تمام مال و اسباب سہج رام کے ہمراہ کابل روانہ کر دیا، حکومت اپنے بھائی جبار خان کے حوالے کی اور کابل کو چل دیا۔ 1۔ ان سائیڈ کشمیر، صفحہ 177۔ 2۔ کشمیر میں لوگ آج بھی کہتے ہیں کہ بیربل کی بیوی نے ہیرے کا ٹکڑا نگل کر خودکشی کی، اور بعض تو یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ الماس چاٹ کر۔ خان بہادر میاں افضل حسین، ایم ایس سی (پنجاب)، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی، نے اس نظریے کے ناقابلِ قبول ہونے کی جانب میری توجہ دلائی۔ یہ معاملہ پنجاب کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی، مغلپورہ، لاہور کے پروفیسر کیمیا ڈاکٹر ایس ڈی مظفر، ایم ایس سی (پنجاب)، پی ایچ ڈی (کیمبرج) کے سامنے پیش کیا گیا تو انہوں نے اپنے مکتوب مورخہ ۵ جون ۱۹۴۲ء میں اس بارے میں اظہارِ رائے کیا، جس کے لیے میں ان کا شکرگزار ہوں۔

یہ رائے حسبِ ذیل ہے: ”آپ نے میری رائے دریافت کی ہے کہ آیا کوئی شخص قیمتی پتھر کھانے سے مر سکتا ہے۔ اس سوال کے بارے میں حقیقتِ حال یہ ہے کہ طبی نقطۂ نظر سے کوئی بھی قیمتی پتھر اس معنی میں زہر کا کام نہیں کرتا جس معنی میں سنکھیا یا افیون وغیرہ کرتے ہیں۔ ان میں ایسی کوئی شے نہیں جو انسانی جسم اور بالخصوص خون میں جاری مختلف کیمیائی عوامل کو درہم برہم کر دے۔ لیکن اگر انہیں اس طرح پیسا جائے کہ ان کے کنارے

تیز دھار ہوں تو ان کا عمل ویسا ہی ہوتا ہے جیسا تیز دھار کناروں والی شیشے کی کرچیاں نگلنے کا، جو جسمانی بافتوں کو کاٹتی اور ان میں پیوست ہو کر مستقل زخم پیدا کرتی ہیں جو اندرونی زہرِ خون کا موجب بن سکتے ہیں۔ یہ بات معروف ہے کہ پسا ہوا شیشہ اسی طرح اثر کرتا ہے اور کھانے میں شیشے کا سفوف ملا کر لوگوں کو ہلاک کیا جاتا رہا ہے۔ لہٰذا اگر آپ یہ فرض کریں کہ مذکورہ خاتون نے کوئی ایسا قیمتی پتھر کھایا جو غالباً صیقل شدہ تھا اور جس کے کنارے زیادہ تیز نہ تھے تو آپ بالکل بجا ہیں۔ لیکن اگر وہی پتھر پیس کر کھایا جاتا تو وہ زہر کا کام کر سکتا تھا۔" لاہور کے ایک معروف صاحبِ علم حکیم نے بھی ہیرا نگلنے سے موت واقع ہونے کی صحت کے بارے میں شبہے کا اظہار کیا۔

افغان افواج کا ایک بڑا حصہ بھی کامران کی سرکوبی کے لیے قندھار روانہ کر دیا گیا۔

جبار خان افغان حکمرانوں میں آخری تھا۔ ان حکمرانوں میں سے متعدد نے ظلم و جبر اور زیادتی کی طرف عجیب میلان کا مظاہرہ کیا، جس نے بالآخر ان کے اقتدار کا خاتمہ کر دیا۔ تاہم اپنے پیش رووں کے برعکس جبار خان نہایت نرم خو اور عادل تھا، مگر قسمت میں اس کی حکمرانی صرف چار ماہ لکھی تھی!

یہ ذکر پہلے آ چکا ہے کہ پنڈت بیربل در کس طرح رنجیت سنگھ کے دربار میں جا پہنچا تھا۔ جب پنڈت نے عظیم خان کی کابل روانگی کی خبر سنی تو اس نے رنجیت سنگھ کو کشمیر پر حملے کی ترغیب دی۔ اپنی سابقہ ناکامی کو یاد کر کے رنجیت سنگھ اس مجوزہ اقدام سے خوف کھاتا تھا۔ آخر کار بیربل در نے ناکامی کی صورت میں ہر ممکنہ نقصان کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ بطور ضمانت پنڈت نے اپنا بیٹا راج کاک در، جس نے بعد ازاں کشمیر میں سکھ عہدِ حکومت کے دوران ایک اعلیٰ انتظامی منصب سنبھالا، "شیرِ پنجاب" کے پاس بطور یرغمال دے

دیا۔ تب مہاراجا نے، یہ جانتے ہوئے کہ کشمیر کی افغان فوج کا ایک بڑا حصہ قندھار میں شاہ کامرانِ ہرات کے خلاف برسرِپیکار ہے، بیربل کے مشورے پر عمل کرنا قبول کر لیا۔

چنانچہ تیس ہزار سکھوں کی ایک فوج نے، جس کی قیادت سردار ہری سنگھ نلوا، حکم سنگھ، راجہ گلاب سنگھ اور دیوان مصرچند جیسے تجربہ کار سالار کر رہے تھے، کشمیر پر حملہ کیا۔ فوج کا بڑا حصہ تھنہ کی جانب بڑھایا گیا اور ایک دستہ درۂ درہال کے راستے روانہ کیا گیا۔ جبار خان اپنی فوج کے ساتھ ہیرا پور پہنچا اور اس نے راستے کی نگہبانی کے لیے ایک دستہ پیر پنجال (پانتسال) بھی بھیجا۔

افغانوں نے حملہ آوروں کو پسپا کر دیا اور دو توپوں پر قبضہ کر لیا، مگر وہ اپنی اس کامیابی سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ ازسرِنو صف آرا سکھوں نے افغانوں پر پھر حملہ کیا اور کیپٹن کننگھم (Captain Cunningham) کے الفاظ میں تقریباً بغیر خونریزی کے فتح پا لی۔ سکھوں کی عددی برتری کے باعث جبار خان کے سپاہیوں کے حوصلے پست ہو گئے، تاہم ان کا سالار خود جان توڑ کر لڑا۔ کہا جاتا ہے کہ جبار خان کو اٹھارہ زخم آئے اور اس کا معتمد افسر اسے میدانِ جنگ سے اٹھا لے گیا اور فوری پسپائی کا حکم دیا۔ کئی دن گزرنے کے بعد جبار خان کو ہوش آیا۔ بعد ازاں وہ اپنا قیمتی مال و متاع لے کر بارہ مولہ کے راستے کابل روانہ ہو گیا اور یوں کشمیر مکمل طور پر سکھوں کے قبضے میں چھوڑ گیا۔

۱۸۱۹ء میں کشمیر کی تسخیر میں دو عوامل نے رنجیت سنگھ کی مدد کی: ایک ۱۸۱۸ء میں قلعۂ ملتان کے سقوط سے اسے حاصل ہونے والا بےپناہ مالِ غنیمت، اور دوسرے افغانستان کی خانہ جنگی کے باعث تقریباً تمام جنگ آزمودہ افغان دستوں کا وادی سے نکل کر دریائے سندھ کے پار چلے جانا۔ وادی میں چھوڑے گئے ناتجربہ کار رنگروٹ ملتان کی لوٹ سے

خوب لیس، ازسرِنو منظم سکھ فوج کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ اس واقعے کی خوشی میں لاہور میں تین دن چراغاں کیا گیا۔ مگر عجیب بات یہ ہے کہ رنجیت سنگھ ایک وہمی خوف کے باعث خود کشمیر میں داخل نہ ہوا۔

اس فتح کا جو بیان ظفرنامہ رنجیت سنگھ کے مصنف نے دیا ہے وہ اعادے کے لائق ہے اور ذیل میں نقل کیا جاتا ہے: "کابل سے یہ اطلاع پہنچی کہ محمود شاہ کا وزیر فتح خان معتوب ہو کر حاکمِ ہرات شہزادہ کامران کے ہاتھوں بینائی سے محروم کر دیا گیا ہے اور افغانستان میں خانہ جنگی برپا ہے، تو مہاراجا نے اسے پشاور اور کشمیر دونوں کی تسخیر کا نادر موقع جانا، خصوصاً اس لیے کہ کشمیر کا انتظام اب جبار خان کے ہاتھ میں تھا، جسے محمد عظیم افغانستان واپس جاتے وقت اپنا نائب بنا کر چھوڑ گیا تھا۔ چنانچہ رنجیت سنگھ نے پشاور کی سمت کوچ کیا۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے راوی، چناب اور جہلم عبور کر لیے، مگر جب وہ دریائے سندھ کے کنارے پہنچا تو وہاں کشتیاں نہ ملیں۔ 'تقریباً معجزانہ انداز میں بغیر کشتیوں کے' گھوڑوں پر اپنی فوج سمیت دریا عبور کر کے وہ بخیریت دوسرے کنارے جا پہنچا، قلعۂ خیرآباد اور پھر قلعۂ جہانگیر فتح کیے، جس پر افغانوں کے قبیلۂ خٹک کا سردار فیروز خان عاجزی کے ساتھ اطاعت بجا لانے حاضر ہوا۔ جب پشاور کے حاکم یار محمد نے رنجیت سنگھ کی آمد کی خبر سنی تو وہ فوراً یوسف زئی کے پہاڑوں میں جا چھپا۔ مہاراجا نے قلعے پر قبضہ کیا، جہانداد خان کو اس کا قلعہ دار مقرر کیا اور صرف تین دن کے قیام کے بعد پھر روانہ ہو گیا۔ اٹک کے قریب پڑاؤ کے دوران رنجیت سنگھ کو یار محمد کی جانب سے ایک لاکھ روپے کے نذرانے کی پیش کش موصول ہوئی، جس نے اس شرط پر کہ اسے دوبارہ حاکم مقرر کر دیا جائے، ہر سال اتنی ہی رقم ادا کرنے کا وعدہ بھی کیا۔"

پشاور، اور مہاراجا نے اس پر رضامندی ظاہر کی۔ اسی اثنا میں خبر پہنچی کہ یار محمد نے دوست محمد کی مدد سے بہرحال جہاں داد خان پر حملہ کر کے اسے پشاور سے نکال باہر کیا اور دونوں نے شہر پر قبضہ کر لیا۔ مہاراجا نے فوراً اپنے بیٹے کھڑک سنگھ کو دس ہزار سپاہ کے ساتھ ان دونوں حملہ آوروں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا، مگر ان پر پڑنے والی یہ ضرب اس وقت ٹل گئی جب وعدہ شدہ اور مدت سے مؤخر نذرانہ آن پہنچا اور یار محمد نے اطاعت کا اظہار کر دیا۔ اس معاملے کو اپنی مرضی کے مطابق نمٹا کر مہاراجا حاصل شدہ رقم سمیت لاہور لوٹ آیا۔ لیکن چونکہ اس کا دل کشمیر کی تسخیر پر تلا ہوا تھا، اس لیے وہ زیادہ دیر چین سے نہ بیٹھ سکا۔ ”سمت ۱۸۷۶ بکرمی میں فوج تیار ہو چکی تھی کہ عین اسی زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا کہ جبار خان نے، جو اس وقت کشمیر کا حاکم تھا، اپنے دیوان پنڈت بیربل کو نہ صرف معزول کیا بلکہ رسوا کر کے مفلسی تک پہنچا دیا۔ اس پر دیوان انتقام کی آگ میں جلتا ہوا لاہور جا پہنچا اور رنجیت سنگھ کو کشمیر کی تسخیر پر اکسانے لگا۔ مہاراجا نے یہ تجویز منظور تو کر لی، مگر اسے اندیشہ تھا کہ اگر ملک کے تمام سرداروں کی حمایت کا یقین حاصل نہ ہوا تو سابقہ موقع کی طرح اس مہم میں بھی اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

چنانچہ مذکورہ دیوان نے راجاؤں کو خطوط بھیجے جن میں انہیں رنجیت سنگھ کی اطاعت کے اظہار کی دعوت دی گئی تھی، اور تھوڑے ہی عرصے میں بیشتر کی جانب سے تسلی بخش جواب موصول ہو گئے۔ حتیٰ کہ بھمبر کے عظیم خان نے بھی، جو پہلے مخالف رہ چکا تھا، رنجیت سنگھ کی حمایت کا وعدہ کر لیا، اور راجوری کے سردار اور پونچھ کے قلعہ دار نے بھی؛ چنانچہ فوج نے فوراً کوچ شروع کر دیا۔ دیوی چند کو حکم ملا کہ جلد از جلد راجوری کے قصبے میں پہنچ کر کوہِ ہمالیہ کے دامن میں مہاراجا کی آمد کا انتظار کرے اور اس دوران پہاڑی سرداروں سے رابطہ رکھ کر ان کی وفاداری کو یقینی بنائے۔ رنجیت سنگھ لاہور سے پہلے امرتسر

گیا، جہاں اس نے رام داس کے مندر میں عبادت کی، وہاں کے سادھوؤں اور فقیروں میں فراوانی سے خیرات بانٹی، اور پھر تیزی سے کشمیر کی جانب کوچ کیا۔ یہاں اس کا دوستانہ خیر مقدم ہوا، کیونکہ مفرور دیوان اس کے ہمراہ تھا۔ تاہم اس نے مناسب سمجھا کہ بھمبر پہنچنے کے بعد مزید پیش قدمی نہ کرے۔ کچھ عرصہ اس خوش گوار قصبے میں قیام اور اپنی فوجوں کے اجتماع کے بعد رنجیت سنگھ نے شہزادہ کھڑک سنگھ کو، دیوی چند کو اس کا نائب مقرر کر کے، پیش قدمی کا حکم دیا۔ وہ دوست سرداروں کے ہمراہ چلتے ہوئے ہمالیہ کے سلسلۂ پیر پنجال تک جا پہنچے، جہاں ان کا دشمن سے سامنا ہوا اور کئی روز تک جاری رہنے والی لڑائی چھڑ گئی جس میں سکھ فتح یاب رہے۔

اس طرح افغانوں اور کشمیریوں کی متحدہ فوجوں کو شکست دے کر انہوں نے سری نگر کو بھی فتح کرنے کے ارادے سے اپنا سفر جاری رکھا۔ حاکمِ کشمیر جبار خان کے دو بڑے افغان افسروں، صمد خان اور مہر دل خان نے سکھوں کی مزید پیش قدمی روکنے کے لیے ان پر حملہ کیا، مگر انہیں پھر شکست ہوئی اور مہر دل مارا گیا۔ اب جبار خان نے شیر گڑھ کے قلعے میں پناہ لی۔ اس پر رنجیت سنگھ کی فوج، جسے مزید کوئی مزاحمت پیش نہ آئی، فوراً شہر سری نگر میں داخل ہو گئی۔ نظمِ حکومت درست کرنے کے بعد مہاراجا نے جبار خان پر، جو شیر گڑھ کے قلعے میں محصور ہو بیٹھا تھا، حملے کا ارادہ کیا مگر معلوم ہوا کہ وہ قلعہ خالی کر کے جا چکا ہے، البتہ اپنی ساری دولت پیچھے چھوڑ گیا ہے، جس پر رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا۔ اس طرح کشمیر فتح کر کے مہاراجا نے دیوان دیوی چند کو اس کا حاکم مقرر کیا، دو ہفتے راجوری میں گزارے، پھر عظیم گڑھ کے قلعے کو اس کی کشمیری چھاؤنی سمیت ایک ہی یلغار میں سر کر لیا اور واپس امرتسر کی راہ لی، جہاں اس نے رام داس کے مندر کو بڑے نذرانے پیش کیے اور خیرات تقسیم کی۔ آخر میں مہاراجا لاہور واپس پہنچا، جہاں اس نے اپنے افسروں اور سپاہیوں کو

خلعتیں اور دیگر انعامات عطا کیے، فتح کی خوشی میں عام جشن منانے کا حکم دیا اور شاہانہ انداز میں ضیافتیں کیں۔" (انڈین اینٹی کویری (Indian Antiquary)، جلد 17، جنوری ۱۸۸۸ء، صفحات 19 تا 21؛ ای ریہاٹسک (E. Rehatsek) کا انگریزی ترجمہ)

کشمیر پر سکھوں کی فتح کی تاریخ خود ان کے جنگی نعرے میں مضمر ہے، جس کے حروف بکرمی سال ۱۸۷۶ یعنی ۱۸۱۹ء کے عدد کے مطابق ہیں:

بولو جی واہ گرو جی کا خالصہ ۔ بولو جی واہ گرو جی کی فتح

یوں کشمیر میں مسلم اقتدار کا خاتمہ ہوا۔ اس کا آغاز ۱۳۲۰ء میں رنچن کے قبولِ اسلام سے ہوا تھا۔ شاہ میری خاندان نے، جو سلطان شمس الدین شاہ میریا شاہ مرزا کی اولاد تھا، ۱۳۳۹ء سے ۱۵۵۵ء تک حکومت کی۔ ان کے بعد چک برسرِ اقتدار آئے اور ۱۵۸۶ء تک حکمران رہے، جب اکبر نے کشمیر فتح کر لیا۔ افغان ۱۷۵۲ء میں آئے اور ان کی حکومت ۱۸۱۹ء میں ختم ہوئی۔

۱۳۲۰ء سے ۱۸۱۹ء تک شمسی حساب سے یہ مدت ۴۹۹ برس بنتی ہے، اور ۷۲۰ھ سے ۱۲۳۵ھ تک قمری حساب سے ۵۱۵ برس۔ گویا کشمیر میں مسلم اقتدار قریباً پانچ سو برس قائم رہا۔

جس افغان نے تیمور شاہ کے بڑے بیٹے ہمایوں کی آنکھوں میں نشتر پھیرا، پھر زمان شاہ کی آنکھوں میں اور پھر وزیر فتح خان کی آنکھوں میں بھی، اس نے وہی نشتر کابل اور کشمیر کے باہمی تعلق پر بھی چلا دیا۔ اگر افغان صوبے دار برطانیہ کی حکومتوں کی تبدیلی کے معاملے میں ہندوستان کے گورنر جنرل کے طرزِ عمل کی پیروی کرتا اور وِگ و ٹوری، لبرل و کنزرویٹو یا

یونینسٹ و لیبر کی تبدیلیوں سے اسی طرح بے نیاز رہتا، تو شاید وہ نہ اپنا خاندان تباہ کرتا اور نہ کابل اور کشمیر کا رشتہ برباد کرتا۔ قیصر اور کامران کی کشمکشِ اقتدار درانیوں کی بے بسی پر منتج ہوئی۔ افغان کی حماقت، اس کی حرص اور اس کی زبردست وصولیاں ہی اس نقصان کی ذمہ دار ہیں۔ اس کا لگایا ہوا سفیدہ، اس کے محلات، اس کا پلاؤ، پنڈت کی صلاحیتوں کی اس کی سرپرستی، پشمینہ (شال یا اونی کپڑے) کی صنعت کو اس کی بخشی ہوئی ترقی اور ہندوستانی لباس پر اس کے میل جول کے اثرات — یہ سب کچھ فراموش ہو چکا ہے۔

لیکن اس کی عدم رواداری اور لوٹ کھسوٹ آج بھی ان لوگوں کی زبانوں پر ہے جن کے آبا و اجداد نے اس کے ہاتھوں دکھ جھیلے اور جو اسی لیے کہتے ہیں:

پرسیدم از باغبان کہ گلشن کہ خراب کرد آہے کشید و گفت کہ افغاں خراب کرد

افغان کے حق میں جو واحد عذر پیش کیا جاتا ہے وہ امورِ سلطنت کو جلد نمٹا دینے کی اس کی روش ہے، جو نرم خو مغلوں کے بعد خاصی کھردری اور عجلت آمیز دکھائی دیتی تھی۔

اب جبکہ کشمیر میں مسلم اقتدار اپنے اختتام کو پہنچتا ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہیں کشمیر میں مسلم ریاست اور معاشرت کے اثرات کی تہذیبی قدر و قیمت پر بحث کی جائے۔ ہم اس موضوع کو کشمیر میں مسلم نظامِ حکومت کی تشریح کے طور پر پیش کریں گے۔ چنانچہ آئندہ تین ابواب، یعنی ہشتم، نہم اور دہم، تین مختلف عنوانات کے تحت اسی موضوع سے بحث کریں گے۔ سیاسی تاریخ کے تسلسل کا دھاگا باب یازدہم میں "سکھوں کے عہد میں کشمیر" کے عنوان سے دوبارہ جوڑا جائے گا۔

پنڈت موہن لال کشمیری عرف آغا حسن جان

یہاں ایک دلکش اور رنگین شخصیت ہماری توجہ اپنی جانب کھینچ لیتی ہے اور ہم ذرا دیر کے لیے اصل موضوع سے ہٹتے ہیں۔

رام ناتھ عرف پنڈت موہن لال، جو ۱۸۱۲ء میں زُتشی خاندان کی اس شاخ میں پیدا ہوا جو دہلی ہجرت کر گئی تھی، ایک غیر معمولی انسان تھا۔

موہن لال کا والد رائے برہم ناتھ تھا، جس کے والد پنڈت منی رام کو عالمگیر ثانی کے بیٹے شاہ عالم ثانی (۱۷۵۹ء–۱۸۰۶ء) کے عہد میں مغل دربار میں بلند منصب حاصل تھا۔

موہن لال نے اردو اور فارسی کی تعلیم گھر پر پائی۔

اس نے دہلی کے فارسی کالج میں ۱۸۲۹ء میں کھولی جانے والی انگریزی جماعت میں داخلہ لیا؛ اس کالج کی بنیاد مغل عہدِ حکومت میں ۱۷۹۲ء میں رکھی گئی تھی۔ ۱۸۲۹ء میں اس کالج کی آمدنی میں لکھنؤ کے سابق وزیر نواب اعتماد الدولہ کے، جو دہلی کے اینگلو عربک کالج کے احاطے میں مدفون ہے، ایک لاکھ ستر ہزار روپے کے فیاضانہ عطیے سے بڑا اضافہ ہوا۔ یہی انگریزی جماعت آگے چل کر دہلی انگلش کالج کی صورت اختیار کر گئی۔ موہن لال نے یہاں تین برس تعلیم پائی۔ ۱۸۳۱ء میں، جب اس کی عمر قریباً انیس برس تھی، وہ سر الیگزینڈر برنز (Sir Alexander Burnes) کے فارسی مترجم کی حیثیت سے ایک ہزار روپے سالانہ تنخواہ پر بخارا گیا۔

موہن لال کا سب سے پرانا ہم جماعت شہامت علی تھا، جو بعد ازاں ”این ہسٹاریکل اکاؤنٹ آف دی سکھس اینڈ افغانز“ کا مصنف بنا اور ۱۸۳۹ء میں لیفٹیننٹ کرنل سر کلاڈ ایم ویڈ (Sir Claud M. Wade) کے پشاور کے مشن میں فارسی سیکریٹری کے فرائض انجام

دیتا رہا۔ شہامت علی اس فوجی مہم میں بھی سر کلاڈ کے ہمراہ رہا جس پر انہیں شاہ شجاع الملک کے بڑے بیٹے شہزادہ تیمور کو سکھ امدادی فوج کے ساتھ درۂ خیبر کے راستے کابل پہنچانے کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔

موہن لال غالباً پہلا کشمیری پنڈت تھا جس نے انگریزی تعلیم حاصل کی، اور غالباً پہلا ہندوستانی تھا جس نے اپنی بیٹی کو انگلستان میں تعلیم دلائی۔

وسطِ ایشیا کے بعد موہن لال نے مصر، انگلستان، اسکاٹ لینڈ، آئرلینڈ، بیلجیم اور جرمنی کی سیاحت کی۔

ہرات کا شاہ کامران اس کی فارسی دانی سے بے حد محظوظ ہوا۔ ایران کے عباس مرزا نے اسے صرف بیس برس کی عمر میں فارس کے نشانِ شیر و خورشید کا اعزاز عطا کر کے "نائٹ" بنا دیا۔ افغانستان کے بادشاہ شاہ شجاع الملک نے اسے سلطنتِ درانی کا ایک نشان عطا کیا۔ مہاراجا رنجیت سنگھ نے اسے پانچ سو روپے اور خلعت سے نوازا۔ مغل بادشاہ محمد اکبر شاہ نے اسے خلعت کے ساتھ ایک دستار پر جڑے چند جواہرات عطا کیے، اور یہ دستار بادشاہ نے اپنے ہاتھوں سے اس کے سر پر باندھی۔

انگلستان اور یورپ کے دیگر ممالک میں موہن لال کی خوب پذیرائی ہوئی۔ پرشیا کے بادشاہ فریڈرک ولیم چہارم (Frederick William IV) نے اسے عشائیے پر مدعو کیا اور ملکہ وکٹوریہ نے اسے شاہی رقص گاہ (بال) میں شرکت کی دعوت دی۔ ("موہن لال کشمیری کی حیات و خدمات، ۱۸۱۲ء–۱۸۷۷ء" از ڈاکٹر ہری رام گپتا (Dr. Hari Ram Gupta)، ایم اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ، سابق لیکچرر فارمن کرسچین کالج لاہور و حال پرنسپل ویش

ڈگری کالج، بھوانی، ضلع حصار، پنجاب؛ منرو ابک شاپ، انارکلی، لاہور، ۱۹۴۳ء۔ مذکورہ بالا خاکہ بیشتر اسی کتاب پر مبنی ہے۔)

موہن لال نے ۱۸۳۴ء میں وسطِ ایشیا سے واپسی پر اپنے سفر کا روزنامچہ شائع کیا۔ بارہ برس بعد یہ کتاب یورپ کے سفرناموں کے اضافے کے ساتھ دوبارہ شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں اس نے امیرِ کابل دوست محمد خان کی سوانح دو جلدوں میں شائع کی۔ اس کے انگریزی اسلوبِ نگارش کو کلکتہ کے اخبار "انگلش مین" کے، جو اب بند ہو چکا ہے، مدیر نے نہایت پسندیدگی کی نظر سے سراہا۔

موہن لال بتیس برس کی عمر میں ایک ہزار پاؤنڈ سالانہ پنشن پر سبکدوش ہو گیا۔

دہلی کے قریب ریاست لوہارو کے حکمران نواب مرزا علاء الدین خان (۱۸۳۳ء–۱۸۸۴ء) نے، جس کا تخلص "علائی" تھا، ایک فارسی نظم میں موہن لال کو آغا حسن جان کہا ہے۔ پنڈت جواہر لال نہرو کا بیان ہے کہ "موہن لال مسلمان ہو گیا اور اس نے ایران میں شاہی خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی؛ اسی بنا پر اسے مرزا کا لقب ملا۔" ڈاکٹر ہری رام گپتا کہتے ہیں کہ حیدرآباد (دکن) کے آغا حیدر حسن موہن لال کے پوتے ہیں، جن کا بیان ہے کہ موہن لال ۱۸۳۱ء سے اپنی وفات تک روزنامچہ لکھتا رہا؛ مگر عجیب بات ہے کہ ڈاکٹر گپتا موہن لال کے قبولِ اسلام کے واقعے کا ذکر کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ موہن لال کی کل سترہ بیویاں تھیں؛ وہ جہاں جاتا، ایک نئی بیوی کر لیتا۔ آخری ایام میں "وہ شراب اور عورتوں کی محبت میں بہہ چکا تھا۔"

لدھیانہ میں موہن لال نے اہلِ تشیع کے لیے وہ عمارت تعمیر کرائی جو آغا حسن جان کے امام باڑے کے نام سے معروف ہے۔ اس کے قریب ہی ایک سڑک اس کے نام سے

موسوم ہے۔ موہن لال کا انتقال ۱۸۷۷ء میں پینسٹھ برس کی عمر میں ہوا اور وہ دہلی میں اپنے باغ، لال باغ، میں دفن ہوا جو دہلی پانی پت روڈ پر آزادپور کے قریب واقع ہے۔ وہاں کوئی مقبرہ نہیں، صرف ایک چبوترہ ہے جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں موہن لال عرف آغا حسن جان اور اس کی چہیتی بیوی حیدری بیگم مدفون ہیں — وہی حیدری بیگم جسے موہن لال نے غدرِ ہند کی افراتفری کے دوران بیگم کے خاندان کے بعض مردوں کو مقدمات میں پھنسا کر حاصل کیا تھا۔ چبوترہ خستہ حالی کا شکار ہے، اور یہ باغ اب موہن لال کے خاندان کی ملکیت میں نہیں رہا۔

موہن لال کی دلآویز شخصیت ہمیں شمالی ہند میں برطانوی اقتدار کے ابتدائی ایام، مہاراجا رنجیت سنگھ کے عہد کے پنجاب، سندھ اور افغانستان میں برطانوی فوجی مہمات، کابل کی تباہیوں اور انیسویں صدی کے چوتھے عشرے میں وسطِ ایشیا کے حالات کی قریبی اور چشم کشا جھلکیاں دکھاتی ہے۔ (جواہر لال نہرو: ''آپ بیتی'' (An Autobiography)، لندن، مطبوعہ جنوری ۱۹۴۱ء، صفحہ 14)